ہماری ویب ای بُک

راشد اشرف

RASHID ASHRAF

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Rashid Ashraf"
at Hamariweb.com

کمال احمد رضوی سے ایک ملاقات

اب کہاں جا کر ڈھونڈیں ایسے دیوانے کو ہم

محمد اسلم لودھی کی تازہ کتاب محبت کا ایک تجزیہ

نگراں کار: www.wadi-e-urdu.com (ابن صفی پر ایک غیر تجارتی ویب سائٹ)

جنوری ۲۰۱۱ میں منظر عام پر آنے والی جناب محمد اسلم لودھی کی کتاب محبت دراصل ان کی خودنوشت سوانح حیات لمحوں کا سفر کا ایک تسلسل ہے۔ لمحوں کا سفر ۲۰۰۷ میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ مختلف النوع مضامین کے مجموعے کی حامل محبت ایک ایسی کتاب ہے جس میں حساس دل رکھنے والوں کو متاثر کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ مذکورہ کتاب میں لودھی صاحب نے جہاں اپنی والدہ محترمہ کا ذکر انتہائی عقیدت سے کیا ہے وہاں ہمیں ان کی نجی زندگی کی ایک تلخ جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب کا قاری ان کی خرابی صحت، بھائیوں سے اختلافات اور نوکری میں درپیش ناساعد حالات کو پڑھتے وقت نہ صرف ایک اپنائیت سی محسوس کرتا ہے بلکہ کئی مقامات پر خود کو ان کے ہمراہ ان مصائب سے نبرد آزما ہوتا بھی محسوس کرتا ہے۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک عام انسان جن مصائب و آلام کا سامنا تمام عمر کرتا ہے، ان میں بین السطور تین بنیادی مسائل سر اٹھائے نظر آتے ہیں۔

وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ آج وہ جس مقام پر ہیں، وہاں پہنچنے میں ان کی والدہ کی دعاؤں کا کلیدی ساتھ رہا ہے۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جن کو اوائل عمر ہی سے غربت اور افلاس سے جنگ کی خاطر مزدوری کرنا پڑی ہو ؟ اور مزدوری بھی ایسی کہ جو انسان کو اندر سے توڑ کر رکھ دے۔ ان کے والد نے میٹرک کے بعد ان سے یہ کہہ کر سلسلہ تعلیم منقطع کرنے کو کہا کہ کالج کی تعلیم تو امیروں کے چونچلے ہیں، ہم ایسے غریبوں کے بس کی بات نہیں۔ لودھی صاحب کے والد بھی اپنی جگہ مجبور تھے کہ حالات سے اکیلے لڑنے کی ان میں سکت نہ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے زندگی کی گاڑی دھکیلنے میں ان کی مدد کریں۔

زیر نظر کتاب میں موجود ایک مضمون زندگی درد مسلسل کی طرح کاٹی ہے کا مطالعہ کرکے ان کی جدوجہد کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ میں لودھی صاحب نے لاہور کینٹ ریلوے اسٹیشن پر چیچا وطنی اور چھانگا مانگا سے آنے والی لکڑی کے ریل گاڑی کے ڈبوں کو خالی کرنے کا کام کیا۔ صبح سے شام تک جاری رہنے والے اس انتہائی مشقت آمیز کام کی مزدوری انہیں صرف تین روپے کی صورت میں ملا کرتی تھی۔ اس کام کے دوران بارہا ان کے ہاتھوں اور پاؤں پر گہرے زخم آئے جن کو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے انہوں نے ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کو پانی پلانے کا کام کیا، گڑھی شاہو

کے علاقے میں واقع ایک اون فیکٹری میں پانچ روپے روز پر ملازمت کی جو صرف دو دن بعد فیکٹری کے آسیب زدہ غسل خانوں کے خوف سے چھوڑ دی اور ماں کے قدموں میں سر رکھ کر اپنی مصیبت بیان کی۔ شفیق ماں کا دل تڑپ اٹھا اور انہوں نے اعلان کیا کہ میرا بچہ یہ نوکری نہیں کرے گا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر گائے بھینسوں کا گوبر جمع کرتے تھے اور کوئلے کے برادے میں ملا کر، اسے چھت پر سکھا کر بارہ آنے ٹین کے حساب سے ریلوے اسٹیشن پر فروخت کیا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رات کو اچانک بارش ہوجاتی تھی اور تمام محنت ضائع ہوجایا کرتی تھی اور پھر ماں اور اس کے بیٹے دیر گئے ملول رہتے تھے۔ کاغذ کے لفافے بنا کر بیچنے اور گھر میں کریانے کی چھوٹی سی دکان چلاتے چلاتے کچھ وقت مزید بیت گیا۔ اس کے بعد پائلٹ انجینئرنگ کمپنی میں ساٹھ روپے ماہانہ پر نوکری کی۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ کا لفافہ اپنی والدہ کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتے تھے، کبھی یوں بھی ہوتا کہ ان پیسوں میں سے کچھ والدہ سے مانگ بیٹھتے اور والدہ محبت سے ٹال دیا کرتی تھیں کہ اتنے قلیل پیسوں میں سے بیٹے کو کیا دے پاتیں۔ ہیکو آئسکریم کی فیکٹری میں بھی کچھ عرصے کام کیا۔ اسی دوران ان کے والد نے اپنے کسی لالچی واقف کار سے ۵۰۰ روپے رشوت دے کر لودھی صاحب کی ملازمت ریلوے میں کرانے کی کوشش کی۔ پانچ کلو مچھلی لودھی صاحب خود ریلوے کے ایک افسر کے گھر واقع گرجا چوک دے کر آئے لیکن بقول ان کے: مچھلی افسر کے حریص پیٹ میں گئی لیکن نوکری پھر

بھی نہ ملی۔۔۔۔۔۔

اسی دوران وہ شارٹ ہینڈ اور اردو ٹائپنگ کا کورس کر چکے تھے جس کی بنیاد پر انہیں لوکل گورنمنٹ کے تعلیم بالغاں کے ادارے میں نوکری مل گئی جو تین برس جاری رہی۔ ۵ مئی ۱۹۷۹ کو پنجاب انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بورڈ میں نوکری اختیار کی اور ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ کو یہاں سے پندرہ برس کی ملازمت کے بعد فارغ ہوئے۔ مذکورہ ادارے سے کی جانے والی ان کی آخری تنخواہ چھ ہزار روپے تھی۔ بلاآخر بنک آف پنجاب میں گیارہویں اسکیل میں اردو اسٹینو گرافر منتخب ہوئے اور تادم تحریر اسی ادارے سے وابستہ ہیں لیکن یہاں بھی روز اول ہی سے آزمائشوں نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور وہ محکمانہ سازشوں کا شکار ہی رہے۔ اسی دوران ۱۰ جون ۲۰۰۷ کو ان کی والدہ ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں جو ان کے لیے ایک نہ بھولنے والا سانحہ بن گیا۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ لودھی صاحب تمام عمر نوکری کے معاملے میں مشکلات کا شکار رہے اور اس سے عجیب بات یہ ہے کہ ان کے والدہ بھی یہ کہا کرتی تھیں کہ جب بھی وہ کہیں کسی چیز کے حصول کی غرض سے جاتی تھیں تو وہ چیز ان کے جاتے ہی ختم ہوجایا کرتی تھی۔ بقول ان کے ، شاید ماں کی خراب قسمت کا تسلسل بیٹے کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

لودھی صاحب کی اپنی والدہ محترمہ سے محبت و عقیدت اس کتاب کے قاری کو اپنی

گرفت میں لے لیتی ہے اور بے اختیار قدرت اللہ شہاب کا یادگار مضمون ماں جی یاد آجاتا ہے۔

صاحبو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالی سے کلام کیا کرتے تھے، ایک روز اللہ سے پوچھا کہ جنت میں میرا ساتھی کون ہوگا ؟ جواب آیا کہ موسیٰ وہ تیری بستی میں رہنے والا فلاں قصائی ہے جو تیرا رفیق ہوگا۔ حضرت موسیٰ مارے تجسس کے اس قصائی کی دکان پر پہنچ گئے۔ قصائی کڑی محنت میں مصروف تھا۔۔۔ موسیٰ اس کو دیکھتے رہے ! ۔۔۔۔ دن ڈھلا اور قصائی نے دکان بند کر، گھر کی راہ لی۔ موسیٰ اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ قصائی اپنی دھن میں چلتے چلتے ایک کچے گھر میں پہنچا۔ وہاں ایک بوڑھی اور لاغر عورت اس کا انتظار کرتی تھی۔ قصائی نے جلدی جلدی ہانڈی چڑھائی، کھانا پکایا، روٹیاں ڈالیں اور نوالے بنا بنا کر بوڑھی عورت کے منہ میں ڈالنے لگا۔ جب وہ سیر ہو چکی تو اس کا منہ صاف کیا۔ بوڑھی عورت نے قصائی کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ ہنسنے لگا۔۔۔۔
موسیٰ جو یہ منظر حیرت سے دیکھ رہے تھے بے اختیار قصائی سے پوچھ بیٹھے کہ یہ عورت کون ہے اور تیرے کان میں کیا کہہ رہی تھی ؟ قصائی نے جواب دیا کہ یہ میری ماں ہے ۔۔۔ چلنے پھرنے نے معذور ہے ۔۔ یہ مجھے دعا دے رہی تھی کہ اللہ تجھے جنت میں موسیٰ کا ساتھی بنائے اور مجھے ہنسی آ گئی کہ کہاں میں اور کہاں موسیٰ ؟

کچھ عرصہ قبل اسلم لودھی صاحب قوت سماعت کی اچانک خرابی کا شکار ہوئے اور یہ روگ بھی ان کے لیے سوہان روح بن گیا۔ گویا آزمائشوں کا سلسلہ ابھی تھا نہیں۔ وہ اپنی والدہ کے فرمابردار بیٹے رہے لیکن قسمت کے کھیل اپنی جگہ۔ ان کی اولاد فرمابردار نکلی لیکن دوسری جانب اپنے سگے بھائیوں کا رویہ ان کے لیے بیحد تکلیف دہ رہا۔ قلم کے ذریعے ان کو عزت حاصل ہوئی لیکن روزگار میں وہ پے در پے پریشانیوں اور !ناانصافیوں کا شکار رہے

لیکن راقم کو یہ یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام دنیاوی پریشانیوں اور آزمائشوں کا آخرت میں ان کو بہترین صلہ عطاء کرے گا۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ اس دعا میں !شریک ہوجایئے

کتاب ملنے کا پتہ: سدرہ ایمپوریم پبلشرز۔ ۸۲ کبیر اسٹریٹ۔اردو بازار۔لاہور۔ (042 -37244358)

اے حمید۔ پھولوں، تتلیوں اور خوشبوں کے تعاقب میں ہم سے دور جاتا مصنف

راشد اشرف۔ نگراں کار: www.wadi-e-urdu.com۔ ۱۹ اپریل ۲۰۱۱

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان جب کسی اسپتال کے آئی سی یو میں وینٹیلیٹر کے سہارے سانس لے رہا ہوتا ہے تو بے ہوشی کے عالم میں وہ کیسے کیسے مناظر دیکھتا ہوگا۔۔۔ اور بیہوشی کی سرحدوں سے ہوش میں آنے کے مختصر درمیانی عرصے میں وہ کن کن باتوں کو یاد کرتا ہوگا۔۔۔۔ یقیناً وہ تمام باتیں اسے یاد آتی ہوں گی جو اس کی زندگی سے جڑی تھیں !

اپنی تحریروں میں تواتر کے ساتھ جنگل، خوشبو، بارش، ناریل، درخت اور چائے کا ذکر کرنے والا پاکستان کا درویش صفت، ایماندار اور ہر دلعزیز مصنف پچھلے ایک ماہ سے بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ جناب عبدالحمید جو اے حمید کے نام سے جانے جاتے ہیں، لاہور کے ایک نجی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔۔ایک ایسی جنگ جس میں زندگی کے غالب آجانے کا امکان روز بروز کم سے کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ مجھ جیسے ان کے ان گنت چاہنے والوں کے یہ ایک اذیت ناک صورتحال ہے۔

یہ تو خدا سلامت رکھے جناب عطاءالحق قاسمی کو کہ جن

کی تنگ ودو کی وجہ سے اے حمید کے علاج کا تمام خرچہ حکومت پنجاب.برداشت کر رہی ہے ورنہ ان کے اہل خانہ میں اس کی سکت نہ تھی۔ اس ملک میں ہر کوئی ان جیسا خوش قسمت کہاں جس کو اس کڑے وقت میں کوئی عطاء الحق قاسمی نصیب ہو جائے۔۔۔ کتنے ہی ادیب و شاعر کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ گئے۔ شاعر و ادیب کیا، یہاں تو اساتذہ کا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ ۷ دسمبر ۲۰۰۳ کو ملیر، کراچی میں واقع ایک تاریخی درسگاہ میں علم کی روشنی پھیلانے والے پروفیسر غازی خان جاکھرانی اور ان کی اہلیہ کی پندرہ روز پرانی لاشوں کا ملنا تو آج بھی کچھ لوگوں کو یاد ہوگا جو بھوک سے دم توڑ گئے تھے۔ عدالت میں دائر کیس کے تصیلات اور اس میں ملوث لوگوں کے نام و دیگر تفصیل یہاں پڑھی جا سکتی ہے:

http://archives.dawn.com/2006/05/16/local4.htm

کل شام مجھے اے حمید کے بیٹے مسعود حمید اپنے والد کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی عطاء الحق قاسمی صاحب کی کوششوں کے بارے میں آگاہ کر چکے تھے۔۔۔۔آج صبح جب مجھ سے رہا نہ گیا تو لاہور میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو فون کر ڈالا۔۔۔۔ وہ مجھے حمید صاحب کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں اور ان کے مثبت نتائج کے بارے میں بتاتے رہے۔ لیکن ہر آن پر اُمید باتیں کرنے والے عطاء صاحب، اے حمید کی صحتیابی کے بارے میں تذبذب کا شکار نظر آئے۔ جو شخص

چند دن وینٹیلیٹر پر گزار لے، اس کی صحت کے بارے میں ڈاکٹر بھی زیادہ پرامید نہیں
پر ہیں۔۔۔۔ (ventilator) رہتے اور ادھر اے حمید تو پورے ایک ماہ سے وینٹیلیٹر
لیکن بقول عطاء صاحب، ہمیں خدا کی ذات سے امید نہیں چھوڑنی چاہیے!

مارچ ۸۰۰۲ کی ایک شام میں لاہور میں واقع اے حمید صاحب سے ملاقات کی غرض سے سمن آباد لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر گیا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، وہ کتابوں سے گھرے چھوٹے سے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں بے صبری سے اس شیفتگی کا ذکر کر رہا تھا جو ایک زمانے سے مجھے ان سے ان کی تحریروں کے تعلق سے ہے۔ وہ میری باتیں سن کر انکساری سے مسکرا رہے تھے۔ میں ان کو شہاب نامہ میں قدرت اللہ شہاب کی ان کے بارے میں رائے یاد دلاتا ہوں کہ کس طرح شہاب صاحب جو اس زمانے میں پنجاب ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے عہدے پر فائز تھے اور حمید صاحب کو پاور لومز کا پرمٹ دے چکے تھے (ان دنوں پاور لومز کا کاروبار انتہائی منفعت بخش کہلاتا تھا اور قدرت اللہ شہاب کے پاس دن بھر اسی سلسلے میں سفارشوں کا بیزار کن تانتا بندھا رہتا تھا) اور کچھ عرصے بعد حمید صاحب، جو ان پرمٹس کو باآسانی بلیک مارکیٹ میں فروخت کرکے ایک بڑی رقم بنا سکتے تھے، شہاب صاحب کو وہ پرمٹس واپس کرنے آئے تھے۔

میں اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے ۔۔وہ قدرت اللہ شہاب سے کہہ رہے تھے۔
یہ شہاب صاحب کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔۔۔اور پھر انھوں نے قلم اٹھایا اور شہاب نامہ میں حمید صاحب کے لیے یہ جملہ لکھا :
اس کی دلنشیں تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا ہی صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا۔۔۔۔ شہاب اس محکمے میں اپنی تقرری کے تمام عرصے کے احوال کے اختتام پر لکھتے ہیں : پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید، آٹا پیسنے کی چکی والا محمد دین، آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی کے ساتھ میری ملاقاتیں اس زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاٹمنٹوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سڑانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اے حمید۔ پاک ٹی ہاؤس کے باہر

شہاب نامہ میں درج اس واقعے کے ذکر پر حمید صاحب ہنسنے لگے اور کہا: یار ! جب کبھی میری بیوی مجھ پر ناراض ہوتی ہے تو میں اسے شہاب نامہ دکھا کر کہتا ہوں کہ دیکھو قدرت اللہ شہاب جیسے انسان نے میرا ذکر کتنے اچھے انداز میں کیا ہے۔

پھر میں اے حمید کو ان کے لکھے ناول ڈربے کے اقتباسات سنانے لگتا ہوں جو میرہ پسندیدہ ترین ناول ہے ۔ میں ان سے اس ناول کے کرداروں کے بارے میں دریافت کرتا ہوں ور انہیں یہ بات بتا تا ہوں کہ کالج کے زمانے میں کس طرح ایک لائبریری سے ۱۹۶۰ کا شائع ہوا یہ ناول مجھے ملا تھا جسے میں نے منہ مانگی قیمت (تیرہ روپے) دے کر اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور پھر ایک روز اس ناول کو میرے والد مرحوم نے پڑھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کو محفوظ کرنے کی خاطر اس پر گردپوش لگا دیا۔ حمید صاحب میرے ہاتھ سے اس ناول کو لے کر بغور دیکھتے ہیں، میری درخواست پر ناول پر اپنے آٹو گراف ثبت کرتے ہیں اور

اس کے تازہ نسخے کے حصول کے لیے مقبول اکیڈمی کے مالک کے نام مجھے ایک رقعہ لکھ دیتے ہیں۔ میں نے اس رقعے کو تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھا اور ایک جگہ محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہو :

http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/5109237158/

اس ملاقات کی تصویر اور ایک مختصر سی ویڈیو (انٹرنیٹ پر موجود واحد ویڈیو ریکارڈ) بھی یہاں دیکھی جا سکتی ہے :

http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/4371908038/in/photostream/

حمید صاحب کو اپنی یاداشتیں لکھنے کی درخواست کے ساتھ ان سے ملاقات کی خوشگوار یادیں لے کر میں وہاں سے لوٹا تھا !

اے حمید (دائیں جانب) اور احمد راہی

اس دن کے بعد سے حمید صاحب سے مستقل فون پر رابطہ رہنے لگا اور گاہے گاہے کراچی سے ان کو لاہور کتابیں ارسال کا سلسلہ جاری رہتا تھا ۔ اپنی بیماری سے چند ماہ پیشتر انہوں نے مجھ سے ابن انشاء پر اپنی لکھی کتاب کی فرمائش کی جو لاہور میں نایاب ہے اور حمید صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ یاد رہے کہ اے حمید ابن انشاء کے گہرے دوست رہے ہیں اور ابن انشاء کے خطوط پر مبنی کتاب خط انشاءجی کے میں اے حمید کے کئی بے تکلفانہ خطوط موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک خط میں (اقتباس) انشاءجی رقم طراز ہیں:
ارے حمید، میری جان ! تمہارے یادوں کے گلاب سب کے سب میں نے پڑھے ہیں بلکہ سونگھے ہیں اور پرانے دنوں کی یاد پر دل کو کچھ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔ تم ٹنڈی مار جاتے ہو۔عشق و عاشقی اور لڑکیوں کے تذکرے میں بھی تم ٹنڈی بلکہ ٹنڈا مار جاتے ہو۔ لڑکیاں تمہاری بھولی بھالی صورت رومانٹک تحریر کے چکر میں آجاتی ہیں۔خیر میاں ہم تو تمہارے عاشق ہیں۔فی زمانہ اور کوئی ہمیں اپنے اوپر عاشق ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

حمید صاحب کی لکھی ایک کتاب امرتسر کی یادیں میں عرصہ پندہ برس سے تلاش کررہا تھا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ حمید صاحب کے پاس

بھی اس کتاب کا ایک ہی نسخہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔کچھ عرصہ پیشتر کراچی سے ایک شناسا لاہور جا رہے تھے، میں نے ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ حمید صاحب سے وہ نسخہ لے کر اس کی فوٹو کاپی بنوا کر لے آئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام سرانجام پایا اور میں نے حمید صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

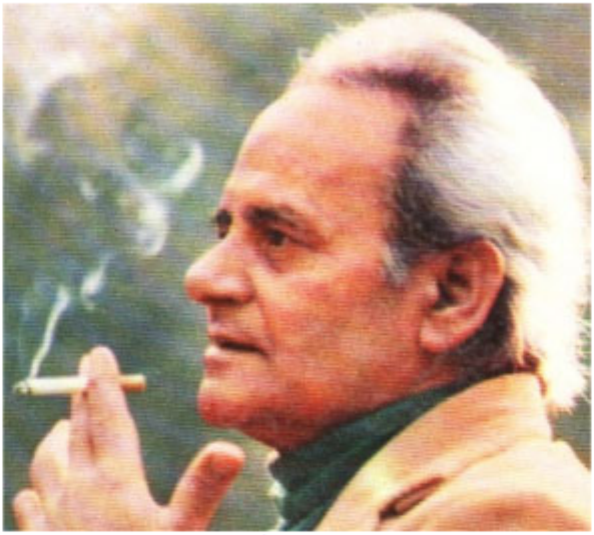

اے حمید ۔ پچیس برس قبل کی ایک تصویر

حمید صاحب کا سن پیدائش ۸۲۹۱ ہے، اس حساب سے وہ ۳۸ برس کے ہوئے۔ امرتسر میں پیدا ہونے والے اے حمید نے ۱ ۸۴۹ میں اپنا پہلا افسانہ منزل منزل لکھا جسے راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی ۔ بہت جلد ان کے افسانے لاہور سے شائع ہونے والے معیاری جریدوں کی زینت بننے لگے۔ وہ ایک کثیر التحیر مصنف ہیں، انہوں نے کم و بیش ۰۰۲ ناولز لکھے جبکہ بچوں

کے لیے ان کی لکھی مشہور زمانہ سیریز امبر ناگ اور ماریہ کے ۱۰۰ ناولز منظر عام پر آئے۔ ان کی چند دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں:

منزل منزل

لاہور کی یادیں

داستان گو

امریکانو

چاند چہرے

گلستان ادب کی سنہری یادیں

دیکھو شہر لاہور

جنوبی ہند کے جنگلوں میں

اردو شعر کی داستان

اردو نثر کی داستان

مرزا غالب لاہور میں

اے حمید نے ریڈیو پاکستان میں عرصہ دراز تک ملازمت کی، بعد ازاں وہ وائس آف امریکہ سے وابستہ ہو کر واشنگٹن چلے گئے جہاں سے واپسی پر انہوں نے وائس آف امریکہ کی دلچسپ یادوں کی قلم بند کیا جو پہلے کراچی کے ایک جریدے نیا رخ

میں قسط وار شائع ہوئی اور بعد ازاں اسے کتابی صورت میں امریکا نو کے عنوان سے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا۔ انھوں نے ٹیلی وژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے، خاص کر بچوں کے لیے لکھا گیا سیریل عینک والا جن بہت مقبول ہوا۔ وہ پچھلے کئی برس سے لاہور کے روزنامے نوائے وقت میں اتوار کے روز کالم لکھ رہے تھے۔۔۔ ۲۰۰۳ میں ابو الحسن نغمی کی خودنوشت یہ لاہور ہے منظر عام پر آئی جس میں نغمی صاحب نے اے حمید کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح دسمبر ۲۰۱۰ میں لاہور سے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ رہے ناصر قریشی صاحب کی خودنوشت ادبیات نشریات شائع ہوئی جس میں قریشی صاحب نے حمید صاحب کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔

مارچ ۲۰۰۸،اپنی رہائش گاہ پر ۔راقم نے محفوظ کی۔

اے حمید ان لوگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت کا مکمل عکس پڑھنے والے کو ان کی تحریروں میں گاہے بگاہے نظر آتا ہے اور یوں مزید معلومات کے حصول کے لیے کسی خارجی سہارے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ کڑکی کے زمانے میں بھی حمید صاحب اچھا لباس پہنتے تھے اور احباب کی محفل میں الگ ہی نظر آتے تھے۔وہ لکھتے ہیں کہ ہمیشہ بہترین لباس پہنو، بہترین خوشبو استعمال کرو اور بہترین لڑکی سے محبت کرو۔

ان کی تحریروں میں ایک عجب دلکشی ہے ۔ پڑھنے والا کچھ دیر تمام غموں سے نجات پا کر گھنے جنگلوں، درختوں، پرندوں ، خوشبوؤں کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ نکلنا نہیں چاہتا لیکن کیا کیجیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتاب ختم ہوجاتی ہے اور اسے دنیاوی بکھیڑوں میں لوٹنا پڑتا ہے۔

وہ لاہور شہر کی روایات کے امین ہیں۔ لاہور کی محفلوں، کھانوں، ناشتوں، پہلوانوں ، تکئیوں، اکھاڑوں، لائبریریوں اور تھیٹر کمپنیوں کا جس انداز سے اے حمید نے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے وہ کسی اور کو کہاں نصیب۔۔۔اسی طرح امرتسر شہر کے ذکر میں بھی یہی موضوعات ان کی تحریر کا خاصہ رہے ہیں (دیکھئے: امرتسر کی یادیں۔سن اشاعت:۱۹۹۱)۔ ممتاز مفتی جب ہندوستان کا سفرنامہ لکھ رہے تو اے حمید کے ذکر کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی محفلوں

کا تذکرہ جس طرح اے حمید نے کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دنوں کا احوال ہر حساس پڑھنے والے کو افسردہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس افسوسناک احوال کی منظر کشی یا تو اے حمید نے کی ہے یا پھر معروف مزاح نگار محمد خالد اختر کے مضمون منٹو کے آخری دن سے اس کا پتہ ملتا ہے۔

اے حمید کی خاکہ نگاری کا ڈھنگ بھی دوسروں سے جدا نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب چاند چہرے میں انھوں نے فیض احمد فیض، سیف الدین سیف، پروفیسر وقار عظیم، اخلاق احمد دہلوی، ابن انشائ، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، عبدالمجید عدم، احمد راہی، ابراہیم جلیس، راجہ مہدی علی، چراغ حسن حسرت، مرزا سلطان بیگ وغیرہ پر خاکے لکھے ہیں اور ان خاکوں میں ایسے ایسے واقعات تحریر کیے ہیں جو کہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے۔ اسی طرح ان کی کتاب "گلستان ادب کی سنہری یادیں" بھی حقیقتاً سنہری یادوں اور باتوں کا ایک ایسا مرقع ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اے حمید اوائل عمری ہی میں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے یہ عرصہ بمبئی میں گزارا تھا۔ اسی طرح جنوب مشرقی ایشیاء کے بھی کئی ممالک بھی انھوں اچھی طرح دیکھ رکھے تھے۔ آگے چل کر اس آوارہ گردی کے تجربات ان کی تحریروں کو جلا بخشنے میں خوب کام آئے اور ان ممالک کے تجربات، رہن سہن، بول چال اور ثقافت کو انھوں نے اپنی تحریروں میں
گا ہے

!بگاہے استعمال کیا اور ان کی تحریروں کا یہی وصف ان کے قارئین کے دل میں گھر کرگیا
:اب دیکھئے کہ بھلا اس انداز تحریر کو کون پسند نہ کرے گا

میں کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے ٹولنٹن مارکیٹ کا" ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔اس کی وجہ ٹولنٹن مارکیٹ کی وہ مخلوط ٹھنڈی خوشبو تھی جو وہاں فضا میں ہر طرف بسی ہوئی ہوتی تھی۔میں جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں سے نیا نیا جدا ہوا تھا۔ان ملکوں کی بارشوں کی آواز اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔جب میں ٹولنٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میں رنگون کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھیگتے "ناریل کے درختوں میں آگیا ہوں۔

:لاہور کی سڑکوں کا احوال بیان کرتے ہوئے انداز تحریر ملاحظہ ہو

سردیوں کے موسم میں جب مطلع صاف ہوتا تھا تو ڈیوس روڈ سنہری دھوپ میں ایک" ایسی روشن سڑک لگتی جو مستقبل کے حسین سبزہ زاروں کی طرف جارہی ہو۔رات کو یہ سڑک کسی گمنام جزیرے کا خواب انگیز راستہ معلوم ہوتا تھا۔جب ساون کی

جھڑیاں لگتی تھیں تو بارش میں اس پر سکون خالی خالی سڑک پر ایک ایسی جنگلی عورت کا گمان ہوتا تھا سنسان جنگل میں اکیلی بارش میں نکل آئی ہو۔

جوں جوں لوگوں کے دل تنگ ہوتے گئے، ڈیوس روڈ کشادہ ہوتی گئی۔ درختوں پر کلہاڑے چلتے گئے۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ اصل سڑک کی جگہ ایک ایسی سڑک نمودار ہو گئی جس کا اصل سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی یہ سڑک فطرت کی آغوش میں سانس لینے والی ایک آزاد جنگلی لڑکی تھی جو جنگل کی بارش میں بے فکری سے نہایا کرتی تھی اور آج یہ سڑک مجھے ایک ایسی بھکاری عورت کی طرح دکھائی دیتی ہے جس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، جس کے بالوں میں گرد جمی ہے اور جو خوفزدہ آنکھوں سے (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" (یادوں کے گلاب اپنے مخصوص انداز میں ماضی کے کسی دلچسپ واقعے کا ذکر کرنا تو اے حمید سے سیکھے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :

غفور بٹ ہفت روزہ اسکرین لائٹ کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر" تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھے تھے۔ ہم سب فاقہ مست ادیب تھے۔ کبھی کبھی اشفاق احمد بھی میرے اصرار پر یہاں آ جاتا تھا۔

مبارک سینما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہوگیا۔ غفور بٹ سیڑھیاں چڑھ کر
: ہانپتا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا
تجمل ! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کا چوکھٹا لگانا نہ بھولنا
تجمل نے جان بوجھ کر کہا، معذرت کا چوکھٹا ؟
غفور بٹ بولا: ہاں یار ! وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر ادارہ اسکرین لائٹ ان کے
(لواحقین سے معذرت خواہ ہے"۔ (داستان گو
: اے حمید ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں
ریگل سنیما میں فلم مادام بواری لگی۔ میں نے اور احمد راہی نے فلم دیکھنے اور اس کے "
بعد شیزان میں بیٹھ کر چائے اور کریون اے کے سگرٹ پینے کا پروگرام بنایا۔ اتفاق سے
اس روز ہماری جیبیں بالکل خالی تھیں۔ ہم فوراً ادب لطیف کے دفتر پہنچے۔ ان دنوں
:ادب لطیف کو مرزا ادیب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ ہم نے جاتے ہی مرزا ادیب سے کہا
مرزا صاحب ! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال کے بہترین ادب کا انتخاب ہم کریں گے
: مرزا ادیب بڑے شریف آدمی ہیں، بہت خوش ہوئے، بولے
یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ احمد راہی صاحب حصہ نظم مرتب کرلیں گے اور آپ "
"افسانوی ادب کا انتخاب کرلیں۔

ہم نے کہا: " تو ایسا کریں کہ ہمیں پچھلے سال کے جس قدر انڈیا اور پاکستان کے ادبی
" رسالے دفتر میں موجود ہیں، دے دیجیے تاکہ ہم انہیں پڑھنا شروع کر دیں
" میرزا صاحب خوش ہو کر بولے: " ضرور۔۔ ضرور
اس کے آدھے گھنٹے بعد جب ہم ادب لطیف کے دفتر سے باہر نکلے تو ہم نے ادبی رسالوں
کے دو بھاری بھرکم پلندے اٹھا رکھے تھے۔ آپ یقین کریں کہ ہم وہاں سے نکل کر
سیدھا موری دروازے کے باہر گندے نالے کے پاس ردی خریدنے والے ایک دکاندار
کے پاس گئے اور سارے ادبی رسالے سات یا آٹھ روپوں میں فروخت کر دئے۔ اس
شام میں نے اور احمد راہی نے بڑی عیاشی کی۔ یعنی مادام بواری فلم بھی دیکھی اور
شیزان میں بیٹھ کر کیک پیسٹری بھی اڑاتے اور کریون اے کے سگرٹ بھی پیتے رہے۔
:اس کے بعد تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز مرزا ادیب ہم سے پوچھ لیتے
بھئی انتخاب کا مسودہ کہاں ہے؟
ہم ہمیشہ یہی جواب دیتے: " بس دو ایک دن میں تیار ہو جائے گا۔ ہم دراصل بڑی
(ذمے داری سے کام کر رہے ہیں۔ " (یادوں کے گلاب
ہمارے ممدوح کو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اداس کرنے کا فن بھی آتا ہے۔
سعادت حسن منٹو سے اپنی آخری ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے

ہیں :

میو اسپتال کی دوسری منزل کے میڈیکل وارڈ میں دروازے کے ساتھ ہی ان کا بستر" لگا تھا۔ منٹو صاحب بستر پر نیم دراز تھے اور ان کی بڑی ہمشیرہ ان کو چمچ کے ساتھ سوپ پلانے کو کوشش کر رہی تھیں۔ میں خاموشی سے بستر کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا۔ منٹو صاحب بے حد نحیف ہو گئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ منٹو صاحب نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے

:بڑے ادب سے پوچھا

اب کیسی طبیعت ہے منٹو صاحب ؟

:اس عظیم افسانہ نگار کے کمزور چہرے پر ایک خفیف سا اداس تبسم ابھرا اور صرف اتنا کہا

!دیکھ لو خواجہ

(اور اس کے کچھ ہی روز بعد سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ (یادوں کے گلاب اے حمید لکھتے ہیں کہ نریش کمار شاد جب دہلی سے لاہور آیا تو سعادت حسن منٹو کی قبر پر جا کر بہت رویا اور پھر کہا: " خدا مسلمانوں کو خوش رکھے۔ ہمارے پیاروں کا نشان "قبر) تو بنا دیتے ہیں۔)

نہ جانے کیوں مجھے ہندوستانی فلم شرابی کا وہ منظر رہ رہ کر یاد آ رہا ہے جس میں ہیرو (امیتابھ) کے ہر دلعزیز "منشی جی " بستر مرگ پر تھے اور جب وہ ان سے ملنے اسپتال پہنچا تو اپنی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔۔۔وہ منظر یادگار تھا جس میں امیتابھ اپنے منشی جی کے سینے پر سر رکھ کر التجائیہ انداز میں کہتا ہے کہ لوٹ آیئے منشی جی۔۔۔۔منشی جی لوٹ آیئے۔۔۔اور اسکرین پر یہ منظر دیکھنے والے لرز اٹھے تھے!

اے حمید نے کہیں لکھا تھا کہ میں اپنے فلاں بیمار دوست کو بستر مرگ پر دیکھنے نہیں گیا اس لیے کہ میں جن سے محبت کرتا ہوں ان کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔

حمید صاحب ! ہم آپ کو اس حالت میں دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں ؟

ایک ستارہ اور ٹوٹا

میرا پیغام تعزیت ہے جہاں تک پہنچے۔
شہرت بخاری نے اپنی خود نوشت کھوئے ہوؤں کی جستجو میں لکھا تھا کہ یہ موت مجھے کہیں مجسم حالت میں مل جائے تو میں اس کا منہ نوچ لوں، کلیجہ چبا لوں۔ یہ ڈائن بار بار ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے۔

موت لے جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے

لیکن صاحبوں! موت تو برحق ہے۔۔۔ اپنا وار کرتی رہے گی۔ علم تصوف میں بتایا جاتا ہے کہ زمانے میں ہمہ وقت " حشر نشر" کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک سمت سے ہر لحظہ مخلوقات کو دنیا میں نشر کیا (پھیلایا) جارہا ہے اور دوسری جانب انہیں حشر (جمع ہونے/سمیٹے جانے) کا سامنا ہے۔ یوں زمانے کی گود میں ازل سے ترتیب و ابتری حرکت میں ہیں، اور روئے زمین پر اسی طور ابد تک محبت اور موت کی نبرد آزمائی جاری رہے گی۔ اللہ تعالٰی کا فرمان ہے (ترجمہ): " یہی ہے ازل سے تیرے رب کا طریقہ اور تو ابد تک اس میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا"۔

:فیض لدھیانوی (وفات :٦ جنوری ١٩٩٥ـ لاہور) کا کیا خوب اور منفرد شعر ہے

میں ہوں ناواقف مگر ہر سال آتی ہے ضرور
فیض جس کو کل کہیں گے میری تاریخ وفات

اے حمید صاحب نے اپنے ایک یادگار ناول ڈربے (مطبوعہ ١٩٦٠) میں ایک گورکن کی زبانی موت کے فلسفے پر سادہ و دلنشین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اس گورکن کی ہر نصیحت کسی نہ کسی مقولے پر ختم ہوا کرتی۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا مگر اس کی باتیں دور دور کی خبر لایا کرتیں۔ موت کے فلسفے پر وہ اس قدر آسانی سے روشنی ڈالا کرتا کہ ہر لفظ جگنو کی مانند چمک چمک کر اپنا مفہوم بتا دیتا تھا: " لوگ موت سے خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔سچ پوچھو تو زندگی کے لیے یہ بڑی ضروری شے ہے۔ ہمیں پھول کیوں اچھے لگتے ہیں ؟اس لیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھلتے ہیں۔اور پھر مرنے سے ہمیں نقصان ہی کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ ہم اس دنیا میں باقی نہیں رہتے، تو اس میں حرج کی بات کیا ہے۔اگر موت نہ ہوتی تو لوگ پہاڑوں سے کودتے، پتھر باندھ کر دریاؤں میں چھلانگ لگاتے، انجن تلے سر دیتے۔ پھر سوچو زندگی کتنی گھناؤنی ہوتی۔ بھئی میں تو ہنسی خوشی جان دوں گا۔ موت کا اسقبال تہوار کی صورت ہونا چاہیے۔

برخوردار یہ سب دکھوں کا آخری علاج ہے۔

کہتے ہیں اگلے وقتوں میں روح قبض کروانے پر مامور فرشتے کو آتا دیکھ کر لوگ دشنام طرازی کیا کرتے تھے۔ طے پایا کہ اس سے بچنے کے لیے موت کے مختلف ذرائع مقرر کردیے جائیں۔ لہذا ہم نے دیکھا کہ اے حمید صاحب نمونیہ کے شدید حملے کا شکار ہوئے اور تقریباً دو ماہ تک اسپتال میں داخل رہنے کے بعد کل رات دو بجے انتقال کر گئے۔

انا للہ و انا علیہ راجعون

وہ تمام عمر سکرات کے اس عالم سے محفوظ رہے جس سے خاص کر ہمارے معاشرے کا کم و بیش ہر ادیب و شاعر گزرتا ہے یعنی زندگی میں قدر نہ ہونے کا احساس۔ اے حمید صاحب کو ان کے چاہنے والوں سے بے اندازہ محبت ملی!

آج علی الصبح ان کے انتقال کی خبر آج ٹی وی نامی چینل سے ملی۔ سات بجے راقم نے ان کی رہائش گاہ پر فون کیا اور ان کی اہلیہ سے بات ہوئی۔ وہ اسپتال میں پچھلے دو ماہ سے مقیم تھیں جہاں پنجاب حکومت نے ان کے لیے ایک کمرہ مخصوص کردیا تھا۔ ان کو اسپتال انتظامیہ نے رات دو بجے اطلاع دی کہ حمید صاحب کی حالت نازک ہے۔ جب وہ کمرے میں پہنچیں تو حمید صاحب جاچکے تھے!۔۔۔۔ کل رات اچانک ان کے جسم میں پانی بھرنا شروع ہوگیا تھا اور دو بجے ان کا انتقال

ہوگیا۔ مجھ سے گفتگو کرتے وقت حمید صاحب کی اہلیہ کا لہجہ پرسکون تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں: حمید صاحب کے چہرے پر بڑا سکون تھا اور کئی لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ انتقال کے بعد ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں نے دریافت کیا کہ اس وقت ان کا جسد خاکی کہاں ہے تو ان کی اہلیہ نے بتایا کہ ابھی ابھی ان کو اسی کمرے میں لایا گیا ہے جہاں میں (راقم) ۸۰۰۲ میں ان سے ملاقات کی غرض سے دیر گئے تک بیٹھا رہا تھا۔ آج یعنی بروز جمعہ، بعد نماز ان کا جنازہ ہے۔

چشم تصور سے میں نے وہ منظر دیکھا ور بوجھل دل کے ساتھ روایتی تعزیتی جملے کا سہارا لیا:

!اللہ آپ کو وقت کے ساتھ صبر دے

بیٹا! وقت تو میرے لیے رک گیا ہے، ختم ہوگیا ہے، تو یہ صبر کیسے آئے گا؟

حمید صاحب کی اہلیہ کے اس جواب سے میری آواز میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

اے حمید صاحب اپنی خود نوشت تحریر کر رہے تھے اور میں اکثر ان سے اس بارے میں فون پر دریافت کرلیا کرتا تھا۔ شاید کم لوگ یہ بات جانتے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی خود نوشت کا عنوان " چھوڑ آئے وہ گلیاں " مقرر کیا تھا۔

فارغ بخاری کی خود نوشت " مسافتیں " کا آخری باب ان کے بیٹے قمر عباس نے تحریر کیا تھا جو خود بھی ایک مصنف تھے اور بعد ازاں ۷ مئی ۲۰۰۷ کے روز پشاور میں قتل کردئے گئے تھے۔

حمید صاحب ! اللہ تعالٰی آپ کو اپنی عنایتوں کے سائے تلے ہمیشہ رکھے۔۔۔ لیکن آپ کی خود نوشت کا آخری باب کون تحریر کرے گا ؟

(اے حمید صاحب پر ان کی بیماری کے دوران راقم نے ایک مضمون تحریر کیا تھا جسے یہاں پڑھا جاسکتا ہے) :

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=12711

ابن صفی۔شہرت اب سرحدوں کے پار

ابن صفی کے فلسفے کی خوشبو سرحد پار پہنچی۔ادب کے ٹھیکیدار اور ادب عالیہ کے علمبردار اسی دن سے توڈرتے تھے۔ان میں سے بہتیرے تو دل میں یہ حسرت لیے دنیا سے چلے گئے کہ ان کا لکھا ہوا کبھی الماریوں سے نکل کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے لیکن راقم گواہ ہے کہ وہ سب ٹنوں کے حساب سے شہر کی لائبریروں میں بندھا پڑا ہے اور مٹی آدم کے ساتھ ساتھ ایسی بے کیف تخلیقات کو بھی کھائے چلے جارہی ہے جن کو لکھنے والے اپنے ناموں کے ساتھ بھاری بھرکم ڈگریوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں!

رند بخشے گئے قیامت میں

شیخ کہتا رہا حساب حساب

مدیر شاعر (ممبئی) افتخار امام صدیقی کا ماننا ہے: ابن صفی کی نثر اردو کے قدیم وجدید اہم ترین نثر نگاروں سے کہیں زیادہ تخلیقی اور زرخیز ہے۔

ڈاکٹر ڈریڈ کا انگریزی ترجمہ۔یس منظر الہ آباد ایڈیشن کا سرورق برقرار رکھا گیا ہے

۲۲ اپریل ۱۱۰۲ کی صبح فرزند ابن صفی ،احمد صفی عازم دہلی ہوئے۔ طے پایا تھا کہ وہ دہلی میں ہندوستان کے نامور اشاعتی اداروں ویسٹ لینڈ اور بلافٹ کی طرف سے ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے چار ناولز کے انگریزی تراجم کی تقریب رونمائی میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کریں گے۔ مذکورہ تقریب ہیبیتاٹ سنٹر کے گلموہر ہال میں تھی جو لودھی روڈ پر واقع ہے۔ ان ناولز کا انگریزی ترجمہ دنیائے ادب کے نامور ادیب، شاعر، تنقید نگار ، ناول نگارپروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے کیا ہے۔ پروفیسر فاروقی خود بھی اس تقریب میں شریک تھے۔ ڈاکٹر ڈریڈ نامی چار کتب کے اس سلسلے میں زہریلے تیر، پانی کا دھواں، لاش کا قہقہ اور ڈاکٹر ڈریڈ نامی ناولز شامل ہیں۔انگریزی میں ان تراجم کے نام یہ ہیں:
Smokewater', Poisoned Arrow', 'Doctor Dread' and 'The Laughing

Corpse'۔

ایک ہندوستانی اخبار نے اپنے مضمون میں اس بات پر حیرت کا اظاہر کیا کہ مذکورہ چار ناولز کے سراوراق پر پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا یہ تبصرہ آویزاں ہے:

The all time greatest urdu detective story writer

راقم الحروف یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہے کہ راکیش کھنہ نے چند ماہ پیشتر راقم کے نام ایک ای میل میں ڈاکٹر قدیر کی اس رائے کی تصدیق چاہی تھی ۔یاد رہے کہ ۹۰۰۲ میں کراچی کے معاصر بزنس ریکارڈر میں راقم کے ابن صفی کی برسی پر شائع ہوئے مضمون میں یہ انکشاف (ڈاکٹر خان کی اجازت سے) پہلی مرتبہ کیا گیا تھا کہ پاکستان کے جوہری سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی ابن صفی کے مداحوں میں سے ہیں۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں راقم نے راکیش کھنہ کو ڈاکٹر صاحب کی ای میل کا متعلقہ حصہ ارسال کیا تھا۔

تقریب میں اوراحمد صفی کے دہلی میں دس روزہ قیام کے دوران ہندوستانی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کی اس تمام معاملے میں دلچسپی حیرت انگیز تھی اوراس بات کا بین ثبوت تھی کہ نئی نسل ابن صفی کی تحریروں میں چھپے پیغام کو

از سر نو کھوجنا چاہتی ہے۔ وہ کم و بیش دس روز میڈیا کے نرغے میں رہے۔ ہندوستان کے معتبر اخباروں ہندوستان ٹائمز اور انڈین ایکسپریس میں ان کے انٹرویو شائع ہوتے رہے۔ انٹرویوز کی اشاعت کا یہ سلسلہ ان کی کراچی آمد کے بعد تک جاری رہا۔ اردو زبان کی صحت کا بے انتہا خیال رکھنے والے معتبر ہندوستانی ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو نے ان کا انٹرویو نشر کیا۔

: تیس اپریل کو ٹائمز آف انڈیا نے احمد صفی کے انٹرویو کی سرخی یہ لگائی

The Jasoos From Across The Border

: دہلی اس روز شاہد جمیل کے اس شعر کے مصداق محسوس ہوتا تھا

تمام لوگ فریدی حمید جیسے ہیں
یہ شہر ابن صفی کی کتاب لگتا ہے

دہلی میں ان کے قیام کا بندوبست متذکرہ کتب کے ناشران نے کیا تھا لیکن ہندوستان میں ابن صفی کے ناولز کے ناشر عباس حسینی کے صاحبزادے ضیاء ان کو اپنے گھر لے گئے اور ان کی ہمراہی میں احمد صفی دہلی کے گلی کوچوں میں پھرا کیے۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے شخصیات ان دوران احمد صفی سے ان کے والد کے تعلق سے ملاقات کرتی رہیں۔ دہلی میں مقیم لئیق رضوی نامی

ابن صفی کے ایک پرستار نے (جنھوں نے ابن صفی پر کئی مضامین تحریر کیے ہیں) تو اس وقت عقیدت کی انتہا کردی جب انہوں نے احمد صفی سے ان کا پانی کا نصف پیا ہوا گلاس تھام لیا اور یہ کہتے ہوئے پی گئے کہ یہ ان کے لیے تبرک ہے۔ احمد صفی باوجود انتہائی کوشش کے الہ آباد نہ جاسکے جہاں وہ ان جگہوں کو دیکھنا چاہتے تھے جہاں ان کے والد گرامی کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا کچھ حصہ گزرا تھا۔ حکومت ہند کی جانب سے کشادہ دلی کا مظاہرہ نہ کیا گیا گرچہ کچھ اخباروں میں اس قسم کی سرخیاں بھی لگیں کہ احمد صفی اپنے والد کی جنم بھومی نہیں دیکھ پائیں گے وغیرہ۔ الہ آباد میں ابن صفی کے دیرنیہ دوست چوراسی سالہ پروفیسر مجاور حسین رضوی عرف ابن سعید ان کا انتظار کرتے رہے۔ احمد صفی کی دہلی روانگی سے چند روز قبل راقم الحروف کو کراچی کے ایک پرانی کتابوں کے ٹھکانے سے جہاں ابن صفی کے کئی اوریجنل ناولز ملے تھے وہاں پروفیسر مجاور حسین رضوی کے سن پچاس کی دہائی میں رومانی دنیا کے تحت لکھے چند ناولز بھی ملے تھے اور طے ہوا تھا کہ احمد صفی، یہ ناولز پروفیسر صاحب کو پیش کریں گے۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی، ابن سعید کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار نے انٹرویو میں احمد صفی کے الہ آباد نہ جاسکنے کا ذکر کیا اور لکھا کہ مذکورہ ناولز احمد صفی پروفیسر مجاور کو تحفتاً پیش کرنے کی غرض سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔

پروفیسر مجاور حسین رضوی جو اگست ۷۴۹۱ میں الہ آباد یونیورسٹی میں ابن صفی کے بی اے کے ہم جماعت رہے ہیں، ان کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جب وہ (ابن صفی) قہقہہ لگاتا ہوا، سرگوشیاں کرتا ہوا، نظمیں سناتا ہوا، کہانیاں لکھتا ہوا، نظروں کے سامنے بیٹھا ہوا دکھائی نہ دیتا ہو۔ میں اگست سے تادم تحریر بیمار رہا لیکن بیمار نہ بھی ہوتا تو شاید اس پر کچھ لکھ نہ پاتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس دنیا سے نہیں گیا، ہم سب کے قلم بھی ساتھ لیتا گیا۔ ہونٹوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ بھی لیتا گیا اور پلکوں پر لرزنے والا ستارہ دے گیا۔

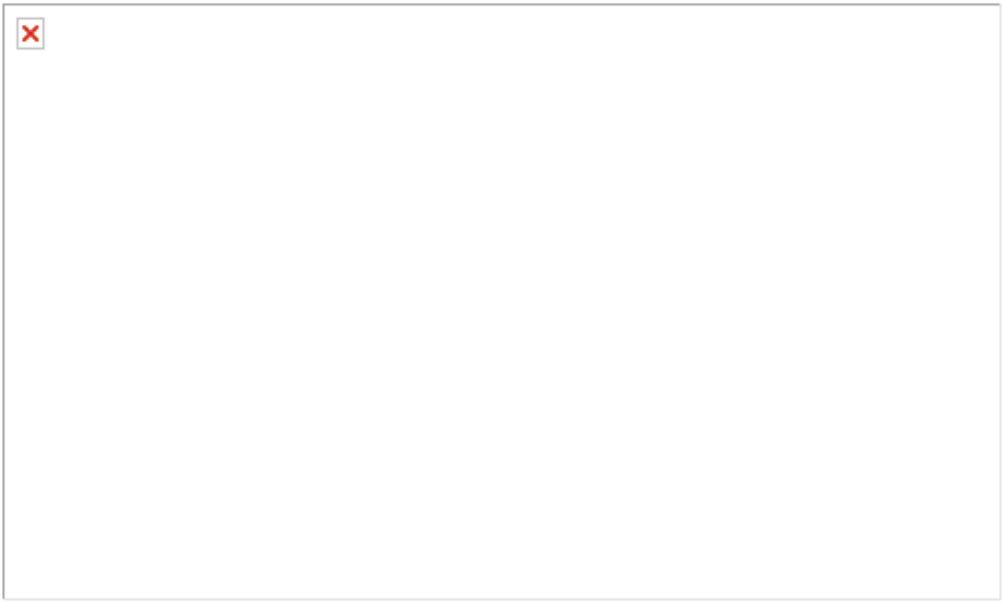

دہلی کے روزنامہ سہارا کی ایک خبر۔۶۲ اپریل ۱۱۰۲

پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے اپنے کیے ہوئے ترجمے کے بارے میں کہا کہ یہ ترجمہ ان کے لیے بیک وقت آسان بھی تھا اور مشکل بھی۔ ابن صفی کی تحریر کی سلاست نے اس کام کو آسان بنایا لیکن ابن صفی کی تحریر میں جہاں مزاحیہ ٹکڑوں کا پیوند لگا ہے، ان مقامات سے گزرنا پروفیسر فاروقی کے بقول اتنا آسان نہ تھا۔

اس سے قبل عمران سیریز کے دو عدد ناولز کے تراجم سن ۲۰۱۰ میں شائع ہو چکے ہیں اور مزاح کے اسی عنصر کو ڈھنگ سے ترجمہ نہ کیے جانے کی بنا پر ان میں سقم محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جملہ جو اس طرح تھا: مدھو بالا کی جوانی کی قسم میں یہ بیگ واپس کر دوں گا۔۔ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

'I swear by Madhubala's youth I will return the bag'

گرچہ اس ترجمے میں کوئی تکنیکی غلطی نہیں لیکن اردو میں موقع کی مناسبت سے ادا کیا گیا یہ جملہ انگریزی میں ترجمہ ہو کر اپنا کٹیلا پن کھو بیٹھا۔

تقریب کے دوران پروفیسر شمس الرحمان فاروقی اور احمد صفی

ادارہ بلافٹ نے ڈاکٹر ڈریڈ کے سلسلے کی ان چار کتابوں کی ہندوستان سے باہر ای۔ بکس (eBooks) فروخت کا اہتمام کیا معروف عالمی ویب سائٹ ایمیزون کے ذریعے کیا ۔ بلافٹ کی انتظامیہ کے مطابق ابن صفی ، مرزا غالب کے بعد دوسرے مصنف ہیں جن کی کتابیں ای۔ بکس کے طریقہ کار کے تحت فروخت کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ادارہ ویسٹ لینڈ کے روح رواں گوتم پدمنابھان اور بلافٹ کے مالک اور ایڈیٹر راکیش کھنہ تقریب میں موجود تھے۔ گوتم پدمنابھان نے اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ابن صفی ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور انگریزی کے یہ تراجم ان کے بقول اس طبقے میں ابن صفی کے کام کے پھیلاؤ میں کارگر ثابت ہوں گے۔راکیش کھنہ نے کہا کہ ان کو ابن صفی کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کا خیال اس وجہ سے آیا کہ اس سے پیشتر وہ تامل زبان کے اقتباسات کا مجموعہ شائع کرنے کا کامیاب تجربہ کرچکے تھے ، اس مرتبہ انہوں نے علاقائی زبانوں میں لکھے گئے جاسوسی ادب کا

انتخاب کیا۔ راکیش کھنہ ، ڈاکٹر ڈریڈ سلسلے کی کامیابی کی صورت میں ابن صفی کے مزید ناولز کے تراجم کرنے کا ادارہ رکھتے ہیں۔

احمد صفی نے تقریب کے شرکاء کو بتایا کہ وہ دہلی آکر بہت خوش ہوئے ہیں ۔انہوں نے کہا کہ یہ ان کا خواب تھا کہ وہ ہندوستان کے ان باسیوں سے ملیں جن کے متعلق ان کے والد اکثر گفتگو کیا کرتے تھے اور وہ الہ آباد کے ضلع کوشمبی میں واقع اپنے آبائی گاؤں نارا جانا چاہتے ہیں جس کے متعلق ان کے والد انہیں یہ بتایا کرتے تھے کہ مذکورہ گاؤں نے بڑے نامور اہل قلم پیدا کیے ہیں۔یاد رہے کہ نارا میں ابن صفی کا خاندان حکیموں کا خاندان کہلاتا تھا اس لیے کہ اس خاندان نے کئی ریاضی دان، سائنسدان، ماہر فلکیات و ماہر نجوم پیدا کیے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی فلمی صنعت سے وابستہ شاعر و ادیب جاوید اختر نے ایک مرتبہ اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ انہوں نے گبر اور موگیمبو جیسے ویلن ، ابن صفی کی تحریروں سے متاثر ہو کر تخلیق کیے۔

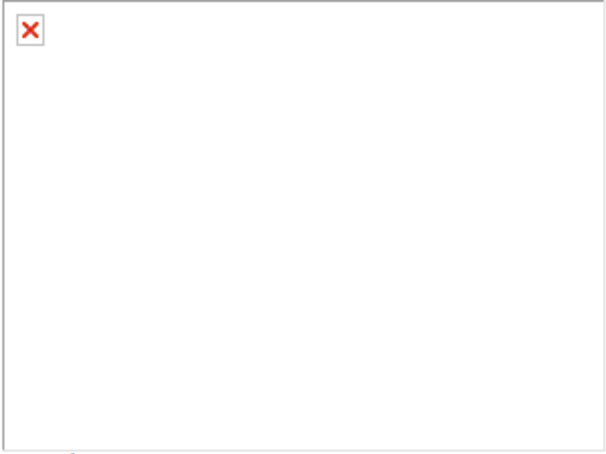

احمد صفی دوران تقریب راقم الحروف کا بنایا ہوا ویڈیو کلپ
A Pictorial Tribute To Ibne Safi (یو ٹیوب پر موجود)
شرکاءکو دکھاتے ہوئے
متذکرہ ویڈیو کلپ، لگ بھگ اسی سے زائد نایاب تصاویر کو
یکجا کرکے تخلیق کیا گیا ہے

مختلف اخباروں کے دئیے گئے انٹرویوز میں احمد صفی نے اپنے والد سے متعلق کئی اہم باتوں کا تذکرہ کیا۔ ابن صفی کی بیماری سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ۰۶۹۱ میں وہ ایک مہینے میں چار ناولز کی حیرت انگیز شرح سے لکھ رہے تھے۔ بے انتہا ذہنی دباؤ کی وجہ سے وہ شیزوفرینیا کی بیماری کا شکار ہوگئے اور پھر تین برس کے علاج کے بعد صحتیاب ہوئے۔ اس دوران انہیں بہ سلسلہ علاج، دواؤں کے ساتھ ساتھ الیکٹرک شاکس بھی دئے جاتے رہے کیونکہ اس زمانے میں ماہر نفسیات مریض کے ساتھ گفتگو یا counselling کے طریقہ علاج سے واقف نہیں تھے۔سن ۳۶۹۱ میں صحتیابی کے بعد معالج نے انہیں مہینے میں ایک

ناول لکھنے کا مشورہ دیا اور یوں یہ سلسلہ ۱۹۸۰ میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ اپنی صحتیابی کا ثبوت انہوں نے ۱۹۶۳ میں ڈیڑھ متوالے جیسا شاندار اور پلاٹ کے اعتبار سے انتہائی مظبوط ناول لکھ کر دیا۔ الہ آباد، ہندوستان میں مذکورہ ناول کی تقریب رونمائی یونین منسٹر لال بہادر شاستری کے ہاتھوں سرانجام پائی۔ رقم الحروف کو احمد صفی نے مذکورہ ناول کا ایک جہازی حجم کا اشتہار دکھایا جسے ابن صفی نے ہندوستان اپنے ناشر عباس حسینی کو بھیجنے کے لیے رکھا تھا اور جو بوجوہ بھیجا نہ جاسکا۔ ابن صفی کی تصویر کے ساتھ اس پر درج تھا کہ آپ کا محبوب مصنف آپ کے لیے دیوانگی کی سرحدوں سے واپس آگیا ہے۔

ڈیڑھ متوالے کی فروخت جاری ہے ۔بشکریہ احمد صفی

اس زمانے میں ابن صفی اپنے ناول کا اشتہار روزنامہ جنگ میں دیا کرتے تھے جبکہ پاکستان کے مختلف ریلوے اسٹیشنز پر اے ایچ ویلر کے بک اسٹالز پر ان کے ناول فروخت کے لیے دستیاب رہتے تھے۔ بعد ازاں اے ایچ ویلر کے اسٹالز، امتداد زمانہ کی نذر ہو کر رفتہ رفتہ منظر عام سے غائب ہو گئے۔ مارچ ۲۵۹۱ میں جاسوسی دنیا کا پہلا ناول دلیر مجرم جسے الہ آباد کے ایک مقامی ناشر نے شائع کیا تھا، الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر واقع اے ایچ ویلر ہی کے بک اسٹال پر فروخت کے لیے رکھا گیا تھا اور اس کی تمام کاپیاں محض ایک ہی ہفتے میں فروخت ہو گئی تھیں۔ اس کی مانگ کو دیکھتے ہوئے ناشر کو دلیر مجرم کو کئی مرتبہ شائع کرنا پڑا تھا۔ غیر ملکی فضاؤں میں لکھے گئے عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے کئی دلچسپ ناولز قارئین کے ذہنوں میں اب بھی محفوظ ہیں۔ ایسے کسی بھی ایڈونچرس ناول کو لکھنے سے پہلے ابن صفی اس ملک و خطے کے حالات، رسم و رواج، رہن سہن، جغرافیائی حالات اور ماحول کے بارے میں مکمل آگاہی کی غرض سے ان ملکوں کے بارے میں مواد جمع کرکے اس کا بغور مطالعہ کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر متعلقہ ملک کے سفارت خانے سے بھی مدد لیا کرتے تھے۔ اٹلی، فرانس، زنجبار، تنزانیہ، اسپین وغیرہ میں ان کے کرداروں کی مہم جو کہانیاں کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ان میں عمران کی ایڈلاوا سیریز (پچھتر تا اٹھتر) سرفہرست ہے۔ انگوروں سے ڈھکی جھیل کومو کے گرد گھومتی ایڈلاوا سیریز کا ناول خیر اندیش (نمبر ۷۶) کون بھول سکتا ہے جس میں ماحول کی

بہترین عکاسی کی گئی ہے، پڑھنے والا سب کچھ بھلا کر اسی ماحول کا حصہ بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اتفاق دیکھئے کہ ابن صفی صاحب کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ایثار صفی (۵۰۰۲ میں اچانک انتقال کر گئے تھے) ایک مرتبہ جب اٹلی گئے تو خصوصی طور پر جھیل کومو کو دیکھنے کی غرض سے وہاں چلے گئے۔ جھیل کا ماحول دیکھ کر وہ سخت حیران ہوئے کہ اس جھیل میں اور ناول میں ان کے والد کی اس سے متعلق کی گئی منظر نگاری میں سر مو فرق نہ تھا۔ راقم نے بھی اس جھیل کی تصاویر انٹرنیٹ پر دیکھیں اور ڈاکٹر ایثار کا ہم خیال ہوا۔

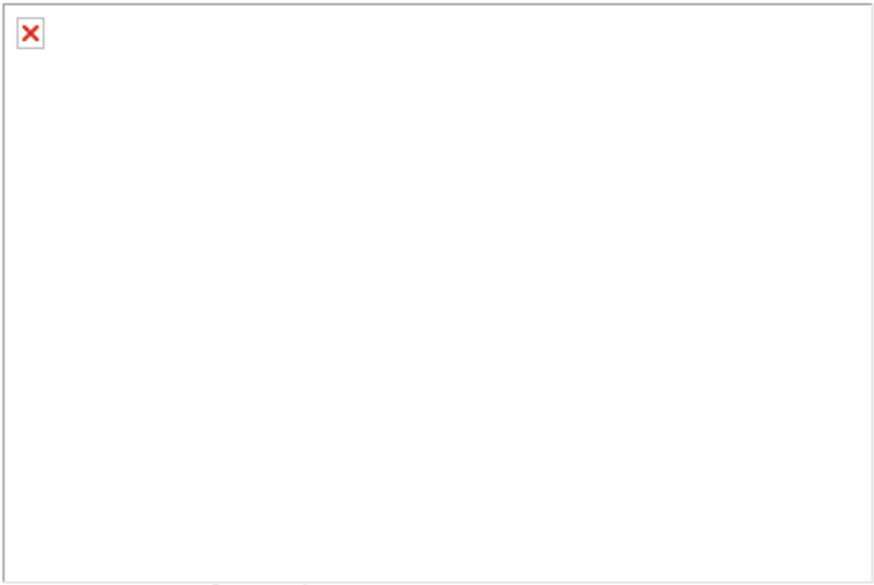

جاسوسی دنیا کے دیدہ زیب سراوراق ۔بائیں سے دوسرا ایڈیشن الہ آباد کا ہے جبکہ بقیہ تمام کراچی ایڈیشنز ہیں
دائیں سے: اشاروں کے شکار (نمبر ۰۹)، شادی کا ہنگامہ (نمبر ۴۷)، ہولناک ویرانے(نمبر ۷۴ الہ آباد)، چاندنی کا دھواں(نمبر ۹۷).

احمد صفی نے مزید کہا کہ وہ ان دنوں اپنے والد کی شاعری پر مبنی مجموعہ کلام متاع قلب و نظر کی اشاعت کے سلسلے میں مصروف ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔

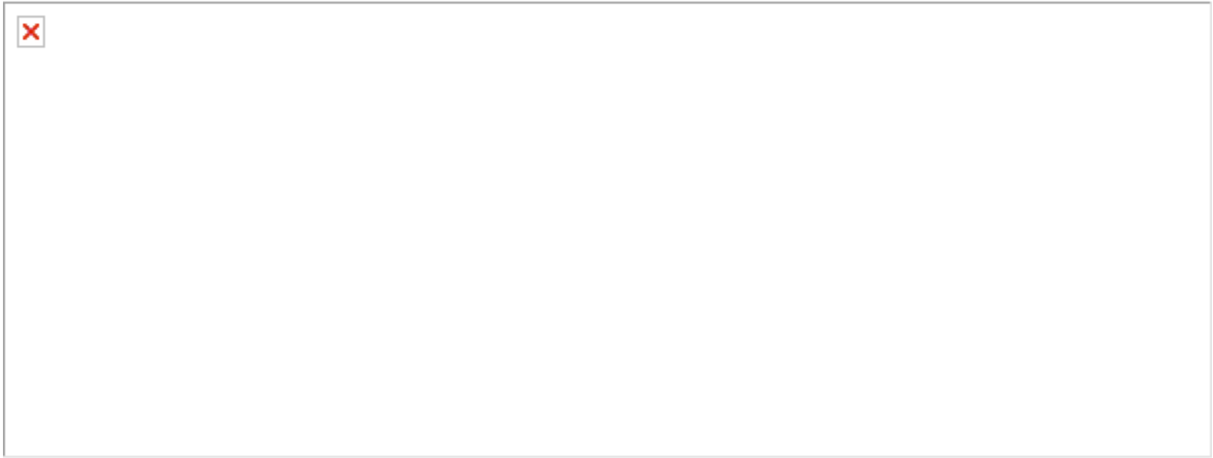

ابن صفی کی تحریرکا ایک نمونہ ۔ بشکریہ: احمد صفی

لئیق رضوی کے مضمون ابن صفی اور سماجی سروکار (کتاب نما دہلی۔۰۱۰۲) سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:
ابن صفی کی ناول نگاری تقریبا اٹھائیس برسوں پر محیط ہے۔ یہ زمانہ برصغیر

کی تاریخ کا انتہائی نازک دور ہے۔ ملک کے ساتھ دل بھی ٹوٹ گئے تھے۔ فسادات سے چور جسم و جاں اور تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ چلنے کا دباؤ، اس دباؤ میں بیتا بگڑتا سماج، روز بروز بڑھتی الجھنیں اور بدعنوانیاں، پیر پسارتا کرپشن، جرائم اور اقتدار کے لیے چالیں اور سازشیں۔ عالمی سطح پر بھی بڑی اتھل پتھل تھی۔ سپرپاور ثابت کرنے کی دوڑ میں بڑی طاقتیں کچھ بھی کر گزرنے کو بے قرار۔ ابن صفی نے وقت کی ہر چال اور آہٹ کو پکڑنے کی کوشش کی اور جہاں بھی جتنا بھی موقع ملا، خلاقانہ مہارت کے ساتھ اپنے ناولز کا حصہ بنایا۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ابن صفی کے فن کے قدردانوں میں سے تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون ابن صفی کی یاد میں میں لکھتے ہیں:

پچھلے دنوں طلسم ہوشربا پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے یہ نکتہ بیان کیا کہ طویل داستانوں کے لیے عہد حاضر کے قاری کے پاس وقت نہ رہا تو اس نے جاسوسی ادب کے ذریعے اپنے ذوق تجسس کی تسکین چاہی اور اس سلسلے میں ابن صفی کی ذات ایک سنگ میل ہے۔ بیدار صاحب کی اس تحریر سے مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں کئی برسوں سے داستان اور جاسوسی ناول کے رشتے پر زور دیتا رہا ہوں اور اسے انسان کے ذوق تجسس سے منسلک کرتا رہا ہوں۔

ابن صفی کو پرستار بھی ایسے مخلص نصیب ہوئے کہ جن کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ سے عقیدت و محبت عیاں ہے۔ ایسے ہی ایک پرستار آذر اعظمی ہیں جھنوں نے صفی صاحب کے انتقال پر تمیں برس پہلے اپنے جذبات کا اظہار ان دلگداز الفاظ میں کیا:

اگر اللہ کو ایک انسان کی جان لینا ہی تھی تو میں اپنی جان حاضر کر دیتا۔ مگر نہیں ۔ میرے روحانی باپ (ابن صفی) نے یہ تلقین کی تھی کہ شکوہ نہ کرو، گنہگار کہلاؤ گے۔ جانا تو ہر شخص کو ہے۔ کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ کیا انہیں اتنی جلدی ہی جانا تھا؟ شہر بھر میں سوگ منایا گیا۔ لاکھوں دل افسردہ ہوگئے اور لاکھوں آنکھوں میں موتی تیرنے لگے۔ پرستاروں اور مداحوں کی بھاری تعداد نوحہ کناں ہے۔ ان کی یاد میں موتی لٹا رہے ہیں۔ محترم ابن صفی نے مجھے ایک مرتبہ میرے خط کو جواب میں برخوردار کہہ کر پکارا تھا۔ وہ میرے باپ تھے۔ آہ میں یتیم ہوگیا ہوں۔ ایک ایسا یتیم جو اپنے باپ کی مرتے دم صورت نہ دیکھ سکا ہو۔ کیا کوئی صورتحال کا اندازہ لگا سکتا ہے؟ ۔۔۔ صرف وہی جن پر بیتی ہو۔ اپنے یتیم ہونے کی خبر سن کر دل بے قابو ہوگیا۔ جگر پھٹ گیا۔ ہوش و حواس معطل ہوگئے۔ چوبیں گھنٹے بے ہوش رہا۔ آنکھیں اب تک ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ کئی روز سے طبعیت مضمحل ہے۔ حالت نیم پاگل کی سی ہے۔ کتابیں سینے سے لگائے، آنسو پینے میں مصروف ہوں۔

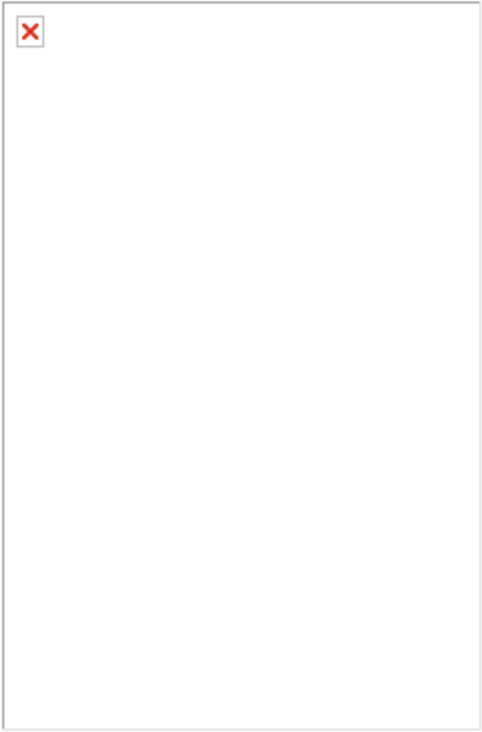

ایک پرستار کا نذرانہ۔ سن اسی کی دہائی میں شائع ہوا۔بشکریہ: نئے افق

یہاں قارئین کی دلچسپی کی غرض سے سن ۰۱۰۲ اور ۱۱۰۲ میں جناب ابن صفی سے متعلق اہم واقعات درج کیے جارہے ہیں:

۔چوبیس جولائی ۰۱۰۲ کو پاکستان کے معروف ٹی وی چینل جیو ٹی وی نے ابن صفی کے فن اور شخصیت پر ایک گھنٹے پر مبنی ایک جامع پروگرام پیش کیا۔مذکورہ پروگرام امریکہ، یورپ، مشرق وسطی اور اسکنڈے نیوین ممالک میں دکھایا گیا۔ ناظرین کی پسندیدگی اور فرمائش پر جیو ٹی وی نے اسے کم و بیش آٹھ مرتبہ نشر کیا ۔
۔۔ ۶۲ جولائی ۰۱۰۲ کو پاکستان کے مختلف اخبارات میں ابن صفی کی تیسویں

برسی کے موقع پر خبریں شائع ہوئیں، پاکستان کے بیشتر ٹی وی چینلز نے اس روز ابن صفی کی برسی پر خبر نشر کی۔ مختلف جرائد میں مضامین شائع ہوئے جبکہ انٹرنیٹ پر دنیا بھر میں خبریں اور مضامین شائع کیے گئے۔

-- چھ نومبر ۰۱۰۲ کو کراچی کے ٹی وی ون نامی چینل نے ابن صفی پر ایک پروگرام نشر کیا۔ مذکورہ پروگرام کے میزبان آصف فرخی تھے جبکہ مہمانوں میں احمد صفی، شکیل عادل زادہ اور ایچ اقبال شامل تھے۔

-- رینڈم ہاؤس، نئی دہلی آفس نے ابن صفی کی عمران سیریز کے ابتدائی دو ناولز کے انگریزی تراجم شائع کیے۔

-- پانچ فروری ۱۱۰۲ کو کراچی میں انٹرنیشنل لٹریچر فیسٹیول منعقد ہوا اور اسی روز اس تقریب میں خرم علی شفیق کی جناب ابن صفی کے ناولز سے اقتباسات اور تبصرے پر مشتمل کتاب سائیکو مینشن شائع ہو کر فروخت کے لیے پیش کی گئی۔

--- ۵۲ مئی ۱۱۰۲ کو ٹی وی چینل اے آر وائی سے تتلیاں نامی پروگرام کے زیر تحت، ابن صفی پر پروگرام نشر ہوا۔ پروگرام میں احمد صفی، خرم علی شفیق اور مشرف علی فاروقی کی آراء شامل تھیں

--- ۱۱۰۲ میں خرم علی شفیق کی کتاب سائیکو مینشن کے دوسرے حصے رانا پیلس کی اشاعت متوقع ہے

--- ۲۲ اپریل ۱۱۰۲ کو نئی دہلی میں اشاعتی ادارے ویسٹ لینڈ اور بلافٹ کے

اشتراک سے ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے چار ناولز کے انگریزی تراجم کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ مذکورہ کتب، عنقریب کراچی میں فروخت کے لیے دستیاب ہوں گی۔

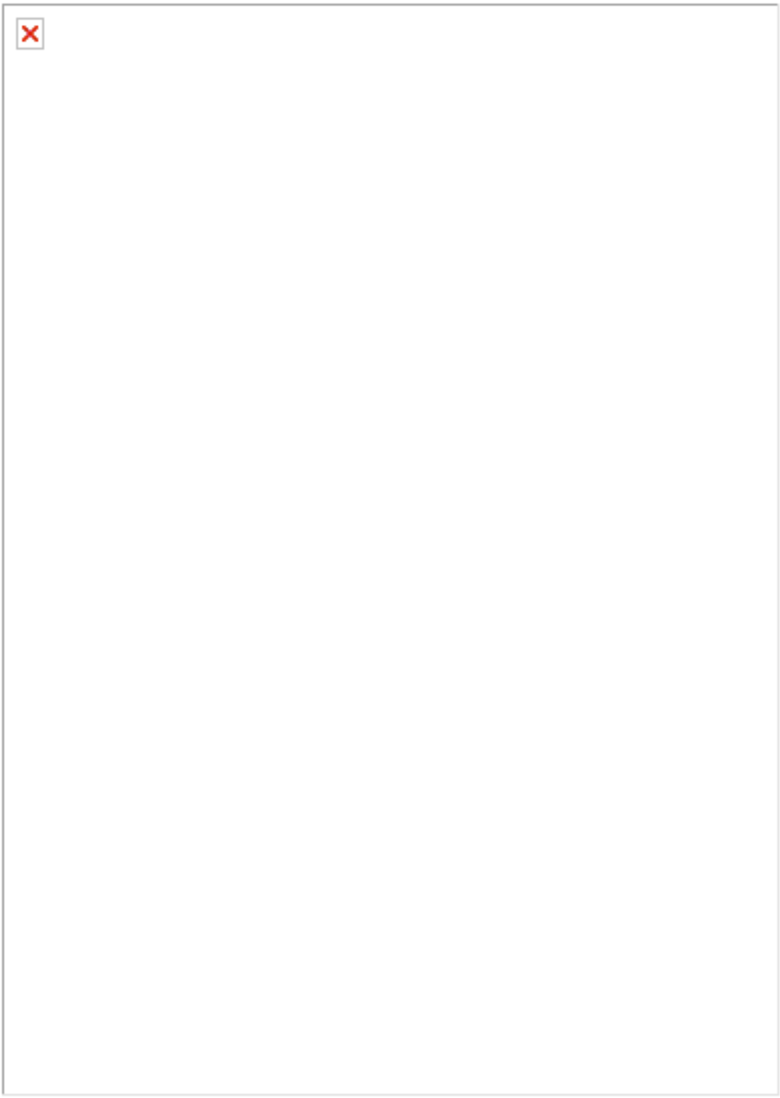

دہلی کی تقریب کا دعوت نامہ

ابن صفی ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ابن صفی کے الہ آباد یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے ہونہار شاگردوں کے تذکرے ملک ادب کے شہزادے میں ان کا تذکرہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ ابن صفی کی شاعری کا بلند معیار ملاحظہ ہو:

ہم پہ صدیوں کی پیاس طاری ہے
قطرے قطرے کا ہو رہا ہے حساب

کارواں منزل مقصود پر کیونکر پہنچے
راہبر راہزنوں سے جو کریں پیار کی بات

جو بوئے گل پہ نہ ہواں کی دسترس اے دل
چمن میں ایسی بھی پابندیوں سے کیا حاصل

تمام عالم امکاں شراب خانہ ہے
یہ اور بات ہے زاہد سبو نہ پہچانے

بلاشبہ بابائے جاسوسی کہلائے جانے کا مستحق، درویش صفت مصنف، دنیا جسے ابن صفی کے نام سے جانتی ہے اور جو تیس برس تک اپنی تحریروں کے ذریعے ہم سب کو قانون کے احترام کا درس دیتا رہا، چھبیس جولائی ۱۹۸۰، کی درمیانی شب، قانون

قدرت کے احترام میں سر جھکا گیا۔

سائیں ظہور دیوانہ کہنداا ے

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

بی بی سی کے تحت بننے والی اینڈی ڈی ایمونی (Andy De Emmony) کی تازہ ترین فلم West is West میں پاکستان کے علاقائی گلوکار سائیں ظہور کو عالم وار فتگی میں ایک ٹرک کے اوپر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہاتھ میں اکتارہ تھامے بیٹھا دیکھا گیا۔ ٹرک اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے اور سائیں ظہور ایک شادی کی.برات کے لیے گارہا ہے۔ ۹۹۹۱ ، West is West میں منظر عام پر آنے والی فلم East is East کا دوسرا حصہ ہے۔ دونوں فلموں کے مرکزی کردار (اصلا.برطانوی و ہندوستانی) ان کی ریلیز کے طویل درمیانی وقفے کے باوجود تقریبا ایک جیسے ہیں۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب سے تعلق رکھنے والا جہانگیر خان جو ساٹھ کی دہائی میں روزی کمانے انگلستان پہنچا تھا اور ایک انگریز خاتون (Linda Bassett اداکار) سے شادی کر کے وہیں بس گیا تھا۔ ٦٧٩١ (انیس سو چھیتر) میں اپنے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ اپنے وطن اپنی پہلی بیوی سے ملاقات کی غرض سے پہنچا۔اس درمیان ٠٣ (تیس) .برس کا وقفہ بیت چلا تھا۔

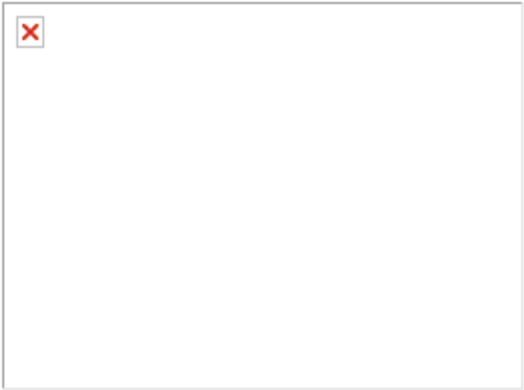

ویسٹ از ویسٹ۔۲۰۱۱

مانچسٹر میں جہانگیر، جارج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنے رسم و رواج اور اپنی جڑوں سے ازسرنو وابستگی و آگاہی کی غرض سے پنجاب لایا ہے۔ لیکن اس کو وہاں مختلف نوعیت کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جارج کا کردا ر ہم سب کے پسندیدہ اداکار اوم پوری نے کیا ہے جبکہ ان کی پہلی بیوی کے کردار میں ایلا ارون نظر آئی ہیں۔دونوں فلمیں بیحد دلچسپ ہیں اور ۶۰ (ساٹھ) اور ۷۰ (ستر) کی دہائی میں پاکستان سے انگلستان جا بسنے والوں کے مسائل کی خوبصورت اور پراثر انداز میں عکاسی کرتی ہیں!

یہاں ذکر سائیں ظہور کا ہے جس کے مقد ر میں پاکستان کے مختلف صوفی بزرگوں

کے مزارات پر ہاتھ میں اکتارہ تھامے، گانا لکھ دیا گیا تھا۔ سائیں ظہور نے پہلا گانا پانچ برس کی عمر میں گایا۔۔ تیرہ برس کی عمر میں اپنا گھر چھوڑا اور سندھ، پنجاب اور آزاد کشمیر کے مختلف صوفیوں کے مزارات کی خاک چھانی۔ گزر بسر کا انحصار گائیکی پر ہی رہا۔ یوں بھی درویشوں کی ضرورت زیادہ کچھ ہوتی ہی کیا ہے۔۔۔ غالب اس دور میں ہوتے تو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے " پکارنے کی حاجت بھی نہ رہ جاتی کہ وطن عزیز " میں ان مزارات پر لذت کام و دہن کے ساتھ ساتھ بیخودی طاری کرنے والے جملہ " ہتھیار " وافر مقدار میں دستیاب ہوتے ہیں!

اسی خاک نوردی کے دوران سائیں ظہور کی ملاقات پٹیالہ گھرانے کے استاد سائیں رونکا سے ہوئی جن سے انہوں نے رموز موسیقی کی تربیت پائی۔ جنوبی پنجاب کے شہر اوچ شریف کے دیگر صوفی موسیقاروں سے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔

گلے میں مالا اور کسی ہوئی سیاہ رنگ کی پگڑی، یہ سائیں ظہور کی پہچان بن گئے!

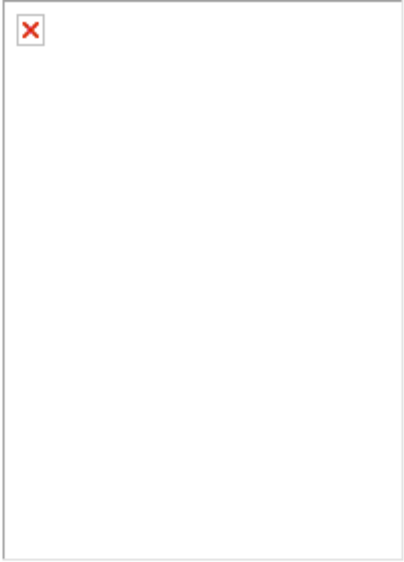

سائیں ظہور ۔دوران گائیکی

سن ۰۴۹۱ (انیس سو چالیس) میں اوکاڑہ میں پیدا ہونے والے سائیں ظہور ۶۰۰۲ (دو ہزار چھ) تک مغربی دنیا کے لیے ایک گمنام شخص تھے کہ اچانک انہیں بی بی سی کی سال ۶۰۰۲ (دو ہزار چھ) کی بہترین آواز کے طور پر نامزد کیا گیا اور صوفیانہ موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں میں وہ راتوں رات مقبول ہوگئے۔ پاکستان کے " کوک اسٹوڈیو" نے انہیں اپنے پروگرام میں گوایا اور تونمبا نامی گیت میں ان کی سیدھی سادھی مگر بلا کا تاثر رکھنے والی ان کی آواز سامعین کے دلوں میں اتر گئی۔ تاحال، سائیں ظہور ہندوستان، آئر لینڈ، جاپان اور انگلستان میں اپنی آواز کا جادو جگا چکے ہیں جبکہ ۷۰۰۲ (دو ہزار سات) میں انہوں نے پاکستانی فلم خداکے لیے کی موسیقی ترتیب دینے میں معاونت کی تھی۔

جو قارئین سائیں ظہور کے شہرہ آفاق گیت تومبا سے ناواقف ہیں، ان کے لیے اس گیت تک رسائی کا یہ لنک حاضر ہے:

http://beemp3.com/download.php?file=9027787&song=Toomba+-+Saieen+Zahoor

سائیں ظہور کی آواز کو مغربی نقادوں نے جادوئی آواز کا خطاب دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ آواز ہے جو آپ کو وجد میں لے آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خان صاحب نصرت فتح علی خان کی صحیح قدر بھی انہی لوگوں نے کی تھی۔ بی بی سی کے ایوان کرسلے نے اپنے تبصرے میں سائیں ظہور کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

"Sain Zahoor now tours the world, often accompanied by harmonium and dholak drum side-players, wreaking the same blissful havoc on devotees and newcomers alike. His piercing chiselled features are a regular sight on Pakistani TV and he has been the subject of at least one documentary.

Fans of the Sufiana kalams claim that seeing and hearing
Sain Zahoor in full
flow is the closest anyone alive will get to being in the
presence of the
the Sufi mystics of yore, like Bulle Shah and Shah Hussain.
It's a musical
spell that is well nigh universally effective."

محمد خالد اختر۔ اردو مزاح نگاری کا اہم ستون

کراچی سے تعلق رکھنے والے ادیب و ناشر اجمل کمال نے جداگانہ اسلوب کے حامل اردو مزاح نگار محمد خالد اختر کی تحریروں کو یکجا و محفوظ کرنے کا بیڑہ اٹھایا، خالد اختر کی تمام تحریروں کو بنا سنوار کر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی کے حوالے کیا اور جون 2011 (دو ہزار گیارہ) میں جہاں ایک طرف اجمل صاحب کی محنت بار آور ثابت ہوئی وہاں اس ادیب بے مثال کی تحریروں تک ان کے پرستاروں اور اردو زبان سے لگاؤ رکھنے والوں کو رسائی حاصل ہوئی جسے دنیا محمد خالد اختر کے نام سے جانتی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی کے تحت محمد خالد اختر کی تمام تحریریں کئی جلدوں میں شائع کی جائیں گی اور اس سلسلے میں دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں جلد دوم (سفر نامے) اور جلد سوم (افسانے) شائع ہو چکے ہیں جبکہ جلد اول (ناول) اشاعتی مراحل میں ہے۔ جلد چہارم جو چچا عبدالباقی کہانیوں کا مجموعہ ہے، اگلے ایک ماہ میں شائع ہونے کی توقع ہے۔

سفرناموں پر مشتمل جلد دوم کے دیباچے میں اجمل کمال لکھتے ہیں: "محمد خالد اختر کے سفرناموں میں پڑھنے والوں کو مسحور کرنے والی بات ان انسانی کرداروں کی رنگا رنگی ہے جن سے ان کی سفر کے دوران ملاقات ہوتی ہے۔ اپنی اپنی مخصوص صورت حال سے دوچار انسانوں پر مشتمل زندگی کا میلہ ہی ہے جس سے محمد خالد اختر کا سفری تجربہ عبارت ہے۔ وہ اپنے ان عارضی ہمسفروں ،مختلف پس منظر رکھنے والے عام لوگوں سے بھرپور تخلیقی دلچسپی لیتے ہیں اور ہمدردی اور گہرائی سے بنائی گئی تصویروں کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے اس مطالعے میں شریک کرتے ہیں۔اس عمل میں محمد خالد اختر کی تخلیقی شخصیت کا فکشن نگار پہلو پوری طرح بروئے کار آتا ہے۔"

ابن انشاء نے خالد اختر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا: "محمد خالد اختر کو پڑھنے والا اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اردو پڑھ رہا ہے۔ اس

میں انگریزی الفاظ کی بھرمار بھی نہیں ہے لیکن جملوں کی ساخت سراسر انگریزی ہے۔ شروع شروع میں یہ انداز غریب اور اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس میں بانکپن کا لطف آنے لگتا ہے۔

محمد خالد اختر کے بارے میں ادیب و انشاءپرداز محمد کاظم کہتے ہیں : " اس اسلوب میں ضرور ایک اجنبی زبان کا اثر ہے لیکن اس کے طنز و مزاح کا ماحول، اس کے افراد اور ان کی گفتگو اور چلت پھرت سب کچھ یہیں کا ہے اور دیسی ہے۔ "

جبکہ اشفاق احمد کی رائے کچھ اس طرح ہے: " خالد کے فن کا سب سے بڑا کمال اس

کے مغربی علوم کے مطالعے ہیں مشرقی زندگی کی پہچان ہے۔ یہ پہچان ایسی انوکھی، ایسی سبک اور کچھ ایسی اچانک ہے کہ اگلے فقرے پر پہنچ جانے کے بعد پچھلا راز کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ ایسا انداز مشق سے حاصل نہیں ہوتا۔۔۔ صرف فطرت کی طرف سے ملتا ہے۔"

فیض احمد فیض، محمد خالد اختر کے ناول چاکیواڑہ میں وصال کو اردو زبان کا اہم ناول قرار دیتے تھے اور اس ناول پر فلم بنانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔

محمد خالد اختر 23 (تیئیس) جنوری 1920 (انیس سو بیس) کو اللہ آباد ضلع بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم صادق ڈین ہائی اسکول سے حاصل کی جبکہ صادق ایجرٹن کالج سے 1938 (انیس سو اڑتیں) میں بی اے کیا۔ صادق ڈین ہائی اسکول میں ساتویں جماعت میں اردو کے مشہور مزاح نگار شفیق الرحمان کچھ عرصے ان کے ہم جماعت رہے تھے۔ صادق ایجرٹن کالج میں داخلہ لینے سے قبل محمد خالد اختر تین ماہ تک لاہور کے گورنمنٹ کالج میں فرسٹ ائیر کے طالب علم رہے۔ مذکورہ کالج میں وہ پروفیسر پطرس بخاری کی شخصیت کے اسیر ہوئے۔ صادق ایجرٹن کالج میں احمد ندیم قاسمی اور محمد خالد اختر کے ساتھ ہوا۔ قاسمی، تھرڈ ائیر میں تھے اور خالد اختر سے دو برس سینئر! ۔۔ دونوں کی دوستی بہت جلد

ہو گئی۔۔۔ محمد خالد اختر فخر سے یہ دعوی کرتے تھے کہ احمد ندیم قاسمی کو انہوں نے
افسانہ نگاری کی راہ پر ڈالا تھا۔

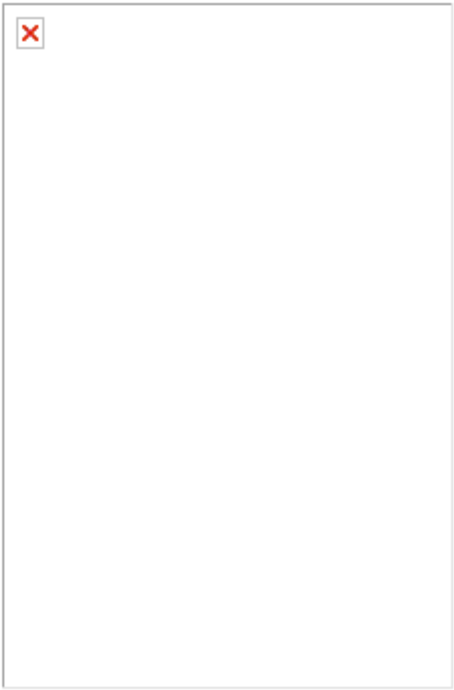

2001 (دو ہزار ایک) کی ایک تصویر

1945 (انیس سو پینتالیس) میں میکنیکل انجینئرنگ کالج سے الیکٹرونکس انجینئرنگ میں بی ایس سی کرنے کے بعد وہ اعلی تعلیم کے لیے لندن گئے اور ایڈاونسز پوسٹ گریجویٹ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد 1948 (انیس سو اڑتالیس) میں وطن واپس آئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انگلش الیکٹرک کمپنی میں دو برس ملازمت کی اور 1952(انیس سو باون) میں واپڈا میں بحیثیت انجینئر تعینات ہوئے۔ محمد خالد اختر واپڈا کے ادارے سے 1980(انیس سو اسی) میں ر یٹائر

ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو (مطبوعہ روزنامہ جنگ۔ 17 اکتوبر 2001
۔ سترہ اکتوبر دو ہزار ایک) میں یہ انکشاف کیا تھا کہ اپنی ریٹائرمنٹ پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔۔۔ان کے الفاظ میں: " میری طبیعت سے میرے پیشے کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ ملازمت کے سارے عرصے میں ایک ذہنی اذیت کا شکار رہا ہوں۔ افسر عموما اچھے ہمدرد لوگ تھے جو میرا خیال کرتے تھے لیکن ملازمت کے آخری چھ سات برسوں میں دو ایسے افسران سے سابقہ پڑا جو انتہائی اذیت پسند واقع ہوئے تھے اور جنہوں نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ اس عملی زندگی کے دوران چند اچھے مہر و مروت کے پتلے دوست بھی میرے ہاتھ ضرور آئے۔ محمد کاظم، صلاح الدین محمود، محمد خورشید، اکرام اللہ، ظہور نظر، ریاض الرحمان (خالد صاحب نے اپنے ناول چاکیواڑہ میں وصال کے ابتدا میں اپنے انہی دوست کو مخاطب کیا ہے۔ راقم) اور احمد حسین چغتائی۔ (محمد حسین چغتائی، محمد خالد اختر کو اپنے ہمراہ چین کی سیاحت پر لے گئے تھے جہاں دونوں دوستوں نے دو ماہ گزارے۔ راقم)

محمد خالد اختر نے اوائل عمری ہی سے لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ جب وہ ساتویں جماعت میں تھے تو پہلی مرتبہ ان کے چند مضامین ماہانہ رسالے "مسلم گوجر" میں شائع ہوئے۔ مذکورہ رسالہ گورداسپور سے شائع ہوتا تھا۔ نویں جماعت میں محمد خالد اختر کو شاعر بننے کا شوق ہوا اور انہوں نے خضر تخلص اختیار کیا۔

پندرہ بیس نظموں کا ایک دیوان مرتب کیا جسے وہ اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتے تھے۔
نویں جماعت کے دنوں ہی میں محمد خالد اختر کو انگریزی ادب پڑھنے کا چسکا پڑا جس کے سحر سے وہ تمام عمر نہ نکل سکے۔ کالج کے زمانے میں وہ نخلستان نامی کالج میگزین میں اردو و انگریزی زبانوں میں لکھتے رہے۔ محمد خالد اختر نے طنز و مزاح، خاکہ نگاری، افسانہ اور سفر نامہ کے علاوہ متعدد ادبی اصناف میں اپنی فن کا لوہا منوایا ہے۔
محمد خالد اختر کی پہلی تحریر جو کسی ادبی جریدے میں شائع ہوئی ، ایک مزاحیہ تحریر تھی جسے احمد ندیم قاسمی کی سفارش پر مولانا چراغ حسن حسرت نے اپنے ہفتہ وار مزاحیہ پرچے " شیرازہ " (۱۹۳۷ میں اجراء ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد بند ہو گیا۔ راقم) میں شائع کیا تھا۔ بعد ازاں، 1946 (انیس سو چھیالیس) میں احمد ندیم قاسمی نے ، خالد صاحب کا تحریر کردہ سفر نامہ " ڈیپلو سے نو کوٹ تک " ادب لطیف میں شائع کیا۔ (محمد خالد اختر متذکرہ سفر نامے کو اپنی بہترین چیزوں میں شمار کرتے تھے ۔ راقم) ۔ اس کے علاوہ سعادت حسن منٹو پر لکھے اپنے ایک مضمون (لالٹین نامی کتاب میں شامل ہے۔ ۔ راقم) کو بھی خالد اختر اپنے پسندیدہ تحریروں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ اپنے ۱۹۹۷ طرز تحریر کے بارے میں اپنی ایک کتاب کھویا ہوا افق میں قاری سے یوں مخاطب ہوتے ہیں: " جو مسخرے پن کو مزاح سمجھتے ہیں، میری کتاب میں ان کو کچھ لطف حاصل نہ ہوگا۔ "

اپنی دلنشیں تحریروں کے ساتھ ساتھ محمد خالد اختر کے بیان میں بھی ایک منفرد چاشنی نظر آتی ہے۔ گرد و پیش کے حالات، تیزی سے بدلتی سماجی قدروں اور ماضی و حال کے موازنے پر ایسا بے لاگ، بھرپور اور دل کو چھو جانے والا تبصرہ خال خال ہی پڑھنے میں آتا ہے۔ اپنے آخری انٹرویو (روزنامہ جنگ کراچی۔2001 سترہ اکتوبر) میں وہ کہتے ہیں: " بیتا ہوا زمانہ ہمیں سہانا لگتا ہے۔ ہمارے بچپن اور لڑکپن کے ایام میں سادگی تھی۔ محبت کرنے والے لوگ تھے۔ فراغت کا احساس تھا۔ انسان کی زندگی اتنی الجھی ہوئی، اتنی مشینی نہ تھی جتنی اب بن کر رہ گئی ہے۔ اب جس شخص سے ملو وہ جلدی میں ہوتا ہے۔ کسی جان لیوا مصیبت میں بتلا۔ اگر زندگی میں گائیوں اور بھیڑوں کی طرح دیر تک خالی نظروں سے دیکھنے کا وقت نہ ہو اور آدمی ہر وقت تفکرات سے مغموم رہے تو اس زندگی کا کیا فائدہ ؟۔۔اس دور میں ہر کوئی اپنے خول میں سمٹ کر جیتا ہے۔ ہمارے معاشرتی اور سماجی رویوں میں کوئی خاطر خواہ یا خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔۔بے شک ہم نے سائنسی طور پر بڑی ترقی کر لی ہے۔ چاند کی تسخیر، سٹیلائٹ، ٹیلی وژن، کمپیوٹر وغیرہ اور ہم سچ سچ ایک نئی دنیا کے قیام کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن کیا اس دور کا آدمی پچھلے دور کے آدمی سے زیادہ خوش اور مطمئین ہے ؟۔۔پھر بھی ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہم آنکھوں پر کپڑا باندھے کوہلو کے بیل نہیں جو چکر کاٹتے رہتے ہیں اور ایک ہی راہ کو روندتے چلے

جاتے ہیں۔میں رجائیت پسند ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آگے کسی بہتر مستقبل کی طرف رواں دواں ہیں ۔ویسے آپ جانتے ہیں کہ مخلوقات میں انسان ہی سب سے زیادہ سفاک، چالاک اور خطرناک حیوان ہے۔ اور یہ دنیا جس میں ہم جیتے اور مرتے ہیں، پرفیکٹ دنیا نہیں۔ایسی دنیا جس میں روپے پیسے کی راجدھانی ہو، پرفیکٹ کیونکر ہو سکتی ہے۔"

محمد خالد اختر انگریزی کے نامور ادیب و انشاء پرداز رابرٹ لوئی اسٹیونسن سے بے انتہا متاثر تھے۔انہیں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔اپنے اسی شوق کی خاطر وہ کئی بار گھر سے نکلے اور دور دراز علاقوں کی مسافت اختیار کی۔گیان اور شانتی کی تلاش میں ایک مرتبہ وہ ہندوؤں کے مقدس مقام ہردوار جا پہنچے اور ہندوانہ نام اختیار کرکے ایک سرائے میں کئی روز قیام کیا۔اپنے اسی قیام کے دوران انہوں نے اپنی مشہور کہانی " کھویا ہوا افق" لکھی۔اس کہانی کو سعادت حسن منٹو نے کتر بیونت کے بعد شائع کیا۔محمد خالد اختر کی تصانیف میں مندرجہ ذیل نام شامل ہیں:

بیس سو گیارہ (ناول) ۔پہلی اشاعت: 1954 (انیس سو چون)۔مکتبہ جدید لاہور

(چاکیواڑہ میں وصال (ناول)۔ 1964 (انیس سو چونسٹھ

کھویا ہوا افق (افسانے) ۔آدم جی ادبی انعام یافتہ ۔پہلی اشاعت: 1967 (انیس سو سڑسٹھ) ۔مکتبہ جدید لاہور

(چچا عبدالباقی (کہانیاں) ۔ قوسین پبلشر۔لاہور۔ 1985 (انیس سو پچاسی

مکاتیب خضر (مضامین) ۔خطوط غالب کی طرز پر لکھے گئے مزاحیہ مکاتیب

(ابن جبیر کا سفر۔ 1994 (انیس سو چورانوے

یاترا (سفر نامہ) ۔آکسفورڈ پریس کے مجموعہ خالد اختر جلد دوم میں شامل ہے۔ سن (اشاعت: جون 2011 (دو ہزار گیارہ

دو سفر (سفر نامہ) ۔ مطبوعات پبلشر۔لاہور۔ 1984 (انیس سو چوراسی) ۔۔آکسفورڈ پریس کے مجموعہ خالد اختر کی جلد دوم میں شامل ہے۔ سن اشاعت: جون (دو ہزار گیارہ) 2011

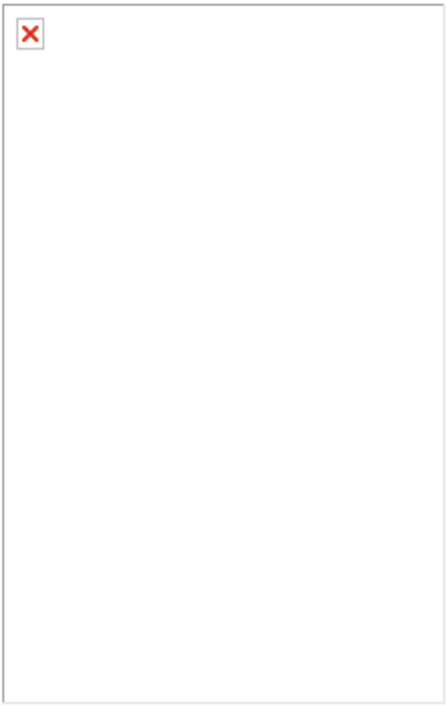

یہاں محمد خالد اختر کے اسلوب تحریر کے چند نمونے پیش خدمت ہیں:

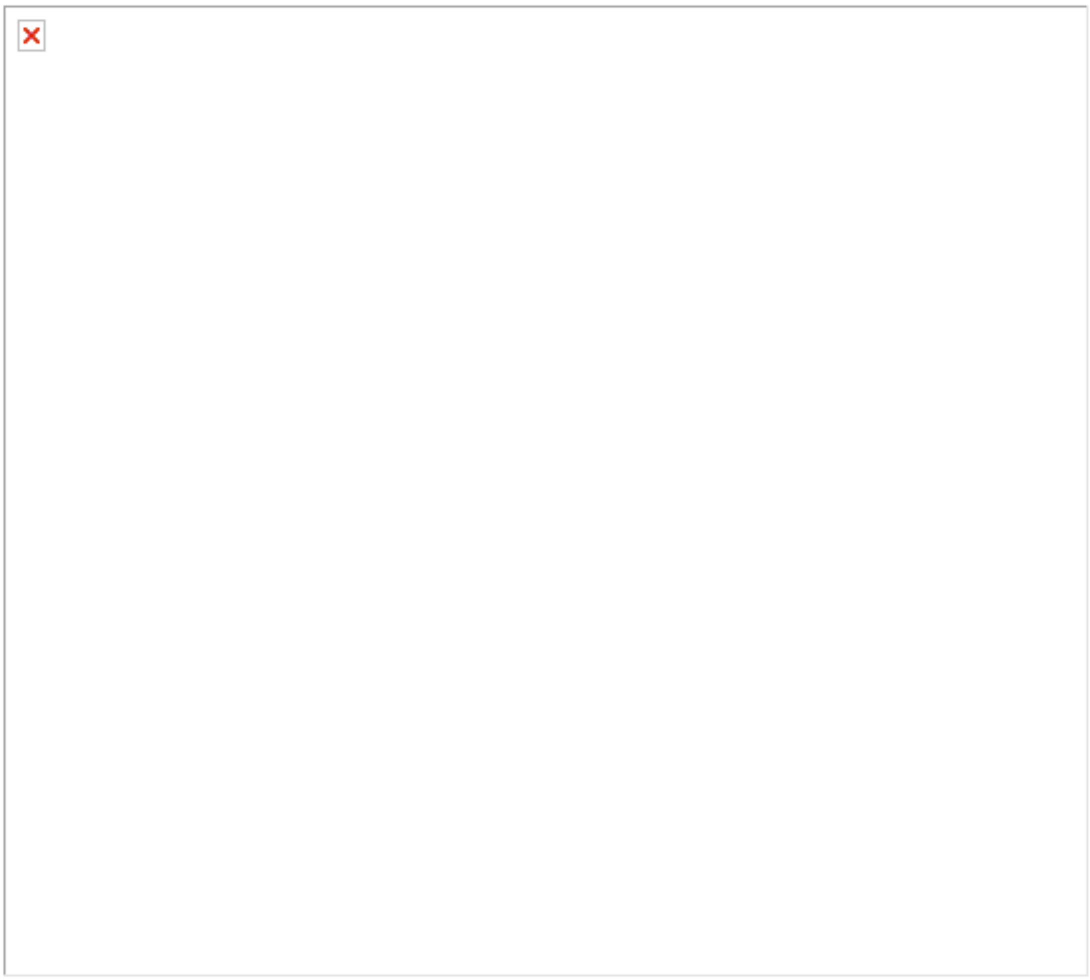

دو سفر

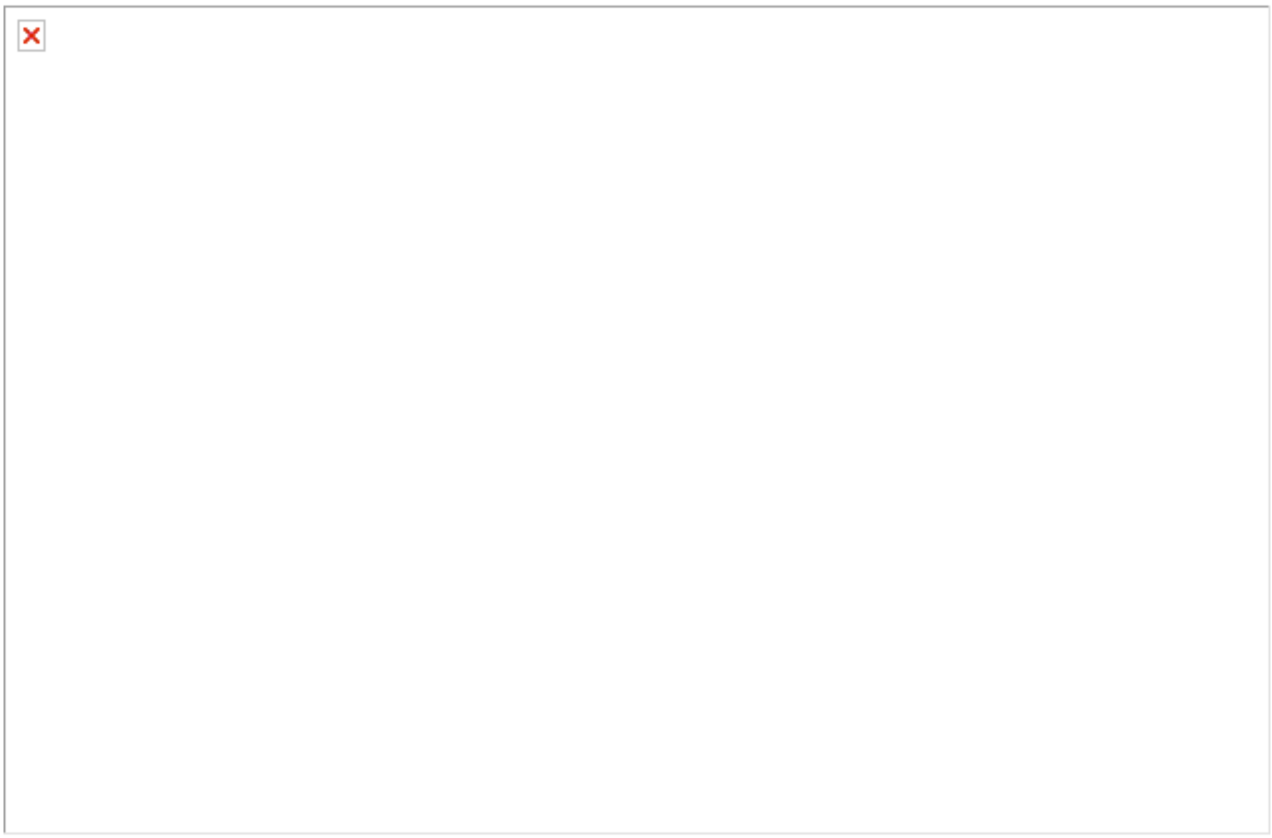

دو سفر

دو سفر

محسود اشعر نے اپنے ایک اہم اور دلچسپ مضمون 2011منفی9 (بیس سو گیارہ منفی نو) میں محمد خالد اختر کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :" ستر کی دہائی کی بات ہے، ان دنوں میں ملتان میں تھا.احمد ندیم قاسمی نے مجھے لکھا کہ محمد خالد اختر تمہارے شہر میں آگئے ہیں ، ان سے ضرور ملو اور ان کا خیال رکھو۔ خالد اختر واپڈا میں تھے اور رحیم یار خان سے ان کا تبادلہ ملتان ہوا تھا۔ میں نے انہیں پڑھا تو بہت تھا اور بہت ذوق و شوق سے پڑھا تھا ، ملا کبھی نہیں تھا۔ دوسرے ہی دن میں ان کے دفتر پہنچ گیا۔یہ دفتر گلگشت میں تھا۔ ایسا ہی دفتر جیسے سرکاری دفتر ہوتے ہیں۔وہی پرانی پالش اتری کرسیاں، وہی بے رونق میز۔ ہاں، اس میز پر فائلوں کا ڈھیر نہیں تھا کہ وہ ایک افسر انجینئر کی میز تھی۔ اس میز کے پیچھے ایک نہایت دبلا پتلا سوکھا تنکا سا آدمی بیٹھا تھا۔ لمبا قد، کندھے تھوڑے سے جھکے ہوئے ، اندر کو دھنسی آنکھیں

گالوں کی ہڈیاں خوب ابھری ہوئیں، لمبے لمبے کان جو استخوانی چہرے کی وجہ سے اور بھی لمبے محسوس ہوتے تھے۔ کشادہ دہانہ اور نوکیلی تھوڑی۔ رنگ کبھی صاف ہوگا مگر اب اجلا ہوا بلکہ جل کر بجھا ہوا نظر آتا تھا۔ اگر ان کے ہونٹوں پر ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ملنساری کی معصومانہ چمک نہ ہوتی تو سچی بات یہ ہے کہ مجھے ان سے مل کر ذرا بھی خوشی نہ ہوتی۔ لیکن ان کی ہنسی اور مسکراہٹ بھی عجیب سی تھی۔ کسی بات پر ہنستے اور پھر فوراً ہی شرما جاتے۔ اپنی بھاری آواز میں ہوں ہوں کرتے اور آنکھیں جھپکانے لگتے۔ میں بھی کچھ کم شرمیلا نہیں ہوں مگر ان کے شرمانے کے آگے میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اب حالت یہ تھی کہ میں باتیں کر رہا تھا اور وہ ہوں ہوں کر رہے تھے "

مسعود اشعر ان دنوں کی یادگار محفلوں کا احوال بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں: "
ملتان میں ریڈیو اسٹیشن نیا نیا کھلا تھا۔ پھر ظہور نظر بھی بہاولپور سے آگئے۔ اب خوب دھما چوکڑی مچنے لگی۔ ظہور نظر کی موجودگی میں اودھم اور دھما چوکڑی ہی مچ سکتی تھی۔ پھر ہم نے سوچا ظہور نظر کے ساتھ شام منائی جائے اور صدارت خالد اختر سے کرائی جائے۔ بڑی منت سماجت کے بعد خالد اختر صدارت کے لیے راضی ہوئے لیکن اس شرط پر کہ وہ کچھ بولیں گے نہیں، دوسروں کی سنتے رہیں گے اور آخر میں شکریہ ادا کرکے جلسہ برخاست کردیں گے۔

پھر ہم سب کے کہنے پر وہ مضمون لکھنے کے لیے بھی راضی ہو گئے لیکن اس شرط پر کہ کوئی اور پڑھے۔ اب کیا کیا جائے ۔۔۔ خالد صاحب کو اپنا مضمون تو خود ہی پڑھنا چاہیے۔

یہ مجھ پر چھوڑ دو" ۔۔ ظہور نظر نے اعلان کیا۔ "میں اس بڈھے کی ایسی مت ماروں گا"

" کہ اسے پتہ بھی نہیں چلے گا اور وہ خود ہی اپنا مضمون پڑھ جائے گا۔

ظہور نظر کی خالد اختر کے ساتھ بہت بے تکلفی تھی۔ خالد اختر چونکہ جوانی ہی میں بوڑھے لگتے تھے اس لیے ظہور نظر انہیں ہمیشہ بڈھا اور بڈھے کہہ کر پکارتا تھا۔

آٹھ بجے جلسہ شروع ہوا، اس وقت تک ظہور نظر اپنی سازش میں کامیاب ہو چکا تھا۔

چنانچہ خالد اختر جلسے میں پہنچے اور اور بڑے اعتماد کے ساتھ صرف صدارت ہی نہیں بلکہ اپنا صدارتی مضمون بھی اس دھڑلے سے پڑھا کہ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مضمون میں کوئی ہنسی کی بات آتی تو خود بھی ہنس پڑتے۔ وہی ہنسی جس کے بعد وہ جھینپ جاتے اور شرما کر خاموش ہو جاتے۔ ان کی ہنسی پر لوگ جب قہقہہ لگاتے تو انگریزی میں ظہور نظر کو موٹی سی گالی دیتے اور کہتے : " ہاں یہ ایسا ہی ہے " ۔۔۔۔ اور ہاں ! اسی اسٹیج پر ظہور نظر کو ڈانٹ بھی دیا۔

اور ایسا ڈانٹا کہ ظہور نظر دھپ ہوگیا۔ ہوا یوں کہ جب وہ (خالد اختر) اپنا مضمون پڑھنے اٹھے تو کہیں پاؤں لڑکھڑا گیا اور ظہور نظر نے جو اسی جانب بیٹھا تھا، انہیں سنبھالنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔۔یکدم ڈانٹ پڑی:

Let me Be You

اس ڈانٹ نے ان کے اندر ایسا اعتماد پیدا کیا کہ پھر کسی شرم اور جھجک کے بغیر اپنا مضمون پڑھ ڈالا۔

مسعود اشعر لاہور کے دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: " خالد اختر کو بہت قریب سے جاننے کا موقع لاہور میں ملا۔ وہ واپڈا میں ڈائریکٹر ہو کر لاہور آ گئے تھے اور مجھے بھی جنرل ضیاء الحق نے ملتان بدر کر دیا تھا۔ اکرام اللہ اور راؤ ریاض بھی لاہور ہی میں تھے۔ یہاں ہم سب کا ٹھکانہ دوستوں کے دوست ہاشم خان کا گلبرگ والا فلیٹ تھا۔ ہاشم خان پیشے کے لحاظ سے تو انجینئر تھے لیکن خالد اختر، راؤ ریاض اور محمد کاظم کی طرح ادب کے شیدائی تھے۔ یہ 1979 (انیس سو اناسی) اور 1980 (انیس سو اسی) کا زمانہ تھا۔ ضیاء الحق کا مارشل لاء اپنے عروج پر تھا۔ ہم سب ہر شام ہاشم خان کے فلیٹ پر اکھٹے ہوتے اور دلوں کا غبار نکالتے۔ ان محفلوں میں دنیا بھر کا ادب، ساری دنیا کی موسیقی اور مقامی سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بخئے ادھیڑے جاتے۔

خالد صاحب اکثر تو خاموش ہی رہتے لیکن جب غصے میں آتے تو سب کو اپنی بھاری آواز میں ڈانٹ دیتے۔ ان دنوں ان کی صحت کچھ زیادہ ہی گرنے لگی تھی۔ انہیں اپنے پیٹ سے تو ہمیشہ ہی شکایت رہی تھی کہ ایک زمانے سے بھوسی والی ڈبل روٹی کے دو توس ہی ان کی غذا تھے۔ اب انہیں بات بات پر رونا آنے لگا تھا۔ جب بھی کوئی دوست ان سے زیادہ گھل مل کر باتیں کرتا تھا یا وہ بہت سرور میں ہوتے تو ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہتے، دونوں گال بھیگ جاتے اور کشادہ ہونٹ اور بھی کشادہ

: ہو جاتے اور ہاشم خان چیختا

چاچا! مت روؤ، کیوں آنسو ضائع کر رہا ہے۔ ان میں سے کوئی تجھے یاد نہیں کرے گا "

"

" اور وہ ہاشم خان سے لپٹ جاتے: " تو ضرور یاد کرے گا مجھے

! پھر وہ ہنسنے لگتے۔۔۔۔۔

ہاشم خان نے خالد اختر کی بھیگی آنکھوں اور گالوں پر بہتے آنسوؤں کی کئی تصاویر کھینچی تھیں۔ وہ یقیناً تاریخی تصویریں ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں ہاشم خان کی کتابوں کی طرح وہ " تصویریں بھی محفوظ نہیں ہوں گی۔

مندجہ بالا بیانئے کے بعد یوں ہوا کہ پھر وقت کے ساتھ ساتھ خالد اختر میں

اس دارفانی کو الوادع کہنے کا خوف ماند پڑتا گیا۔ اس سلسلے میں مسعود اشعر بیان کرتے ہیں: "عجیب بات ہے، بیس پچیس سال پہلے تو وہ دوستوں سے گلے مل کر روتے تھے جیسے انہیں اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں ہے مگر جوں جوں بیسویں صدی کے آخری سال قریب آرہے تھے، انہوں نے کہنا شروع کردیا تھا کہ میں نیا میلینیم دیکھے بنا نہیں جاؤں گا۔ اور جب نیا میلینیم شروع ہوگیا تو ہم نے یعنی ان کے دوستوں نے انہیں تسلی دینا شروع کردی کہ اب آپ اپنے ناول کا بیس سو گیارہ بھی دیکھیں گے۔ میں نے انہیں لکھا کہ Futuristic ناول لکھنے والوں میں سے جن تین ناول نگاروں کو میں نے پڑھا ہے ان میں سے صرف آرویل ہی ایسا تھا جس نے اپنے ناول کا سال نہیں دیکھا۔ باقی دونوں وہ سال دیکھنے کے لیے زندہ رہے۔ انتھونی برجیس اپنے ناول والے سال کے کئی برس بعد مرا اور آرتھر کلارک ابھی تک زندہ ہے۔ آپ بھی بیس سو گیارہ ضرور دیکھیں گے۔ یہ خط پڑھ کر وہ بہت خوش ہوئے تھے اور لکھا تھا: "تم کہتے ہو تو ضرور دیکھوں گا وہ سال"

پھر کیا ہوا؟ اکرام اللہ (لاہور کے دوست) کہتے ہیں انہوں نے انتقال سے چند روز قبل ہی انہیں ٹیلیفون کیا تھا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی ان کی آواز میں۔ انہوں نے کہا: "تمہارا خط آئے کافی دن ہوگئے ہیں۔ جلد ہی جواب لکھوں گا۔

مگر پھر وہ کسی کے خط کا جواب نہیں دے سکے ۔ آخر ان کا جسم اپنی اس سازش میں کامیاب ہو گیا جس کے تانے بانے وہ تیس چالیس سال سے بن رہا تھا۔ صرف نو برس ہی تو رہ گئے تھے بیس سو گیارہ میں۔ بیس سو گیارہ کو تو وہ اپنے لمبے لمبے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے تھے۔ (مسعود اشعر

اجمل کمال نے 'آج' نامی اشاعتی سلسلے کے تحت 1997 (انیس سو ستانوے) بیں محمد خالد اختر کے متفرق مضامین پر مشتمل لالٹین کے عنوان سے کتاب شائع کی تھی، اس کے علاوہ اجمل کمال نے اپنے ادبی جریدے سہ ماہی آج کا محمد خالد اختر نمبر بھی نکالا ہے۔ محمد خالد اختر کی تحاریر کو محفوظ کرنے میں اجمل کمال اور آکسفورڈ پریس کی قابل قدر کوشش کا ذکر بین السطور کیا جا چکا ہے۔

فیض احمد فیض کے علاوہ محمد خالد اختر کے مداحوں میں کنہیا لال کپور، احمد ندیم قاسمی، شفیق الرحمان، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، سید سبط حسن ، سید ضمیر جعفری اور فہمیدہ ریاض کے نام شامل ہیں۔

سید ضمیر جعفری خالد اختر کے بارے میں رائے زن ہیں: "اردو ادب کا یہ

انجینئر ان چیف اپنی غیر معمولی تخلیقی ذکاوت سے نئی نئی شاہراہیں تراشتا رہتا ہے۔ اور پنڈی میں اس کے تین عشاق، بریگیڈیئر شفیق الرحمان، کرنل محمد خان اور راقم الحروف جب بھی یکجا ہوتے ہیں تو محمد خالد اختر کے چمکیلے اور خوش ذائقہ اسلوب نگارش پر اکیس " توپوں کی سلامی نچھاور کر لیتے ہیں۔

یہاں اجمل کمال کے محمد خالد اختر کے اسلوب پر سیر حاصل تبصرے کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں سمجھا جانا چاہیے۔۔۔۔ وہ لکھتے ہیں: "اردو نثر کے تاریخی ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے کسی شخص کو محمد خالد اختر کے مخصوص اسلوب میں ایک گہری تہذیبی تبدیلی کارفرما محسوس ہو سکتی ہے جس کے تحت علم، اطلاع اور ثقافتی اقدار کے منبعے کے طور پر فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی جگہ رفتہ رفتہ انگریزی نے حاصل کر لی۔ اردو کی تقریباً تمام تر جدید نثر اسی تہذیبی تبدیلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اردو کے جدید تخلیقی ادب میں اس کا اولین اظہار قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ محمد خالد اختر کے ہاں انگریزی نثر کے رچاؤ کا یہ رنگ نسبتاً زیادہ گہرا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی تحریروں میں ایک خوشگوار طور پر نامانوس لہجہ جنم لیتا ہے بلکہ کسی بھی انسانی صورتحال کو ایک خارجی، نسبتاً زیادہ معروضی زاویے سے دیکھنے کا تخلیقی انداز بھی پیدا ہوتا ہے۔ محمد خالد اختر کی تحریروں میں متواتر محسوس ہونے والا خفیف طنز ان کے اسی مخصوص تخلیقی اسلوب کی دین ہے۔"

جنوری 2002 (دو ہزار دو) کو عالمی فروغ اردو ادب دوحہ نے انہیں ڈیڑھ لاکھ کے 9 ایوارڈ اور ایک عدد گولڈ میڈل سے نوازا۔ علالت کے باوجود محمد خالد اختر نے یہ ایوارڈ دوحہ جا کر وصول کیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر محمد خالد اختر کو احساس ہوا کہ اب ان کی زندگی کی لو ٹمٹما رہی ہے۔ تب انہوں نے کہا: "میں اب سب خواہشوں اور امنگوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ نہ علمی، نہ ادبی اور نہ عملی۔ سورج غروب ہو رہا ہے اور سائے لمبے ہو رہے ہیں۔ جلد، بہت جلد میں بھی اس دور دراز کے سفر پر چل نکلوں گا جو جلد یا بدیر ہم سب کو درپیش ہے۔ معمولی سا ٹیلنٹ یا صلاحیت مجھ میں تھی، اس کو موافق جو کچھ مجھ سے ہو سکا، میں نے کرلیا۔ پچھتاوے بھی نہیں ہیں۔ایک خواہش البتہ ہے کہ جب اس دنیا سے جاؤں تو چلتا پھرتا جاؤں۔ کسی کا محتاج ہوئے بغیر، کسی کو جوکھم میں ڈالے بغیر، ! "

اردو ادب کا یہ نام و نمود و شہرت سے دور بھاگنے والا، مشرق اور مغرب کو اپنی تحریروں میں یکجا کرنے والا منفرد مزاح نگار، دنیا جس کو محمد خالد اختر کے نام سے جانتی ہے، 2 فروری 2002 (دو ہزار دو) کو کراچی میں 90 (نوے) برس کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ کراچی میں سوسائٹی کے قبرستان

میں تدفین ہوئی۔انتقال سے چند روز قبل احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے آخری خط میں انہوں نے لکھا کہ" میری حالت کچھ ٹھیک نہیں۔۔آپ کی طرح خوش خوش جیا اور خوش خوش جاؤں گا۔۔یعنی 2011 (بیس سو گیارہ) میں۔۔اپنے وعدے پر انشاء اللہ قائم ہوں۔۔ویسے پھیپھڑے ستر فیصد بیکار ہو چکے ہیں مگر ان کے بغیر بھی آدمی جی سکتا ہے۔"

یہاں محمد خالد اختر کا اشارہ اپنے ناول بیس سو گیارہ کے عنوان کے مطابق سن بیس سو گیارہ میں اس دنیا سے رخصت ہونے کی طرف تھا۔

ادیب و مترجم وجاہت مسعود نے انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا: " چاکیواڑہ اور مٹھن کوٹ اداس ہیں کہ محمد خالد اختر چلا گیا۔ کہانیاں کہتا ہوا۔۔۔ایک زود بصر گیانی کی سی وسعت قلب سے گاہے مسکراتا، گاہے ہنستا۔۔۔گیا کی ترائیوں میں برگد کے پیڑ بہت ہیں۔۔۔۔اور رات ابھی باقی ہے۔"

غروبِ آفتاب

چوبیس مئی ۱۱۰۲ کو آفتاب احمد خان نے سیالکوٹ میں آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آئیڈی آرٹ کلب، فیصل آباد کے جنرل سیکریٹری تھے۔ مذکورہ ادارہ، فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ادیب جاوید اقبال اور ان کے احباب نے قائم کیا تھا۔ غیر منقسم ہندوستان کے فلمی نگار خانوں اور مشہور فلمی شخصیات کے بارے میں جتنا آفتاب احمد خان جانتے تھے، شاید ہی کوئی اور جانتا ہو۔ راقم کے علم میں ان کی واحد تحریر جو ایک حیرت انگیز طور پر معلوماتی تحریر کہلائے جانے کے قابل ہے، کتاب ملاقاتوں کے بعد کے دیباچے کے طور پر لکھی گئی اور جو ہندوستانی فلمی صنعت کے سرکردہ افراد کی زندگیوں کے مختلف النوع دلچسپ گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ ملاقاتوں کے بعد کے مصنف جاوید اقبال موجودہ صدی کے پہلے عشرے کے وسط میں فیصل آباد سے بمبئی پہنچے تھے اور یوں اکتوبر ۶۰۰۲ میں ہندوستانی فلمی صنعت سے وابستہ تخلیق کاروں سے انٹرویوز پر مبنی کتاب ملاقاتوں کے بعد منظر عام پر آئی۔ یہ وہ کام تھا جو فیصل آباد جیسے صنعتی شہر میں رہائش پذیر ایک شخص کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ مذکورہ کتاب میں موسیقار اعظم نوشاد، خیام، جگجیت کور، شیام بینیگل، اشوک کمار، نقش لائل پوری، افتخار امام صدیقی، سیما سہگل، ندا فاضلی اور نصیر الدین شاہ کے انٹرویوز شامل ہیں۔ جاوید اقبال صاحب کے مطابق

کتاب میں شامل نوشاد اور اشوک کمار کے انٹرویز، دونوں حضرات کے آخری طویل انٹرویوز قرار پائے۔

آفتاب احمد خان کے بارے میں زیر نظر مضمون جناب جاوید اقبال کی تازہ تحریر ہے جس سے خان صاحب کی ہفت پہلو شخصیت پڑھنے والے پر آشکار ہوتی ہے۔ مضمون کی فراہمی پر راقم الحروف، جاوید صاحب کا ممنون ہے۔

یوں تو خان صاحب سے متعلق اس مضمون میں دلچسپ واقعات کی بھرمار ہے لیکن یہاں خصوصیت سے ایک واقعے کا ذکر لازمی ٹھہرا :

بچپن کے ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے تھے۔ سکول کے زمانہ ان کے ایک ہندو استاد چرن داس ہوا کرتے تھے۔ کسی بات پہ ایک دن ماسٹر صاحب نے میری پٹائی کردی اس قدر ڈنڈے مارے کہ میری قوت برداشت ختم ہوگئی۔ مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا۔ میں نے شدید تکلیف کے عالم میں ماسٹر صاحب سے ڈنڈا چھینا۔ جواباً ان کے جسم پر دو تین ڈنڈے برسائے اور پھر خوف کے عالم میں وہاں سے بھاگ گیا۔ جماعت کے لڑکے میرے پیچھے بھاگے لیکن میں صحت کے لحاظ سے بہتر تھا۔ ویسے بھی جان بچانے والے کو ایسی حالت میں ایک اضافی طاقت عطا ہو جاتی ہے۔ بھاگتا بھاگتا اُن کی حدود سے باہر آگیا۔ میں ڈر کے مارے گھر بھی نہیں

گیا کیوں کہ ماسٹر صاحب ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ اُن کی شکایت پر میرے ساتھ جو سلوک ہونا تھا، مجھے اُس کا اندازہ تھا۔ بغیر ٹکٹ کے سیدھا جالندھر اپنے دودھیال پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے اطلاع بھجوادی کہ آپ چاہے مجھے جان سے ماردیں۔ میں نے اب اُس سکول میں نہیں پڑھنا۔ میں جالندھر میں پڑھنے لگا۔ چھ ماہ بعد گھر جانے کو دل بے تاب ہوگیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر آگیا۔ اسٹیشن سے پیدل ہی گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔ گھر کے راستے میں شمشان گھاٹ آتا تھا۔ وہاں کچھ لوگ جمع تھے۔ اُن کے قریب جا کھڑا ہوا۔ آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ کسی مردے کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ ساتھ والے آدمی سے پوچھا۔ "کون مرگیا۔" وہ کہنے لگا۔ "ماسٹر چرن داس پرلوک سدھار گئے ہیں۔" مردے کے سر پر ہتھوڑا مارنے کا مرحلہ آیا۔ ہتھوڑا مارا گیا اور چوٹ پڑتے ہی فضا میں چھوٹی چھوٹی ہڈیاں بکھر گئیں۔ ہڈی کا ایک ٹکڑا بہت بری طرح میرے ٹخنے پر آکے لگا۔ شدید تکلیف سے دوہرا ہوگیا۔ وہ یہ واقعہ سناتے ہوئے بہت ہنسا کرتے اور کہا کرتے۔" ماسٹر چرن داس مر تو گیا لیکن جاتے جاتے مجھ سے اپنا بدلہ لے گیا۔"

آیئے یہ مضمون پڑھتے ہیں اور اس شخص کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں جو آفتاب احمد خان کہلاتا تھا!

خیر اندیش

راشد اشرف

غروبِ آفتاب

جنازگاہ کا ماحول حسبِ روایت سوگوار تھا۔ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لئے قاری صاحب کا انتظار تھا۔ اگلی صف میں اقبال فیروز اور حمید شاکر افسردہ کھڑے نظر آئے۔ میں اُن کے قریب چلا آیا۔ اقبال فیروز مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگے۔ "رانا صاحب نے زندگی کے آخری سال قریباً آپ کے ساتھ ہی گزارے ہیں۔"

لیکن کل شام آخری باتیں میرے ساتھ ہوئی تھیں۔" حمید شاکر فوراً بولے۔ میں خاموش رہا۔۔۔اقبال فیروز نے قریب پڑی میّت کو تاسف سے دیکھا اور بولے۔" کون کہتا ہے، انسان دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے۔یہ شخص اپنا علم، تجربہ، مشاہدہ اور اپنی باتیں ساتھ لے کر جارہا ہے۔" قاری صاحب آگئے۔ نمازہ جنازہ ہوئی۔تدفین کے بعد ہم نے واپسی کی راہ لی لیکن اقبال فیروز کے جملے میرے احساس سے چپکے رہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں دیانتداری سے لکھنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے جو دنیا چھوڑ کر چلا جائے کیونکہ

بالعموم ایسے عالم میں اُس شخصیت سے متعلق آپ کے اندر سے مثبت آوازیں ہی برآمد ہوتی ہیں۔۔۔ میں یہاں کوشش کروں گا کہ جذبات سے ہٹ کر کچھ تحریر کر سکوں۔ آفتاب احمد خاں سے پہلی ملاقات مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں ہے کہ کہاں ہوئی اور اُس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں۔آپ کو زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں۔ اُن میں جو روح کے ساتھی ہوتے ہیں وہ بغیر کسی وجہ کے آپ کے قریب آ جاتے ہیں اور غیر متعلق لوگ بغیر کسی وجہ کے آپ کی زندگی سے دور چلے جاتے ہیں۔آفتاب احمد خاں کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا وہ دھیرے دھیرے نہیں آنا فاناً میرے قریب آ گئے۔ غالباً حمید شاکر انہیں میرے پاس "کیفے دیوان" میں لے کر آئے تھے۔ اُن دنوں جھنگ بازار فیصل آباد کے کیفے دیوان میں رات کی طویل نشستیں ہمارے ادبی و فنی کیتھارسس کا ذریعہ ہوتی تھیں۔ جن میں شہر کے کئی معروف دوست شریک ہوتے تھے۔ خیر آفتاب احمد آئے۔ دھوتی اور قمیص میں ملبوس، بھاری بھر کم جثہ، رعب دار آواز اور چاک وچوبند انداز۔۔۔ دیکھنے میں وہ مکمل غیر آرٹسٹ نظر آئے۔ اس طویل ملاقات کے بعد حمید شاکر نے مجھے بتایا کہ وہ منتخب لوگوں سے دوستی کرنا پسند کرتے ہیں۔یہاں آنے کے لئے بھی رضامند نہیں تھے۔ کہہ رہے تھے آپ پتا نہیں مجھے کن لوگوں سے ملوانے جا رہے ہو۔ خیر اُس نشست میں ہونے والی باتوں سے وہ کسی حد تک مطمئن دکھائی دیئے لیکن انھوں نے

اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ فوری رائے دینے سے احتراز کرتے تھے۔۔۔ اس کے بعد ہماری کیفے دیوان والی نشستیں تواتر سے ہونے لگیں۔ جن میں اُن کی شخصیت کے کئی اور پہلو بھی نمایاں ہوئے۔

سارے دوست انہیں "رانا صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ ہم انجانے میں اُن کو کسی ناگواری میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ایک بار ریاض مجید سے اُن کی کسی بات پہ ناراضی ہوئی۔ کچھ عرصہ بول چال بند رہی۔ آخر مجھے کودنا پڑا۔ میں نے ریاض مجید سے کہا کہ آپ صلح کرلیں۔ وہ بڑے فراخ اور فیاض ہیں اِس معاملہ میں، ناراضی کے ایک اور واقعہ پر ریاض مجید نے اپنا بڑا سفید رومال جسے وہ گرمی سے بچاؤ، کسی چیز کو سمیٹنے اور ضرورت پڑنے پر جائے نماز کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں، شانے سے اتار کر خان صاحب کے قدموں پہ رکھ دیا تھا۔ خیر ریاض مجید حسب امید فوراً ہی مان گئے۔ کہنے لگے۔ " میری تو کوئی لڑائی ہی نہیں ہے۔" اب رانا صاحب کو منانا خاصا مشکل تھا۔ بہر حال میں نے کچھ محنت کر کے اُن کو راضی کر لیا لیکن انہوں نے چند شرائط رکھیں کہ اُن کو پورا کئے بغیر صلح ممکن نہیں ہے۔ اُن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ انہیں "رانا" کہہ کر نہ بلایا جائے۔ استفسار پر بتانے لگے۔ "رانا ایک مشرکانہ نام ہے۔ مجھے اس نام کا سابقہ پسند نہیں ہے۔" " پھر کیا کہا جائے آپ کو۔" میں نے پوچھا۔ کہنے لگے۔ "آپ مجھے آفتاب کہہ لیا کرو۔" عمروں کے

تفاوت کی وجہ سے انہیں اِس بے تکلفی سے پکارنا میری اخلاقیات کی راہ میں مانع تھا اس لئے میں انہیں " خان صاحب " کہہ کر مخاطب کرنے لگا لیکن دوست احباب پھر بھی انہیں رانا صاحب کے نام سے ہی بلاتے تھے۔

پچھلے دو ماہ سے اُن سے رابطہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ ہاں شاید ایک وجہ تھی۔ انہوں نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ ان کی صحت اب بہتر نہیں رہی۔ ممکن ہے وہ اب فیصل آباد نہ آ سکیں۔ میں اُن کی بات سن کر بجھ سا گیا تھا۔ میں نے اُن سے دانستہ رابطہ ختم کر لیا تھا شاید کسی انجانے خوف کے زیرِاثر۔۔۔ البتہ جمعہ کے روز حلقہ اربابِ ذوق کی میٹنگ میں جب اُن کے بھائی ارشد جاوید سے ملاقات ہوتی تو میں اُن کی خیریت دریافت کر لیتا تھا۔ بعد کی ایک ملاقات میں ارشد جاوید نے بتایا کہ اُن کی طبیعت اب سنبھل چکی ہے اور پھر حمید شاکر کے ذریعے مجھے آفتاب صاحب کا پیغام ملا کہ میں رابطہ کروں۔ اُن کو فون کیا تو آواز کی توانائی سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب بہتر حالت میں ہیں ۔ اپنی مصروفیات اور کچھ تساہل پسندی کی وجہ سے اُن سے پھر رابطہ نہ کر سکا اور بالآخر 24 مئی 2011ء کی شب ان کے بھتیجے مدثر اور بھائی ارشد جاوید کی یکے بعد دیگرے دو فون کالز نے اُن کے دنیا چھوڑ جانے کی بات کو راسخ کر دیا۔

وہ زیادہ تر ماضی میں رہنا پسند کرتے تھے اور خود کو آر تھوڈوکس کہتے تھے۔ بقول اُن کے بالخصوص تاریخ اور فلم میرے پسندیدہ موضوعات ہیں لیکن میری دانست میں وہ قریباً ہر موضوع پر معلومات کے خزانے لٹاتے تھے۔ تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے وہ فصاحت و بلاغت کے وسیع اظہار میں اس قدر محو ہو جاتے جیسے اُن صدیوں میں اُن لوگوں کے درمیان موجود رہے ہوں۔ محفل میں موجود سارے لوگ خود کو اُن کی بارعب آواز اور سیر حاصل گفتگو کے بوجھ تلے دبا محسوس کرتے اور چپ چاپ اُن کی حیران کن علمی و ادبی باتیں سننے میں ہی عافیت محسوس کرتے اور ایک دم سے وہ کمرہ جہاں اِس طرز کی گفتگو جاری ہوتی، گلوبل روم میں بدل جاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر اُن کی کوئی بات غلط ہے تو معترض شخص ان کی غلطی کے حوالہ سے کوئی ثبوت ضرور پیش کرے۔

وہ مشاہیر سے ملنے کے بھی بڑے شائق تھے۔ سعادت حسن منٹو کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ پچاس کی دہائی میں جب میں دیال سنگھ کالج میں پڑھتا تھا تو کبھی کبھار منٹو سے ملنے لکشمی مینشن اُن کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ ایک بار میں فیصل آباد کے " منروا" سنیما کے باہر کھڑا نئی ریلیز ہونے والی فلم "شہنائی" کے پوسٹر دیکھ رہا تھا کہ ایک پر شکوہ گاڑی میرے قریب آکر رکی۔ میں نے نظر دوڑائی۔ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر فلم "شہنائی" کے ہیرو اور دلیپ کمار کے بھائی ناصر خان بیٹھے تھے اور پچھلی سیٹ پر تھکے تھکے

سے منٹو صاحب موجود تھے۔ناصر خان گاڑی سے باہر آتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئے۔
یہاں کے کسی اچھے سے ہوٹل کا پتا بتا سکتے ہو۔"میں نے کچہری بازار کے ایک ہوٹل کا" بتایا اور مزید کہا کہ وہاں سے آپ کو اچھا کھانا مل جائے گا۔اتنے میں منٹو بھی کمر پر ہاتھ رکھے گاڑی سے باہر آگئے اور مجھے پہچانتے ہوئے پنجابی میں بولے۔

"اؤے توں کتھے ؟۔"

جی ایتھے میرا گھر اے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔"

"تے فیر لاہور؟۔"

"جی اوتھے میں پڑھدا واں۔"

منٹو کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولے۔

"فیر تے توں بڑا بدمعاش ایں۔"

ساحر لدھیانوی کا تعلق اُن کے علاقے یعنی لدھیانہ سے تھا۔دونوں خاندانوں کا آپس میں گھریلو تعلق تھا۔ساحر عمر میں اُن سے بڑے تھے اس لئے وہ ساحر کو" بھائی جی" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔جب 1948 میں ساحر پاکستان چھوڑ کر واپس انڈیا چلے گئے تو ساحر کے والد چوہدری فضل محمد آفتاب احمد سے ساحر کو خط لکھوایا کرتے تھے کیونکہ چوہدری صاحب پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔اِس حوالے

سے اُن کا مفصل بیان آپ کو کتاب "ملاقاتوں کے بعد" میں اُن کے تحریر کردہ دیباچہ میں مل سکتا ہے۔ بہر حال وہ ساحر کو انڈین فلم انڈسٹری کو جدیدیت سے ہمکنار کرنے والے پہلے شاعر کا درجہ دیتے تھے۔علاوہ ازیں وہ ساحر اور امرتا پریتم کے لاہور میں گزرے محبت بھرے دنوں کے بھی عینی شاہد تھے۔اِس امر کا کچھ اظہار انہوں نے 14 ستمبر2010 کو ریڈیو ایف ایم 103 لاہور کے ایک پروگرام میں کیا تھا۔ یہ پروگرام ساحر لدھیانوی کے فن وزندگی سے متعلق تھا۔

شعراء میں وہ علامہ اقبال، مرزا غالب ، سیماب اکبر آبادی، سیف الدین سیف اور عبدالحمید عدم کے پرستار تھے۔ اپنی گفتگو میں وہ علامہ صاحب اور غالب کے اردو اور فارسی کے لاتعداد شعروں کو بکثرت استعمال کرتے تھے۔ قریباً سبھی اکابرین کی تخلیقات کے اقتباسات اور بالخصوص اُن کی نجی زندگیوں کے متعلق نایاب تحقیق اُن کی باتوں کو تقویت بخشتی تھی۔وہ فنِ صحافت میں مولانا ظفر علی خان اور مولانا چراغ حسن حسرت کے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غالباً چراغ حسن حسرت کا ایک شعر وہ کبھی کبھی خاص رومانی موڈ میں پڑھا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ کیا سادہ لفظوں میں انہوں نے انسانی جمالیات کو سمیٹ لیا ہے۔

زلف کی ، رخسار کی باتیں کریں
آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں

ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں وہ بغیر ویزہ، بارڈر کے لوگوں سے " مِل ملا " کے بمبئی میں موسیقار مدن موہن کے گھر مہمان کی حیثیت سے گئے۔ مدن موہن کے اسسٹنٹ بپن بابل (سید مرغوب صدیقی) اُن کے برادر نسبتی تھے۔ بابل کے متعلق وہ بتایا کرتے تھے کہ وہ مدن موہن کے کلاس فیلو رہے تھے میوزک سے لگاؤ دونوں کی گہری دوستی کا سبب بنا۔ بابل اُن دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے ۔ ایک دن وہ اپنے کمرے میں ہار مونیم بجا رہے تھے کہ اُن کے والد اندر آئے۔ بہت غصے میں تھے۔ کہنے لگے۔ "اِن بے ہودہ کاموں کو چھوڑ دو یا ابھی اِس گھر کو چھوڑ دو۔" بابل نے اُسی لمحے گھر چھوڑ دیا اور اپنے دوست مدن موہن کے پاس لکھنو چلے گئے جو وہاں ریڈیو اسٹیشن میں ملازم تھے۔ وہ ساری عمر مدن موہن کو اسسٹ کرتے رہے۔ 1975 میں مدن کی موت کے بعد پاکستان آئے۔ ایک پاکستانی فلم بھی سائن کی لیکن کام مکمل ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہندوستان میں بابل نے آزاد حیثیت میں بھی کچھ فلموں سلامِ محبت۔ 24 گھنٹے ۔ بس کنڈکٹر اور بادل اور بجلی " وغیرہ میں موسیقی دی اور اُن " کے چند گیت کافی مقبول ہوئے۔ بہر حال مدن کے گھر آفتاب صاحب کی ملاقات آشا بھونسلے سے بھی ہوئی جو ریکارڈنگ کے سلسلے میں آئی تھیں کیونکہ مدن موہن نے ریکارڈنگ سٹوڈیو گھر میں ہی بنا رکھا تھا۔ شام ڈھلتے ہی مدن موہن کے گھر مختلف فنکار جمع ہو جاتے تھے۔ اُن میں راجہ مہدی علی خان، او پی نیر، جے دیو

اور راجندر کرشن وغیرہ نمایاں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دن مدن ،آشااور میں تینوں کمرے میں بیٹھے تھے۔ مدن موہن آشا سے کہنے لگے۔

"آشا بائی! ٹھیک ہے تیری بہن لتا بھی خوب گاتی ہے لیکن تیرا تو جواب ہی نہیں ہے۔ "

آپ تو بس یونہی بناتے ہیں۔" آشا نے انکساری سے کہا۔ "

بناتا نہیں۔ سچ کہتا ہوں۔" مدن موہن نے اُسی سچائی سے جواب دیا۔ "

آفتاب صاحب آشا بھونسلے کے بہت بڑے مداح تھے اور اُن کے گیتوں پر جھوم جھوم جاتے تھے۔ ہم انٹرویوز کے لئے انڈیا جانے لگے تو انہوں نے مختلف مشاہیر سے کئے جانے والے سوالات کی ایک بڑی فہرست ہمیں تھما دی کہ آپ اپنے سوالات کے علاوہ یہ سوال بھی ضرور کریں۔ان سوالوں کو دیکھ کر نوشاد صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ مجھ سے زیادہ تو آفتاب صاحب میرے بارے میں جانتے ہیں۔ بہر حال اُن سے پوچھا گیا کہ لتا اور آشا میں سے کون بہتر سنگر ہے۔نوشاد صاحب پہلے تو ٹال مٹول کرتے رہے لیکن ہمارے اصرار پہ رائے دینے پر مجبور ہو گئے۔ کہنے لگے۔" لتا نے شروع سے خود پر سنجیدہ موڈ طاری کیا ہوا ہے۔ وہ اُس سے نکل نہیں پائیں جبکہ آشا کے پاس ورائٹی ہے وہ ہر طرح کے گیت آسانی سے گا لیتی ہیں۔" آفتاب صاحب کی آشا کے بارے میں جو رائے تھی اُس پر مہرِ تصدیق ثبت ہو گئی اور وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس بات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ وہ

بالخصوص آشا کے دو گیت " شوخ نظر کی بجلیاں دل پہ میرے گرائے جا۔" اور "آیئے مہرباں " ترنگ میں آ کر گایا کرتے تھے۔ شمشاد بیگم کی گائیکی بھی انہیں پسند تھی۔اُن کا ایک گیت "میرے پیا گئے رنگون" وہ بار بار سنا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ شمشاد نے اِس گیت کے شروع میں لفظ "پیا" جس شوخی و طراری سے ادا کیا ہے وہ کسی اور سنگر کے بس کی بات نہیں ہے۔ شمشاد بیگم نے اپنی زندگی میں صرف ایک ٹی وی انٹرویو دیا ہے۔ اتفاق سے وہ میرے پاس موجود تھا۔ وہ متعدد بار بڑے ذوق و شوق سے یہ انٹرویو دیکھ چکے تھے۔ وہ کے ایل سہگل کے گیتوں کے دیوانے تھے۔ نوشاد صاحب نے جب سہگل کے بارے میں کہا۔ " اُس جیسا کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔" تو وہ عش عش کر اٹھے تھے۔ جالندھر میں 18 جنوری 1947 کو سہگل کی ارتھی کو جاتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بتاتے تھے کہ اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بیل گاڑی پر سپیکر نصب تھے۔ اور اُن کے گائے گئے ایک گیت "جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں گے" کو بار بار بجایا جا رہا تھا کیونکہ یہ سہگل کی وصیت تھی ۔
۔۔ محمد رفیع کی گائیکی کے بارے میں آفتاب صاحب کہتے تھے کہ آج اگر تان سین کہیں سے آ جائے تو محمد رفیع کے گیت سن کر شرم سے دریا میں ڈوب مرے۔ اُن کی باتوں میں شدت پسندی کا رجحان نمایاں ہوتا تھا۔ شدت پسندی کے اظہار کے لئے وہ پنجابی زبان کی مرصع گالیوں کا استعمال کرتے تھے ان کی شدت پسند طبع شاید اسی طرح تسکین پاتی تھی۔ بتاتے تھے کہ یہ عادت انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہے۔ شدت

پسند مزاج کے اظہار کے لئے وہ "داغ" کے اس مصرعہ " جلاکے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں" کو اِس ترمیم کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔" جلاکے بھسم نہ کردوں تو داغ نام نہیں"۔

خان صاحب شاعری میں بھی طبع آزمائی کرلیتے تھے۔ میں نے ان کی چند تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے۔ اُن کی غزلوں اور نظموں پہ مشتمل شاعرانہ کاوشوں کے علاوہ نایاب کتب، صدیوں پرانے کرنسی سکے، غیر دستیاب فلمی و غیر فلمی گانوں کے البم، پرانی فلمیں، اختر شیرانی کی دستخط شدہ تصویر اور جانے کیا کچھ اُن کے اثاثہ میں محفوظ پڑا ہوگا۔ کتاب "ملاقاتوں کے بعد" کے دیباچہ "دیباچہ نہیں الف لیلیٰ" میں اُن کی ہشت پہلو شخصیت کا" اظہار موجود ہے۔

بمبئی قیام کے اُن دنوں سے پہلے اور بعد میں بھی انہوں نے فلمی طرز کے کچھ گیت لکھے ۔ یہ گیت بذریعہ ڈاک وہ مدن موہن کو بھجوادیتے تھے۔ اُن کا لکھا ہوا ایک گیت محمد رفیع اور گیتا دت نے گایا تھا جو فلم "آگرہ روڈ" سے ہے۔ گیت کے بول تھے۔" دنیا کی نظر ہے بری ،زلفیں نہ سنوارا کرو۔" مدن موہن نے وہ گیت فلمی شاعر پریم دھون کو تھما دیا اور وہ اسے متذکرہ بالا فلم میں لے آئے۔

کتاب "ملاقاتوں کے بعد" کے دیباچہ میں انہوں نے مدھو بالا کو کائناتِ عکس و آہنگ کی حسین ترین عورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ قدرت کو اپنے تخلیق کردہ حسین چہرے پر کوئی شکن گوارہ نہیں تھی اس لئے عین شباب میں اسے واپس بلا لیا۔ انہوں نے ہم دوستوں کو بتایا تھا کہ وہ مدھو بالا کو زندگی میں صرف ایک بار دیکھ سکے ہیں وہ بھی کچھ فاصلے سے۔ بمبئی قیام کے انہی دنوں میں انہوں نے 'پیڈر روڈ' کی دوسری جانب مدھو بالا کو ایک گاڑی کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس تھیں اور اُن کے لفظوں "زمین کا وہ ٹکڑا شفاف نور میں ڈھلا ہوا تھا۔" مدھو بالا نے اپنے ڈرائیور سے کوئی بات کی اور پھر پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئیں یوں وہ فوراً ہی اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ وہ یہ بات اور اِس طرح کی دوسری باتیں متعدد بار بتا چکے تھے لیکن ہر بار اُن کے اظہار میں تازگی ہوتی تھی۔۔۔ آفتاب صاحب کافی سالوں سے مدھو بالا کے برتھ سرٹیفیکیٹ کی تلاش میں سرگرداں تھے اور متعدد بار لاہور کارپوریشن کے چکر لگا چکے تھے۔ مجھے علم نہیں وہ کامیاب ہوئے کہ نہیں، البتہ وہ نورجہاں کا برتھ سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئے تھے۔ اِن باتوں سے اُن کا فنکاروں کے ساتھ گہری وابستگی کا پتا چلتا ہے۔ ایک بار ہم ممبئی کے " سانتا کروز" قبرستان سے مدھو بالا کی قبر کی کچھ مٹی لے آئے۔ ایک شب چنیوٹ بازار میں دوستوں کی محفل جمی تھی۔
آفتاب صاحب کے آتے ہی میں نے انہیں مٹی کی وہ پڑیا پیش کی۔ انہوں نے پڑیا کھولی۔
چند لمحے محبت

اور حسرت سے اُسے دیکھتے رہے۔ ایک آہ بھری۔ تھوڑی سی مٹی ہتھیلی پر رکھی ۔منہ میں ڈالی اور پھرپانی پی لیا۔اِس عمل کے بعد اُن کی ذہنی بشاشت سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی حیات آفریں دوا کھالی ہو۔کچھ دوست حیران تھے لیکن ریاض مجید کی حیرانی دیدنی تھی۔ریاض مجید متعدد محفلوں میں اُن کی اِس 'حرکت' کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ خان صاحب بتاتے تھے کہ وہ مدھو بالا کو پہلے بس ایک ایکٹریس کے طور پر لیتے تھے لیکن جب اُن کی موت واقع ہوئی تو انہیں ایک جھٹکا لگا کہ اس طرح کی خوبصورتی بھی مر سکتی ہے؟ منٹو کے ایک کردار کی طرح، جس میں ایک ماں فسادات میں کھوئی اپنی بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ منٹوایک دن اُسے بتاتے ہیں "تمہاری بیٹی مر چکی ہے۔"ماں بے یقینی سے کہتی ہے۔ "نہیں، وہ اتنی خوبصورت ہے، مر نہیں سکتی۔" آفتاب صاحب بتاتے تھے ۔مدھوبالا کی موت کے بعد مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ رنج وملال کی کیفیت میں کتنے ہی دن میں بھوکااور پیاسا رہااور قدرت اللہ شہاب کے افسانہ "چندراوتی" کا اختتامیہ مجھے اپنے آپ پہ منطبق لگا،یعنی مدھوبالا سے مجھے اُس وقت محبت ہوئی جب اسے مرے ہوئے تیسرا دن تھا۔

افسانہ" چندراوتی "اُن کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ وہ اس افسانے کو فلمبند کرنا چاہتے تھے۔۔بڑے سرگرم دکھائی دیتے تھے اُن دنوں ۔ ہماری نشستوں میں اب زیادہ تر ،اِسی موضوع پر بات ہونے لگی تھی۔ منظر نامے پر بات ہوتی

مکالمے بولے جاتے۔ اس بات پہ غور و خوض جاری رہتا کہ اس منصوبے کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لاہور میں فلم ڈائریکٹر اسلم ڈار سے بھی ملاقات کی۔ اسلم ڈار کو آئیڈیا پسند آیا لیکن ۔۔۔۔ فلم نہیں بن سکی۔ ان کی چند دیگر خواہشوں میں "چندراوتی" بنانے کی یہ خواہش بھی شامل تھی لیکن تشنہ کام رہی۔ انہوں نے چندراواتی کا برتھ سرٹیفیکٹ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جانے وہ کامیاب ہوئے یا نہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے اُن کمروں میں خاص طور پر گئے جہاں چندراوتی پڑھتی تھی۔ وہ ایمن آباد میں واقع چندراوتی کے گھر بھی گئے۔ گھر کے باہر لگے نلکے سے پانی پی کر انہیں فرحت انگیز احساس ہوا، جس کا وہ اظہار کرتے تھے۔ وہاں کے لوگوں سے کچھ معلومات بھی حاصل کیں۔ بتاتے تھے کہ امتدادِ زمانہ ایمن آباد کو زیادہ بدل نہیں پایا۔

بمبئ قیام کے دنوں میں انہوں نے دلیپ کمار سے ملنے کی بھی جستجو کی۔ وہ دلیپ کے گھر پہنچے۔ پتا چلا وہ کسی شوٹنگ کے سلسلہ میں بمبئ سے باہر ہیں۔ نوشاد صاحب سے ملنے کا ارمان بھی شدید تھا لیکن کسی وجہ سے وہ بھی نہ مل سکے۔ دلیپ کمار اور نوشاد سے نہ مل سکنے کا انہیں ساری زندگی قلق رہا۔ میں نے ایک بار پوچھا۔ " دلیپ کمار کے علاوہ آپ کو کس ہیرو نے متاثر کیا ہے؟" کہنے لگے۔ " سچ پوچھو! دلیپ کمار سے باہر کسی کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اداکاری سے ہٹ کر اس کی شکل و صورت سے مماثل بھی کوئی شخص میں نے روئے

زمین پر نہیں دیکھا۔" وہ بے جا حمایت کے بھی قائل نہیں تھے۔اُن دنوں فیصل آباد کے اقبال سٹیڈیم میں پاکستان اور انڈیا کے مابین کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ آئیوی آرٹ کلب کی ایک ذیلی تنظیم " دیوداس گروپ " بھی ہے۔ جو دلیپ کمار کی شہرہ آفاق فلم دیواس حوالے سے ہم نے قائم کی ہے۔ خیر حمید شاکر نے مجھے بتایا کہ میں نے دیوداس گروپ کے بارے میں بات کی تھی ۔اس سلسلے میں "زی ٹی وی" والے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شام کو " پرائم ہوٹل "میں اُن کے ساتھ پروگرام طے ہے۔ میں ، آفتاب صاحب، میاں بشیر اعجاز، کامران رشید اور دوسرے احباب پرائم ہوٹل پہنچے۔ زی ٹی وی کا کیمرہ آن ہوا۔ ان کا مجھ سے پہلا سوال ہی کافی تیز تھا کہ پاکستان جیسے گھٹے ہوئے ملک میں آپ کس طرح اس گروپ کو چلارہے ہیں کہ جس میں ہیرو ہر وقت شراب کے نشہ میں دھت رہتا ہے۔۔۔ میں نے کوشش کرکے کسی حد تک موثر جواب دیا۔ کیمرہ آفتاب صاحب پر اوپن ہوا۔

آپ کو دیوداس میں کیا سب سے بہتر لگا۔" زی کے نمائندے نے پوچھا۔ "

میں منافقت نہیں کرسکتا۔" آفتاب صاحب دھیمے لہجے میں بولے۔" مجھے دلیپ کمار " والی نہیں سہگل والی دیوداس پسند ہے۔" ہمارے چہروں پر ناگواری ابھری ۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ سہگل کی دیوداس کو پسند کرتے ہیں اور یہیں راستے میں انہیں سمجھاتا آیا تھا کہ آپ دلیپ کمار کی دیوداس پر کوئی توصیفی بات کردیں لیکن

دلیپ کمار کو پسند کرنے کے باوجود وہ کیمرے کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکے۔ جھوٹ کچھ لوگوں کی سرشت میں نہیں ہوتا وہ بھی شاید اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ (دلیپ (کمار پر ہم نے آفتاب صاحب کے ساتھ مل کر چار گھنٹوں پہ محیط ایک پروگرام کیا تھا وہ روئے زمیں پر شاید موسیقار نوشاد کے سب سے بڑے پرستار تھے۔ نوشاد کی منتخب دھنوں پر وہ جھوم جھوم جاتے تھے۔ وہ اس قدر بے خود ہو جاتے تھے کہ انہیں پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں اور اُس ماحول میں اِس طرح کی وارفتگی کی اجازت ہے بھی یا نہیں۔ نوشاد صاحب نے بھی اپنے انٹرویو میں آفتاب صاحب کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُن جیسے موسیقی سے محبت کرنے والوں کے دم سے ہمارے اندر کام کرنے کی لگن موجود رہتی ہے۔ نوشاد صاحب کا فلم " شاردا" کا گیت " تم نہیں آتے ہو، نہیں آؤ، یاد سے کہہ دو، وہ بھی نہ آئے۔" وہ اکثر گا کر سنایا کرتے تھے۔ وہ دوسرے بھی کئی گیت بھی گایا کرتے تھے ۔ کبھی جب بہت اچھے موڈ میں ہوتے تو ردھم کے ساتھ میز بھی بجایا کرتے تھے۔

گلوکارہ سریندر کور اُن کی پسندیدہ سنگر تھیں۔ ان کی پسندیدگی کی وجہ سریندر کور کے اردو گانے تھے۔ جب انہوں نے پہلی بار اس امر کا اظہار کیا تو ہمیں

کافی حیرت ہوئی کیونکہ ہم سریندر کو محض پنجابی سنگر کے طور پر جانتے تھے۔ جب ہم نے سریندر کور کے اردو گیت سنے تو ہمیں اپنی کوتاہ نظری کا شدید احساس ہوا۔ باکمال اردو گیت تھے سریندر کور کے۔۔۔ سریندر کور کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک پروگرام شاہد ندیم (سیکریٹری جنرل آئیوی آرٹ کلب) کے گھر طے پایا۔ ہم دوست وہاں اکٹھے ہوگئے۔ آفتاب صاحب کے انتظار میں ہم گلی میں کھڑے تھے کہ دور سے وہ سائیکل پر آتے دکھائی دیئے۔ سائیکل اُن کو زندگی کی اس مشکل دوڑ میں بھگائے پھرتا تھا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے ٹانگوں کے درد کی وجہ سے ان کا بہترین دوست بچھڑ گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں اس ساتھی کے جدا ہونے سے وہ آدھے سے زیادہ مر گئے تھے۔ اُن محافل سے کٹ گئے تھے جو ان کے مخصوص مزاج کو آکسیجن فراہم کرتی تھیں۔ خیر ! آفتاب صاحب آسمانی رنگ کے شلوار سوٹ میں تھے۔ آنکھوں کو رے بین کی خوبصورت عینک نے ڈھانپ رکھا تھا۔ پاس آکر رکے۔ چہرے پر شادمانی کا تاثر، وہ کچھ گنگنا رہے تھے۔ان کے آجانے پر ہم گھر میں داخل ہونے کے لئے دروازے کی طرف بڑھے تو انہوں نے کہا۔ " نہیں رکو۔ " اُن کی آواز میں ایک خاص حکمیہ طرز کا دبدبہ ہوتا تھا۔ ہم فوراً رک گئے۔ان کے چہرے پر خوشگواریت پھر سے عود کر آئی اور وہ ہمیں اپنی ذہنی کیفیت میں شامل کرنے کے لئے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے گانے لگے۔ " اساں گندھائیاں مینڈھیاں تُو کسے بہانے ویکھ بھلا۔" گیت ختم ہوتے ہی بولے۔ "میں سارا رستہ یہی گاتا آیا ہوں۔ " سریندر کور کے پروگرام میں انہوں نے اردو

زبان میں گفتگو کی۔اختتام پر میں نے کہا۔" سریندر کور پنجابی ہیں۔آپ پنجابی زبان میں بات کر لیتے۔" کہنے لگے۔" میرا لہجہ کرخت ہے۔ پنجابی میں بات کرتے وقت زیادہ کرخت لگتا ہے اس لئے میں ایسے موقعوں پر اردو زبان کا سہارا لیتا ہوں۔ جس سے کرختگی کسی حد تک کم ہو جاتی ہے۔" سریندر کور کے حوالے سے مرتب شدہ وہ پروگرام غالباً ریاض مجید کے پاس محفوظ ہے۔

صاف اور کھری بات منہ پہ کہنے کے عادی تھے۔ایک بار امجد اسلام امجد فیصل آباد آئے۔ میں ان سے اپنی کتاب "ملاقاتوں کے بعد" کے دیباچہ کے سلسلے میں ملنا چاہتا تھا۔فون پہ انہوں نے بتایا کہ وہ فیصل آباد یونیورسٹی اور ایم ٹیکس کے پروگرامز میں مدعو ہیں۔آپ شام کے بعد سیرینا ہوٹل کے فلاں کمرے میں آ جائیں۔ مغرب کے بعد میں اور آفتاب صاحب سیرینا جا پہنچے۔امجد صاحب سے مختلف موضوعات پر بات چیت شروع ہو گئی۔بات اُن فنکاروں کی ہونے لگی جو دوسرے ممالک میں جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ امجد اسلام امجد بتانے لگے کہ عدنان سمیع نے پچھلے دنوں برطانیہ میں شو کیا۔اس نے پروگرام کے اتنے پونڈز طلب کئے یعنی ایک خطیر رقم وصول کی۔یہ کہتے ہوئے امجد صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مرعوبیت نظر آئی۔یہ سنتے ہی آفتاب صاحب اپنے مخصوص دبنگ لہجے میں بولے۔

امجد صاحب ! آپ اپنے شعبہ میں بلند مرتبے پر فائز ہیں۔آپ کو اس طرح کی "

"باتیں زیب نہیں دیتیں۔

تاریخی عمارتوں اور نوادرات سے انہیں دلی انس تھا۔تاریخی اثاثے کی بربادی کا بہت دکھ اور کرب سے ذکر کیا کرتے تھے کہ اِن مشرف بہ اسلام لوگوں نے فلاں تاریخی عمارت گرادی۔ فلاں عمارت خستہ حالی کا شکار ہے وغیرہ۔ ایک بار مجھ سے ملنے آئے تو ان کے پاس ایک تھیلا تھا۔ کوئی وزنی چیز لگ رہی تھی اُس میں۔ کھولا تو اس میں مندر کی ایک بڑی سی گھنٹی تھی۔ کہنے لگے۔" یہ گھنٹی میں نے گزشتہ 55 سال سے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ 1947 میں یہ گھنٹی میں نے لاہور کے ایک بڑے مندر سے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اتاری تھی۔ کیونکہ اُس برباد مندر میں ایک سانپ کا بسیرا تھا۔ مندر کا نام بھی انہوں نے بتایا تھا لیکن میں اِس وقت بھول رہا ہوں۔ پھر بولے۔"" آپ لوگ انڈیا جاتے رہتے ہیں۔ میری خواہش ہے جہاں کی یہ چیز ہے وہاں پہنچ جائے۔ آپ یہ گھنٹی وہاں کسی مندر کو دے دیں۔" وہ گھنٹی اب میرے پاس محفوظ پڑی ہے۔ زیادہ وزنی ہونے اور سیکیورٹی معاملات کی وجہ سے میں اُن کی خواہش پوری نہیں کرسکا۔

لاہور شہر ان کے رگ وپے میں سرایت کرتا تھا۔ اس شہر کے گلی کوچوں کا ذکر ہوتے ہی وہ عجیب سی کیفیت میں کھوئے آہیں بھرا کرتے تھے شاید وہ شہر اُن کی

کئی ایک سہانی یادوں کا مدفن تھا۔ کہتے تھے۔ "اگر آپ نے قیام پاکستان سے پہلے کا لاہور دیکھنا ہے تو 1940 میں بنی فلم" داسی" دیکھیں۔" وہ ارشد چودھری سے یہ فلم بھی لے کر آئے اور کہا کہ اپنے کمپیوٹر میں کاپی کر لیں۔ ایک بار اُن کے ساتھ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے امرتا پریتم، باری علیگ، منٹو اور دیگر مشاہیر کے گھر اور تاریخی حوالے سے معتبر کئی مقامات دکھائے۔۔۔ آخری عمر تک اُن کا ایک خاص معمول رہا۔ وہ دیال سنگھ کالج سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بس سٹاپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ بس سٹاپ والی سڑک کا نام بھی مجھے اب یاد نہیں آ رہا۔ لاہور تو جاتے ہی رہتے تھے حتیٰ کہ سیالکوٹ سے فیصل آباد کے لئے روانہ ہوتے تو اپنے اس معمول کا پورا کرنے کے لئے 100 سے زائد کلو میٹر کا اضافی سفر طے کر کے لاہور پہنچتے۔ جاتے ہی وہ اُس بس سٹاپ کی طرف روانہ ہو جاتے۔ پندرہ بیس منٹ اس بس سٹاپ پر گم صم کھڑے رہتے۔ کمال معصومیت سے بتاتے تھے۔ "زمانہ طالبعلمی میں، میں اس بس سٹاپ سے کالج کی بس پکڑا کرتا تھا۔ کچھ فاصلے پر وہ کھڑی ہوتی تھی۔ نظریں جھکائے۔ نظر ملتی تو دانستہ چرا لیتی۔ میں موقع پا کر بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ شرما کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔" یہ مصرعہ ادا کر کے انہوں نے پر فغاں آہ بھری۔" وہ چہچہاتی بلبلیں جانے گئیں کہاں۔ وہ زمانہ رخصت ہوا۔ کئی اور زمانے گزر گئے۔ میں اب بھی وہاں جاتا ہوں اور بچھڑی ہوئی اُسی فضا کو محسوس کرنے کے لئے بس سٹاپ پر کھڑا رہتا ہوں۔" وہ قریباً ساٹھ برس تک اِس رسمِ دلبری کو

نبھاتے رہے۔

وہ جب بھی کوئی اچھا گیت سنتے۔ مشاہیر کی کوئی اچھی بات ذہن میں آتی یا ماضی کی کسی یاد میں کھوئے ہوتے تو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اختتامی لمحوں میں کچھ ایسے انداز سے آہ بھرتے کہ وہ "آہ" ان کے دل کے سرد خانوں سے نکل کر فضا کو سوگوار کر دیتی۔ ایسے میں جانے کیوں مجھے علم کے بوجھ تلے دبے بڑے بڑے نام ان کی سچی اور کھری محض ایک "آہ" کے مقابل ماند نظر آتے۔اپنی اس بات کا اظہار میں کچھ دوستوں سے پہلے بھی کر چکا ہوں۔

مشاہیر کے انٹرویوز پر مبنی کتاب "ملاقاتوں کے بعد" کا دیباچہ لکھنے کا مرحلہ آیا تو میں نے کہا۔" دو میں سے ایک دیباچہ آپ لکھ دیں۔" میری بات مان لیتے تھے۔ دراصل اُن کو سمجھنے کے لئے ایک خاص طرز کی مہارت درکار تھی اور میں شاید اس سے آشنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان سے دس بارہ سال کی ملاقات میں ہمارے بیچ ایک بھی تلخ جملے کا تبادلہ نہیں ہوا۔ خیر حسبِ امید دیباچہ لکھنے پر راضی ہو گئے۔ بہترین پیپرز کثیر تعداد میں منگوائے گئے۔ لکھنے کے لئے اعلیٰ طرز کا قلم خریدا گیا۔وہ کچھ بھی لکھنے کے لئے اچھے کاغذ اور قلم کے قائل تھے۔ طویل دیباچہ انہوں نے قریباً تین ماہ میں میرے پاس بیٹھ کر ہی مکمل کیا کیونکہ ایک نشست میں ایک ڈیڑھ صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ بہت

کم ایسا ہوا کہ وہ گھر سے کچھ لکھ کر لائے ہوں۔ کتاب چھپ کر آئی تو مسرت سے کہنے لگے کہ آپ کو نہیں پتا، آپ نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ اشاعت کے کچھ عرصہ بعد ہی مجھ سے کہنے لگے۔ " جب اس کتاب کا نیا ایڈیشن آئے تو دیباچے میں سے فلاں فلاں پیراگراف حذف کر لینا۔ مجھ سے نجانے کس ترنگ میں تحریر ہو گئے ہیں۔ " میں نے "کہا۔ "جی ضرور!۔

کچھ لوگ محافل میں صرف اس لئے شرکت کرتے ہیں کہ وہ ان محافل کا حسن برباد کر کے رکھ دیں۔ محفل کے مزاج اور موڈ کو سمجھے بغیر غیر متعلق باتیں کر کے وہ نادانستگی میں کیا ظلم کر جاتے ہیں انہیں پتا نہیں ہوتا۔ کیفے دیوان کی نشستوں کے دنوں میں ایک رات ہم حسبِ معمول چھت پر بیٹھے تھے کہ دور سے ایک ایسا ہی" دوست" آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی یہ مصرعہ کہا۔ "تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا۔" آفتاب صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے۔ "بڑا بر محل کہا ہے۔" پھر کہنے لگے۔ دیوانِ غالب کے پرانے نسخوں میں مرگ کے بجائے لفظ" موت " لکھا ہوا ہے۔ کسی کی بھی تصحیح کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ مجھے جب اس طرز کی مدد درکار ہوتی تو میں ان سے رجوع کرتا تھا۔ شاید میں نے کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھا جتنا میں نے ان کے ساتھ ہونے والی نشستوں میں پایا ہے۔ بہت سے دوست اپنی تخلیقات کے حوالے سے ان سے اکتسابِ فیض کرتے رہے ہیں۔ لائل پور کہانی کے عنوان سے چھپنے والی دونوں کتابوں میں ان کا

بھرپور حصہ شامل ہے۔

ہماری نشستیں کچھ عرصہ ناظم آباد کے بوہڑ چوک میں بھی ہوتی رہی ہیں۔اُن دنوں آفتاب صاحب، حمید شاکر سے کسی بات پر خفا تھے۔ ہم وہاں بیٹھے تھے کہ حمید شاکر بھی آگئے اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگے۔آپ ہماری صلح کرا دیں۔ میں نے کہا۔ کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔"میں نے حمید شاکر کو وہیں چھوڑا اور آفتاب صاحب کے" پاس آکر کہا۔" آپ شاکر صاحب سے صلح کر لیں۔ وہ صرف اسی غرض سے اپنا کام چھوڑ کر آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے جو بھی غلطی ہوئی ہے اس کی آفتاب "صاحب سے معافی مانگ لیتا ہوں۔

نہ کبھی کسی سے معافی مانگی ہے اور نہ کبھی دی ہے۔" حسبِ توقع ان کی آواز رعب " دار تھی۔ اس بھاری بھر کم جملے نے میری امید کو ختم کر دیا اور میں خاموش ہو گیا۔ میں نے حمید شاکر کو جو کچھ فاصلے پر موجود تھے، پاس بلا لیا۔ جانے کیوں کچھ دیر بعد میں نے پھر کہا۔" خان صاحب ! جانے دیں۔" وہ بولے۔" اِس سے پوچھو ! یہ پہلے ایسی غلطیاں کیوں کرتا ہے۔" مجھے لگا اب بات بن جائے گی۔ خیر میں اُن کے بیچ صلح کرانے میں کامیاب ہوگیا اور دوسرے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد دیکھا۔ آفتاب صاحب اور حمید شاکر ہمیں بھول کر کسی بات پر ہنستے ہوئے بے تکلف گفتگو میں مصروف ہیں۔

معروف تو ایک طرف وہ کم معروف بندوں کے بھی حسب نسب، اور ذات برادری وغیرہ سے کمال درجہ کی آگہی رکھتے تھے۔ نئے ملنے والے سے ابتدائی تعارف کے بعد بتا دیتے کہ آپ کے آباء کا تعلق کس علاقہ سے ہے۔ شروع میں آپ کا قبیلہ کہاں آباد تھا اور اب پاکستان میں آپ کی برادری کن کن علاقوں میں مقیم ہے۔ یوں آنے والا شخص اپنے بارے میں نئی معلومات جان کر حیرت میں ڈوبا رخصت ہوتا۔ شوبز سے متعلق لوگوں کے بارے میں تو وہ کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ مثلاً امیتابھ بچن کی ماں کچہری بازار فیصل آباد کی کس گلی اور کس مکان میں رہتی تھیں۔ موسیقار روی فلم لائن میں آنے سے پہلے کیا کام کرتے تھے۔ ساحر لدھیانوی کی بہن فیصل آباد کے کس گاؤں میں بیاہی گئی ہیں۔ او پی نیر شروع میں ایک سازندے کے طور پر لاہور کے کس ہوٹل میں ملازمت کرتے تھے۔ امروز فیصل آباد کی کس دکان میں پینٹنگ کا کام کیا کرتے تھے۔ اس طرز کی ہزار ہا باتیں۔۔۔ اور تو اور انہوں نے ہمارے محلّہ ہرچرن پورہ نمبر 1 سے ہی ایک ایسے موسیقار کو برآمد کر لیا جس نے انڈین فلم انڈسٹری کو بہت اچھے گانے دیئے۔ کہتے تھے کہ آپ کے محلّہ کی گلی نمبر 4 میں وہ رہتے تھے۔ کچھ سال پہلے تک سیمنٹ کی دیوار میں کندہ اُن کی نیم پلیٹ موجود تھی۔ میں نے اس گلی میں رہائش پذیر اپنے شاعر دوست نعیم احمد سے پتا کیا تو انہوں نے بتایا کہ اتفاق سے ہم اُسی گھر میں رہ رہے ہیں۔ وہ موسیقار، ہنس راج بہل تھے، جن کا ایک گیت

انڈین فلم انڈسٹری کے ٹاپ ٹوئنٹی میں شامل ہے۔ فلم" ملن "سے لتا کا گایا گیت تھا۔
"ہائے جیا روئے۔"
بچپن کے واقعات وہ بڑے اشتیاق اور جذبے سے سنایا کرتے تھے۔کہتے تھے۔قدرتی طور پر میری آواز اچھی تھی۔ہندو عورتیں مجھے اپنے گھر بلا لیتیں اور مجھ سے بھجن سنا کرتی تھیں۔ واپسی پر وہ مجھے پیسہ دو پیسہ تھما دیتیں یوں کافی پیسے جمع ہو جاتے تھے اور کبھی ساتھ میں مٹھائی اور بتاشے وغیرہ بھی دے دیتی تھیں۔جب گھر لوٹتا تو والدہ کو پتا نہیں کیسے پتا چل جاتا اور وہ ڈانٹنے لگ جاتیں۔
"کافرا۔ اَج فیر گا کے آیا ایں؟"
بتاتے تھے کہ بہتر زندگی گزارنے کے لئے ایک رہنما بات میں نے ایک سکھ سے سیکھی ہے۔ ہم کچھ حیران ہوئے کیونکہ سکھوں سے ایسی توقع عبث لگتی ہے۔کہنے لگے۔" بچپن میں جب مجھے سائیکل سیکھنے کا شوق پیدا ہوا تو میں کرائے کا سائیکل لے کر لدھیانہ کے پل جگراواں "پر چلا جاتا۔پل سے اُترائی میں جاتی سائیکل یوں لگتی جیسے میں دنیا کی سب سے اچھی سواری کا لطف لے رہا ہوں۔ ایک دن میں جگراواں پل پر سائیکل کی گدی پر ساکت حالت میں بیٹھا تھا کہ ایک سکھ کا وہاں سے گزر ہوا۔

کاکا ایتھے کیوں کھڑاں؟" سکھ نے پوچھا۔ "

"او جی! سامنے گائیاں نیں۔ لنگ لین تے فیر میں سائیکل چلاناں۔ "

"او چھڈ توں گائیاں نوں۔ پیڈل توں پیر چکٹ لے۔ رستہ آپی لبھ جائے گا۔ "

بچپن کے ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے تھے۔ سکول کے زمانہ ان کے ایک ہندو استاد چرن داس ہوا کرتے تھے۔ کسی بات پہ ایک دن ماسٹر صاحب نے میری پٹائی کردی اس قدر ڈنڈے مارے کہ میری قوت برداشت ختم ہو گئی۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا۔ میں نے شدید تکلیف کے عالم میں ماسٹر صاحب سے ڈنڈا چھینا۔ جواباً ان کے جسم پر دو تین ڈنڈے برسائے اور پھر خوف کے عالم یں وہاں سے بھاگ گیا۔ جماعت کے لڑکے میرے پیچھے بھاگے لیکن میں صحت کے لحاظ سے بہتر تھا۔ ویسے بھی جان بچانے والے کو ایسی حالت میں ایک اضافی طاقت عطا ہو جاتی ہے۔ بھاگتا بھاگتا اُن کی حدود سے باہر آگیا۔ میں ڈر کے مارے گھر بھی نہیں گیا کیوں کہ ماسٹر صاحب ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ اُن کی شکایت پر میرے ساتھ جو سلوک ہونا تھا، مجھے اُس کا اندازہ تھا۔ بغیر ٹکٹ کے سیدھا جالندھر اپنے دودھیال پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے اطلاع بھجوادی کہ آپ چاہے مجھے جان سے ماردیں۔ میں نے اب اُس سکول میں نہیں پڑھنا۔ میں جالندھر میں پڑھنے لگا۔ چھ ماہ بعد گھر جانے کو دل بے تاب ہوگیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر آگیا۔

اسٹیشن سے پیدل ہی گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔ گھر کے راستے میں شمشان گھاٹ آتا تھا ۔وہاں کچھ لوگ جمع تھے۔اُن کے قریب جا کھڑا ہوا۔آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ کسی مردے کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ساتھ والے آدمی سے پوچھا۔ "کون مرگیا۔" وہ کہنے لگا۔ "ماسٹر چرن داس پرلوک سدھار گئے ہیں۔"مردے کے سر پر ہتھوڑا مارنے کا مرحلہ آیا۔ ہتھوڑا مارا گیا اور چوٹ پڑتے ہی فضا میں چھوٹی چھوٹی ہڈیاں بکھر گئیں۔ ہڈی کا ایک ٹکڑا بہت بری طرح میرے ٹخنے پر آ کے لگا۔ شدید تکلیف سے دوہرا ہوگیا۔وہ یہ واقعہ سناتے ہوئے بہت ہنسا کرتے اور کہا کرتے۔" ماسٹر چرن داس مر تو گیا لیکن جاتے جاتے مجھ سے اپنا بدلہ لے گیا۔"

علامہ محمد اقبال کی وفات کے وقت وہ آٹھ برس کے تھے۔ بتاتے تھے۔ علامہ صاحب کے دنیا سے چلے جانے کا اُن دنوں اِس قدر چرچا تھا کہ مجھے لگ رہا تھا کسی بہت بڑے انسان کا انتقال ہوگیا ہے ۔ اس کے علاوہ ذہن میں اور کچھ نہیں تھا۔ماضی کے مشہور فلمسٹار دھرمیندر" گورنمنٹ ہائی سکول جگراواں میں اُن کے کلاس فیلو ہوا کرتے تھے۔

آفتاب صاحب ! غالباً ساٹھ کی دہائی ہیں معروف فلم ڈائریکٹر انور کمال پاشا کے اسسٹنٹ بھی رہ چکے تھے۔اس زمانے میں فلم سٹار منور ظریف اورچنگیزی اُن کے

قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ بتایا کرتے تھے کہ منور ظریف کی کرسچین خواہرِ نسبتی "جوائس" کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت انہوں نے محدود مدتی شادی بھی کی تھی۔ مزید یہ بات کیا کرتے تھے کہ چنگیزی فلم شعلہ اور شبنم کا گیت " جیت ہی لیں گے بازی ہم تم۔" اکثر گایا کرتے تھے اور بہت سر میں ہوتے تھے۔ میں نے منور ظریف اور چنگیزی کو نشے سے باز رکھنے کے لئے بہت جتن کئے لیکن انہوں نے نشہ نہیں چھوڑا، زندگی چھوڑ دی۔۔آفتاب صاحب نے انور کمال پاشا کے ساتھ دو فلمیں اسسٹ کیں۔ بتاتے تھے کہ ایک دن پاشا صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے۔" دیکھو آفتاب!۔"انہوں نے انگلیوں سے اپنی قیمتی شرٹ کے کالر کو بانکپن سے ہلایا۔" فلم انڈسٹری میں مجھ جیسے رئیس رہ سکتے ہیں یا پھر بھانڈ اور دَلال۔۔۔ تمہارے جیسے لوگوں کی یہاں پہ کوئی جگہ نہیں ہے۔"پاشا صاحب کی یہ بات میری سمجھ میں آ گئی اور اس دن کے بعد میں نے فلم اسٹوڈیوز کا رخ نہیں کیا۔

غلام حیدر وائیں کا شمار بھی ان کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ وائیں جب وزیرِ اعلیٰ پنجاب بنے تو انہوں نے آفتاب صاحب کو از راہِ محبت ایک پلاٹ کے پیپرز دیئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر پیپرز واپس کردیئے کہ وہ پلاٹ لینے کے لئے تو سیاست میں نہیں آئے۔

کتاب "ملاقاتوں کے بعد" کی اشاعت کے بعد دوسری بے شمار فون کالز کے علاوہ اسلام آباد سے پی ٹی وی کے ایک انجنئیر سید طارق حسین کا فون بھی آیا۔ کہنے لگے۔" آپ نے فیصل آباد جیسے صنعتی شہر میں رہ کر اتنا بڑا کام کیا ہے جو اسلام آباد اور لاہور جیسے بڑے شہروں کے لوگ بھی نہ کرپائے۔ میں نے اپنے تمام حلقہ احباب سے اس بات کا برملا اظہار کیا ہے اور انہیں شرم کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔" خیر توصیفی جملوں کے بعد وہ کہنے لگے۔" آپ سے ملنے کی خواہش ہے۔ بتایئے کب آجاؤں۔" میں نے کہا۔" جب آپ کا دل چاہے۔" وہ کہنے لگے" پھر میں آج ہی آرہا ہوں اپنے ایک اسسٹنٹ کے ساتھ۔ شام چھ بجے اسلام آباد سے روانہ ہوں گا اور رات دس بجے کے قریب آپ سے ملاقات ہوگی۔" میں نے آفتاب صاحب کو اُن کی آمد کے متعلق بتایا۔انہوں نے کہا کہ انہیں" شیبا ریسٹورنٹ اقبال سٹیڈیم میں بلالیں۔" ساڑھے دس کے قریب طارق صاحب آگئے۔ ہم پہلے سے منتظر تھے۔ رسمی دعا سلام کے بعد فوراً ہی فلمی طرز کا موضوع چھڑ گیا۔ کھانے کے بعد ہم بارہ بجے کے قریب اپنے آفس چلے آئے۔ گفتگو شروع ہوگئی اور طارق صاحب کئی سوالوں کے ساتھ میدان میں اتر آئے۔ آفتاب صاحب فلم سے متعلق سوالوں کے جوابات ماضی سے ڈانڈے جوڑتے ہوئے اس قدر وضاحت اور روانی سے دے رہے تھے جس سے تدریجاً طارق صاحب کی مرعوبیت بڑھتی جارہی تھی۔ فلم میں جو اداکار ایک سین میں بھی آیا ہے اُس پر بات ہو رہی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل ہیرا منڈی لاہور کی جو لڑکیاں فلم لائن میں آئیں انہوں نے کیسے اپنی

بقا کی جنگ لڑی۔ کن وڈیروں اور سیاست دانوں نے اُن سے یا اُن کی اولادوں سے شادیاں کیں۔ منٹو اور بیدی نے کن فلموں میں کام کیا ہے۔ جس فنکار نے زندگی میں صرف ایک دو گیت گائے ہیں وہ آگے کیوں نہیں گا پایا۔ ساحر پاکستان سے کن حالات کی وجہ سے بھاگے۔ مدن موہن کی دھنوں پر عربی موسیقی کی چھاپ کیوں ہے؟
خیر ساری رات اِس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے شروع میں کچھ حصہ لیا جب گیم ہاتھ سے پھسلتی محسوس ہوئی تو لا تعلق ہو کر اُن کی باتیں سننے میں ہی عافیت جانی۔ آفتاب صاحب کے ساتھ "برپا" محفلوں میں قریباً ایسا ہی ہوتا تھا۔ لوگ اُن کی تجربے اور مطالعے سے آراستہ و پیوستہ بلیغ گفتگو صرف سننے پر خود کو مجبور پاتے تھے۔ ایک طرح سے" شامل باجے" بن جاتے تھے البتہ میں نے اقبال فیروز اور کبھی کبھی ریاض مجید کو اُن کے ساتھ برابری کی سطح پر علمی بحث و مباحث کرتے ہوئے دیکھا۔۔۔ صبح کے آٹھ بج گئے تھے اور طارق صاحب سے ان کی غیر مختتم باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ رات بیت جانے کا احساس تب ہوا جب سورج کی کرنیں باقاعدہ کمرے کے اندر بھی آ گئیں۔ مجھے یقین ہے اگر اس روز کسی وجہ سے سورج نہ نکلتا اور وہ رات کسی طرح سے چالیس پچاس گھنٹوں کی بھی ہو جاتی تو آفتاب صاحب کی گفتگو شاید ختم نہ ہوتی۔ طارق صاحب کی پی ٹی وی میں رات کی ڈیوٹی تھی اس لئے وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اجازت لے کر چلے گئے۔۔۔ کچھ دن پہلے طارق صاحب کا تعزیتی فون آیا۔ کہنے لگے۔" جاوید اقبال!

ہمیں آفتاب صاحب کا اب نعم البدل نہیں ملے گا۔" ان کی آواز میں افسردگی تھی۔

آفتاب صاحب کی بے پناہ فصاحت و بلاغت کا راز میں نے ایک بار پوچھا۔ کہنے لگے۔ میں جو کچھ بھی ہوں اس میں میری والدہ کی تربیت کا بہت دخل ہے وہ اپنے وقت کی" گریجویٹ تھیں۔ کہتی تھیں۔" اپنی سے بڑی عمر کے عاقل بالغ لوگوں میں بیٹھا کرو اور اُن کی باتیں سنا کرو۔ خود کچھ نہ بولو۔" میں نے اِس بات پر عمل کیا اور اپنی عمر کے پہلے تیس پینتیس سال میں نے بڑے لوگوں کو خاموشی سے سننے میں گزارے ہیں۔"

۔۔۔ایک بار ہم لاہور میں پرانی انارکلی کے ایک چائے خانہ کے باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ اُس دکان پر شہر کے شاعر و ادیب ہر وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم عالم خان کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے۔ ہم سے کچھ آگے ایک اور ٹولی بیٹھی تھی۔ ایک سفید بالوں والے دہرے بدن کے آدمی بڑی پُر مغز اور مدلل علمی گفتگو کر رہے تھے۔ ہم غیر ارادی طور پر اُس طرف متوجہ ہوگئے۔ عالم خاں کہنے لگے۔" یہ لاہور کے "رانا صاحب " ہیں۔

اُن کا معمول تھا کہ گھر سے صبح دس بجے کے قریب کسی نہ کسی دوست سے ملنے سائیکل پر نکل پڑتے۔ ایک شام میرے پاس آئے تو میں نے بات شروع کرنے کے لئے یوں " ہی پوچھ لیا۔ "گھر سے کب نکلے تھے۔

ساٹھ سال ہوگئے ہیں گھر سے نکلے ہوئے۔" انہوں نے آہ بھر کر جواب دیا۔ اُن کی " باتیں کثیر الاتعداد ماہ سال پر مبنی ہوتی تھیں۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے آم پیش کئے۔ کہنے لگے۔" آم کھائے ہوئے چالیس سال ہوگئے ہیں۔" مچھلی اور بڑے گوشت کے ساتھ بھی کئی دہائیوں سے بائیکاٹ تھا۔ پان کھانے والے کو سختی سے منع کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ پان کا پتہ بہت گرم ہوتا ہے۔ پچھلے زمانہ میں کسی کو شدید اندرونی چوٹ لگ جاتی تو متاثرہ حصہ پر پان کا پتہ باندھا جاتا تھا۔

جب سے میری اُن سے شناسائی ہوئی تھی میں نے ان کو مالی مشکلات میں گھرے دیکھا۔ بہت سے دوست اُن سے ملتے تھے۔ سارے زمانے کی باتیں کرتے۔ اکتساب فیض کرتے لیکن عملاً اُن کی اُس خاص مشکل کا معمولی بھی مداوا نہ کرسکے۔ ایک بار انہوں نے مجھے سیالکوٹ سے خط لکھا کہ کچھ روپوں کی فوری ضرورت ہے۔ خط لکھنے کی روایت سے وہ آخری عمر تک جڑے رہے۔ خط منتخب لفظوں سے سجا ہوتا اور ساتھ میں وہ جوابی لفافہ بھی ضرور بھیجتے۔ عموماً خطوں میں وہ حال احوال پوچھتے اور اپنے فیصل آباد آنے کے پروگرام سے آگاہ کرتے۔ انہوں نے متذکرہ بالا خط میں لکھا۔" اگر آسانی سے روپوں کا بندوبست ہوجائے تو منی آرڈر کر دینا وگرنہ اللہ کارساز ہے۔" ایسے میں مجھے پھر منٹو یاد آ گئے۔ قیامِ پاکستان

سے قبل منٹو اور فلم سٹار اشوک کمار گہرے دوست تھے۔ تقسیم کے بعد منٹو لاہور آ گئے۔ منٹو اشوک کمار پر لکھے گئے خاکہ میں کہتے ہیں کہ لاہور آنے کے کچھ سالوں بعد ایک دن اچانک ہی مجھے اشوک کمار کا بھیجا ہوا 500 روپے کا منی آرڈر ملا۔ میں نے خط کے ذریعے اشوک کمار سے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ جواب میں اشوک کمار نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کو ہر وقت ہی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آفتاب صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا تھا۔ میں اُن کی بہتری کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس ایسا نہیں کر پایا۔ اس سلسلے میں، میں نے ریاض مجید سے بھی بات کی۔ " سر! کچھ سوچیں! اِس عمر میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ انہیں مسائل کا سامنا ہے۔ "میں بھی کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ریاض مجید کبھی کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ کہنے لگے۔ "اچھا! کچھ کرتے ہیں۔" دلی میں ایک بار ہم ایک ہندو کی دکان پہ شاپنگ کر رہے تھے تو کسی بات پر اُس ہندو بنئے نے کہا۔ " ہم میٹھی بات تو کر سکتے ہیں، گڑ نہیں دے سکتے۔" ریاض مجید بھی میٹھی باتوں سے بہت کام لیتے ہیں۔۔۔ کافی دن تک ریاض مجید سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خیر! ایک شب کیفے دیوان کی نشست میں تشریف لے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور حکومت میں دو طرح سے لوگوں کی مدد فرماتے تھے۔ چھپا کر دیتے تھے اور بھری بزم میں بھی عطا کرتے تھے۔ بھری بزم میں اسلئے کہ

دیکھنے والوں کے اندر نیکی کی ترغیب جنم لے۔ خیر نشست کے اختتام پر بھری بزم میں ریاض مجید نے کچھ روپے آفتاب صاحب کی نذر کر دیئے۔ ریاض مجید کی زندگی میں جب بھی کوئی ایسا نیک موقع آیا ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کے دوسرے حصے کو اپناتے نظر آئے ہیں۔

اُنہی دنوں ایک شب میں کیفے دیوان میں کچھ دیر سے پہنچا۔ آفتاب صاحب پہلے سے موجود تھے اور کیفے کے باہر کرسی ڈالے ہمارے منتظر تھے۔ کچھ دیر بعد بتانے لگے کہ ابھی ایک بندہ میری طرف اشارہ کرکے دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "یار میں تو سمجھا تھا کہ یہ کوئی ریڑھی والا ہے لیکن یہ تو بہت پڑھا لکھا ہے۔" اُس نے یقینی طور آفتاب صاحب کی باتیں سنی ہونگی کیونکہ اُن کی آواز دور تک جاتی تھی۔ کہنے لگے میں نے اُسے پاس بلا لیا اور کہا۔ " تمہاری دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ تو میں ریڑھی والا ہوں اور نہ ہی پڑھا لکھا۔"

ایک روز میں نے ان سے کہا۔" آپ کے بھائی ارشد جاوید بھی فلم انڈسٹری کے بارے میں بھرپور معلومات رکھتے ہیں۔ آفتاب صاحب کی اپنے بھائی سے نظریاتی طور پر برس ہا برس سے ناراضی تھی لیکن یہ بات سن کر کہنے لگے۔" اُس کی تربیت میرے ہاتھوں جو ہوئی ہے۔" بات کوئی بھی ہوتی، اپنے ایک خاص ڈھب سے پیش کرتے تھے۔ ارشد جاوید نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں ۔ قدرت کی مرضی

کہ اُن کی دونوں بیویاں انتقال کر گئیں۔آفتاب صاحب! ایک دن میرے پاس آئے۔ کہنے لگے۔"آج میں ارشد جاوید کو پیغام دے آیا ہوں کہ اب تیسری شادی کا نہ سوچے۔قبرستان میں اب کسی اور قبر کے لئے جگہ نہیں ہے۔"

وہ ذاتی طور پر تو مالی معاملات کی وجہ سے غیر متوازن زندگی گزار ہی رہے تھے لیکن ایسے میں بھی وہ مستحق بندوں کا خاصا خیال رکھتے تھے۔ذاتی استعمال کی بہت سی اشیاء وہ ضرورت مند بندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔اگر کسی کی مدد کرنے میں خود کو قاصر پاتے تو منتخب دوست احباب کو مدد کے لئے کہتے تھے۔فلاکت زدہ بندے کی پریشانی کو وہ سنجیدگی سے لیتے تھے۔۔۔جب بھی میری اُن سے فون پر بات ہوتی تو آخر میں وہ کہتے۔ بشیر خان چوکیدار کو سلام کہہ دینا۔انہوں نے فون پر کبھی کسی معروف بندے کو سلام نہیں بھجوایا۔ محفل میں کبھی کہہ دیتے۔ کھانے کے لئے فلاں چیز منگوائیں۔ مطلوبہ چیز آنے پر پہلے دوسروں میں تقسیم کرتے اور آخر میں اپنے لئے کچھ بچا لیتے۔

اُن میں کچھ بشری کمزوریاں بھی تھیں۔سب سے بڑی یہ کمزوری کہ وہ دوسروں کو جلد ناراض کر دیتے تھے۔ شدت پسند طبع اور بلند آواز کے کھردرے پن کی وجہ سے دوست اُن سے نالاں رہتے تھے مگر وہ اپنی کسی غلطی میں بھی مخلص ہوتے تھے۔اُن کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک خاص طرز کی مہارت درکار تھی۔ میں شاید

یہ راز جان گیا تھا، اس لئے دوستی کے دس بارہ سالوں میں ہمارے بیچ ایک بھی تلخ جملے کا تبادلہ نہیں ہوا۔وہ ناریل صفت تھے، باہر سے سخت لیکن اندر سے نرم و گداز اور خوشبو سے لبریز۔۔۔

مجھ سے ایک دو بار انھوں نے کہا۔"جب میں مروں تو خواہش ہے کہ کسی کو بتائے بغیر چپکے سے گدھا گاڑھی پر ڈال کر قبرستان پہنچا دیا جائے۔" اُس وقت وہ شاید غالب والی اُس کیفیت سے گزر رہے ہوتے۔" اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔" وہ تیزی سے ناپید ہوتی ہوئی اُس نسل کے نمائندہ تھے جنھوں نے تقسیم ہندوستان کو اپنے پورے شعور میں دیکھا اور جس کے اثرات سے وہ ساری عمر نکل نہیں پائے۔

واقعات کے بیان میں زمانی ترتیب نہیں رکھ پایا۔اِس غلطی پر معافی نہیں چاہوں گا، اس لئے کہ یادیں غیر مہذب ہوتی ہیں۔ پتا نہیں کب کونسی یاد، دوسری یادوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی آپ کے ذہن پر قابض ہو جائے اور بے بسی کے گناہ پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں ہوتی۔

ساحر لدھیانوی کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ ان کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد یہاں کے کچھ اہل دانش اس بات کا دعویٰ کرنے لگے کہ ساحر ان کے قریبی

دوست تھے لیکن حقیقت میں ساحر کے جاننے والے تو بہت تھے لیکن دوست کوئی بھی نہیں تھا۔

ہم بھی ان کے دوست نہیں تھے اور شائد صحیح طرح سے انہیں ۔۔۔۔جان بھی نہ پائے!

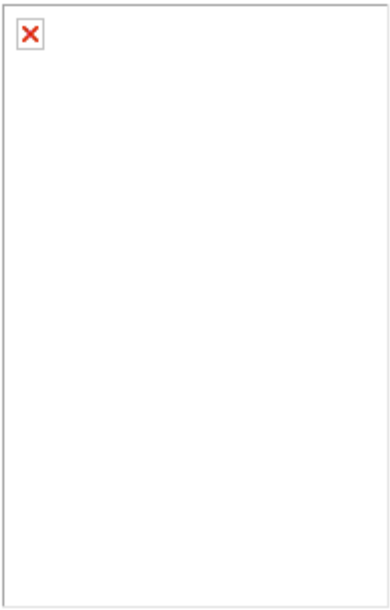

لڑکپن کی ایک تصویر۔بشکریہ منصور و ہارون خالد (پسران: محمد خالد اختر)

اگر سرائے کے اندر کا دروازہ اور باہر والا سلاخوں کا دروازہ دونوں کھلے ہوتے تو پھر گھر کے کسی پنجرے میں رہنے کا احساس ہوتا اور مجھے تو کئی بار محسوس ہوا کہ اپنی سرخ ٹائی، سبز ہیٹ اور بی اے کی ڈگری کے باوجود میں کوئی بہتر قسم کا لنگور ہوں جو کھڑکی میں سے نیچے اسٹیشن کے سامنے بیٹھے ہوئے بندروں کو پہچان کر بھائی بندی کے جذبے کے تحت مسکرا رہا ہے۔

کھویا ہوا افق

مستری مہتاب دین کی بیوی حکیم علی علم، مشہور موجد سرمہ کی تیسری بیٹی تھی۔

حکیم صاحب کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرمہ استعمال کرے گا، وہ دن کو تارے دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ شہر لاہور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تارے ہی نظر آتے ہیں اور وہ حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

لالٹین

بشکریہ منصور و ہارون خالد۔(پسران: محمدخالد اختر)

تصویریں چچا عبدالباقی کے گھر پر میرے خرچے سے کھینچی گئیں اور اپنی تصویر میں چچا نے اپنے گھر کے افراد کو بھی شامل کرلیا۔ میری تصویر میں چچا اپنے بیٹے عبدالرحمن کو میری گود میں بٹھانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کرکے

پہلی بار اپنے کردار کی پختگی کا ثبوت دیا۔ عبدالرحمٰن نکلے ہوئے کانوں والا ایک شوخ لڑکا ہے۔ وہ میرا حد درجے مشتاق ہو رہا تھا، پل بھر کے لیے بھی مجھے تنہا نہ چھوڑتا اور میں سرد آہیں بھر کر اکثر اس بات پر تعجب کرتا تھا کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے اس قدر مشاق کیونکر ہو جاتے ہیں۔

(ماہنامہ الو کا اجراء (چچا عبدالباقی کہانی

جب میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی گرد اور سیاہی میں ملفوف گھر پہنچا تو بوڑھا آدمی والد) برآمدے میں بیٹھا اپنی داڑھی کو وسمہ لگا رہا تھا۔ ایک اور چھوٹا سا دبلا شخص ،) جو قدرے ایک بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح تھا، سامنے کرسی پر ٹانگ رکھے بیٹھا ایک پلیٹ میں سے چلغوزے کھا رہا تھا۔ کسی چیز نے مجھے بتایا کہ یہی وہ ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر ہے یعنی میرا ہونے والا سسر۔ میرا دل بوٹوں تک ڈوب گیا۔ ہونے والے خسروں کا ہمیشہ مجھ پر یہی اثر ہوتا ہے۔ ہم خلجی قدرے نروس ہیں۔

(زیبرا اسکیم (چچا عبدالباقی کہانی

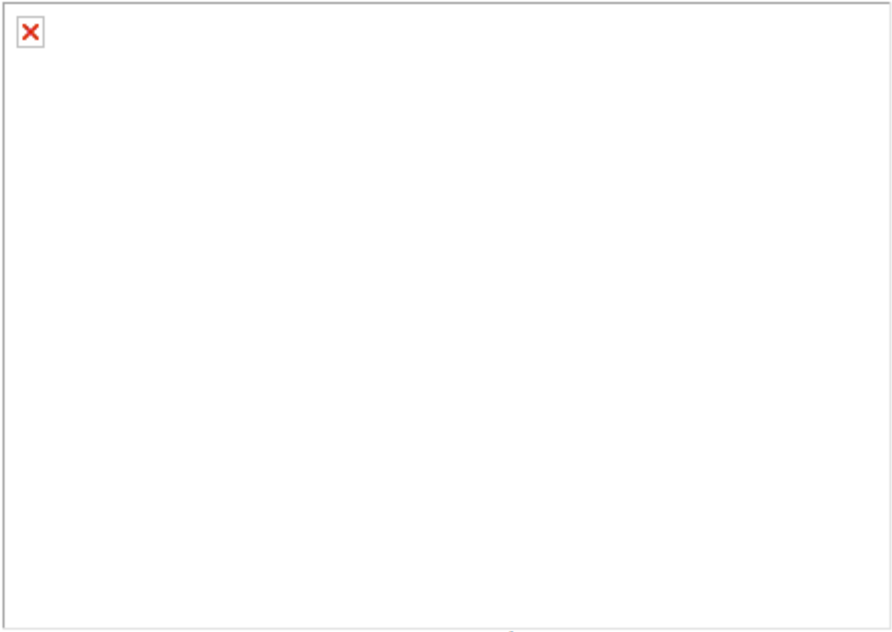

دوحہ میں ۔مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ کے موقع پر۔بشکریہ منصور و ہارون خالد(پسران: محمدخالد اختر)

لوح قبر۔ محمد خالد اختر۔راقم نے ۹۲ جولائی ۱۱۰۲ کو محفوظ کی

ہیلو ! ہیلو ! پرائم منسٹر کی کوٹھی۔ہیلو سیکرٹری صاحب۔ کیوں بھئی اُدھوانا صاحب ہیں۔مصروف ہیں ؟ کیا کہا کوئی کانفرنس ہورہی ہے ؟ ۔۔ بھئی ان کو ذرا فون پر بھیجو۔میں بول رہا ہوں۔آنریبل وڈیرا رسول بخش ملنگی آف

واٹر ورکس ۔۔۔ اُدھوانا صاحب ہیں ! آیا ۔۔ سنایئے۔ قبلہ یہ کیا اکیلے اکیلے کانفرنسیں ہو رہی ہیں ۔۔ میں بھی پرسوں ہی ہیلی کاپٹر میں سیلاب زدہ علاقے کا دورہ کرکے لوٹا ! ہوں ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ اس سے سیلاب تھم گیا ہے

(آنریبل ملنگی کا حسرتناک انجام ۔ (چچا عبدالباقی کہانی

سیاہ گاؤن اور چوکور ٹوپی جو رسم اسناد کے موقع پر تم نے اچھے سمجھدار سنجیدہ آدمیوں کو جو عام حالات میں کبھی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے) پہنے ہوئے دیکھا ہوگا۔) جن میں وہ کچھ کچھ پرندے سے لگتے ہیں۔ پہاڑی کوؤں سے مشابہہ)۔ یہ سیاہ گاؤن اور) چوکور پھندنے والی ٹوپی میرے پاس تھے۔ یہ درست نہیں ہے کہ میں نے یہ بی اے کی ڈگری کے موقع پر بنوائے تھے۔ جب میں ان کو اپنے ایک خالو سے ادھار مانگ سکتا تھا تو بھلا مجھے ان کے سلوانے اور خاص طور پر بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا خالو مولوی محمد باقر ایک مقامی کالج میں پینسٹھ روپے ماہوار پر عربی کا پروفیسر تھا اور اس جامعہ میں جہاں سے اس نے فاضل اجل یا اسی قسم کی ڈگری لی تھی۔

(چاکیواڑہ میں وصال ۔ (ناول

:پارٹیوں کی فہرست اپنی نامکمل صورت میں کچھ اس طرح تھی

پارٹی ------ لیڈر سربراہ وغیرہ

رکابی پارٹی --- حاجی شناسی

چودھری گارڈن پارٹی --- چودھری سوہن میاں

فصلانہ گارڈن پارٹی --- نواب نیک محمد فصلانہ

خانان گارڈن پارٹی ---- خان مسیتا خان صاحب

بانگلا جتا پارٹی ----- غیظ الرحمٰن بندو

گھیراؤ جلاؤ پارٹی ---- مولانا طوفانی

گھونپ پارٹی ---- علی قلی خان

لوک پارٹی ---- رعد علی بدلو

جمیعت فقیہان نکاح خوان مولانا عرفانی قہرمانی

وغیرہ وغیرہ

(الیکشن ٹکٹ ۔ (چچا عبدالباقی کہانی

آرام گاہ۔محمد خالد اختر۔راقم نے ۹۲ جولائی ۱۱۰۲ کو محفوظ کی

جب میز پر سب پلیٹیں صاف ہوگئیں اور دودھ کے گلاس خالی ہوگئے، پروفیسر شاہسوار خاں نے ایک زبردست ڈکار لی۔ شاید زبردست ترین ڈکار جو اس الاٹ کے ریسٹوران میں کسی نے نہ لی ہوگی اور جس نے اس کمرے میں بیٹھے ہوئے سب بورژواؤں کی نظر پروفیسر کی طرف مرکوز کردی۔ میں نے ایک بورژوا عورت کو ، جو ایک پھولدار غرارہ پہنے ہوئی تھی ، ڈر کر اپنی چائے کی پیالی کو نیچے فرش پر گراتے سنا۔ اس نے غالبا سمجھا تھا کہ کوئی مرکھنا درندہ شاہزان میں گھس آیا ہے۔ پروفیسر اس ہلچل سے جو اس نے پیدا کردی تھی، قطعا بے پرواہ اور غیر متاثر تھا۔
چاکیواڑہ میں وصال ۔(ناول)

دائیں سے: جناب ہارون خالد اور جناب منصور خالدپسران محمد خالد اختر

تقریباً ہر شخص میں قدرت نے ہیرو پرستی کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر شخص کے اپنے خاص ہیرو ہوتے ہیں جنہیں وہ ایک زریں سی دھند میں اپنے سے اوپر اولمپیا کی بلندیوں پر بیٹھے دیکھتا ہے۔ مثلاً میرے ایک دوست کا (جو امپورٹ کنٹرول میں ایک معمولی کلرک ہے) ہیرو اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہے جو ۔ کئی بار اس کے ساتھ شام کو پررونق صدر میں گزرتے ہوئے اور منور دکانوں میں حسین چہروں کو تاکتے ہوئے مودبانہ لہجے میں سامنے بشرٹ میں ایک گنجے بطخ نما انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :
" یہ چوہدری عبدالکریم ہے، ہمارا سپرنٹنڈنٹ، ساڑھے آٹھ

سو تنخواہ پاتا ہے"۔ میرا دوست یہ کہتے وقت ایک بچے کی طرح خوش اور مغرور ہوتا ہے جیسے کہ اس نے مجھے دنیا کا ایک آٹھواں عجوبہ دکھادیا ہو۔ ایک عجوبہ جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ایجاد کیا ہو۔ چوہدری عبدالکریم میرے دوست کے لیے اولمپیا کا دیوتا ہے۔ اس کے نزدیک چوہدری عبدالکریم انسانی ترقی کی ایسی معراج پر پہنچ چکا ہے جہاں اس جیسے شخص کبھی پہنچنے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتے۔ عموما ہمارے ہیرو ایسے شخص ہوتے ہیں جو کچھ بن چکے ہیں جو ہم بننا چاہتے تھے مگر جانتے ہیں کہ کبھی بھی نہ بن سکیں گے۔

(چاکیواڑہ میں وصال ۔ (ناول

بس کے اڈے کے پاس ایک لکڑی کے بجلی کے پول سے ٹیک لگائے ایک بوڑھا خانہ " بدوش جوڑا بیٹھا تھا۔ گول ٹوکری میں گھر کا سار سامان تھا۔ گدھا پول سے بندھا تھا۔ سفید پریشان داڑھی والے منگول خدو خال کے بوڑھے چہرے پر بے بسی اور بوکھلاہٹ تھی۔ اس کی بیوی پچپن سال کی، کھچڑی رنگت کے بالوں والی، سکڑی ہوئی بوڑھی عورت تھی۔ بیس پچیس سال پہلے وہ ایک پہاڑی ہیلن ہو گی۔ اب بھی اس نے اپنے اعضا کی مناسبت، اپنے تیکھے نقوش کی حساسیت نہ کھوئی تھی۔ خانہ بدوشوں کی گہری عیاری اس کی نیلی آنکھوں میں تھی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ناقابل ملامت کردار کی مالک نہ تھی اور آنکھ بچا کر چھوٹی موٹی چیزیں

چرا لینا اس سے بعید نہ تھا، مگر وہ اپنے بوڑھے کی وفادار تھی۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ اب پہاڑی سے نیچے اپنے سفر کے آخر کو پہنچ رہے تھے۔ بوڑھے جوڑوں کی رفاقت اور ایک دوسرے پر سہارے میں کوئی بڑی خوبصورت چیز ہوتی ہے۔ اور اسی لیے شادی کا جوا کھیلنے سے نوجوان کو بچنا نہیں چاہیے۔ ایک اکیلی، سونی، خود غرضانہ زندگی بلاشبہ ایک خوفناک چیز ہے۔"

(دو سفر۔ (پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے کیے جانے والے دو سفر

میرے اپنے ہیرو۔۔۔ میرے حقیقی ہیرو۔۔وہ لوگ ہیں جو کتابیں لکھتے ہیں۔ میں ان ادیبوں کو ترجیح دیتا ہوں جو ادیب شہیر یا مصور جذبات بن چکے ہیں۔ مگر ان ادبی شیروں کے علاوہ ہر وہ شخص جس نے کوئی کتاب لکھی ہو، خواہ وہ 'پکی روٹی' کا مصنف ہی کیوں نہ ہو، میرا ہیرو ہے۔۔ میرا اپنا سگا بھائی ہے۔۔ میں ادبی لوگوں کو اس طرح جمع کرتا ہوں جس طرح بعض لوگ ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ میری آٹو گراف کتاب پر شیخ اے ڈی کھوکھر (مصنف 'ہن میں پتلون پاواں گی تے ڈانس گھراں وچ جاواں گی) سے لے کر چوہدری نرگس بغدادی (مصنف مشہور اسلامی ناول دغا باز شیر) تک کے آٹو گراف، ان کے اپنے ہاتھوں سے (اگرچہ میرے فونٹین پین کی سیاہی سے) رقم زدہ موجود ہیں۔

(چاکیواڑہ میں وصال ۔ (ناول

ناول کے آخری باب میں مسٹر منظور کی ہیروئن سے شادی اور اس کے باغ حسن کی گل چینی اور دوسرے لذیذ امور کا ایسے مشرح انداز میں ذکر کرکے ناول کو اختتام تک لایا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کی نیند کا قطعی حرام ہوجانا یقینی ہوجاتا ہے۔ سب سے آخر میں یہ فقرہ " پیارے قارئین ! پھر ملیں گے اگر خدا لایا" ہوتا ہے۔ شیخ قربان علی کٹار کے معاملے میں خدا یہ ہر دو ماہ کے بعد کرتا یعنی اپنے پیارے قارئین سے ملانے کے لیے لاتا۔

(چاکیواڑہ میں وصال ۔ (ناول

میں جانتا ہوں، ایسے لوگ موجود ہیں جن کے لیے سفر کا بہترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب " وہ واپس اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں۔ میں ان سے سراسر مختلف ہوں۔ چھت کے نیچے میرا سانس گھٹتا ہے اور میں کبھی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا گھر سے دور کھلے سڑک پر، اور چھٹکے ہوئے تاروں کے نیچے۔ میں اپنے دل میں

ایک خانہ بدوش ہوں، اور اپنے گھر اور دفتر کی مہذب رسمی زندگی مجھے زنداں کی پُر اذیت قید لگتی ہے۔ میں جانتا ہوں اس زندگی نے بہت سوں کو مار دیا ہے اور ہمارے گونجتے ہوئے شہر ان رینگتی ہوئی لاشوں سے پُر ہیں۔ میں خود کو باغی سمجھنا پسند کرتا ہوں اور شاید حقیقیت میں محض ایک بزدل شخص ہوں جو دنیا کی حقیقتوں سے بھاگتے رہنے میں اپنی عافیت دیکھتا ہے۔"

(دو سفر۔ (پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے کیے جانے والے دو سفر

نیچے جنگلوں سے ڈھنپے ہوئے چٹانی نشیبوں اور بلندیوں کے درمیان ایک زریں دھند کے میدان میں سیف الملوک جھیل یاقوت کے نگینے کی طرح جڑی ہوئی تھی۔ سفید برف کے تودے اس کی صاف سطح پر تیر رہے تھے۔ ان میں سے چند اپنے خاص زاویے کی وجہ سے سورج کی روشنی میں خون سا چھلکا رہے تھے۔ جھیل کے مشرقی کونے سے کچھ دور ایک پر شکوہ، برف سا سفید پہاڑ اپنا مغرور سر اٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ ترشا ہوا بلور تھا اور اسی لیے اسے شیشہ پہاڑی کہتے ہیں۔ اس آسمانی منظر کو دیکھ کر ہمارہ سب تھکاوٹ گویا جادو کے اثر سے اتر گئی۔

میں نے اپنے ننھے گائیڈ کو تشکر کے جذبے سے دیکھ کر اسے اپنے راز میں شریک

" کیا: " یہ پہاڑی پر برف کیسی ۔۔۔۔ کیسی

میرے پاس اس پہاڑ کی برفوں کو بیان کرنے کے لیے کوئی الفاظ نہ تھا۔

میرا راہنما صحیح لفظ کی تلاش میں میری پریشانی پر مسکرایا۔ اس نے میری مدد کی اور سادگی سے کہا:

" سچی برف "

سچی برف " ! یہ اس برف کو بیان کرنے کے لیے واحد صحیح لفظ تھا جس کی مجھے تلاش " تھی۔ اس کوہستانی لڑکے نے مجھے یہ لفظ دیا تھا۔۔ وہ لڑکا جس نے کبھی اسکول کا منہ نہ دیکھا ہوگا۔

لڑکے میں ایک پیدائشی شاعر کی روح تھی۔ میرا ایک دوست شاید اس برف کو ' سچری برف ' کہتا اور میں کچھ سوچ کر غالباً اس کے لیے ' کنواری ' کا لفظ دریافت کرتا مگر " سچی " کا لفظ اس برف کو پوری طرح بیان کرتا ہے جو اس پہاڑ کو سر تاپا ایک براق لبادے کی طرح ڈھانپے تھی۔

جب ہم پہاڑ کی اترائیوں میں آئے تو ہم نے اونی بالاپوش میں ایک آدمی کو۔۔۔ جو آدمی کے بجائے ایک غلیظ حیوان لگتا تھا، رسہ لیے بھاگتے دیکھا۔

ہزاروی نے کہا: " یہ گوجر ہے " ! اور اس سے پوچھا: " تمہارے پاس دودھ ہوگا " ؟

آدمی نے رک کر کہا: " تم دودھ پیے گا ؟ اچھا تم نیچے جائے، میں ابھی بھینس کو پکڑ کر تمہارے لیے دودھ لاتا ہوں "

وہ ایک عجیب سی ہندوستانی بولتا تھا جو اردو کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ یہ گجری زبان تھی۔ اسے تھوڑی سی توجہ دینے سے بخوبی سمجھا جاسکتا تھا۔ ہم نیچے اتر آئے اور چھوٹی چٹانوں کو پھلانگتے جھیل کی کی سمت چلنے لگے۔ ہمارا گوجر میزبان رسہ لیے چٹانوں اور پہاڑی " راستوں پر ناقابل یقین پھرتی سے بھاگتا ہوا جنگلوں کی کوئی بوسیدہ مخلوق لگتا تھا۔
(دو سفر۔ (پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے کیے جانے والے دو سفر

جب میں اٹھا تو پو پھٹ رہی تھی۔ چاند کی سفید تکیہ اسی طرح چمک رہی تھی۔ ستارے بھی اسی طرح چمکیلے تھے۔ البتہ کبھی کبھی ان کی لو میں پھیکے پن کا سا گمان ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے طبعا محسوس کیا کہ میں آخر کار رات کو صبح کے ڈر سے دبے پاؤں بھاگتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ عناصر کی تمام کروٹوں میں سے یہی ایک کروٹ مجھے سب سے زیادہ دلآ ویز اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لمحے کی شیرنی صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو گھر کی چاردیواریوں کے باہر کھلی فضاؤں ییں راتیں بسر کرنے کا تجربہ حاصل کرچکے ہیں۔ کیا کنجوس کروڑ پتی کا سارا سونا اس ایک پل کا بدل ہو سکتا ہے جب اشجار اور جھاڑیاں ایک نئی سانس لیتے ہیں اور کائنات ایک انگڑائی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لمحے کی تاثر

آفرینی کو صرف شاعروں اور مصوروں، عاشقوں اور سیاحوں نے محسوس کیا ہے اور ہمارے ہندوستان میں جوش نے محسوس کیا ہے:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

(ڈیپلو سے نوکوٹ تک۔ (سفرنامہ

بیتا ہوا زمانہ ہمیں سہانا لگتا ہے۔ ہمارے بچپن اور لڑکپن کے ایام میں سادگی تھی۔" محبت کرنے والے لوگ تھے۔ فراغت کا احساس تھا۔ انسان کی زندگی اتنی الجھی ہوئی، اتنی مشینی نہ تھی جتنی اب بن کر رہ گئی ہے۔ اب جس شخص سے ملو وہ جلدی میں ہوتا ہے۔ کسی جان لیوا مصیبت میں مبتلا۔ اگر زندگی میں گائیوں اور بھیڑوں کی طرح دیر تک خالی نظروں سے دیکھنے کا وقت نہ ہو اور آدمی ہر وقت تفکرات سے مغموم رہے تو اس زندگی کا کیا فائدہ ؟۔۔اس دور میں ہر کوئی اپنے خول میں سمٹ کر جیتا ہے۔ ہمارے معاشرتی اور سماجی رویوں میں کوئی خاطر خواہ یا خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔۔بے شک ہم نے سائنسی طور پر بڑی ترقی کرلی ہے۔ چاند کی تسخیر، سٹیلائٹ، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر وغیرہ اور ہم سج سج ایک نئی دنیا کے قیام کی طرف جارہے ہیں۔ لیکن کیا اس دور کا آدمی

پچھلے دور کے آدمی سے زیادہ خوش اور مطمئین ہے ؟۔۔پھر بھی ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ہم آنکھوں پر کپڑا باندھے کوہلو کے بیل نہیں جو چکر کاٹتے رہتے ہیں اور ایک ہی راہ کو روندتے چلے جاتے ہیں۔میں رجائیت پسند ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آگے کسی بہتر مستقبل کی طرف رواں دواں ہیں ۔ویسے آپ جانتے ہیں کہ مخلوقات میں انسان ہی سب سے زیادہ سفاک، چالاک اور خطرناک حیوان ہے۔ اور یہ دنیا جس میں ہم جیتے اور مرتے ہیں، پرفیکٹ دنیا نہیں۔ایسی دنیا جس میں روپے پیسے کی راجدھانی ہو ، پرفیکٹ کیونکر ہو سکتی ہے۔"

محمد خالد اختر کے ایک مضمون سے

"میں اب سب خواہشوں اور امنگوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ نہ علمی، نہ ادبی اور نہ عملی۔ سورج غروب ہو رہا ہے اور سائے لمبے ہو رہے ہیں۔ جلد، بہت جلد میں بھی اس دور دراز کے سفر پر چل نکلوں گا جو جلد یا بدیر ہم سب کو در پیش ہے۔ معمولی سا ٹیلنٹ یا صلاحیت مجھ میں تھی ، اس کو موافق جو کچھ مجھ سے ہو سکا، میں نے کر لیا۔ پچھتاوے بھی نہیں ہیں۔ایک خواہش البتہ ہے کہ جب اس دنیا سے جاؤں ، چلتا پھرتا جاؤں۔ کسی کا محتاج ہوئے بغیر، کسی کو جوکھم میں ڈالے بغیر ! "

محمد خالد اختر۔ ایک آخر آخر کی تحریر

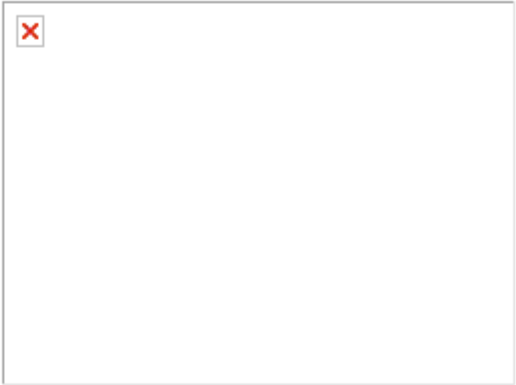

اس کمرے میں محمد خالد اختر نے ۲ فروری ۲۰۰۲ کو دن گیارہ بجے آخری سانسیں لیں

مرزا شاہی۔ ہونٹوں پہ ہنسی، پاؤں میں چھالے

فرش پر آلتی پالتی مارے، میرے سامنے مرزا شاہی بیٹھے تھے، رمضان کا مہینہ تھا ،اتوار کا دن تھا اور تاریخ تھی ۷ اگست 2011۔ ان کا اصرار تھا کہ میں شربت ضرور پیئیوں، ادھر میں انکاری تھا

" میرا روزہ ہے جناب " میں ان سے کہتا ہوں

" بھئی ایک گلاس شربت پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا" ۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے ایک اسی سالہ بوڑھے بیمار آدمی کی حس مزاح نے ابھی بھی دم نہیں توڑا ہے۔ اس ملاقات سے ایک ہفتہ قبل ایک روز علی الصبح وہ مجھے گلشن اقبال میں اپنے فلیٹ کے نیچے خاموشی سے اپنے رستے لڑکھڑاتے ہوئے جاتے نظر آئے تھے اور میں نے لپک کر ان کو روکا اور ایک تصویر کی درخواست کی تھی۔ ہاتھ میں سبزی کے تھیلے کو چھپاتے ہوئے بچوں کی سی معصومیت لیے اپنی بھاری آواز میں بولے تھے " بس یہ تھیلا تصویر میں نہ آئے "۔۔ یہ تصویر فیس بک پر شامل کی گئی اور

احباب کے پیغامات کا تانتا بندھ گیا کہ مرزا صاحب سے ملاقات کی جائے اور مزید احوال سے آگاہ کیا جائے۔ اس دنیا میں حیرت انگیز باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہوا یوں کہ مرزا شاہی سے اپنی اس مختصر سی ملاقات کا ذکر میں نے اپنے دفتر میں کیا اور میرے ہی ساتھ کام کرنے والی ایک خاتون نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ ڈھاکہ کی اصفہانی کالونی میں میں مرزا شاہی ان کے ہمسائے تھے۔ پھر وہ دیر گئے مجھے ان کے بارے میں دلچسپ باتیں بتاتی رہیں۔

اور اب اتوار کے دن، انہی کی بیٹھک کے فرش پر براجمان، میں ان کو باور کروا رہا تھا کہ مرزا صاحب! لوگ آپ سے آج بھی محبت کرتے ہیں۔

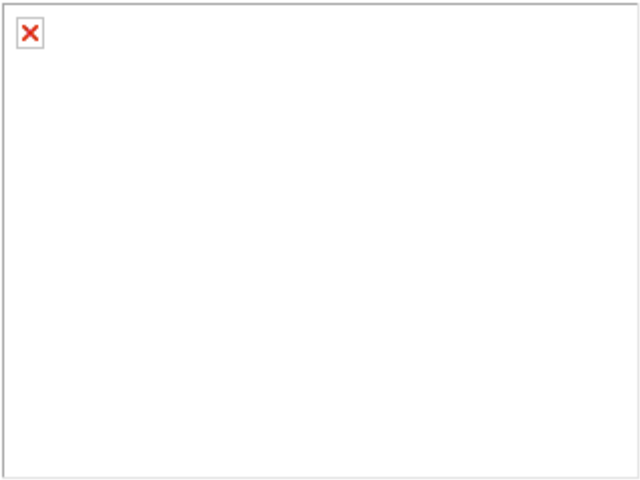

۷ اگست 2011 ۔ راقم ، مرزا شاہی کے ہمراہ

لیکن صاحبو! صرف محبت سے تو کام نہیں چلتا، پرستار تو ہر حال میں محبت کرتے ہی رہیں گے، حکومتی سطح پر ایسا کوئی ادارہ۔۔۔۔۔۔ لیکن ذرا ٹھہرئے۔۔شاید میں بہک رہا ہوں۔ اگر ایسا کوئی ادارہ ہوتا تو لاہور میں لاکھوں پڑھنے والوں کو ان گنت خوبصورت کہانیوں کا تحفہ دینے والے صاحب طرز ادیب اے حمید 2010 کی جان لیوا گرمیوں میں بیماری کی کیفیت میں ایئر کنڈ شہر کے ہوتے ہوئے بھی اپنے کمرے میں گرمی سے نہ تڑپتے رہتے۔ محض اس لیے کہ بجلی کا بل دینے کے لیے ان کے پاس پیسے نہ تھے۔ حمید اختر ان ہی دنوں اے حمید سے مل کر آئے تھے اور سخت افسردہ اور ملول تھے ۔ ادیبوں اور فنکاروں کی زبوں حالی کی بھتیری دردناک مثالیں اور بھی موجود ہیں ۔ مزاحیہ اداکار فرید خان ، اداکار لہری، اداکارہ شہزادی، تاج نیازی کی حالت زار کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے ۔

مرزا شاہی کو اپنی تاریخ پیدائش خوب یاد ہے۔ ١١١ اکتوبر 1931 کے روز وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ان ایرانی النسل افراد میں سے ہیں جن کے آباؤ اجداد ایران سے برما اور مشرق بعید کے دیگر ممالک میں منتقل ہوگئے تھے۔ کلکتہ ہی سے سینئر کیمبرج کیا۔ ریڈیو کلکتہ سے غزلیں گاتے تھے۔ ' لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں ' ان کی پسندیدہ غزل تھی جسے وہ کلکتہ ریڈیو سے گایا کرتے تھے۔ حالات نے کروٹ لی اور مرزا شاہی اپنے اہل خانہ کے ساتھ

ڈھاکہ آ گئے۔ تلاش معاش شروع ہوئی اور بات بنی عالمی ادارہ صحت میں۔ نوکری ان کو راس آئی اور وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ کبھی وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف جانکلتے تھے۔ پلیٹ فارم پر جا پہنچتے، بقول انتظار حسین، آتی جاتی گاڑیوں کے ڈبوں پر نظر دوڑائی، رنگ رنگ کے چہروں کی دید کی، اترتی چڑھتی سواریوں کی رنگا رنگی دیکھی، اچھے چہرے دیکھے، ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔

لیکن کچھ لوگوں ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کو مصائب و آلام تاحیات اپنی تاک میں رکھتے ہیں۔ مرزا شاہی بھی حالات کی ستم ظریفی کا شکار رہنے والوں میں سے ایک ہیں۔ مشرقی پاکستان کے حالات تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئے اور ایک روز یوں ہوا کہ مرزا شاہی، اپنے ہی گھر کے سامنے ایک قطار میں کھڑے مکتی باہنی کی جانب سے اپنی 'مکتی' کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن آگے ایک طویل زندگی ان کی منتظر تھی، عین وقت پر ان کے ساتھ دفتر میں کام کرنے والا ایک بنگالی دوست کہیں سے نمودار ہوا اور مکتی باہنی والوں سے ان کی گلوخلاصی کروائی۔ جان بچی اور مرزا صاحب نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کا کرب اٹھایا، اس مرتبہ کلکتہ ہی ان کی منزل تھی۔ اپنی چھوٹی بچی کو نیند کی دوا کھلا کر وہ کالونی سے نکلے تھے کہ رستے میں اس معصوم کی ' اردو' کہیں کسی مصیبت کا شاخسانہ نہ بن جائے۔ کلکتہ میں اپنی چھوٹی سگی خالہ کے چھوٹے سے مکان میں پڑاؤ ڈالا۔

گلی تنگ تھی لیکن دل ابتدا میں کشادہ پائے۔ رفتہ رفتہ حالات سخت ہوتے چلے گئے ۔پیٹ کی خاطر سبزی کا ٹھیلہ تک لگانا پڑا۔ ایک دن عجب افتاد آن پڑی، شام کو تھکے ہارے گھر پہنچے تو خالہ نے سخت مجبوری کے عالم میں بہت پیار سے کہا کہ بیٹا اب تمہارا اس گھر میں رہنا ہمارے لیے مصیبت کا سبب بن جائے گا اور کہیں خفیہ والوں کو علم ہوگیا تو ہم سب دھر لیے جائیں گے۔ سر چھپانے کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔

مرزا شاہی اس گلی سے یوں اٹھے جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے۔

مایوسی کے عالم میں یاد آیا کہ قریبی واقع ایک چھوٹے سے شہر ہگلی میں سجاد نامی ایک شخص ہیں جن کو مرزا صاحب کے دادا نے پالا تھا۔ سو وہاں کا رخ کیا، کچھ مالی معاونت سجاد صاحب سے پائی اور نیپال جا نکلے۔ نیپال میں ایک برس تک قیام کیا۔ بلآخر کراچی میں ان کے خاندان والوں نے مدد کی اور یوں مرزا شاہی اہل خانہ سمیت لاہور میں براجے۔

لاہور نے اوروں کی طرح ان کو بھی اپنے دامن میں پناہ دی۔ نیف ڈیک میں کسی طور نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آٹھ برس دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔ پھر 'امیر المومنین' نے نیف ڈیک کو بند کرنے کا حکم صادر کیا، بے روزگاری

کے عفریت نے ایک مرتبہ پھر مرزا صاحب کو آن دبوچا۔

اس بار شہر کراچی ان کی منزل تھا۔

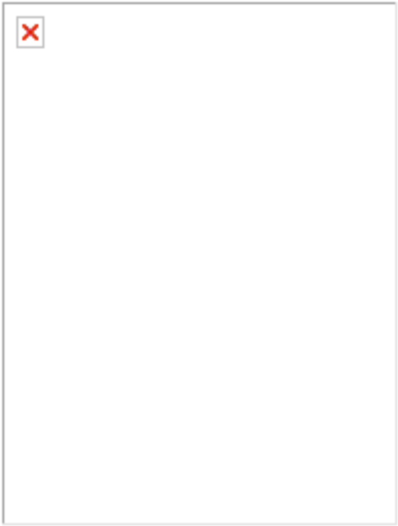

اس معصوم سے انسان سے کون محبت نہ کرے گا؟

کراچی پہنچے تو روزگار کا بنیادی مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔اس مرتبہ قسمت نے بس اس حد تک ساتھ دیا کہ سائیٹ ایریا میں واقع رزاق اسٹیل مل میں چھوٹی موٹی نوکری مل گئی۔ اٹھارہ برس کی نوکری کے بعد ریٹائر ہوئے۔ یوں تو لاہور میں فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار کرتے رہے تھے لیکن کراچی آکر ٹی وی میں بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ معاملہ چھوٹے کرداروں سے آگے نہیں بڑھا۔ روٹی روزی چلتی رہی۔حال ہی جیو ٹی وی سے نادانیاں نامی ڈرامہ ایک طویل عرصہ تک

نشر ہو کر بند ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں مرزا شاہی نے چچا کمال کا کردار ادا کیا تھا۔
کراچی ہی میں انہوں نے اپنی چاروں بیٹیوں کی شادیاں کیں۔

مجھے تھکنے نہیں دیتا میری ضرورتوں کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

" اب لوگ مجھے چچا کمال کے نام سے پکارتے ہیں ، اصلی نام تو شاید آپ جیسے چند لوگوں ہی کو یاد رہ گیا ہو" ۔۔۔ وہ بولے۔

کراچی ٹی وی کے ذکر پر میں نے یادگار ڈرامے ' عید ٹرین ' کا ذکر کیا اور مرزا شاہی جھٹ بولے :

" آپ نے میرا لوٹا تو نہیں دیکھا ؟ ' (مذکورہ ڈرامے میں مرزا شاہی کا ایک معروف ڈائیلاگ)

گفتگو کے اس موڑ پر مرزا صاحب سے راقم السطور کی بے تکلفی اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ بلا تامل معین اختر کا جوابی ڈائیلاگ عرض کیا :

' کچل دوں گا تیرے لوٹے کو ۔۔۔ مسئل دوں گا "

اور وہ بچوں کی طرح کھکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

دوران گفتگو جب کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتی تو اپنے ماتھے پر ننھے بچوں کی طرح ہاتھ مار کر کہتے: " افوہ! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا "

ایک موقع پر میں نے ان سے ان کی بچپن کی تصاویر کی درخواست کی۔ جواب ملا: " یہ بچپن آپ کے سامنے جو بیٹھا ہے "

آپ کو معلوم ہے " وہ گویا ہوئے۔ " میں اب تک تقریبا دو ہزار ڈراموں میں کام کرچکا ہوں۔ ففٹی ففٹی پانچ سال تک چلا تھا اور ہفتے میں اس کے دو پروگرامز نشر ہوتے تھے، اب آپ خود ہی اندازا لگالیں "

ریٹائرمنٹ کے بعد مرزا شاہی ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوگئے کہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوجاتے تھے اور ہوش میں آنے کے بعد کسی کو نہیں پہچانتے تھے۔ ان کے دماغ میں خون کا ایک شرارتی لوتھڑا اٹکھیلیاں کرتا پھرتا ہے، کبھی جو تھک کر بیٹھتا ہے تو مرزا صاحب صاحب فراش ہوجاتے ہیں۔ ایسی شرارتی چیزوں کو سزا دینے کے لیے پہلے جراحی کرنی پڑتی تھی، اب اس کو قابو کرنے کی دوائی دستیاب ہے سو وہ مرزا شاہی کو تاحیات کھانی پڑے گی۔ کچھ عرصے سے وہ گھٹنوں کے درد میں مبتلا ہوگئے ہیں جو انہیں بے طرح سے ستاتا رہتا ہے، ڈاکٹر ان

سے گھٹنوں کی تبدیلی کے سات لاکھ روپے مانگتے ہیں اور وہ مسکرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کا فلیٹ دوسری منزل پر ہے، سیڑھیاں چڑھنا ان کے لیے اب ایک امتحان سے کم نہیں رہا ہے!

چند ٹی وی چینل کے لوگوں نے تو یہ غضب کیا کہ مجھے پیسے نہیں دیے، بس وعدہ کرتے رہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔

آج کل کام کر رہے ہیں آپ؟ ۔۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں

"جی ہاں! ہیلتھ ٹی وی کے ایک ڈرامے میں آ رہا ہوں۔"

اور میں سوچنے لگا کہ ہیلتھ ٹی وی والے ان کو کیا معاوضہ دیتے ہوں گے اور کیا وقت پر بھی دیتے ہوں گے؟

اچھا یہ بتائیے کہ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں آپ" ؟ ۔۔ یہ سوال پوچھ کر گویا میں" نے اپنا ہی دھیان ہٹانے کی کوشش کی تھی!

اس سوال پر پہلے تو وہ ذرا ٹھٹکے، پھر مسکرا کر بولے : " دال چاول اور کریلے 'کا' بھاجی ۔۔ یاد رہے کہ روز مرہ کی زندگی میں مرزا صاحب کا لب و لہجہ ان کے بنگالی ہونے" کی غمازی کرتا ہے۔

میں ان سے سوال کرتا ہوں: " مرزا صاحب! آپ کراچی آئے اور اب اس شہر میں آپ کو لگ بھگ تیس برس ہو چلے ہیں، آپ ایسے لوگوں کو ہنساتے ہیں جو ہنسی کے لیے ترسے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان ہنسنے والوں کی ہنسی میں آپ کے دل کے داغوں کی روشنی ہوتی ہے۔ ذرا کوئی تین ایسے نام لیجیے جن کو آپ صحیح معنوں میں اپنا دوست کہہ سکتے ہوں۔"

اس سوال پر وہ ایک لحظے کے لیے خاموش ہوئے، پھر بولے: ایسا تو ایک ہی تھا۔۔ معین اختر۔۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو خبر گیری کرتا تھا۔ مجھے فون کرکے کہتا تھا، مرزا بھائی! پیسوں کی ضرورت ہو، ڈاکٹر کی یا پھر دوائی کی، بس مجھے بتایئے گا۔۔۔ وہ چلا گیا اور میں گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے اس کے جنازے میں بھی نہ جاسکا۔۔۔ اب دیکھئے ہم کب جائیں گے "

میں بھاری دل سے مرزا شاہی کے فلیٹ کی سیڑھیاں اترتے وقت اپنے آگے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں ایک انسان کی بے بسی کا دکھ اپنے دل میں لیے چلا تھا!

گھومتی ندی۔ایک گھومتی خودنوشت

گھومتی ندی ،پروفیسر وارث کرمانی کی خودنوشت ہے جو رام پور کی رضا لائبریری سے ۲۰۰۶ میں شائع ہوئی تھی۔لگ بھگ ۴۵۰ صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کے ناشر ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی ہیں، کتاب میں جن کا تعارف بطور افسر بکار خاص درج ہے۔ گھومتی ندی ماہنامہ شبخون الہ آباد میں ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۵ تک قسط وار شائع ہوتی رہی تھی۔ پروفیسر کرمانی مدرس کی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔

اس خودنوشت کی ورق گردانی کے دوران مشفق خواجہ مرحوم کے سدا بہار کردار استاد لاغر مرادآبادی یاد آئے۔ ایسی ہی ایک آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد، استاد خواجہ صاحب سے اس کا معاوضہ طلب کرنے لگے تھے۔ فرمایا کہ مصنف کو اس کے لکھنے میں اتنی محنت نہ کرنی پڑی ہوگی جتنی مجھے اس کو پڑھنے میں صرف ہوئی ہے۔ خودنوشت سوانح عمریوں کا 'پوسٹ مارٹم' کرنے میں ڈاکٹر پرویز پروازی کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پس نوشت، پس پس نوشت اور اس کے بعد پس نوشت سوم میں ڈاکٹر پروازی نے یہ عمل جراحی بڑی بیدردی سے آزمایا ہے۔ کچھ کی اس عمل کے بعد سلائی کردی ہے، لیکن بہتیری تو ایسی ہیں کہ آپریشن کے بعد میز پر کھلے زخموں کے ساتھ جراح کے انتظار میں پڑی ہی رہ گئیں۔

ڈاکٹر پرواری نے ہندوستان بالخصوص پٹنہ سے شائع ہوئی تمام خودنوشتوں کو روکھا پھیکا قرار دیا ہے۔ گھومتی ندی ان کی نظر سے اوجھل رہی ورنہ شاید وہ بھی اس کی زد میں آجاتی۔

یہ ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ کل نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں جابجا ایک بیان کردہ موضوع سے یک لخت دوسرے پر جست لگانے کی علت پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ مصنف امریکہ کے پروفیسر بروس اور ان کی اہلیہ، جو علی گڑھ میں تحقیق کے لیے آئے ہوئے تھے، سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر یکایک دیوا شریف کی اودھی زبان کے اشعار اور کہاوتوں کا تذکرہ شروع ہوجاتا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ وارث کرمانی ۵۲۹۱ میں دیوا شریف میں پیدا ہوئے اور اب ریٹائر ہوکر دیوا شریف ہی واپس چلے گئے ہیں۔

یادوں کی برات میں حضرت جوش نے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ یادوں کی برات پاکستان سے شائع ہوئی تھی، پروفیسر وارث کو ہندوستان میں یہ محاذ خالی جاتا دیکھنا گوارا نہ ہوا اور انھوں نے بھی جوش کی تقلید میں اپنی رومان پرور داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک معاملہ تو ایسا ہوا کہ وہ اپنی

بیوی کی سہیلی کے خط کا جواب لکھنے کے دوران ان (سہیلی) پر عاشق ہو گئے۔۔۔۔ کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا، پھر دونوں کو بیوی کے ڈر سے چھوڑ دیا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنا ناول آگ کا دریا زہرا خاتون بیگم جرار حیدر کے نام کیا تھا، انہی زہرا خاتون پر بھی پروفیسر صاحب عاشق ہو گئے تھے۔ نتیجہ خاتون کی بیزاری کی صورت میں نکلا۔

کہیں کہیں مصنف نے اپنے بارے میں بڑی بیباکی سے الفاظ و تشبیہات کا استعمال کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں: "علی گڑھ یونیورسٹی میں، میں نے اپنے حلقہ احباب کو اخوان الشیاطین کا خطاب دے رکھا تھا، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ میں خود انہی میں شامل تھا۔
"

کتاب کے شروع میں چند حضرات کے تبصرے بھی اہتمام کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ جموں سے کسی جگناتھ آزاد نے لکھا ہے: " وارث کرمانی کی گھومتی ندی کا تیسرا "باب ارضِ کنعاں میں نے اپنی علالت کے باوجود اول سے آخر تک پڑھ لیا۔

جگناتھ آزاد صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ مذکورہ باب کو پڑھنے کے بعد ان کی علالت میں کیا رد و بدل ہوا؟ یہ معمہ بھی حل طلب ہی رہا کہ آزاد صاحب 'ارض

!کنعاں' پڑھنے سے پہلے علیل تھے یا اس کے بعد ہوئے

گھومتی ندی کے مطالعے کے دوران قاری، اس کتاب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔ اور آخر میں اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی دائرے میں گھوم رہا تھا۔

دائرہ وار ہی تو ہیں عشق کے راستے تمام

راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں

گھومتی ندی ایک خودنوشت سے زیادہ پروفیسر وارث کرمانی کا ذاتی روزنامچہ معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵۰ پر کھلے دل سے کیا ہے۔ اسی صفحے پر وہ مزید لکھتے ہیں: " میری اس سوانح حیات میں جو حصہ سوانح نہیں ہے، وہی قابل توجہ اور باعث دلچسپی ہو سکتا ہے۔"

حیرت انگیز طور پر یہ بات اس کے برعکس ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مذکورہ کتاب کا وہ تھوڑا سا حصہ جو سوانح ہے، وہی قابل توجہ ہے۔

پروفیسر صاحب نے ایک جگہ ظفر اقبال کے یہ اشعار نقل کیے ہیں اور خود بھی

:حیرت کا اظہار کیا ہے اور پڑھنے والے کو بھی اپنے انتخاب پر ششدر کر دیا ہے

رنگت ہی بدل گئی بدن کی

جب سانپ نے پہلی بار ڈسا

ڈھیلے ہیں پڑے ہوئے میاں تو

بیگم کا ابھی وہی ہے ٹھسا

پانی اتنا ملا کے اس نے

لسی کا کر دیا ہے لسا

ایک دلچسپ اور واقعات سے بھری پری خود نوشت میں سے اقتباسات نکالنا بہت دقت طلب کام ہوتا ہے، اور کیا لیا جائے اور کیا چھوڑا جائے، اس کا فیصلہ مشکل۔۔۔۔ لیکن گھومتی ندی میں ایسے اقتباسات نکالنا جن میں میں دلچسپی کا عنصر ہو، اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے آپ کو لگ بھگ ۴۵۰ صفحات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ کہتے ہیں کہ بعض سفلی عملیات میں الہامی کتابوں کو الٹا پڑھا جاتا ہے، اگر آپ اس پر عمل کرتے ہوئے گھومتی ندی کو بھی اسی طور برتیں تو منزل یک دم سہل ہو جائے گی اور کتاب کے آخری صفحے پر درج سب سے عمدہ پیراگراف سامنے ہوگا جو کچھ اس طرح ہے: "گھومتی ندی بہت سے پیچ و خم اور نشیب و

فراز سے گزرتی ہوئی اپنے مخرج تک پہنچنے والی ہے۔ میری پر شور زندگی گزر چکی ہے اور اس کی بہت دھندلی سی آواز بہت دور سے کانوں میں آ رہی ہے، کبھی ابھرتی اور کبھی ڈوب جاتی ہے۔ میرے چاہنے والے میرے سرپرست رخصت ہو چکے ہیں۔ ندی کے پانی میں غروب آفتاب کا منظر میرے سامنے ہے۔شاد عظیم آبادی کی طرح میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں۔ ساحل پر حسرت بہت کم ہے، البتہ حیرت زیادہ ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس ہمیں اس لیے حسب حال لگا کہ گھومتی ندی پڑھنے کے بعد ہم بھی اسے ہاتھ میں تھامے حیرت و حسرت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ حسرت بہت کم ہے، البتہ حیرت زیادہ ہے۔!

اثر غوری کی شاعری میں آسیبی کیفیات

آندھرا پردیش، حیدرآباد دکن سے ایک کرم فرمانے ہمیں محترم اثر غوری کے کلام پر حضرت نادر المسدوسی کا ستائشی تبصرہ ارسال کیا ہے اور تبصرے کے بارے میں ہماری رائے جاننا چاہی ہے۔

صاحبو ! خامہ بگوش نے کیا خوب کہا تھا کہ فی زمانہ جس رفتار سے شعراء کرام پیدا ہو رہے ہیں، اس کے مقابلے پر قارئین کی شرح پیدائش بہت کم ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ آگے چل کر یہ صنف بالکل ہی معدوم ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں قاری کی پریشانی کا تذکرہ غیر ضروری ہے، شعرائے کرام کی پیدائش پر شکر کرتے رہنا ہی کافی ہے۔ نیز اس عذاب الہی سے ڈرتے رہنا چاہیے جو شاعروں کی صورت میں قوموں پر مسلط کیا جاتا ہے۔"

نادر المسدوسی ، غوری صاحب کو دکن کے صف اول کے شعراء میں شمار کرتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ یہ صف کن اشخاص پر مشتمل ہے۔ حضرت مسدودی کے مطابق ،اثر غوری کا ایک وصف خاص جسے وہ ودیعت الہی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ ہے کہ جناب غوری کی ابتدا سے تاحال (1983 تا2005) شاعری کی سطح ہموار ہے۔ ہمارے ایسے

طفل مکتب کے مطابق یہ سطح اس قدر ہموار ہے کہ یہاں آپ کچھ بھی کاشت کر سکتے ہیں۔

اپنی بیان کی تائید میں نادر المسدوسی نے اثر غوری کے 1983 کے مجموعے سے یہ شعر نقل کیا ہے :

ہیں ویران کیوں شہر کے بام و در

اندھیرا تو کچے مکانوں میں ہے

اس کا موازنہ انھوں نے غوری صاحب کے 2005 کے مجموعے کے مندرجہ ذیل شعر سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دونوں مجموعوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا کلام کس زمانے کا ہے۔

مجھے تو لگتا ہے پاگل ہے گھر کا سناٹا

تمام رات جو دیوار و در میں رہتا ہے

دونوں مجموعوں کے درمیان 22 برس کا وقفہ ہے اور اس دوران بات ویرانی اور اندھیرے سے ہوتے ہوتے پاگل پن اور سناٹے کی کیفیت میں آ پہنچی لیکن حیرت کی بات ہے کہ مسدودی صاحب اسے محسوس نہ کرپائے۔

مسدوسی صاحب نے اپنے تجزیئے میں ایک ستم یہ بھی کیا ہے کہ جا بجا اثر غوری کے کلام کا موازنہ غالب، فیض اور ناصر کاظمی سے کرڈالا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" ملاحظہ فرمایئے کہ ناصر کاظمی کہتے ہیں:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اثر غوری کہتے ہیں:

چٹائی شام غم کی کیا بچھاؤں

میرے کمرے کا چھپّر بن رہا ہے

ایک اور جگہ حضرت مسدودی فرماتے ہیں:

" پرانے دور کے شاعر کی تہنائی اس کی ذات اور دوون خانہ کی حد تک محدود تھی۔ لیکن آج کے شاعر کی تنہائی سماج کے ہر فرد کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔"

مسدودی صاحب اپنے بیان کی تائید میں مزید لکھتے ہیں:

فیض کا یہ شعر دیکھئے:

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

غالب نے کہا تھا :

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

مسدودی صاحب نے مندرجہ بالا جید شعراء کی ٹکر پر اثر غوری کا یہ ٹکڑا نقل کیا ہے :

جدا ہو کر بھی ہم ایک دوسرے سے
جانے کیوں محبت کر رہے ہیں
آنکھ بند بھی کرلے تو دکھائی دوں گا
عمر بھر میں ترے کانوں میں سنائی دوں گا

ان اشعار کو سن کر ای این ٹی کے ڈاکٹروں کے کان کھڑے ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ ہمارے خیال سے عاشق اگر محبوب کے کانوں میں عمر بھر سنائی دیتا رہے گا تو محبو بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اس کی زندگی تو عمر بھر کے لیے ' گونجتے کانوں ' کا مرکب بن کر رہ جائے گی اور اس بات

کا قوی امکان بھی ہے کہ یہ گونجتے کان کچھ عرصہ میں بہنے بھی لگیں گے۔

محض گونجتے کانوں پر کیا موقوف، مسدودی صاحب نے اثر غوری کے کلام میں چند مزید پُرہول کیفیات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

" اثر غوری کا جدید لب و لہجہ دیکھئے کہ کس طرح انہوں نے چونکا دینے والی کیفیت پیدا کی ہے۔

رات بھر چیختے ہیں سناٹے

کوئی آسیب ہے مکان میں کیا

اثر غوری کے پہلے مجموعہ کلام 'بوند بوند روشنی' کا یہ شعر بھی اسی تنہائی کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ہر طرف خوفناک چیخیں ہیں

کس بھیانک کھنڈر میں اترا ہوں "

ہمیں تو ان اشعار کا قاری چونکنے سے زیادہ خوف زدہ ہوتا نظر آتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کو جناب اثر غوری کی سلامتی کی فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ خامہ بگوش کی رحلت کے بعد ان کے دیرینہ ہمدم، استاد لاغر مراد آبادی ہمیں ایک سالخوردہ چائے خانے میں بیٹھے مل گئے۔ ان چھ برسوں میں وہ مزید لاغر ہو چکے

ہیں لیکن بذلہ سنجی کا وہی عالم ہے جو خامہ بگوش کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ استاد نے یہ اشعار سن کر فرمایا کہ " اس قسم کے اشعار کے ساتھ تو کسی کھنڈر ہی میں اترا جاسکتا ہے۔ لیکن شاعر کو فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے پاس ان آسیبوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک موثر حربہ ہے اور وہ ہے ان کی اپنی شاعری ! "

انہی آسیبی کیفیات کو مزید بیان کرتے ہوئے جناب غوری کا تازہ شعر ملاحظہ ہو:

جھولتی ہے فکر کی کرسی اثر

اپنے کمرے کے ذرا اندر چلو

خامہ بگوش نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا:

" ہماری طرح بے شمار لوگوں کو پہلے بار معلوم ہوگا کہ شاعری کتنی مشکل سے وجود میں آتی ہے۔ ردیف اور قافیے کی حد تک تو کام آسان ہے لیکن احساس کی مکانیت اور زمانیت تخیل اور جذبے کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ منطق کو صورت پذیر کرنا، ہفت خوان رستم طے کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ "

خامہ بگوش نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، جناب اثر غوری کے معاملے میں یہ بات

:واضح ہوئی کہ اتنی مشقت کے بعد ہی اس قسم کے شعر کہے جا سکتے ہیں

بچے کی آنکھ لگ گئی اتوار بھی ہے کل
بتی بجھاؤ گہری بہت رات ہو گئی

اثر دفتر سے جلدی لوٹ آنا
کوئی ماں کے علاوہ بولتا ہے

حضرت مسدودی مندرجہ بالا اشعار پر فریفتہ ہو کر یہ نوید بھی سناتے ہیں کہ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد دکن میں ایک ریسرچ اسکالر انجم شافعی نے پروفیسر محمد انور الدین کی زیر نگرانی " اثر غوری فن اور شخصیت" کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا اور درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔

ہمارے خیال سے یہاں حضرت مسدودی سے مقالے کے عنوان کے بیان میں سہو ہوا ہے۔ مقالہ ضرور لکھا گیا ہوگا اور اس کی درجہ اول میں کامیابی پر تو ہمیں صد فیصد یقین :ہے، البتہ درست عنوان یہ رہا ہوگا

اور شخصیت FUNاثر غوری۔

چار ستمبر، 2011- عید کا پانچواں روز اور کتابوں کا اتوار بازار

کبھی جن راہوں میں اے بے وفا تو ساتھ ہوتا تھا

ترا دیوانہ اب ان راہوں سے تنہا گزرتا ہے

عید پر سکون گزری، شب و روز ہنگامہ خیز رہے، حکومت وقت کے کہنے پر تنخواہیں قبل از عید ادا کردی گئی تھیں، سو جیبیں بھی بھاری نظر آئیں پانچواں روز آتے آتے جو بچا تھا، سوچا کتابوں کے اتوار بازار میں لٹا آئیں، یہ خیال بھی پیش نظر تھا اس مرتبہ شاید ہی کتب فروش بازار کا رخ کریں لیکن صاحب یہ طبقہ ایسی عیاشی کا سوچ بھی کہاں سکتا ہے، سو 'کورم' پورا نظر آیا!

ایک شام قبل نجمہ عثمان صاحبہ کے اعزاز میں چھ بجے سے رات نو بجے تک جاری رہنے والی تقریب کا احوال لکھتے لکھتے شب کے تین ہوئے تھے لیکن اتوار بازار کا چسکہ، کیا کیجیے!

رات تین بجے گلشن اقبال میں غروب ہوئے تو علی الصبح صدر میں واقع اتوار بازار میں طلوع ہونا لازمی ٹھہرا طبیعت مضمحل تھی اور رہی سہی کثر موسم نے

تمام کی

مجال ہے کہ ایک پودا بھی اپنی جگہ سے ہل جائے، جنوبی پنجاب کے شہر مظفرگڑھ میں گزارے ہوئے دن اور وہاں کا ساکت و جامد موسم یاد آگیا۔۔۔۔

فضا میں بلا کا حبس تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ لو کی دعا مانگی جائے!

کراچی کا موسم کچھ ایسا ہی رہتا ہے، مشتاق یوسفی جو بات کہہ رہے ہیں، وہ ہمیشہ کراچی کے موسم پر صادق آتی ہی رہے گی، فرماتے ہیں کہ "کراچی کا موسم ایسا ہے کہ جو کپڑا بھی پہن کر نکلو، دو گھنٹے بعد غلط معلوم ہونے لگتا ہے"

خیال تھا کہ اس مرتبہ اتوار بازار میں "نیا مال" شاید ہی نظر آئے لیکن ایک پہچان کا کتب فروش آہستہ سے کان میں سرگوشی کرگیا: ' بائی صاب! دس منٹ میں آ جانا' --

یہ ایک پشتو بولنے والا شخص ہے، شاید شہر کراچی کا واحد ٹھیٹھ پشتو بولنے والا شخص جو اردو کی کتابیں فروخت کرتا ہے، مردم شناس ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ گاہک کی وضع قطع دیکھ کر دام کھرے کرتا ہو، جو دیجیے خامشی سے رکھ لیتا ہے، دام کم ہوں تو آہستگی سے احتجاج جسے گاہک سنی ان سنی کرکے آگے بڑھ جاتا ہے۔۔۔۔ ہاں! اس کو جاتا دیکھ کر نسوار کی پچکاری پھینکنا

اس کا حق بھی ہے اور بے ضرر سا ردعمل بھی!

ہم اس کے پاس پہنچے ۔۔۔۔ کچھ ہی دیر میں اس کے خفیہ پیغام کا عقدہ کھلا اور ساتھ ہی چار عدد پٹ سن کے مظبوط بورے بھی!

صاحبو! بوتل کھلنے کی بھی کیا خوشی ہوتی ہوگی جو آج "بورا" کھلنے پر گاہکوں کے چہروں پر دیکھی۔

ایک عرصے بعد شہر کراچی میں 'بورا' کھلنے پر اس میں صرف اور صرف پرانی کتابیں ہی برآمد ہوتی دیکھیں اور وہ بھی صحیح سلامت، سالم، مکمل حالت میں!

شکنجے ٹوٹ گئے، زخم بدحواس ہوئے
ستم کی حد ہے کہ اہل ستم اداس ہوئے

کتابیں خوب عمدہ حالت میں تھیں، تعارف پیش خدمت ہے:

تلاش حیات ۔وحید الدین قریشی

01- تلاش حیات گم گشتہ
وحید الدین قریشی
خودنوشت
صفحات: 302
سن اشاعت: 1991
مقام اشاعت: کراچی

قریشی صاحب کے اجداد کا تعلق سہارنپور سے تھا جہاں سے وہ ہجرت کرکے وسط ہندوستان کے ایک خطہ زمین بنام مالوہ کے قصبے بھانپور میں جا بسے تھے ، پھر وہاں سے کراچی کا رخ کیا!

وحید الدین قریشی صاحب نے اس کتاب میں اپنی اہلیہ کا نوحہ لکھا ہے جن کی وفات (1989) کے بعد انہیں ایسا گہرا صدمہ پہنچا کہ یہ کتاب وجود میں آئی۔ اپنی ایک تصویر کا عنوان رکھتے ہیں " اے مرگ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے" -- مصنف کو اپنی اہلیہ سے ایسی محبت کہ کتاب میں جہاں ان کے پہلی بار یرقان میں مبتلا ہونے کا احوال شامل ہے وہاں ان سے فون پر ہونے والی آخری گفتگو بھی شامل کی گئی ہے۔ عالم بالا میں اپنی اہلیہ کی ممکنہ پذیرائی کا منظر بھی بیان کیا گیا ہے!

اہلیہ سے عشقیہ خط وکتابت بھی جاری رہی، سو کتاب میں شامل ہے

صاحبو! کسی ستم ظریف کا کہنا ہے کہ "بیوی سے عشقیہ گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسان وہاں خارش کرے جہاں نہ ہو رہی ہو"

لیکن قریشی صاحب کی روداد کے ایک ایک لفظ سے ان کی اپنی اہلیہ کے ساتھ جس نوعیت کی شدید جذباتی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے احترام میں قاری کا دل بھی گداز ہو جاتا ہے چاہے قاری کی اپنی اہلیہ کتنی ہی خونخوار کیوں نہ ہو!

یہ تو وہی جانتا ہے جس کا عمر بھر کا ساتھ چھوٹ گیا ہو۔ عموما یہی دیکھا

گیا ہے کہ کسی ایک کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے غم میں گھلتا ہوا ساتھی بھی دنیا چھوڑ گیا۔ ان دنوں پٹنہ کے کلیم احمد عاجز کی دلچسپ خودنوشت "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" زیر مطالعہ ہے۔ ایک عجب پر اثر واقعہ اس کتاب میں پڑھا، کلیم صاحب کے پڑوس میں سید کبیر الدین رہتے تھے، چھوٹا ناگپور کے محکمہ جنگلات میں داروغہ تھے، بہت خاموش آدمی، لوگوں سے ملنا جلنا بہت ہی کم، جب گھر آتے تو گھر پر ہی رہتے، کبھی زور سے نہ بولتے، ان کی بیوی کلیم صاحب کی چچی تھیں۔ وہ بھی کم سخنی اور کم آمیزی میں اپنے شوہر کا جواب تھیں۔ میں بیوی میں بہت پیار تھا۔

پھر یوں ہوا کہ کلیم صاحب کی چچی بیمار پڑیں، چچا ملازمت پر تھے، چند ہی روز میں حالت بگڑ گئی، خبر بھی نہ جا سکی اور وہ چل بسیں۔

تین چار روز بعد کبیر صاحب آئے، کلیم احمد عاجز کو اچھی طرح یاد تھا کہ ان کے چچا یکنگر کے اسٹیشن سے سائکل پر آئے تھے، گھر کے دروازے تک سائکل تھامے چلتے آئے، کسی کی بات کا، مزاج پرسی کا کوئی جواب نہیں دیا، ساتھ میں کوئی سامان نہ تھا، مع سائکل گھر کے اندر داخل ہوئے، کلیم صاحب کی بہنیں، چچا کی لڑکیاں گھر میں تھیں، ان کے دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک بار سب چیخ کر رو پڑیں، کبیر چچا ایسے مہین ریشمی انسان جن کی آواز بھی کم سنی جاتی تھی،

اتنے زور سے ڈپٹ پڑے کہ سب کو سکتہ ہوگیا۔ سائکل سائبان تلے کھڑی کی، جس حال میں، جس لباس میں تھے اسی کمرے میں داخل ہوئے جس میں ان کی بیوی رہتی تھیں، دوبار گھوم کر کمرے کا جائزہ لیا، پھر اس پلنگ کے پاس آئے جس پر چچی سوتی تھیں، دیر تک سرہانے خاموش کھڑے رہے، پھر بیٹھ گئے اور چند ہی منٹ بعد پلنگ پر لیٹ رہے ۔۔۔۔۔ تمام دن کسی سے کچھ نہ بولے، قریب آنے والوں کو آہستگی سے چمکار کر واپس بھیجتے رہے

اگلے روز اسی پلنگ سے ان کا بھی جنازہ اٹھا!

رہے نام اللہ کا!

علی گڑھ کی تربیت گاہ اول ۔ محمد عشرت حسین

02- علی گڑھ کی تربیت گاہ
مصنف: محمد عشرت حسین
صفحات: 159
ناشر: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کراچی
سن شاعت: اکتوبر 1996

داستان کمال سید کمال

03- داستان کمال (فلمی اداکار سید کمال)
خودنوشت

تحریر: سید کمال

سن اشاعت: 1998

مقام اشاعت: کراچی

صفحات: 167

مصنف نے یکم جولائی 2005 کو اپنے دستخط سے یہ نسخہ کسی امان اللہ خاں کی خدمت میں خلوص کے ساتھ پیش کیا تھا۔۔۔۔

آج مورخہ 4 ستمبر 2011 کے روز مصنف کے خلوص کی قیمت لگی، مبلغ 50 روپے!

دلی جو ایک شہر تھا ۔ ملا واحدی

04- دلی جو ایک شہر تھا-یادگار لوگ، ناقابل فراموش باتیں
مصنف: ملا واحدی
ناشر: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس
سن اشاعت: 2003
صفحات: 196

سو وہ بھی ہے آدمی

05- سو وہ بھی ہے آدمی
اخباری کالمز کا مجوعہ

مصائب و آلام میں گھرے عام انسانوں کی داستانیں

سن اشاعت: 2002

ناشر: منشورات، لاہور

مجھولی کا آدم خور تیندوا

6-مجھولی کا آدم خور تیندوا
شکاریات
طابع: ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی
ناشر: مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور
سن اشاعت: 1991

صفحات: 318

ناریل کے درختوں کے نیچے۔ پھر نئے سلسلے بن گئے ہیں

نجمہ عثمان کے اعزاز میں ایک ادبی نشست

یوں تو ستمبر کا مہینہ کبھی کسی کے لیے ستمگر بھی کہلاتا ہے لیکن کیا کیجیے کہ اس مرتبہ ہر طرح کی قیامت اگست ہی جھیل گیا، عید آئی تو وقتی طور پر خوف کے سائے کچھ کم ہوئے، لوگ گھروں سے سہمے سہمے نکل توپڑے لیکن اجنبی علاقوں میں جانے سے کتراتے رہے۔ ایسے میں شہر کے ایک کونے میں مقیم ادیب، شاعر، ناشر، مدیر محترم معراج جامی کی جانب سے عندیہ دیا گیا کہ تین ستمبر 2011 کی شام سن 1960 سے برطانیہ میں رہائش پذیر شاعرہ، ادیبہ وافسانہ نگار محترمہ نجمہ عثمان کے نام ہوگی جو پچھلے چند ہفتوں سے کراچی میں مقیم ہیں۔ نجمہ عثمان اپنی والدہ کی شدید علالت کی وجہ سے کراچی تشریف لائی تھیں، چند دن قبل ان کی والدہ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا!

انا للہ وانا الیہ راجعون

دائیں سے۔معراج جامی، رضیہ سلطانہ، نجمہ عثمان، بیگم امیرالاسلام ہاشمی، امیر الالسلام ہاشمی، کلیم چغتائی

راقم السطور اپنی منزل پر پہنچا تو پانچ بجے کا وقت تھا اور تقریبا تمام شرکاءتشریف لا چکے تھے ۔ کمرہ کتابوں سے گھرا ہوا، کمر ٹکانے کو بھی کتابیں، پیش منظر میں بھی کتابیں اور پس منظر میں بھی کتابیں ہی کتابیں۔ جامی صاحب سے عرض کیا کہ کاغذات کو سہارا دینے کے لیے کچھ عنایت کیجیے تو ایک غیرمعمولی حجم کی کتاب ہی پیش کی گئی۔

معراج جامی صاحب نے محفل کا آغاز کیا اور اپنی نظمیں پیش کیں:

خوف آنے لگتا ہے
آدمی کی پستی سے

آؤ کوچ کر جائیں
بے ضمیر بستی سے

ظالموں سے بڑھ کر بھی
ظالم ایک ہوتا ہے
وہ جو ظلم سہتا ہے
اس کو پہلے مرنا ہے

دونوں بے وسیلہ ہیں
اس لیے محبت میں
عہد و پیاں کرتے ہیں
اور وسیلہ ملتے ہی
وہ بھی بھول جائے گی
میں بھی بھول جاؤں گا
!سامعین کی جانب سے بھرپور داد ملتی رہی

رضیہ سلطانہ صاحبہ کو دعوت کلام دی گئی، آپ ایک سرکاری افسر بھی ہیں، کسی نے کہا کہ کچی آبادی کی ڈائرکٹر ہیں، جامی صاحب نے ٹکڑا لگایا کہ " رضیہ کچی آبادی کی پکی "ڈائرکٹر ہیں۔

کاش اس شخص سے پیمان وفا ہو جائے
جو میری بات سنے اور خفا ہو جائے
جاکے منزل ہی پہ دم لیں گے میرے بیتاب قدم
میری پرواز طلب مثل صبا ہو جائے

اس کے بعد نثر و مزاح نگار جناب شجاع الدین غوری نے اپنا مضمون "بایو بجلی۔ہائے اور بجلی" پیش کیا۔ انہوں نے اس مضمون کی شان نزول کے بارے میں شرکاء کو آگاہ کیا کہ بایو گیس پر ایک اخباری مضمون پڑھنے کے بعد ان کی طبیعت اس جانب موزوں ہوئی۔ اس مضمون میں گوبر وغیرہ کا بیان غالب تھا اور ہم نے دو ایک احباب کو ناک پر !رومال رکھ کر اسے سنتے دیکھا

جامی صاحب نے اگلا نام پکارا۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعرہ بھی، آپ بھی ایک سرکاری ملازم ہیں۔ ڈاکٹر نگار نے اپنی ایک خوبصورت نظم خود کلامی پیش کی جسے بہت پسند کیا گیا۔

اس کے بعد تھے حضرت کلیم چغتائی ، آپ شاعر و ادیب ہیں، آپ نے ایک طویل نظم پیش کی، عنوان تھا "ماں" --- ماں جیسی ہستی کا ذکر ہو تو دل گداز ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔

!سننے والے سنتے رہے اور داد دیتے رہے

حسن ابدال سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست محترم محمد ظہیر قندیل کراچی میں عرصہ دو ماہ سے مقیم ہیں، پرانی کتابوں کے اتوار بازار میں کئی مرتبہ ملاقات طے ہوئی مگر :

۔۔اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں تو کبھی ہم نہیں

ملاقات ہوئی تو جامی صاحب کے یہاں

: ظہیر صاحب نے غزل پیش کی اور سننے والوں کے من کو بھا گئی

دلوں میں دوریاں اتنی نہیں تھیں
کبھی مجبوریاں اتنی نہیں تھیں

میری دولت سہارا دے رہی ہے
کہ مجھ میں خوبیاں اتنی نہیں تھیں

میری سب بیٹیوں کی عید ہوتی
خریدیں چوڑیاں اتنی نہیں تھیں
یہاں مارے گئے آہو تھے جتنے
ملیں کستوریاں اتنی نہیں تھیں
میری پرواز ہے جتنی پرندے
تیری لاہوتیاں اتنی نہیں تھیں

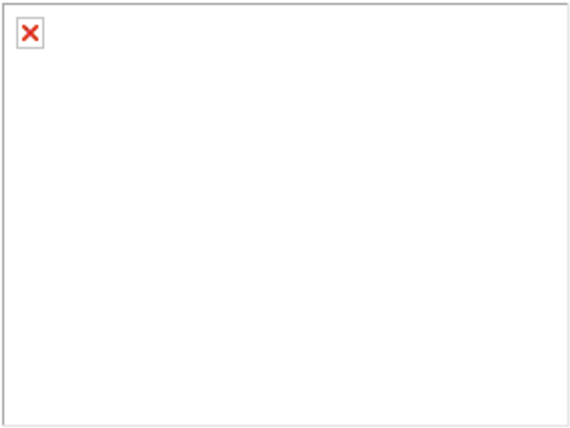

دائیں سے: محمد ظہیر قندیل، حکیم عبدالسلام اسعد، راقم الحروف

شرکاءکی جانب سے فرمائش ہوئی کہ مزید کلام سے نوازا جائے ظہیر صاحب نےایک اور غزل پیش کی، دو شعر ملاحظہ ہوں:

ناریل کے درختوں کے نیچے
نئے سلسلے بن گئے ہیں
زندگی نے رلایا بہت ہے
اس لیے مسخرے بن گئے ہیں

!موخر الذکر شعر (مقطع) پر حاضرین نے اسے ایک اچھوتا خیال قرار دیا

اس کے بعد منشی احمد انور صاحب نے اپنا ایک مضمون پیش کیا، فرمانے لگے کہ یہ مضمون صاحب خانہ کے اعزاز میں لکھا گیا ہے، نظریں معراج جامی صاحب کی جانب اٹھ گئیں۔۔۔۔۔۔

"مضمون کا عنوان تھا " اردو ادب کا ایدھی

جامی صاحب اپنے جابجا و برجستہ فقروں سے محفل کو دلچسپ بنائے ہوئے تھے، مذکورہ عنوان پر احباب نے دو ایک تیر پھینکے، ایک خاتون کی آواز آئی:

" بھئی اس عنوان پر ایدھی کا سرد خانہ یاد آگیا "

مضمون عمدہ تھا اور مزاحیہ پیرائے میں لکھا گیا تھا، چھوٹے چھوٹے فقرے خوب

مزہ دے رہے تھے۔

حکیم عبدالسلام اسعد مظفر گڑھ سے تشریف لائے تھے۔ اہل ذوق ہیں، اردو سے محبت کرتے ہیں، ایک اخبار بھی نکالتے ہیں، انہوں نے ایک غزل پیش کی، احباب نے بھاری دل سے شہر کے دگرگوں حالات کا نوحہ سنا، چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

تم چلوگے تو دیکھوگے ہر گام پر

خون ہی خون ہے، خون ہی خون ہے

صبح کے ملبوس پر، دامن شام پر

خون ہی خون ہے، خون ہی خون ہے

اب سر راہ یہاں کوئی کس سے ملے

ہیں سڑک پر بھی ملتے ہیں خطرے بڑے

ہم جہاں ہیں وہاں شارع عام پر

خون ہی خون ہے، خون ہی خون ہے

خواجہ رضی حیدر نے اپنی تین نظمیں پیش کیں، عنوانات تھے پاداش، بوسیدہ لفظ اور واپسی۔ سامعین نے دل کھول کر داد دی، افسوس کہ راقم الحروف انہیں خواجہ صاحب کے جلدی پڑھنے کی وجہ سے محفوظ نہ کرسکا، تقریب کے اختتام پر عرض کیا

حضور اجازت ہو تو انہیں نوٹ کرلیا جائے، اس پر خواجہ صاحب نے ایک تبسم فرمایا اور کہا "رہنے دیجیے، میں نہیں چاہتا کہ ان کا حوالہ کہیں آئے، میں ان چیزوں سے دور رہتا ہوں۔"

اس موقع پر خامہ بگوش بے طرح سے یاد آئے لیکن اس کا ذکر ہم کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں! (یاد رہے کہ یوٹیوب پر خواجہ صاحب کی ایسی کئی ویڈیوز موجود ہیں جن میں وہ اپنا کلام سناتے دیکھے جا سکتے ہیں)

تین عدد نظموں کے بعد خواجہ رضی حیدر کی پیش کی گئی ایک غزل کا خوبصورت مقطع ملاحظہ ہو:

میں نے پوچھا کہ کوئی دل زدگاں کی ہے مثال
کس توقف سے کہا اس نے کہ ہاں تم اور میں

نجمہ عثمان صاحبہ نے اپنا کلام پیش کیا، والدہ کا غم تازہ ہے، نظم کا عنوان تھا 'پھیلے ہوئے ہاتھوں کی دعا'، آواز بھرائی ہوئی رہی اور نظم کے آخر میں وہ رو پڑیں:

میں جب بھی وقت کی سنگینیوں کی زد میں آتی ہوں

کوئی کمزور لمحہ جب مجھے آنسو رلاتا ہے

سی ننھی سی خواہش

اور اپنی بے بسی سے خوف آتا ہے

تو جانے کون سی قوت میرے اندر سماتی ہے

میں اپنی ننھی منھی سی وہ خواہش بھول جاتی ہوں

بہت مضبوط ہر کر مسکراتی ہوں

مجھے کامل یقیں ہے

اس گھڑی بھی میری ماں

ہاتھوں کو پھیلا کر دعائیں مانگتی ہے !

نجمہ عثمان کی پیش کی گئی دو مزید غزلوں کے یہ اشعار دیکھئے :

زمانہ ساز ادا کا ہنر سمیٹ لیا

میرے لیے تو نہیں تھا مگر سمیٹ لیا

خیال و خواب کی دنیا کو پاش پاش کیا

وجود اپنا بکھیرا تو گھر سمیٹ لیا

کس کو معلوم دکھ کے جنگل میں
کون سی شاخ کس شجر کی ہے
آئینے عکس سے ہوئے محروم
یہ عنایت بھی چشم تر کی ہے

بزرگ شاعر امیر السلام ہاشمی صاحب سے کون واقف نہیں، مزاحیہ شاعری کے میدان میں ایک معتبر نام ہیں، آپ کی مشہور زمانہ تخلیق " اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں" کہنے کو تو مزاحیہ پیرائے میں کہی گئی ہے لیکن درحقیقت اپنے اندر تلخ حقائق کو سموئے ہوئے ہے۔

ہاشمی صاحب کے کلام سے محفل کا رنگ بدلا، چہروں پر مسکراہٹ آئی جو اس شہر میں کچھ عرصے سے نایاب ہو چلی تھی:

اس بڑھاپے میں بھی ان حسینوں سے اکثر
بہت بات کرنے کو جی چاہتا ہے
مگر جب ہمیں کوئی کہتی ہے انکل
تو ڈوب مرجانے کو جی چاہتا ہے

یوں تو صورت سے نہاہت واجبی سی لگتی ہو تم
اور سانحہ یہ ہے کہ اچھی واقعی لگتی ہو تم
مجھ کو ہے اردو میں ہے شدھ بدھ تم کو میں کیسے پڑھوں
اک حکایت در زباں پہلوی لگتی ہوں تم

جو ہوتے پیر تو چھو چھو کے دیکھتے اس کو
اس اس کے بعد دکھانے کو اس پر چھو کرتے
کبھی جو غیر سے وہ گفتگو کرتے
یہ آرزو تھی کہ پیچھے سے جاکے چھو کرتے
جگہ جگہ سے ہے مسکی ہوئی قبائے حیات
ذرا سی جان بھی ہوتی تو ہم رفو کرتے
(یہاں ہاشمی صاحب نے شرکاء سے کہا کہ یہ ذرا سنجیدہ بات ہو گئی)

امیر الاسلام ہاشمی صاحب، راقم کو " اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں" کی

ایک کاپی عنایت کی۔

ہاشمی صاحب نے یہ نظم اقبال سے انتہائی معذرت کے ساتھ لکھی تھی لیکن یہ من حیث القوم یہ ہماری موجودہ انفرادی و اجتماعی صورتحال کی عکاس ہے:

دہقان تو مرکھپ گیا، اب کس کو جگاؤں
ملتا ہے کہاں خوشہ گندم، کہ جلاؤں
شاہیں کا ہے گنبدِ شاہی پہ بسیرا
کنجشکِ فرومایہ کو اب کس سے لڑاؤں
مکاری و عیاری و غداری و ہیجان
اب بنتا ہے ان چار عناصر سے مسلمان
قاری اسے کہنا تو بڑی بات ہے یارو
اس نے تو کبھی کھول کے دیکھا نہیں قرآن
بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن
مکاری و روباہی پہ اتراتا ہے مومن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو
وہ رزق بڑے شوق سے کھاتا ہے مومن
شاہیں کا جہاں آج ممولے کا جہاں ہے

ملتی ہوئی ملا سے ، مجاہد کی اذاں ہے
مانا کہ ستاروں سے بھی آگے ہیں جہاں اور
شاہیں میں مگر طاقت پرواز کہاں ہے؟
کردار کا، گفتار کا، اعمال کا مومن
قائل نہیں، ایسے کسی جنجال کا مومن
سرحد کا ہے مومن، کوئی بنگال کا مومن
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مومن
ہر داڑھی میں تنکا ہے، ہر آنکھ میں شہتیر
مومن کی نگاہوں سے اب بدلتی نہیں تقدیر
توحید کی تلواروں سے خالی ہیں نیامیں
اب ذوقِ یقیں سے نہیں کٹتی، کوئی زنجیر
دیکھو تو ذرا، محلوں کے پردوں کو اٹھا کر
شمشیر و سِناں رکھی ہیں طاقوں میں سجا کر
آتے ہیں نظر مسندِ شاہی پہ رنگیلے
تقدیرِ امم سو گئی، طاؤس پہ آکر
مرمر کی سلوں سے کوئی بے زار نہیں ہے
رہنے کو حرم میں کوئی تیار نہیں ہے
کہنے کو ہر شخص مسلمان ہے لیکن

دیکھو تو کہیں نام کو کردار نہیں ہے
محمودوں کی صف آج ایازوں سے پرے ہے
جمہور سے سلطانی جمہور ورے ہے
تھامے ہوئے دامن ہے، یہاں پر جو خودی کا
مر مر کے جئے ہے، کبھی جی جی کے مرے ہے
پیدا کبھی ہوتی تھی سحر، جس کی اذاں سے
اس بندہ مومن کو اب میں لاؤں کہاں سے

محفل اختتام کو پہنچی، چائے اور فواکہات سے شرکاء کی تواضع کی گئی، گروپ میں تصاویر بنوائی گئیں۔۔ گھر کی تیسری منزل سے لوگ اترتے گئے، مرکزی دروازے پر بھی ایک دوسرے سے تبادلہ خیال جاری رہا، اجنبی لوگ ایک دوسرے سے آشنا ہوئے اور اجنبی نہ رہے، نجمہ عثمان صاحبہ کا حکم تھا کہ راقم السطور بھی تقریب میں شرکت کرے کہ اس سے قبل انٹرنیٹ پر فعال بزم قلم نامی گروپ کے توسط سے رابطہ استوار ہوا تھا، ان کا پیغام محترمہ عذرا اصغر نے پہنچایا تھا، اب مل لیے ہیں اور مزید ملاقاتوں کی بات ہو رہی ہے، نجمہ صاحبہ مزید ایک ہفتہ کراچی میں قیام کریں گی، وہ میرے ساتھ پرانی کتابوں کے اتوار بازار جانا چاہتی تھیں، ادھر جناب معراج جامی نے آگاہ کیا کہ اس پروگرام میں وہ بھی شامل تھے لیکن نجمہ صاحبہ نے آج رات ڈیفنس سوسائٹی کا قصد کیا اور ان کے

وہاں چلے جانے سے پروگرام متاثر ہوا! ۔۔

مظفر گڑھ والے حکیم عبدالسلام اسعد جنھوں نے محفل میں ' خون ہی خون ہے ' سنائی تھی، مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ اگر فلاں علاقے کی طرف جائیں گے تو مجھے بھی لیتے چلیں۔ علاقے کا نام سن کر مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہی خون رقصاں نظر آتا ہے۔ دریں اثناء اسی طرف جانے والا کوئی مہربان حکیم صاحب کو آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کرتا ہے اور ان کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

!احباب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہیں

معراج جامی صاحب کے گھر کے اوپر ناریل کے بے مثال درختوں کا طمانیت بخش سایہ ہے۔ محمد ظہیر قندیل کل صبح حسن ابدال جا رہے ہیں، انہی کے الفاظ میں:

ناریل کے درختوں کے نیچے

پھر نئے سلسلے بن گئے ہیں

دائیں سے: محمد ظہیر قندیل، غفور اسد، کلیم چغتائی، امیر الاسلام ہاشمی، نجمہ عثمان،
حکیم عبدالسلام اسعد، خواجہ رضی حیدر

آپس کی باتیں یا آپس کی کدورتیں

لاہور کے ناشر مقبول اکیڈمی کے مالک ملک مقبول احمد کا قلم کچھ عرصے سے رواں ہے۔ اردو ادب کی کئی اصناف میں دراندازی کر چکے ہیں، پذیرائی، گلشن ادب، سیاحت نامہ ترکی اور 50 نامور ادبی شخصیات کے عنوانات سے ان کی کتابیں شائع ہوئیں۔ سفر جاری ہے کے عنوان سے خودنوشت تحریر کی جس کا دوسرا ایڈیشن 2008 میں منظر عام پر آیا۔ ادب کی ایک صنف ایسی بھی ہے جس کا کوئی باضابطہ نام نہیں ہے، اس کو کئی نام دیے جا سکتے ہیں۔ ہم اس کو کدورت بھی کہہ سکتے ہیں، عداوت اور بغض کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس صنف ادب کی ترویج میں کئی نامور اہل قلم کا لازوال حصہ ہے اور یہ کوئی آج کا قصہ نہیں ہے۔ مصحفی و انشائ، شرر اور چکبست، مولانا آزاد اور مولانا ماجد، اوپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو، چراغ حسن حسرت اور ایم ڈی تاثیر، سرسید احمد خاں اور اکبر الہ آبادی (اقدار کا تصادم)، معرکہ حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی (سکھر کے اخبار کی زینت بنا)، منیر نیازی و جون ایلیا اور جمیل یوسف اور ظفر اقبال کے درمیان چپقلش سے ایک دنیا واقف ہے۔ اور پھر اُدھر نارنگ و شمس الرحمان فاروقی اور ادھر احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے درمیان رسوائے زمانہ معرکے اس پر مستزاد۔ موخر الذکر میں ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی بقدر ظرف اپنا اپنا

حصہ ڈالا اور اسے ترقی کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ ایک مرتبہ اہل قلم کانفرنس کے دوران تو احمد فراز اور اجمل نیازی دست و گریباں بھی ہو گئے تھے، فراز نے اجمل نیازی کی ریش پر ہاتھ ڈالا اور جواب میں نیازی صاحب نے کرسی اٹھالی تھی۔

ادبی چپقلشوں کے تعلق سے اس ضمن میں کئی لطیفے بھی مشہور ہوئے۔ مشفق خواجہ نے شاہد دہلوی اور جوش ملیح آبادی کے درمیان چپقلش کے تعلق سے نومبر 1995 کے ایک کالم میں یہ پر لطف واقعہ درج کیا:

مصطفیٰ زیدی نواب شاہ سندھ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔انہوں نے ایک ادبی کانفرنس منعقد" کی اور اس میں شاہد احمد دہلوی اور جوش ملیح آبادی کو مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان دونوں میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ مصطفیٰ زیدی نے ان دونوں بزرگوں کو کراچی سے نواب شاہ لے جانے کا کام طفیل احمد جمالی کے سپرد کیا۔ سفر ریل گاڑی سے کرنا تھا، اس لیے جمالی نے ایک گاڑی سے جوش صاحب کو روانہ کیا اور دوسری سے شاہد صاحب کو لے کر وہ خود نواب شاہ پہنچے۔ مصطفیٰ زیدی نے جمالی سے کہا: " اگر آپ ان دونوں کو ایک ہی گاڑی سے لے کر آتے تو مجھے استقبال کے لیے دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔ "۔۔

جمالی نے جواب دیا

آپ کو اپنی زحمت کا تو خیال ہے لیکن اس کا خیال نہیں کہ اگر یہ دونوں بزرگ ایک " ساتھ سفر کرتے اور راستے میں ان کے درمیان صلح ہو جاتی تو اس حادثے کا کون ذمہ " دار ہوتا؟

خواجہ صاحب نے مزید لکھا: "اس واقعے سے جو اخلاقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اس کی بنا پر ہمارا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی محفل میں یک جا نہیں " ہونا چاہیے۔

صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر جریدہ نقوش کو 1981 میں ادبی معرکے کے عنوان سے خاص نمبر چھاپنا پڑا تھا، اس سلسلے میں مواد کی کمی نہ تھی، پڑھنے والے لطف اندوز ہوئے۔ نقوش کے اس جریدے میں دلچسپ کارٹونز بھی شائع ہوئے۔ایک کارٹون میں مصحفی، انشاء اللہ خاں انشاء کی جانب پشت کیے کھڑے ہیں اور انشاء اپنے دونوں کانوں پر انگوٹھے رکھے، بقیہ انگلیاں عمودی حالت میں ہوا میں لہرا رہے ہیں، جوش اور شاہد دہلوی ایک دوسرے پر سیاہی والے قلم سے روشنائی کے چھینٹے اڑا رہے ہیں۔ اور ایک کارٹون تو ایسا کہ تمام صورتحال دیکھنے والے پر عیاں ہو جائے، اس میں دو ممکنہ مشاہیر ادب ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں، ایک حضرت اپنے حریف پر تلوار سے وار کر رہے ہیں جبکہ حریف اس

کو ایک ضخیم لغت پر روک رہے ہیں، عقب میں ان دونوں کے چند دیگر پروردہ و کاسہ لیس ، ایک دوسرے پر تیر اور بھالوں سے نبرد آزما ہیں، ایک لاغر سا شخص آپس کی اس لڑائی کی زد میں آکر مضروب حالت میں زمین پر ڈھیر پڑا ہے جبکہ ایک ہرے رنگ کے چہرے والا (عموما شیطان کو اس حلیے میں دکھایا جاتا ہے) کتابوں کی الماری کی اوٹ سے فساد کا یہ منظر دیکھ کر مسکرا رہا ہے!

خدا سلامت رکھے ڈاکٹر انور سدید کو کہ اس قوی صنف ادب اور اپنے ترکش، دونوں کو نہ صرف فعال رکھا ہوا ہے بلکہ شنید ہے کہ ترکش کا آخری تیر سائنایڈ میں بجھا کر اپنے آخری زندہ بچ جانے والے دشمن کے لیے محفوظ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ بعض لوگ انہیں 'زبان دراز سرگودھوی' کہتے ہیں اور بعض وزیر آغا کا مزارع۔ ڈاکٹر سدید نے تمام زندگی بقول شخصے ' نہر کے موگے توڑ' محکمے میں بحیثیت انجینئر نوکری کی ، ساتھ ساتھ ہی ساتھ وہ ادبی نہر کے موگے توڑنے میں بھی تندہی سے مصروف رہے۔ توڑ پھوڑ کا یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی کثیر التعداد تصنیفات اور ڈاکٹر صاحب کی احمد ندیم قاسمی سے چپقلش کو مشفق خواجہ نے ایک ہی جگہ کچھ یوں باندھا ہے : "ڈاکٹر انور سدید کی تصانیف پڑھنے کا کام خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا خطرناک

بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ذریعے حاصل کردہ علم تو بے ضرر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے اور قارئین میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے بلڈ پریشر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کے بجائے ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تازہ تصنیف ' دلی دور نہیں' پڑھنے کے دوران ہم پر کیا گزری۔ احمد ندیم قاسمی کا ذکر اس سفر نامے میں ایک درجن سے زیادہ مرتبہ کیا گیا ہے اور ہر جگہ سخن گسترانہ انداز میں ہے۔ حیرت ہے کہ دلی میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے احمد ندیم قاسمی کا پیچھا نہ چھوڑا، مثلاً 1988 کے لاہور کے فیض میلے میں بعض سخن ناشناسوں نے قاسمی صاحب کو کلام نہیں سنانے دیا۔ اس واقعے کا دلی یا دلی کے سفر نامے سے کوئی تعلق نہیں لیکن داد دیجیے ڈاکٹر سدید کو کہ انہوں نے اس واقعے کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے۔ انداز یہ اختیار کیا ہے جیسے سخن ناشناسوں " کی یہ حرکت انہیں ناگوار گزری ہو لیکن بین السطور سے دلی مسرت پھوٹی پڑتی ہے۔

مقبول اکیڈمی کے مالک ملک مقبول احمد نے حال ہی میں (2011) 'آپس کی باتیں' کے عنوان سے کتاب مرتب کی ہے۔ مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر سدید کے جولائی 1993 سے جولائی 2001 تک مختلف جرائد میں شائع ہونے والے انٹرویوز کو یکجا کیا گیا ہے۔ کتاب میں کل اٹھارہ انٹرویوز شامل ہیں اور کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے ڈاکٹر سدید سے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں سوال نہ پوچھا ہو، حسن اتفاق یا قباحت اتفاق ہے، ڈاکٹر سدید کے جوابات ملتے جلتے (جلتے کو زبر سے پڑھا جائے) نظر آئے۔

یہاں ہمیں مشفق خواجہ مرحوم ایک مرتبہ پھر یاد آئے، فرماتے ہیں: ڈاکٹر وزیر آغا سے ڈاکٹر انور سدید کی دوستی مثالی ہے، مگر دوستی کا لفظ تعلقات کی گہرائی اور نوعیت کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا، معاملہ دوستی سے کچھ آگے کا معلوم ہوتا ہے۔ موصوف سے سوال کیا گیا کہ اگر آپ کی ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا سے نہ ہوتی تو آپ کی زندگی میں کس چیز کی کمی ہوتی ؟۔۔انہوں نے جواب دیا: "میری زندگی ادھوری رہتی، میں اردو ادب سے بھاگا ہوا فرد بھی شمار نہ ہوتا، محکمہ آب پاشی کے ایک گم نام کارکن کی حیثیت میں ملازمت سے ریٹائر ہو جاتا۔ جس دن وزیر آغا سے ملاقات نہیں ہوتی، میں اسے اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔"

خواجہ صاحب تبصرہ کرتے ہیں: "خوشی کی بات یہ ہے کہ محمکہ آب پاشی کا ایک گمنام کارکن آج محکمہ نمک پاشی میں ملک بھر شہرت رکھتا ہے۔"

بات اگر محض طنز کے پیرائے میں کہی گئی ہو تو غنیمت لیکن یہاں معاملہ اس سے کچھ سوا ہے۔ طنز کے بارے میں ایک جید نقاد کا کہنا ہے کہ " طنز کی تخریبی کاروائی صرف ناسور پر نشتر چلانے کی حد تک ہے، طنز کے لیے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔"

آپس کی باتیں' میں شامل کردہ انٹرویوز میں ڈاکٹر سدید شکر کو کونین میں لپیٹ کر' پیش کرتے نظر آتے ہیں!

ہمارے خیال سے آپس کی باتیں کا درست عنوان آپس کی کدورتیں ہونا چاہیے کہ یہ کتاب ایسی باتوں سے پُر ہے جن میں قاری کے ہاتھ بھی ماسوائے کدورت کے، اور کچھ نہیں آتا۔ ملک صاحب نے کتاب شائع تو کردی لیکن اس کے جواز میں انہیں پیش لفظ بھی لکھنا پڑا۔ کتاب کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری ناقص رائے میں اس کا عنوان پیش لفظ سے بہتر پیش قبض ہونا چاہیے تھا۔

ملک مقبول پیش لفظ میں لکھتے ہیں: "مجھے حیرت ہوئی کہ ان (انور سدید) کے

بارے میں جو باتیں ایک کان سے دوسرے کان تک خفیہ سرگوشی کی صورت میں پہنچائی جاتی تھیں ان میں انور سدید کی کردار شکنی کا زاویہ ہوتا تھا لیکن ان سے ملاقات ہوئی اور لمبی گفتگو ہوئی تو وہ افواہوں سے پھیلائے ہوئے تاثر سے مختلف انسان نظر آئے۔ میں نے یہ کتاب چھاپنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ انور سدید ہر سوال کے جواب میں نہ صرف اپنا باطن عریاں کرڈالتے ہیں بلکہ ادبی معاشرے میں پھیلی ہوئی گرد کو بھی صاف کر دیتے ہیں "

پیش لفظ میں تو ملک صاحب کی رائے تبدیل ہوتی دیکھی گئی لیکن ان تمام انٹرویوز کو پڑھنے کے بعد اس رائے کے ایک مرتبہ پھر تبدیل ہوجانے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ملک صاحب، ڈاکٹر سدید کی کتابوں کے پرانے ناشر ہیں، ان کی رائے کے تبدیل ہوجانے کا براہ راست تعلق ان کے کاروبار سے ہے اور ایک کامیاب کاروباری شخص ہونے کے ناطے ملک صاحب ہرگز یہ گوارا نہیں کریں گے۔

باطن عریاں کرکے ادبی معاشرے میں پھیلی ہوئی گرد صاف کرنے کا خیال اچھوتا ہے۔، بشرطیکہ گرد صاف کرنے والے کا،اسے پھیلانے میں اپنا ہاتھ نہ ہو۔

ملک صاحب نے پیش لفظ میں جناب شبیر احمد خان میواتی کا خصوصی شکریہ ادا

کیاہے جنھوں نے ان انٹرویوز کو کتابی شکل میں چھپوانے کے خیال کو سب سے زیادہ تقویت دی اور ذاتی ذخیرے سے تمام انٹرویوز کے تراشے فراہم کیے۔ ہم ٹھہرے سدا کے قنوطی، اس 'میوے' سے کچھ انتخاب پیش خدمت ہے۔ یاد رہے کہ پہلے ہی انٹرویو میں (صفحہ ۱۱) ڈاکٹر سدید نے یہ انکشاف کیا ہے کہ وہ دریائے جہلم کی بڑی طغیانی کے دنوں میں پیدا ہوئے تھے۔ ہم اپنے قارئین سے امید کرتے ہیں کہ وہ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اقتباسات پڑھیں گے:

جواز جعفری کا سوال: اردو تنقید میں سب سے بڑی تنقید کس نے لکھی؟

انور سدید: "کیا آپ کا اشارہ عطاء الحق قاسمی کے اس جملے کی طرف ہے کہ جو نقاد ان کے 'پیر' کے ایک افسانے 'بین' کی تعریف نہیں کرتا وہ باسٹرڈ ہے۔"

جولائی 1982

☆

۔"گارساں دتاسی کے بعد سب سے زیادہ ادبی جائزے میں نے اور سلیم اختر نے لکھے ہیں۔"

۔"میں احمد ندیم قاسمی سے گزارش کروں گا کہ وہ اس ادیب کو نوبل ایوارڈ دلائیں، ان کی رسائی سرکاری دربار تک ہے۔"

۔"میں ڈاکٹر سلیم اختر پر رائے دینے کا اہل نہیں ہوں، وہ سچ سننے سے گریز کرتے ہیں اور تحسین دروغ آمیز کے لیے کان کھلے رکھتے ہیں، ان کا ریاض ابھی

"نامکمل ہے۔

۔"پہلے ان کا (ڈاکٹر سلیم اختر) خلوص وہاں تک جاتا تھا جہاں تک ان کی سائیکل جاتی تھی، اب وہاں تک جاتا ہے جہاں تک ڈاکٹر یزدانی کی کار انہیں لے جاتی ہے۔"

۔"میں نے ڈاکٹر وزیر آغا کو اور احمد ندیم قاسمی کو ایک خط لکھا تھا کہ وہ میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرما کر اکھٹے چائے نوش کریں، قاسمی صاحب نے جواب ہی نہیں دیا۔"

۔"سلیم اختر کی رائے ان کی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے ہر ایڈیشن پر بدل جاتی ہے، جو ادیب اچھی چائے نہ پلائے وہ قابل مذمت، جو پلا دے وہ قابل تعریف ہے۔"

۔"میں انشاء اللہ اپنا دفاع راجپوتی قلم سے کروں گا۔اس جھوٹے الزام (انور سدید کی کتاب سلیم اختر کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا چربہ ہے۔راقم) پر میں سلیم اختر کا دامن حشر کے روز بھی پکڑوں گا لیکن بقول شخصے وہ تو خدا اور اسلامی بنیادوں پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔عید کے دن بھی بیت الخلا میں بیٹھے رہتے ہیں۔" (افسوس کہ ڈاکٹر سدید یہ بھول گئے کہ عورت، جنس اور جذبات جیسی تخلیقات بیت الخلا ہی میں بیٹھ کر لکھی جاتی ہیں۔راقم)

جولائی1982

☆

۔ ”مشفق خواجہ بنیادی طور پر محقق ہیں اور محقق بھی اس قسم کے جو پرانی کتابوں میں سے اغلاط تلاش کرکے ان کی تصحیح کرتے ہیں۔“

۔ ”ڈاکٹر سلیم اختر نفسیات کے بہت بڑے نقاد ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے صرف نصابی سطح کی نفسیات پڑھی ہے اور اسے بھی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔“

۔ ” ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالے پر وزیر آغا نے اختلافی نوٹ لکھا لہٰذا سلیم اختر ناراض ہو گئے۔“

۔ ”عطاء الحق قاسمی کا پیرس کا ایک سفرنامہ فنون میں چھپا تو محترمہ افضل توصیف نے فنون ہی میں ایک خط کے ذریعے بتایا کہ اس سفرنامے میں جن مقامات اور واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ تو پیرس میں موجود ہی نہیں، یہ سفرنامہ تو ڈارئنگ روم میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے“

۔ ” ہجرہ ایوارڈ بھی آپ کے سامنے ہے، ایک سال تو وہ ملتا ہے ڈاکٹر سلیم اختر کو اور پھر امجد اسلام امجد کو، شاید شاعری کا معیار ہی امجد اسلام امجد رہ گیا ہے۔“

۔ ”میں احمد ندیم قاسمی کی بخشش کی دعا کروں گا، ترقی پسندوں میں وہ جنت کے حقدار ہیں، وہ اپنے آپ کو کمیونسٹ مسلمان شمار کرتے ہیں۔“

ماہنامہ کھیل رنگ۔ دسمبر 1985

☆

۔"ڈاکٹر سلیم اختر پر اب تھکن کے آثار نظر آ رہے ہیں"

۔"مجھ میں حسد کی شدید کمی ہے۔"

۔"احمد ندیم قاسمی کی روحانیت پر ترقی پسندی غالب آ گئی اور وہ مادہ پرستی میں دب گئے، ان کے ہاں انسان دوستی محض نعرہ ہے لیکن باطن میں مفاد پرستی اور آدم دشمنی کا عنصر موجود ہے۔"

۔"احمد ندیم قاسمی کا یہ ارشاد ان کی پوری شخصیت کا آئینہ دار ہے کہ انور سدید کا نام لینے سے ان کی زبان پلید ہو جاتی ہے۔"

۔" میں وزیر آغا کے علم کی چاندنی میں غسل ماہتابی کرتا رہا ہوں، میں نے (احمد ندیم) قاسمی صاحب کے جلال کی کرنیں دور سے محسوس کی۔"

تحقیقی مقالہ 'انور سدید کی ادبی خدمات' کے لیے سوالنامہ۔جون 1986

☆

۔" ادب میں تعصب کی، خواہ وہ ذاتی ہو یا گروہی، کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔"

۔" میری تحریریں سوچ کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔"

۔" میں نے لودھراں میں انشائیہ کانفرنس میں گزارش کی تھی کہ انشائیہ پر مہر لگانے کا کام ڈاکٹر سلیم اختر کو سونپ دیا جائے کیونکہ وہ خود انشائیہ لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے لیکن انشائیہ کی بنیاد ہلانے کے درپے ہیں۔"

ماہنامہ نیرنگ خیال، راولپنڈی، فروری 1990

☆

حسن رضوی کا سوال: ابھی آپ احمد ندیم قاسمی کے انٹرویو کے حوالے سے ایک جملے کا حوالہ دے رہے تھے، کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ ایسا جملہ کسی سے اکتا کر ہی ادا کیا جاتا ہے۔آخر آپ نے بھی تو دشنام طرازی کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی" ؟

ڈاکٹر سدید کا جواب: ہمارے بزرگ قاسمی صاحب ادبی دنیا میں ستر سال سے سیاست آزمائی کر رہے ہیں، انہیں ابھی تک کیا ادبی معاشرے کے رسوم و آداب سے بھی آگہی حاصل نہیں ہوئی ؟

۔" ڈاکٹر سلیم اختر زود رنج نقاد ہیں، مطالعے کو ہضم کرنے سے پہلے اگل دیتے ہیں، کاتتے (کتاب میں یہ لفظ اسی طرح لکھا گیا ہے، یہ کاتب کی غلطی ہے یا پروف ریڈر کی ڈاکٹر سلیم اختر سے ہمدردی، خدا ہی جانے۔راقم) سے پہلے دوڑنے لگتے ہیں اور زیادہ دوڑتے ہیں، ان کی تنقید مالی مفادات اور مخصوص مقاصد کی تابع فرمان ہے۔"

۔" مجھے وزیر آغا کے قریب ہونے کا اعزاز یقیناً حاصل ہے لیکن میں نے ان کا دفاع کرنے کے بجائے ادب کا دفاع کیا ہے۔"

۔" یہ اطلاع شاید آپ سب کے لیے حیرت انگیز ہو کہ وزیر آغا اپنے خلاف لکھے دشنام کے پشتاروں کو پڑھتے ہی نہیں، مجھے یہ سب کچھ پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے اور جواب لکھ کر بھی میں عجیب لطف وانبساط حاصل کرتا ہوں۔"

گفت و شنید، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور۔1990

☆

"۔" بدقسمتی سے احمد ندیم قاسمی نے اپنے بی اے کے مطالعے کو آگے نہیں بڑھایا۔

۔" احمد ندیم قاسمی کی شخصی کمزوریاں اور ان کا بڑھاپا ان کے آڑے آرہا ہے، اسی لیے ان کو مشاعروں سے نکال دیا جاتا ہے یا بلایا ہی نہیں جاتا، مجھے تو ان پر رحم آتا ہے، "

۔

۔" عطاء الحق قاسمی کی شاعرانہ حیثیت کو نذیر قیصر نے مشکوک قرار دیا ہے اور دعوی کیا ہے کہ وہ ان (عطاء الحق قاسمی) کو غزلیں لکھ کر دیتے رہے ہیں ۔ "

ماہنامہ صدائے انقلاب، لاہور ا مئی 1990

☆

۔" میں تو احمد ندیم قاسمی کا نیاز مند ہوں، ان کا خورد ہوں، ان کی بے پناہ عزت کرتا ہوں، انہیں ادب میں ان کے شایان شان مقام دیتا ہوں۔ میں نے حال ہی میں ان کی 79 ویں سالگرہ اپنے گھر پر منائی۔ "

روزنامہ رفاقت لاہور، 2 جنوری 1996

☆

'آپس کی بات' کی قیمت ساڑھے چار سو روپے ہے، ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ قیمت دے کر ادبی تنازعات 'مول' لیے ہیں، لیکن اس کے بغور مطالعے کے بعد ہم پر کئی انکشافات ہوئے جن کے بعد یہ سودا ہمیں گراں محسوس نہیں ہوتا۔

اول: ڈاکٹر سلیم اختر عید کے دن بیت الخلا میں بیٹھے رہتے ہیں۔

دوم: ڈاکٹر انور سدید دریائے جہلم کی بڑی طغیانی کے دنوں میں پیدا ہوئے تھے۔

سوم: ڈاکٹر وزیر آغا اپنے خلاف لکھے دشنام کے پشتاروں کو پڑھتے ہی نہیں تھے، وہ سب تو ڈاکٹر انور سدید نہ صرف مزے لے کر پڑھا کرتے تھے بلکہ ان کے جوابات بھی ایک عجیب لطف اور انبساط کے ساتھ دیا کرتے تھے۔

چہارم: ڈاکٹر انور سدید ایک نجیب الطرفین راجپوت ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ان کے آباء واجداد نے کب اسلام قبول کیا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اس بات کا علم (ڈاکٹر سدید کو بھی نہیں ہے (بحوالہ:1991 کا انٹرویو

پنجم: ڈاکٹر انور سدید کو زبان دراز سرگودھوی کا خطاب جناب عطاء الحق قاسمی نے دیا تھا۔

ششم: عطاء الحق قاسمی صاحب کو جوابی حملے میں اللہ دتہ کالمی کا خطاب دینے والے ڈاکٹر انور سدید تھے۔

ہفتم: ڈاکٹر انور سدید کو 'وزیر آغا کا مزارع' کا خطاب ڈاکٹر سلیم اختر نے دیا تھا۔

ہشتم: ڈاکٹر انور سدید، پانی سے نہیں بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علم کی چاندنی سے غسل کرتے تھے۔

نہم: مشفق خواجہ بنیادی طور پر ایک ایسے محقق تھے جو پرانی کتابوں میں سے اغلاط تلاش کرکے ان کی تصحیح کرتے ہیں۔ (یہ جان کر ہمیں اس لیے اور زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ گزشتہ ایک ماہ سے ہم مشفق خواجہ صاحب کو ایک اہم ادبی شخصیت جان کر ان کے سینکڑوں کالمز کا ایک انتخاب مرتب کر رہے ہیں اور اب یہ کام ہمیں رائیگاں جاتا محسوس ہو رہا ہے۔)

دہم: یہ 'دہم' ہمارے قارئین کے سر پر دھم سے لگے تو پیشگی معذرت: ڈاکٹر انور سدید نے خلیج کی جنگ صدر جارج بش کے ساتھ بغداد میں لڑی تھی، وہ اس فوجی طیارے میں بھی سوار تھے جو فوجی بنکروں میں گھس گیا تھا، وہ بوسنیا ہرزو وینا کے مجاہد عبد العزیز سے بھی ملاقات کر چکے ہیں (جولائی 1993۔انٹرویو)۔۔ لیکن ذرا ٹھہریے! یہ تمام جنگی معرکے انہوں نے خواب میں سر کیے ہیں، حقیقی زندگی کے ادبی معرکوں میں وہ حریفوں کے بنکروں میں گھسنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں، یہ ہم ان کے زندہ بچ جانے والے حریفوں سے دریافت کریں گے۔

گیارہ: ڈاکٹر انور سدید ایک اچانک موت کے خواہشمند ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انہیں رحمان مذہب جیسی موت پسند ہے جو لکھتے لکھتے اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ (کاش کہ کوئی ادب کا محقق ان لوگوں کی فہرست بھی مرتب کرے جو ڈاکٹر صاحب کی تحریریں پڑھتے پڑھتے اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں)

کتاب ’آپس کی باتیں‘ ،کے آخر میں پروفیسر صابر لودھی کا ایک تبصرہ شامل ہے، وہ لکھتے ہیں:

جب انور سدید محکمہ انہار کے طویل و عریض بنگلے سے نکل کر اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہوئے تو بے حد خوش تھے۔ ان کے پرانے ساتھی نے پوچھا:

"اس مکان میں دل لگ جائے گا"؟

انور سدید نے مسکرا کر جواب دیا:

"میں طویل عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں پہنچ کر انسان کو چھ فٹ زمین کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں دست بدستہ عرض ہے کہ ’آپس کی باتیں‘ کے مطالعے کے بعد اس کے قاری کو چھ فٹ زمین ہی کا خیال آئے گا۔

ممکن ہے کہ بہت سے لوگ یہ اعتراض کریں کہ ہم نے ’آپس کی بات‘ میں جملہ معترضہ پر مبنی اقتباسات ہی کیوں نکالے تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جب ملک مقبول احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی یا احمد ندیم قاسمی کے انٹرویوز پر مشتمل کتاب مرتب کریں گے تو جواب آں غزل کے طور پر اس میں سے بھی ہم اقتباسات پیش کریں گے۔

آپس کی باتیں۔مرتب: ملک مقبول احمد۔مقبول اکیڈمی، لاہور۔2011

قصہ بے سمت زندگی کا

بی بی پور، ضلع جہان آباد، بہار میں پیدا ہونے والے پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی خودنوشت 'قصہ بے سمت زندگی کا' کے عنوان سے 2008 میں تحریر کی تھی، دو برس کے قلیل عرصے میں 2010 میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ دورہ ہندوستان کے دوران ڈاکٹر فاطمہ حسن کو مصنف نے خودنوشت کی ایک کاپی اپنے دستخط کے ساتھ پیش کی، کتاب کراچی آئی اور مشفق خواجہ مرحوم کے ہم زلف پروفیسر ذوالفقار مصطفیٰ ، جنہیں خواجہ صاحب از راہ تفنن 'ہم زلف کار' کہتے تھے، اسے فاطمہ حسن سے عاریتا لے آئے۔ ادھر پروفیسر صاحب سے اس کتاب کی نقل بنوانے کی درخواست کرنے میں ہمیں کوئی عار نہ تھی۔

سترہ ابواب پر مشتمل خودنوشت میں پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی زندگی کے حالات ، سیاسی واقعات، نوکری کے مسائل، واقف کاروں اور دوستوں کا احوال وغیرہ تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ البتہ پڑھنے والوں کے ساتھ یہ ستم بھی روا رکھا ہے کہ کتاب کے ابتدائی باب میں اپنے خاندان والوں کا تذکرہ اس طور کیا ہے کہ قاری ان کے بچوں، بچوں کے بچوں اور خاندان کے دیگر افراد کی تفصیل پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے اور اسے یہ خودنوشت سے زیادہ مصنف کا

خاندانی شجرہ معلوم ہونے لگتا ہے۔کتاب کا انتساب بھی انہوں نے اپنے پوتے پوتیوں کے نام کیا ہے۔

قصہ بے سمت زندگی کا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔368 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی بھارت میں قیمت 400روپے مقرر کی گئی ہے۔کتاب کے پیش لفظ کا پہلا جملہ ہے: "میں نے اپنی آپ بیتی کیوں قلم بند کرنا چاہی، اس کا سراغ مجھے خود نہیں ملتا۔" ۔کتاب کے حرف بہ حرف مطالعے کے بعد ہم پروفیسر صاحب کے ہم خیال ہوگئے ہیں۔پیش لفظ میں خودنوشت سوانح عمریوں کے باب میں ایک جگہ ساقی فاروقی کی خودنوشت 'پاپ بیتی' کو 'پاپ نامہ' لکھا گیا ہے۔ساقی فاروقی خوش قسمت ہیں کہ ان کی 'پاپ بیتی' کو اس قدر شہرت مل رہی ہے کہ اب 'پاپوں' سے بھرپور اس آپ بیتی کے متبادل نام بھی تجویز کیے جانے لگے ہیں ۔ اسی طرح یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ بدنام عورت کی کتھا' کے عنوان سے فہمیدہ ریاض نے اپنی خودنوشت تحریر کی' ہے۔فہمیدہ ریاض نے شاید یہ خودنوشت، کشور ناہید کی آپ بیتی 'بری عورت کی کتھا' کی ٹکر پر لکھی ہے اور انہیں کی طرح اسے سب سے پہلے ہندوستان سے شائع کروایا ہے، ہم منتظر ہیں کہ فہمیدہ ریاض اسے پاکستان سے کب شائع کرواتی ہیں،اس وقت تک ہم ان کی شاعری پڑھ کر ہی کام چلالیں گے ۔

وہاب اشرفی تقسیم ہند کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تین چار دنوں کے محاصرے کے بعد بلوائی گاؤں میں داخل ہو گئے، ایک کے مقابلے پر تین سو کا معاملہ تھا، گاؤں کی اکثر عورتیں کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دیتی رہیں۔ کنواں لاشوں سے پٹ گیا، بلوائی اوپر سے پتھر بھی پھینکتے رہے کہ کوئی زندہ نہ بچ جائے۔ ایک عورت نے اپنے دودھ پیتے بچے سمیت کنویں میں کود گئی، کسی نے کنویں میں ایک ٹوکری بھی پھینک دی جو اس عورت کے لیے پتھروں سے بچاؤ کا سبب بن گئی۔ تین روز بعد پولیس گاؤں میں آئی اور تانک جھانک شروع ہوئی تو ماں اور اس کے بچے کو بے ہوشی کی حالت میں کنویں سے نکالا گیا۔ بعد ہیں ماں کا انتقال ہو گیا اور بچہ پاکستان چلا گیا جہاں وہ ادھیڑ عمر ہو کر زندگی بسر کر رہا ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنے خاندان کے کئی لوگوں کے پاکستان ہجرت کر جانے کا تذکرہ تفصیلا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس انداز سے کہ گویا یہ بھی ایک فاش غلطی تھی، پاکستان جانے والا ان کا کوئی عزیز خوش نہیں رہا۔ اپنے پھوبھی زاد بھائی عبدالمنان کے بارے میں لکھتے ہیں (ص 94) :

" وہ بیحد ذہین آدمی تھے لیکن المیہ یہ ہوا کہ وہ بھی ایک طرح سے ہجرت کر گئے، ریلوے کے ملازم تھے، جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں ملازمت

کریں گے یا پاکستان میں تو انہوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ فیصلہ ان کے لیے ایک بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ پاکستان کے طور طریق سے ہمیشہ نالاں رہے۔ اس حد تک کہ اپنے فیملی کے ممبران کو ہندوستان ہی میں رکھتے، گاہے گاہے ہندوستان آتے اور اپنے کرب کا اظہار کرتے۔"

پروفیسر صاحب کے اپنے لیے ان کا ہندوستان میں رہنا کس قدر سود مند ثابت ہوا، اس کا اندازہ ان کی خودنوشت کے پندرھویں باب 'میری گرفتاری' کے مطالعے کے بعد ہوتا ہے، یہ گرفتاری اس وقت ہوئی جب پروفیسر شمس الرحمان فاروقی اور برطانیہ سے آئے ہوئے قیصر تمکین ان کے گھر رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ پروفیسر وہاب اشرفی خوشی خوشی گھر آئے اور دھر لیے گئے۔ پولیس ان کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے موجود تھی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے بہار یونیورسٹی کے سروس کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے امیدواروں کے انتخاب میں 'مسلمانوں' کو اولیت دی تھی۔ اس بارے میں وہ صفحہ 343 پر لکھتے ہیں:

"بائیس فیصد مختلف درجات کے مسلمان کامیاب ہوئے تھے، ان میں اردو، فارسی اور عربی کے بھی لوگ تھے، یہ انتخاب تاریخی تھا اور بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل قبول۔ میرے خلاف ایک خاص حلقے میں مخالفت کی لہر دوڑ گئی اور مجھے زک دینے کے کتنے ہی پروگرام بنتے اور بگڑتے رہے۔"

معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا، پروفیسر وہاب اشرفی رانچی یونیورسٹی سے پٹنہ یونیورسٹی منتقل ہونا چاہتے تھے اور اسی سلسلے میں کسی انتظامی عہدے کے حصول کی خاطر انہوں نے بہار کے وزیر اعلی لالو پرشاد یادو سے ملاقات کی ٹھانی، ابتدا میں ناکامی کے بعد لالو پرشاد کے دست راست ڈاکٹر رنجن یادو سے جا ٹکرائے جو ایک سخت متعصب انسان تھے۔
پروفیسر وہاب اشرفی نے اس قصے کی دردناک تفصیل اپنی خودنوشت کے نویں باب سیاست کی گلیاں اور نئے مصائب' میں بیان کی ہے۔'
پروفیسر وہاب اشرف نے پاکستانی نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے متعلق کتاب میں ایک واقعہ بیان کیا ہے:
غالب اکیڈمی کا دہلی میں سیمینار تھا، اسلوب احمد انصاری اپنا مقالہ پیش کر رہے تھے، " ڈائس پر پاکستان کے نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری موجود تھے، فرمان صاحب نے انتہائی غصے اور جذبات سے پُر اپنی رائے زنی میں اس کا انکشاف کیا کہ اسلوب صاحب کا مقالہ ان کے کسی مقالے کا چربہ اور سرقہ ہے اور انہوں نے یہ مال مسروقہ خود ان کے سامنے پیش کرنے کی جرات کی ہے۔ موصوف کا انداز انتہائی جارحانہ اور غیر علمی تھا۔ سرقے کی تفصیل میں وہ نہیں گئے اور

مسلسل غصے کا اظہار کرتے گئے، یہاں تک کہ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ ایسا لگا کہ فرمان فتح پوری نشے میں ہوں، حالانکہ ایسا نہیں تھا، شاید ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا، لہٰذا وہ توازن کھو بیٹھے، میں نے مداخلت کی اور صاف صاف کہا کہ جب تک دونوں مقالے سامنے نہ ہوں، یہ باتیں فضول ہیں"

ایک دوسرے موقع پر وہ پاکستانی نقاد محمد علی صدیقی سے الجھ پڑے تھے، انہی کی زبانی سنیے:

''مجھے مشرق وسطی کا ایک سفر یاد آرہا ہے۔، موقع ادبی انعام کی تقریب کا تھا، میں جیوری کے ممبر کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ اس تقریب میں میری ملاقات مشہور ترقی پسند پاکستانی نقاد محمد علی صدیقی سے ہوئی لیکن کیا کیا جائے کہ ایک ادبی مسئلے میں ہم دونوں الجھ گئے، جناب محمد علی صدیقی کا حال یہ ہوا کہ ان پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی ۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پسینے سے شرابور ہو رہے ہیں ۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض رہے ہیں اور ایسے موقعوں پر ان کے خون کا دباؤ لازماً بڑھ جاتا ہے۔ میرا حال یہ کہ میں بلڈ پریشر کا مریض تو ہوں لیکن ذیابطیس کا مرض ایک عرصے سے مجھے شکار بنائے ہوئے ہے لیکن ایسی کوئی کیفیت مجھ پر طاری نہیں ہوتی۔"

افسوس کہ پروفیسر وہاب اشرفی کو زندگی میں دو ہی پاکستانی ادیبوں سے واسطہ پڑا اور شومئی قسمت سے دونوں کے بلڈ پریشر، وہاب صاحب سے ملاقات کے بعد یا ان کی مداخلت کے باعث، اپنی انتہا کو جا پہنچے۔ محمد علی صدیقی صاحب کے باب میں ان کا یہ جملہ کہ " ایسے موقعوں پر ان کے خون کا دباؤ لازماً بڑھ جاتا ہے"، حد درجہ معنی خیز ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب ایسے موقعوں سے اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں یا خدانخواستہ ان کی تنقیدی تحریروں کے یہ نتائج اکثر برآمد ہوتے ہیں۔

وہاب صاحب کا یہ دعویٰ کہ اس جھگڑے کے دوران وہ نارمل رہے اور ایسی کوئی کیفیت ان پر طاری نہیں ہوئی، سمجھ میں آتا ہے۔یقیناً ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے جھڑپ کے بعد وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اگلی جھڑپ کے لیے تیار ہو کر گئے ہوں گے۔ ہم ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے، جو ہمارے گھر کے بالکل قریب رہتے ہیں، ملاقات کا سوچ رہے تھے، پروفیسر وہاب کے بیان کردہ مذکورہ بالا واقعے کے بعد اپنے ارادے پر نظر ثانی کر لینا ہی ہمیں بہتر نظر آ رہا ہے۔ویسے بھی اس ملاقات کا واحد مقصد ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت 'بلاجواز' کے بارے میں اپنے ایک کرم فرما کے تبصرے ('ڈاکٹر صاحب کی خودنوشت بلاجواز، بلاجواز ہی لکھی گئی ہے') پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے لینا مقصود تھا جو ان حالات میں خطرے سے خالی نظر نہیں آ رہا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے ہندوستانی شاعر اور نقاد وحید اختر کے بارے میں بیان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک اضطراب کے عالم میں رہتے تھے۔ محمود ہاشمی نے وحید اختر کے ایک مجموعہ کلام 'پتھروں کا مغنی' پر تبصرہ کیا تھا اور اس کو گداگری کا 'میگنا کارٹا' قرار دیا تھا اور ثابت کیا کہ بھیک مانگنے والوں کے لیے یہ شاعری بے حد مفید ہو گی۔ یہ ایک انتہائی سفاک تبصرہ تھا۔ پروفیسر صاحب کے بقول، 'اس کے بعد سے وحید اختر بجھے بجھے رہنے لگے'۔ پروفیسر صاحب کی نظر میں شاید محمود ہاشمی کا تبصرہ کافی نہ تھا، جناب وحید اختر کو مکمل طور پر 'بجھا' دینے کی غرض سے انہوں نے اس واقعے کے بعد الہ آباد میں فراق گورکھپوری سے ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا:

الہ آباد کے سیمینار میں وحید اختر علی گڑھ سے آئے تھے، اس وقت فراق گورکھپوری" خاصے بیمار ہو چکے تھے۔ وحید اختر نے جعفر رضا اور مجھ سے کہا کہ فراق کے یہاں جانا چاہیے، وہ جب سے علیل ہوئے ہیں فلسفے پر زیادہ باتیں کرنے لگے ہیں، میں انہیں بتاؤں گا کہ فلسفے کے عمیق مباحث کیا اور کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہم لوگ فراق کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ وہ ایک معمولی سا کپڑا اپنے نچلے حصے پر ڈالے ہوئے تھے اور کھیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے منہ میں رکھے ہوئے تھے۔ علیک سلیک کے بعد کہنے لگے کہ آپ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کھیرا کھا رہا ہوں، نہیں، میں تو اسے محض زبان کے ایک حصے سے دوسرے تک

ادھر ادھر کر رہا ہوں، اس لیے کہ میں انہیں کھانے کی سکت نہیں رکھتا۔ پھر نہ معلوم کی بات آ گئی۔ اب کیا تھا۔ فراق شروع ہوئے تو ختم Infinite اور Finite کیسے ہونے کا نام نہیں۔ فلسفیوں کے نام الگ لیتے، قرآن سے مثالیں پیش کرتے اور ہندو دیو مالا کی طرف رخ کرتے، وہ بولتے رہے اور ہم سب بس گم سم سنتے رہے۔ وحید اختر کو جیسے چپ سی لگ گئی۔"

پروفیسر شمس الرحمان فاروقی سے اشرفی صاحب کو ایک تعلق خاطر ہے، کتاب کے پہلے ایڈیشن کو پڑھ کر فاروقی صاحب نے انہیں لکھا کہ "پوری کتاب سے مصنف کے مطالعے کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا اور یہ کمی کھٹکتی ہے۔" پروفیسر فاروقی کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں جناب مصنف نے 'میرا مطالعہ' کے عنوان سے ایک پورا باب لکھ ڈالا جس میں لاتعداد اردو و انگریزی کتابوں کے نام درج کر دیے، حتی کہ اس میں فاروقی صاحب کے ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کا ذکر بھی کر دیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی کے پاس اس ناول کو پڑھنے کا وقت نہیں تھا اور ادھر خود نوشت کا دوسرا ایڈیشن شائع کروانے کی جلدی بھی تھی لہٰذا وہ یہ تبصرہ کر گئے:

" اس وقت میرے سامنے شمس الرحمان فاروقی کا ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جس کے سلسلے میں، میں فی الحال کوئی رائے

نہیں دے سکتا، لیکن اگر زندگی نے کچھ مزید فرصت دی تو تفصیلی مطالعے کی کوشش طویل مضمون کی صورت میں سامنے آجائے گی"

ڈاکٹر اسلم فرخی کے پڑوس میں ایک ماہر مالیات رہتے ہیں اور بقول ڈاکٹر فرخی 'بڑے مصروف انسان ہیں'، وہ ڈاکٹر صاحب سے پروفیسر فاروقی کا ناول پڑھنے کی غرض سے لے گئے۔ڈاکٹر فرخی بیان کرتے ہیں:

'' ان صاحب نے 'کئی چاند تھے سر آسمان' کے ابتدائی بیس صفحات پڑھنے کے بعد اس کتاب کو اس طرح پڑھا کہ ہر چیز سے بے نیاز و بیگانہ ہوگئے۔ ایک اور صاحب نے جو ہمارے ملک کے بہت بڑے سائنسدان ہیں، مجھ (اسلم فرخی) سے کہا کہ میری بیوی نے مجھے اس کتاب میں غرق دیکھ کر یہ پوچھا کہ آج تک تم نے کوئی کتاب اس انہماک سے نہیں پڑھی، اب تمھیں کیا ہوگیا ہے؟"

ہم ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ماہر معاشیات پاکستان کے دیوالیہ ہونے کی پیش گوئی کررہے ہیں، ایک ہاہاکار ہے جو ہر طرف مچی ہوئی ہے،.بڑے.بڑے ادارے معاشی طور پر تباہی کے قریب ہیں، نوبت یہ آگئی ہے کہ اکثر اداروں میں تنخواہیں کی بر وقت ادائیگی بھی انتظامیہ کے لیے مشکل ہو گئی ہے، ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں بھی پریشان کن اطلاعات معمول کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں، ادھر ہم پریشان تھے کہ آخر حالات کے اس نہج پر پہنچنے کے اسباب غیر

واضح کیوں ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے اس بیان سے صورت حال واضح ہو گئی ہے۔
ہمارے اہم ماہر معاشیات اور ملک کے بہت بڑے سائنسداں 'کئی چاند تھے سر آسماں' کے مطالعے میں مصروف رہے ہیں، اس انداز سے کہ 'ہر چیز سے بے نیاز و بیگانہ ہوگئے'، ادھر بہت بڑے سائنسداں صاحب کی بیگم ان سے سوال کرنے پر مجبور ہو گئیں کہ ' اب تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'۔ ہم ان ماہر معاشیات اور سائنسداں صاحب سے درخواست کریں گے کہ اگر وہ 'کئی چاند تھے سر آسماں' کے مطالعے سے فارغ ہو گئے ہوں تو سر آسماں منڈلانے والے اندیشوں پر بھی توجہ کرلیں۔
اور تو اور، پروفیسر وہاب اشرفی کو بھی یہ ناول ایک چیلنج کی صورت لگا ہے۔
خودنوشت میں ایک دلچسپ شخصیت سید مظفر نواب کا تفصیلی ذکر ہے۔ یہ ایک انوکھی شخصیت کے مالک تھے، بمبئی کی فلمی دنیا سے ان کا تعلق تھا، کئی فلمیں بنائی جو سب کی سب فلاپ ہو گئیں۔ بقول پروفیسر وہاب، نرگس کی والدہ (جدن بائی) مظفر نواب کے والد گرامی کی منظور نظر تھیں۔ گیا میں نواب صاحب کا مکان ظفر منزل کے نام سے مشہور تھا، یار باشی کا یہ عالم تھا کہ روزانہ شام کے وقت پینے پلانے کی محفلیں جم جاتی تھیں، ظفر منزل کی الماریاں نت

نئی شرابوں کی بوتلوں سے بھری رہتی تھیں۔ دساور کی دخترِ رز سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ لیکن ایسی روش سے تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو سکتا ہے، سو وہی ہوا، جائداد کے ساتھ نواب مظفر کو مکان کے کئی حصے بھی فروخت کرنے پڑے، اپنے ہی مکان کے احاطے میں ایک چھوٹے مکان کی تعمیر کی اور وہاں منتقل ہوئے لیکن جلد ہی اسے بھی چھوڑنا پڑا اور آخر میں ایک کمرے کے مکان میں سکونت اختیار کی۔ وہ کہتے تھے کہ جس دن مجھے قرض لینے کی حاجت ہوئی، میں خو کو شوٹ کرلوں گا، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور اللہ تعالی نے انہیں بلالیا۔

پروفیر وہاب بیان کرتے ہیں کہ کہ نواب مظفر کو ہزاروں فحش اشعار یاد تھے اور وہ بلاتکلف محفلوں میں انہیں سنایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی تعجب انگیز تھا کہ انھوں نے قرآن کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی۔ پروفیسر وہاب بمبئی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں: " میں اپنے شعبے کے لڑکوں کو لے کر بمبئی گیا ہوا تھا، وہاں اچانک نواب مظفر سے ملاقات ہوگئی، بولے بمبئی دیکھنا نصیب ہوا؟ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولے سارے بچوں کو سینما بھیج دیجیے۔ انھوں نے سب کے ٹکٹس کا انتظام کیا اور طالب علم خوشی خوشی چلے گئے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ رہ گئے اور مجھے ایک کلب میں لے گئے جہاں فحش ڈانس ہو رہا تھا، میں نے آج تک ایسا کوئی رقص نہیں دیکھا تھا، جب میں وہاں سے نکلا تو میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھاگیا، طرفہ تماشا یہ کہ

نواب مظفر بیچ میں اٹھ گئے، مجھے اکیلا چھوڑ گئے، یہ کہتے ہوئے کہ کل انہیں حج کے لیے
"روانہ ہونا ہے، بہت سے کام ہیں۔
اپنی خودنوشت کے صفحہ 339 پر پروفیسر صاحب اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
"سال چھ ماہ میں میرا پاؤں بھاری ہو جاتا ہے، لفظ بھاری سے آپ کو ہنسی آسکتی ہے "
ہمیں ہنسی تو خیر بالکل نہیں آئی بلکہ ایک طرح کی تشویش لاحق ہو گئی، ساتھ ہی اپنی
لاعلمی پر افسوس بھی ہوا کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہم اپنے پڑوسی ملک میں رونما ہونے
والے ایک اہم ترین جینیاتی انقلاب کی خبر سے محروم رہے۔
غرض یہ کہ 'قصہ بے سمت زندگی کا' مجموعی طور پر ایک اہم خودنوشت ہے، یہ پروفیسر
وہاب اشرفی کی بے سمت زندگی کا احوال ہے لیکن کتاب پڑھ کر پڑھنے والوں کے بے
سمت ہونے کا ڈر جاتا رہتا ہے۔

عالمی اردو کانفرنس کراچی۔2011

حضرت داغ اپنے 'یاروں' سے کہہ گئے ہیں کہ اردو زبان آتے آتے ، آتی ہے۔ جبکہ بزرگوں کا مشورہ ہے کہ زبان و بیان کو غلطیوں سے پاک رکھنے کے لیے لازم ہے کہ زبان و بیان کے ماہرین کی تحاریر پڑھنے اور کلاسیکی شاعری کا مسلسل مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اہل زبان کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کی گفتگو سننے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ کسی اہل زبان حور خوش خصال کی صحبت نصیب ہوجائے تو کیا ہی کہنے

ردیف، قافیہ، بندش، خیال، لفظ گری
وہ حور زینہ اترتے ہوئے سکھانے لگی

یہ علاحدہ بات ہے کہ اکثر محفلوں میں بیٹھ کر جو پلے ہوتا ہے، الٹا اس کے لٹ جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ بقول شخصے گوراشاہی اردو نے اردو کا حال ، بے حال کردیا ہے، ایسے جملے عام ہوچکے ہیں کہ ' مجھے آفٹر نون میں بینک جانا ہے، وہاں ٹو او کلاک کو آڈٹ شروع ہوجائے گا' ۔۔ ان تمام فاسد خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کچھ سیکھنے کی غرض سے رخ کیا عالمی اردو کانفرنس کے رنگا رنگ میلے کا۔

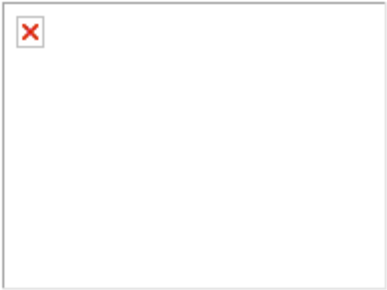

دائیں سے: ایوب خاور، کاظم پاشا، اشفاق حسین، آغا ناصر، زبیر رضوی، راشد اشرف

روزنامہ ایکسپریس کے زیر اہتمام اردو اور عصر حاضر بین الا قوامی کانفرنس ، 30 ستمبر اور یکم اکتوبر کے دو روز اہلیان کراچی کے لیے تحفے سے کم نہ تھے، دنیا بھر سے مندوبین کی آمد نے اسے دونوں دن حاضرین کے لیے پرکشش بنائے رکھا۔ ہندوستان سے جیلانی بانو، زبیر رضوی، عازم کوہلی اور شمیم حنفی تشریف لائے، رضا علی عابدی نے لندن سے کراچی کا رخ کیا، کینیڈا سے اشفاق حسین اور تقی عابدی، ناروے سے فیصل ہاشمی، ترکی سے ڈاکٹر خلیل طوق آر اور چین سے تھانگ منگ شنگ نے اردو کانفرنس کو رونق بخشی، لاہور سے امجد اسلام امجد، عطاءالحق قاسمی، انتظار حسین ، ڈاکٹر سلیم اخترشریک ہوئے، کراچی سے زبیر

زادہ قاسم، فاطمہ حسن، زاہدہ حنا، محمد علی صدیقی شریک ہوئے۔ دیگر شرکاء میں آغا ناصر، ڈاکٹر نجیب جمال، احفاظ الرحمٰن، امینہ سید موجود تھے۔ مقالے پڑھے گئے اور شاعری سنائی گئی۔

شاعری کے میدان کو پر کرنے لیے کانفرنس کے دوسرے دن ظفر اقبال، سحر انصاری، ایوب خاور، سعود عثمانی،انور مسعود،اشفاق حسین، فاطمہ حسن، پیرزادہ قاسم، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، عازم کوہلی، شاہدہ حسن، بشریٰ اعجاز، زبیر رضوی، تقی عابدی، سورج نرائن، عباس تابش، سرور جاوید، حسن اکبر کمال اور جاوید صبا نے اپنے کلام سے شرکاء کو محظوظ بھی کیا اور رات تین بجے تک محبوس بھی کیے رکھا۔ لاہور سے آئی ہوئی بشریٰ اعجاز تو پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ وہ کراچی کے حالات کی وجہ سے خوفزدہ تھیں۔

رضا علی عابدی اردو زبان کو چراغوں کا تیل قرار دے رہے تھے اور اس سے متعلق واقعہ سناتے ہوئے بیان کر رہے تھے کہ وہ بھارتی شہر کلکتہ کا ایک ایسا انوکھا مندر دیکھنے پہنچے جو مکمل طور پر سفید چمکیلے پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ اس مندر کی دیوار میں ایک طاق تھا جس میں چراغ جل رہا تھا۔اس چراغ کی لو کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے جلنے سے مندر کی دیوار سیاہ نہیں ہو رہی تھی۔ یہ منظر لوگوں کے لیے حیران کن تھا۔ وہاں موجود لوگوں سے پوچھا گیا کہ اس

چراغ میں آخر کون سا تیل ہے ؟ رضا علی عابدی جھٹ بولے ' اس میں اردو زبان کا
'تیل ہے، یہ زبان سیاہ نہیں کرتی

: تقریب کے دیگر مقررین کے خطابات سے چیدہ چیدہ نکات پیش خدمت ہیں

۔اس کانفرنس کی کامیابی نے اردو زبان کو لاحق خطرات کا خاتمہ کیا ہے (ڈاکٹر سلیم
(اختر

۔جیلانی بانو نے 'اردو ادب میں خواتین کی حصہ داری' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش (کیا۔انھوں نے کہا کہ دنیا کے پہلے افسانے میں عورت کا کردار اہم رہا اس کے بعد سب کچھ مرد نے لکھا۔شراب، عورت اور رات ادب کا حصہ ہے لیکن صرف خوبصورت عورت کو ہی یہاں تک رسائی حاصل ہے، جو عورت خوبصورت نہ ہو اسے اردو ادب میں چڑیل کا کردار دیا گیا ہے۔ مرد شاعر ایک طوائف کے عشوہ و غمزہ کی بنیاد پر مشاعرہ لوٹ لیتا ہے لیکن عصمت چغتائی کو لحاف کے لیے عدالت تک جانا پڑا۔

۔میٹرک کے بعد اردو زبان ہانپنے اور انٹرمیڈیٹ کے بعد ہکلانے لگتی ہے (شکیل
(عادل زادہ

۔جس روز پاکستانی مائیں اپنے بچوں کو انگریزی سکھانے کی کوشش ترک کردیں گی (اسی روز سے اردو کے عملی نفاذ کی راہ ہموار ہونا شروع ہو جائے گی۔افریقہ کے

کئی ممالک میں جنگلوں میں بھی کالے حبشی فر فر انگریزی اور فرانسیسی بولتے ہیں لیکن یہ زبانیں وہاں سڑک، صحت اور خوشحالی نہیں لے کر گئیں۔ چین اور ترکی کا کام انگریزی کے بغیر بھی بہت اچھا چل رہا ہے۔ (ڈاکٹر خلیل طوق آر۔ترکی)

کانفرنس کے دوسرے روز میں صبح صبح رضا علی عابدی صاحب کے پاس بیٹھا تھا، خوش قسمتی سے وہ جلدی پہنچ گئے تھے ، مرکزی دروازے پر میں ان کے استقبال کے لیے موجود تھا، ایک صاحب ان کی جانب لپکے اور باتیں کرنے لگے، کچھ دیر بعد عابدی صاحب میری طرف اشارہ کرکے ان صاحب سے کہتے ہیں کہ میں ' ان کے ساتھ ہال میں جارہاہوں، یہ میرے فیس بک کے دوست ہیں' ۔۔ وہ صاحب جھٹ جواب دیتے ہیں " تو یوں کہیے کہ آپ کے فیس بک کے دوست اس وقت فیس ٹو فیس ہیں " ۔ عابدی صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے ہال کا رخ کرتے ہیں۔

دائیں سے: مدیر اردو ڈائجسٹ، اختر عباس، رضا علی عابدی، راشد اشرف

اندر پہنچ کر ہم نے ایک گوشہ عافیت تاکا۔ عابدی صاحب سے جی بھر کے باتیں کیں۔ کتابوں کی، لوگوں کی، اردو زبان سے ان کی محبت کی۔ درمیان میں لوگ ان سے ملاقات کے لیے آتے رہے، لاہور سے آئے
ہوئے اردو ڈ ائجسٹ کے نئے مدیر اختر عباس نے دس منٹ کا انٹرویو محفوظ کیا۔ پشتو بو لنے والا ایک نوجوان اپنی عقیدت کا مظاہرہ کرتا رہا ، وہ کراچی کے ایک اردو اخبار میں ملازم ہے، اردو میں لکھنے کا شوق ہے، عابدی صاحب اس کی باتیں نہایت غور سے سنتے رہے کہ وہ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہوتی، عابدی صاحب نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔چلتے چلتے وہ نوجوان مجھ سے میرا تعارف پوچھتا ہے، میں اپنا نام بتاتا ہوں، وہ یک دم ٹھٹک جاتا ہے۔ ' وہ خودکش والے راشد اشرف' ؟ .. میں گھبرا جاتا ہوں، وہ قبائلی علاقے کا رہنے والا کہیں میری تلاش کی مہم پر مامور تو نہیں ؟
'بھائی وہ خودکش (زبرکے ساتھ) تھا' ۔میں اسے جواب دیتا ہوں

ایک خاتون رضا علی عابدی صاحب کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہیں، اپنی دو عدد سہیلیوں کو بھی کھینچ لائی ہیں، عابدی صاحب کے ساتھ تصاویر کی فرمائش مجھ ہی سے کرتی ہیں اور میں دل ہی دل میں کہتا ہوں " بی بی ! قدموں میں بیٹھیے، خدا کے لیے جڑوں میں نہ بیٹھ جایئے گا کہ عابدی صاحب کا سلسلہ تکلم ان کے چاہنے والوں کی دراندازی سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔"

کچھ فرصت ہوئی تو عابدی صاحب مجھے بتانے لگے کہ انہوں نے اردو کی خاطر کھبتی ہوئی آگ، دہکتی ہوئی زمین اور برستے شعلوں جیسی گرمی میں بہار کا سفر کیا تھا اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ بی بی سی سے وابستہ تھے اور جرنیلی سڑک جیسے پروگرامز کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ان کی آنے والی کتابوں میں 'کتابیں اپنے آباء کی' اور ' اخبار کی راتیں 'شامل ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ "لوگ طویل سفر کرکے سفر نامہ لکھتے ہیں لیکن طویل قیام کرکے کوئی قیام نامہ نہیں لکھتا، میں اپنے قاری کو ان یادوں میں حصہ دار بنانا چاہتا ہوں لیکن ٹائپنگ کی غلطیوں اور دیگر معاملات کی وجہ سے پریشان ہوں، یہ کیا کہ 'بیت 'صفحے کے آخر میں لکھا گیا اور 'خلا' اگلے صفحے کے شروع میں ' '

لندن میں چالیس برس سے مقیم رضا علی عابدی کے قارئین کو شنید ہو کہ عابدی

صاحب کا قلم ایک قیام نامہ تحریر کرے گا۔

انہوں نے کہا" سفر نامہ نگار منظر کو بیان کرتا ہے، میں منظر کو دعوت دیتا ہوں کہ خود کو بیان کرے"

کراچی کے اتوار بازار سے ملنے پرانی کتابوں کے احوال میں، میں عابدی صاحب کو بھی شریک کرتا رہتا ہوں، اسی کا ذکر چل نکلا، مصنفین کے دستخط شدہ نسخوں کی فٹ پاتھ پر فروخت کی بات ہوئی تو عابدی صاحب نے یہ کہہ کر مجھے حیران کردیا کہ ایک مرتبہ انہوں نے الہ آباد کے فٹ پاتھ پر مشتاق احمد یوسفی کی کتاب فروخت ہوتے دیکھی، اس کتاب پر یوسفی صاحب کے دستخط موجود تھے۔

جواب میں ایک تگڑی مثال تو میرے پاس بھی تھی، کنور مہندر سنگھ بیدی کی یادوں کا جشن، جس پر ان کے دستخط موجود تھے، کراچی کے فٹ پاتھ سے مجھے ملی تھی۔

ارے بھئی ایک مرتبہ تو حد ہو گئی" رضا علی عابدی کہہ رہے تھے۔"بہاولپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے مجھے اپنی ایک کتاب پیش کی اور ساتھ ہی

فرمانے لگے کہ عابدی صاحب، اس کتاب پر میں نے اپنا وزٹنگ کارڈ چسپاں کردیا ہے، اگر آپ اس کتاب کو کبھی کسی کو دیں تو اس کارڈ کو نوچ کر پھینک دیجیے گا، میں نے انہیں کہا کہ صاحب! اطمانچہ مارنے کو میں ہی ملا تھا آپ کو"

بڑی اسکرین کے ٹی وی پر ہندوستان سے سمپورن سنگھ گلزار، اردو کانفرنس کے بارے میں اظہار خیال کررہے تھے۔

اسی دوران عقیل عباس جعفری صاحب تشریف لے آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک اسٹیج سے ڈاکٹر تقی عابدی کے گرجنے کی آواز آئی، ہم نے گھبرا کر اس طرف دیکھا، یوں لگا تھا جیسے کوئی سیاسی لیڈر اسٹیج پر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ جلد ہی شرکاء کی توجہ ان کی جانب مکمل طور پر مبذول ہوگئی۔ وہ کہہ رہے تھے:

" میر انیس نے اردو کو کلمہ پڑھایا، غزل نے اردو زبان کو لالی لگائی، مرثیے نے اس کی آنکھوں میں سرمہ لگایا، قطعہ نے اسے دلہن بنایا، فارسی نے سوتن بن کر اردو زبان کو دربار میں جانے سے روکا، پھر بھی لوگ اس کی زلفوں کے اسیر ہوگئے۔اردو کا رسم الخط اس کی پہچان اور اس کے جسم کا لباس ہے، اس سے سمجھوتہ کرنا اردو سے غداری کے مترادف ہے۔"

تقریب کے شرکاء تالیاں بجاتے بجاتے بے حال ہو گئے۔

اپنے ساتھ کھڑے ایکسپریس ٹی وی کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے میں نے درخواست کی کہ جس حساب سے یہاں بات بات پر تالیاں بجائی جا رہی ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے آپ سے درخواست ہے کہ فوری طور پر اگلی تقریب ڈینگی مچھر کے حملے کی زد میں آئے ہوئے شہر لاہور میں منعقد کروائی جائے کہ اس نامعقول مچھر سے نجات کا اس سے ارزاں حل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ مچھر لاہور میں منہ زور ہو رہا ہے۔ ڈینگی کے ایک مچھر نے دوسرے سے کہا کہ میں دنیا بھر میں گھوما ہوں، لاتعداد لوگوں کو کاٹا ہے لیکن 'لاہور، لاہور ہے'

انتظار حسین نے اپنے خطاب میں اردو افسانے سے متعلق احمد ندیم قاسمی کے جملے کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "اردو افسانہ انگریزی افسانے سے آگے نکل گیا ہے۔" ۔ انتظار حسین کا کہنا تھا کہ وہ اپنی حد تک یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ 'میرا افسانہ انگریزی افسانے سے آگے نہیں نکلا' ۔

آغا ناصر نے اپنے خطاب میں ایک مکمل اردو ٹی وی چینل کے اجراء کی تجویز پیش کی۔

کانفرنس کے دوسرے روز سر شام مشاعرہ بپا ہوا اور نثری حملوں سے ادھ موئے شرکاء نے اسے خوش آمدید کہا۔
شرکاء نے شعراکے کلام پر داد بھی دی اور جہاں معاملے کو زبانی داد سے بڑھ کر پایا، وہاں بے اختیار تالیاں پیٹنا شروع کر دیں ۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں :

نہ جانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
(میں ڈوبتا ہوں سمندر اچھال دیتا ہے (سورج نرائن

☆

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
(میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے (عباس تابش

☆

اب اسے بھول جانے کا ارادہ کرلیا ہے
(بھروسہ غالبا خود پر زیادہ کرلیا ہے (عطاء الحق قاسمی

☆

میں نے کب دعوی کیا تھا سر بسر باقی ہوں میں

(پیش خدمت ہوگیا ہوں میں، جس قدر باقی ہوں میں (ظفر اقبال

امجد اسلام امجد نے اپنے پٹارے سے ،برسوں پرانی ’ تجھ سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں‘ نکالی اور باوجود اس قدر جھمیلے کے، اپنی نظم پڑھ گئے۔ پیرزادہ قاسم نے بھی اپنی مشہور زمانہ غزل ’خون سے جب جلا دیا اک دیا بجھا ہوا۔ پھر مجھے دے دیا گیا اک دیا بجھا ہوا‘ دوبارہ سنائی، شرکاء نے ان کا یہ کلام ان کی آواز سے آواز ملا کر مکمل کیا۔

:یہ ممکن نہیں کہ جس محفل میں انور مسعود ہوں، وہاں قہقہے نہ گونجیں

گویا کم کم ہے دید کا امکان
آرزو کی کلی نہیں کھلتی
گرچہ نزدیک ہے گلی تیری
پر ہمیں پارکنگ نہیں ملتی

انور مسعود اسٹیج سے جانے کے لیے اٹھتے تھے اور ادھر ہر بار مجمع سے ایک غلغلہ بلند ہوتا تھا کہ مت جایئے۔ آخر میں جاتے جاتے کہنے لگے کہ ’والدین

کے اصرار پر میں نے ڈاکٹر نہ بن کر میڈیکل سائنس پر احسان کیا ہے۔

امن و امان کی دگرگوں صورتحال اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے بے حال اس شہر میں یہ
تقریب ادبی تقریبات کا ایک روشن باب قرار پائی

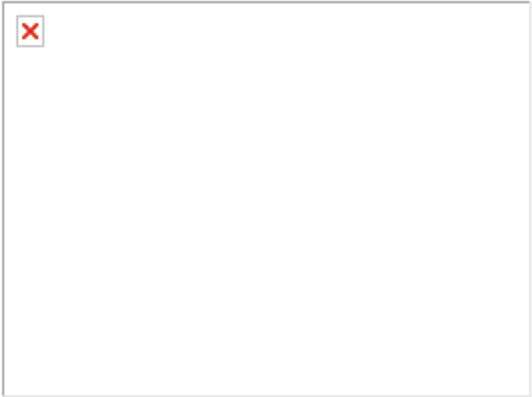

ہندوستان سے تشریف لائی محترمہ جیلانی بانو کے ہمراہ

چہار سو خلاؤں میں اڑتی پھرتی شاعری

راولپنڈی کے ادبی جریدے چہار سو کا ستمبر۔اکتوبر2011کا شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مذکورہ شمارے میں کینیڈا میں مقیم شاعر، ادیب، افسانہ نگار عبداللہ جاوید اور ان کی اہلیہ شہناز خانم عابدی کو قرطاس اعزاز پیش کیا گیا ہے۔ ایک علاحدہ گوشے میں عبداللہ جاوید کے طویل انٹرویو اور افسانے کے علاوہ عبداللہ جاوید کے کمال فن پر اقبال بھٹی، گلزار جاوید، ستیہ پال آنند، صابر وسیم،اے خیام، مبین مرزا، اکرام بریلوی و دیگر کی آراء شامل کی گئی ہیں۔ادبی جریدوں میں مختلف شعراء وادباء کے فن اور شخصیت پر خصوصی گوشے شامل کرنے کی روایت زور پکڑتی جارہی ہے۔ ہم ایسے گوشہ نشین شخص کے لیے تو یہ گوشے بہت معلوماتی ہوتے ہیں، اس طرح گھر بیٹھے بیٹھے گوشہ گمنامی میں پڑے کسی شاعر یا ادیب سے تعارف ہوجاتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ اکتوبر2011 میں کراچی میں ایکسپریس اخبار کے زیر اہتمام منعقد ہوئی عالمی اردو کانفرنس میں بھارت سے آئی ہوئی محترمہ جیلانی بانو کا ان ادبی گوشوں کے بارے میں موقف سخت تھا، ان کے مطابق ادبی جرائد میں ان گوشوں کی تواتر کے ساتھ اشاعت پڑھنے والوں کو اکتاہٹ میں مبتلا کررہی ہے اور یہ تمام معاملہ ذاتی تعلقات کی بنیادوں پر انجام پاتا ہے۔

بعض لوگوں کے خیال سے ادبی گوشوں میں ادباء اور شعراء کو قید کرنے سے بہتر ان کی تصانیف کی تقریب رونمائی ہوٹل وغیرہ میں کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے، جہاں لذت کام و دہن کا بھی معقول انتظام رہتا ہے۔ فروری 1966 میں شمس الرحمان فاروقی کے جریدے شب خون کی تقریب اجراء بھی الہ آباد کے گنڈر نامی ریسٹورنٹ میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کی تازہ مثال انیس جون 2010 کو ٹورنٹو میں ممتاز ادیبہ شکیلہ رفیق کی آٹھویں کتاب 'وے صورتیں الہی' کی تقریب تعارف ہے جو ٹورنٹو کے "تندوری چکن ریسٹورنٹ" میں منعقد کی گئی تھی۔ کتاب میں جنس کے موضوع پر افسانے شامل ہیں، شاید اسی مناسبت سے یہ تقریب 'تندوری چکن ریسٹورنٹ' میں رکھی گئی تھی۔ کتابیں تو روزانہ درجنوں کے حساب سے شائع ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن ایسی جگہوں پر تقریبات منعقد کرنے کا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شرکاء کو کتاب کے مندرجات بے شک یاد رہیں یا نہ رہیں، تندوری چکن کا ذائقہ ایک عرصے تک یاد رہتا ہے۔ یہاں ہزاروں میل دور کراچی میں بیٹھ کر ہم نے کتاب پڑھی اور تندوری چکن کا لطف پایا۔ تقریب مذکورہ کا حاصل عابدہ کرامت کا وہ تبصرہ تھا جس میں انہوں نے شکیلہ رفیق کے بارے میں فرمایا کہ '' وہ منافقت کا دوپٹہ نہیں اوڑھ سکتی اور اگر ضرورتا اوڑھنا ہی پڑے تو اس کے آنچل سے سر نہیں ڈھک سکتی"۔ شکیلہ رفیق صاحبہ نے کب اور کن موقعوں پر ضرورتا منافقت کا دوپٹہ اوڑھا ہے، عابدہ کرامت نے ان کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ اس پر ستم یہ رہا کہ تقریب کے اختتام پر شکیلہ

رفیق نے عابدہ کرامت کے بارے میں حاضرین کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ 'اتنا اندر سے تو انہیں ان کے اپنے بھی نہ سمجھ پائے جتنا عابدہ کرامت نے انہیں سمجھا ہے'۔

بات ہو رہی تھی چہار سو اور عبداللہ جاوید صاحب کی۔ جاوید صاحب کی کتاب بیادِ اقبال 1968 میں منظرِ عام پر آئی تھی، شاعری پر طبع آزمائی کا نتیجہ 1969 میں موجِ صد رنگ کی اشاعت کی صورت میں نکلا۔ قلم آزمائی کا یہ سلسلہ تاحال جاری ہے اور 2010 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'بھاگتے لمحے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعض حاسدوں کا کہنا ہے کہ یہ کتاب بھاگتے ہوئے لکھی گئی ہے اور بھاگتے ہوئے ہی پڑھی جانی چاہیے۔ اس بھاگ دوڑ میں ہم کہاں سے کہاں نکل گئے، ذکر ہے عبداللہ جاوید اور چہار سو کا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب چہار سو عبداللہ جاوید کا ہی ذکر ہے۔

جریدے کے ابتدا میں شامل انٹرویو میں جناب گلزار جاوید نے عبداللہ جاوید کے شعر:

لاکھ اڑتی پھرے خلاؤں میں

فکر ہم شاعروں کی زد میں ہے

کا حوالہ دیا اور ان پر الزام لگایا کہ اس بارے میں وہ تعلّی کا شکار ہیں۔

جواب میں عبداللہ جاوید نے اپنے دفاع میں خلاؤں میں اڑتی فکر کا ہی سہارا لیتے ہوئے کہا کہ " ہم شاعروں سے میری مراد اردو میں میر، غالب اور اقبال ہیں، دنیا کی دوسری زبانوں کے اکابر شاعر ہیں، میں ان کی جوتیوں کے آس پاس کہیں ہونے کا عرض گزار ہوں۔"

خلاؤں میں اڑتی فکروں کا ہمہ وقت شاعر کی زد میں رہنا ایک قابل قدر دعوی ہے لیکن ساتھ ہی شاعر کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ خلاؤں میں اڑتی ہوئی چیزیں اکثر کشش ثقل سے باہر نکل جاتی ہیں اور شاعر تو ایک طرف رہے، سائنسدانوں کے قابو سے بھی باہر ہوجاتی ہیں۔ امریکیوں نے خلاؤں میں اڑتی پھرتی ایسی چیزوں کو یو ایف او یعنی Unidentified Flying Object کا نام دیا ہے۔اردو اور دنیا کی دیگر زبانوں کے اکابر شعراء کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے اور اگر ان کی جوتیوں کو جمع کرلیا جائے تو ہزاروں کی تعداد بنتی ہے۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ان شعراء کرام کے آس پاس رہنے کی کوشش کی جاتی نہ کہ ان کی ہزارہا جوتیوں کے ۔ایسے منظر تو مزارات کے باہر دیکھنے میں آتے ہیں جہاں ہزاروں جوتیاں ایک ڈھیر کی صورت پڑی ہوتی ہیں ، حاضرین کی مزار سے واپسی پر اس کا نگراں کار حاضرین سے پیسوں کا 'عرض گزار' ہوتا ہے۔

شاعری در حقیقت ہے کیا، عبداللہ جاوید اس بارے میں مفاہیم و مطالب کو پانی پانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"شاعری وہ ہے جو لفظوں کے لبالب بھرے ہوئے کوزوں میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کے وجدان کو ممکنہ حد تک لامکانی و لازمانی وجدان کے ارتسامات سے برقیا کر، بوند بوند داخل کرے"

جناب عبداللہ جاوید نے ٹھیک ہی تو کہا ہے، کوزے میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کو برقیا کر بوند بوند داخل کرنے سے اس قسم کی معنی خیز شاعری وجود میں آتی ہے:

پھول پہ رکھ کر پاؤں
جب واجا نے مونچھ مروڑی
رویا سارا گاؤں

اس کلام سے یہ واضح نہیں ہوا کہ واجا نے درحقیقت اپنی مونچھ مروڑی تھی یا گاؤں والوں کی۔ عبداللہ جاوید کی اس تین سطری نظم کو پڑھ کر گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ ان کا قاری بھی بے اختیار رو پڑتا ہے!

اس رجحان ساز انٹرویو میں عبداللہ جاوید مزید کہتے ہیں کہ ’’ میرے مزاج میں شہرت گریزی اتنی زیادہ ہے کہ جہاں دھماکہ کرنا لازمی تھا، وہاں بھی دھماکہ نہ کیا‘‘

جناب عبداللہ جاوید نے دھماکہ نہ کرکے عقل مندی سے کام لیا ہے، صرف پاکستان ہی ایسی جگہ ہے جہاں آپ کہیں، کسی وقت بھی دھماکہ کر سکتے ہیں، کینیڈا میں اس قسم کی کوشش کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔

عبداللہ جاوید مزید فرماتے ہیں :

" میرا پہلا شعری مجموعہ 1969 میں شائع ہوا، اس میں شامل نظموں اور غزلوں کو ساٹھ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے دیگر شعری مجموعوں کے مشمولات کے ساتھ رکھ کر دیکھنے پر میں خود بھی اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ میرے پاس بہت کچھ ہٹا ہوا، اجنبی اجنبی سا، نیا نیا سا ہے۔ میں نے زبان کو اردو + فارسی کی حدود سے ممکنہ حد تک باہر نکال کر اردو + ہندی میں ڈھانے کی کوشش کی۔ موضوعات میں حسن قاتل کا موضوع میری نظموں کے واسطے سے اردو میں پہنچا۔ وقت کے موضوع پر میرے نظریات علامہ اقبال کے سلسلہ روز و شب کی موجودگی میں بھی ایک علیحدہ مقام بنا چکے ہیں"

عبداللہ جاوید 1960 میں کی گئی اپنی شاعری کو خود ہی اجنبی اجنبی سا قرار دے چکے ہیں۔ جن لوگوں نے جناب عبداللہ جاوید کے پہلے شعری مجموعے کا مطالعہ کیا ہے ان کا یہ خیال ہے کہ آج اکیاون برس گزر جانے بعد بھی یہ ' اجنبیت ' اسی شان سے قائم ہے۔

گلزار جاوید نے اس انٹرویو میں طرح طرح کے سوالات سے جاوید صاحب کو دق کیے رکھا، چند مثالیں پیش خدمت ہیں :

۔احباب کی ایک معقول تعداد آپ کے تجربات کی طرف بھی توجہ دلایا کرتی ہے مگر نشان دہی کوئی نہیں کرتا کہ آپ کو کب، کہاں ، کس نوعیت کے تجربات کا وقت میسر رہا ؟

۔آپ کے یہاں الفاظ کا دائرہ اکثر بحور سے وسیع کیوں کر ہوتا ہے ؟ '

۔کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے اپنی ایک دنیا بنا لی ہے جس سے باہر آنا آپ پسند نہیں کرتے ؟

۔اگر کوئی شخص آپ کے کلام میں طنز، تلخی اور چراندھ کی نشان دہی کرے تو آپ کا جواب کیا ہوگا ؟

۔آپ کو مظہر جان جاناں ، نیاز بریلوی، عبد الحئی تاباں اور میر درد کا سفیر گردانئے والے کس امر کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں ؟

۔آپ کے تخلیقی سفر میں طویل وقفے کی بابت قاری قطعی طور پر کیوں بے خبر ہے

؟

۔ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے اپنی بیگم کو بطور افسانہ نگار تسلیم کرانے کی غرض سے خود کو افسانہ نگاری سے اس وقت تک دور رکھا جب تک بیگم صاحبہ مستند افسانہ نگار تسلیم نہ کر لی گئیں ؟

جناب عبداللہ جاوید ان سوالات سے ہرگز پریشان نہیں ہوئے بلکہ اپنے جوابات سے انہوں نے قاری کو پریشان کر دیا، چند متفرق مثالیں ملاحظہ ہوں:

۔ میری شاعری، میرے افسانے اور میری تحریر قاری کو میری اپنی دنیا میں لے آتی ہے، مجھے اور کیا چاہیے۔

۔ قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے سمجھنا پڑے گا،اگر ہر قرات پر قاری مجھ میں کچھ نیا دریافت کرے گا تو اس کو نئی حیرانی اور نئی خوشی ملے گی۔

۔ میر درد تکیہ صوفی بزرگ تھے، میں بھی تصوف سے عملی طور پر جڑا ہوں لیکن پورا شاعر ہوں۔ میر نے درد کو آدھا شاعر مانا تھا۔

۔ میں خود بھی نہایت چھوٹے درجے کا صوفی ہوں اور وہ بھی صوفیائے ملامیہ کے اڑوس پڑوس والا۔

۔ مجھے زیادہ سطح کے اوپر اوپر ہی دیکھا اور جانچا جا رہا ہے۔

جناب عبداللہ جاوید کا یہ کہنا کہ ’قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے

سمجھنا پڑے گا اگر ہر قرات پر قاری مجھ میں کچھ نیا دریافت کرے گا تو اس کو نئی حیرانی اور نئی خوشی ملے گی'، قاری کو ایک کھٹن امتحان میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ گویا مظلوم قاری کو دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے، دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قاری کو شاعر پہلی کوشش میں ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا، اسے اپنی تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال کر شاعر کو روزانہ تھوڑا تھوڑا سمجھنا چاہیے، شاید وہ دس بیس سال میں وقفے وقفے سے کچھ سمجھ پائے اور جب جب ایسا ہوگا، بقول شاعر، قاری کو ایک نئی حیرت اور نئی خوشی ملے گی، یہاں اس بات کا ڈر لاحق ہوتا نظر آ رہا ہے کہ اس قدر ان گنت خوشیاں سمیٹتے سمیٹتے کہیں قاری شادی مرگ کی کیفیت سے دوچار نہ ہو جائے۔

جناب عبداللہ جاوید کے مذکورہ بالا بیانات کو پڑھ کر صوفیہ ملامیہ کے اڑوس پڑوس سے تعلق رکھنے والے بہت سے حاسدوں نے کہا کہ جناب شاعر کی شاعری کو علامتی نہیں بلکہ 'ملامتی' کہا جائے تو بہتر ہوگا، لیکن ہم ایسی شرپسندانہ باتوں پر سے کان ہی نہیں دھرتے۔ البتہ جاوید صاحب کے اس دعوے پر کہ وہ میر درد کے مقابلے میں وہ آدھے نہیں پورے شاعر ہیں، ہمیں جناب عبداللہ جاوید کے درج بالا آخری دعوے کی اصل وجہ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے جس میں وہ گلہ کرتے ہیں کہ "مجھے زیادہ سطح کے اوپر اوپر ہی دیکھا اور جانچا جارہا ہے"۔ لیکن چونکہ اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد ہمیں جناب عبداللہ

جاوید سے ایک اپنائیت سی محسوس ہونے لگی ہے، لہٰذا ہم نے ان کی شاعری کی اوپری سطح کو چھوڑ کر اس کی تہہ میں غوطہ لگایا اور چند آبدار موتی چنے جنہیں خوب جانچ کر یہاں پیش کر رہے ہیں :

سنڈی سے

تتلی کے قالب میں آجانا

پھر سنڈی بن جانا

مر جانا

تتلی بن کر اڑ جانا

☆

میرے اندر بھی کوئی ناچتا ہے

میں اس کے ساتھ پیارے رقص میں ہوں

☆

فلک پر جب ستارے ٹوٹتے ہیں

زمیں پر دل ہمارے ٹوٹتے ہیں

☆

پھول کے چوکیدار

رنگ و بو پر پہرے وہرے

سب کے سب بے کار

☆

ان اشعار کو پڑھ کر شاعر کے ' کوزے میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کے وجدان کو برقیا کر بوند بوند داخل کرنے ' کی بات تو ایک طرف، خود قاری کے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ جاتی ہے۔ البتہ سنڈی اور تتلی والے بیان میں ہمیں جناب عبداللہ جاوید کا یہ کہنا کہ 'قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کرکے مجھے سمجھنا پڑے گا' درست معلوم ہو رہا ہے۔ ہم ایسے کوتاہ نظر کو تتلی اور سنڈی کے ہیر پھیر میں بادی النظر میں تو کوئی نئی حیرانی اور نئی خوشی والی بات نظر نہیں آئی لیکن پھر گھنٹوں اس پر غور کرنے سے یہ سمجھ میں آیا کہ یہ دراصل 'زولوجی' یا علم الحیوانات سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی عمیق گتھی ہے جس کو سلجھانے پر علم الحیوانات کی دنیا کا تحقیق سے متعلق کوئی بڑا انعام ملنے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

بحیثیت قاری، ہم جناب عبداللہ جاوید کی شاعری پڑھ کر خوش تو کم ہوئے البتہ حیران زیادہ ہوئے ہیں۔ رہا سوال قاری کا جناب شاعر کی دنیا میں چلے جانے کا، تو عرض یہ ہے کہ قاری اپنی ہی دنیا میں خوش ہے، ایسی جگہ جا کر وہ کیا کرے گا جہاں شاعر کا کلام اور اس کی تخلیقات چوری ہو جاتی ہوں۔ تفصیل اس اجمال

کی یہ ہے کہ انٹرویو میں ایک جگہ جناب عبداللہ جاوید بیان کرتے ہیں کہ " جاوید جاوید یوسف زئی کے قلمی نام سے اپنے شائع شدہ افسانوں کی ایک فائل اپنے ساتھ (کینیڈا) لایا تھا وہ غائب کردی گئی۔اس کے بعد جب بھی کوئی افسانہ لکھا، کسی پرچے میں بھجوانے سے پہلے ہی گم ہوگیا۔ انگریزی زبان میں براہ راست ٹائپ کیے ہوئے چار چھ افسانوں کا بھی یہی انجام ہوا "

اس دنیا میں لوگوں پر کیسے کیسے روح فرسا سانحے گزر جاتے ہیں، اس کا اندازہ ہمیں مندرجہ بالا واقعے کو پڑھ کر ہوا، اسے پڑھ کر ہم آبدیدہ ہوگئے، جب طبیعت کچھ سنبھلی تو بے اختیار خامہ بگوش کی یاد آ گئی ۔ وہ اسی سے ملتا جلتا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چند برس قبل اتفاق سے ایک مشہور ادیب کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ان کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں جل گئیں۔ کئی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی جل کر خاک ہوگئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے دوست اظہار ہمدردی کے لیے ان کے ہاں پہنچے۔ ہر دوست نے اپنی بساط کے مطابق آتش زدگی کے واقعے پر اظہار افسوس کیا۔ البتہ ایک دوست نے منفرد انداز سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا: " اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے لیکن یاد رکھیے کہ ہر شر میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ جہاں

مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے، وہیں آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔۔یقیننا یہ آپ کا نقصان ہے لیکن " یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہو گئے۔

خامہ بگوش کے بیان کردہ اس واقعے پر تبصرہ در تبصرہ مناسب نہ ہوگا، البتہ ہمیں جاوید صاحب سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے شاعری کرتے وقت طبیعات کے بنیادی اصولوں کا خیال نہیں رکھا۔ کشش ثقل کے اصول کے عین خلاف یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ کس کے اشک ہیں اوج فلک تک
کوئی روتا رہا ہے رات بھر کیا

استاد لاغر مراد آبادی نے شعر مذکورہ سن کر فرمایا کہ اشک ہمیشہ نیچے کی طرف رخ کرتے ہیں، وہ آہیں ہیں جو اثر لانے کو آسماں کی طرف جاتی ہیں۔ اصول کشش ثقل کا بانی اگر یہ شعر سن لیتا تو گمان ہے کہ رات بھر روتا رہتا۔

جاوید صاحب نے ایک جگہ لطیف انداز میں شمشان گھاٹ کے مسائل کو بھی عمدگی سے شعر کی زبان میں ڈھالا ہے:

پھول دشمن کے ہوں یا اپنے ہوں
پھول جلتے نہیں دیکھے جاتے

اور آخر میں جناب عبداللہ جاوید کی وہ تخلیق ملاحظہ ہو جس کو چہار سو کے زیر تبصرہ شمارے میں ڈاکٹر الیاس عشقی نے مرزا غالب کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے غالب کے دشت امکاں کو دائرہ امکاں میں ڈھالنا قرار دیا ہے:

پانی
بادل کا
اونچے سے اونچا
جاتا بھی ہے
نیچے سے نیچے
آتا بھی ہے

☆

غالب کے دشت امکاں کو جس طرح پانی سے بھرے بادلوں کی مدد سے سیراب کیا گیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ہمیں تو نہیں ملی اور شاید ڈاکٹر الیاس عشقی کو بھی نہ مل پائے۔ مذکورہ مضمون میں ڈاکٹر عشقی نے اس بات پر حیرت کا اظہار

کیا ہے کہ ' عبداللہ جاوید کو ناگزیر الفاظ کس آسانی سے جاتے ہیں ' ، حیرت و استعجاب
:کے اسی عالم میں ڈاکٹر عشقی نے جناب عبداللہ جاوید کی یہ تخلیق درج کی ہے

دریا میں رہنا بھی ہے

بہنا بھی ہے

پل پل کچھ کرنا بھی ہے

بھرنا بھی ہے

فصل غم بونا بھی ہے

ڈھونا بھی ہے

مرنے سے ڈرنا بھی ہے

مرنا بھی ہے

حضرت جوش ملیح آبادی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے کہ جیسے چاہیں انہیں استعمال کریں۔ مذکورہ بالا کلام میں بہنا بھی ہے، ڈھونا بھی ہے، بھرنا بھی ہے، کرنا بھی ہے جیسے الفاظ کی تکرار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ممدوح کے سامنے الفاظ صرف ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں بھی باندھے پڑے رہتے ہیں کہ کہ جیسے اور جب چاہیں انہیں استعمال

کریں۔

مذکورہ انٹرویو میں فیض احمد فیض کا ذکر بھی آیا، جواباً، جناب عبداللہ جاوید کی :سعادتمندی تو دیکھیے کہ احتراماً" وہ فیض کا نام لینے سے بھی گریزاں نظر آئے

سوال: "تراجم کے حوالے سے آپ پر کچھ ذمہ داریاں لازم تھیں، کم از کم میر، غالب، اقبال اور فیض کا آپ پر کچھ حق تو بنتا ہے" ؟

جواب: "اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا میرے بس کا کام نہیں تھا۔ یہ آپ نے ایک سانس یں تین ناموں میر، غالب اور اقبال کے ساتھ چوتھا نام کیسے لے لیا۔ کم از کم "مجھ سے تو نہ لیا جائے گا۔ معذرت۔

انٹرویو کا نچوڑ عبداللہ جاوید کا وہ تبصرہ ہے جس میں انہوں نے اپنی تمام ادبی سرگرمیوں کا مقصد ایک مختصر جملے میں بیان کردیا، سوال تھا کہ 'ایک ہی وقت میں روایتی اور عطفی تراکیب کا استعمال قاری کو متجسس کیوں کرتا ہے؟' ۔۔ عبداللہ جاوید کا جواب تھا: قاری کو تنگ جو کرنا ہوا' ۔ '

جناب عبداللہ جاوید کی اس بات کے جواب میں عرض ہے کہ قاری کو اتنا تنگ کرنا ٹھیک نہیں، اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اگر قاری تنگ آمد بجنگ آمد کے

محاورے پر عمل کر بیٹھا تو حالات کے نازک ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

ہمارے قارئین ہمارے اس مضمون کو پڑھ کر یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ ہم ایک کے بعد بات سے بات نکالتے چلے جارہے ہیں اور ان کو غور کرنے کا موقع فراہم کر ہی نہیں رہے، لہٰذا اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے ہم جناب عبداللہ جاوید کے اس انٹرویو سے ایک سوال اور اس کا جواب درج کرتے ہوئے اس پر تبصرے کا موقع اپنے پڑھنے والوں کو فراہم کررہے ہیں:

سوال: "عیسیٰ، حسین، سقراط، بقراط، کرشن، سدھارتھ کو آپ نے اندر کا مکیں کیونکر بنا لیا، اگر بنا لیا تو اُن سے کس طرح کی قربت اور فیض حاصل کیا"؟

جواب: "قبضہ مافیا کے لوگ ہیں، مجھ پر قابض ہو گئے۔جلال الدین رومی کے نام کا اضافہ فرما لیجیے۔"

بزرگ ادیب جمیل الدین عالی نے چہار سو کے زیر تبصرہ شمارے میں شائع ہوئے عبداللہ جاوید کے تنقیدی مضمون کے بارے میں تبصرہ (روزنامہ جنگ۔22 ستمبر 2011) کرتے ہوئے کہا:

"عبداللہ جاوید کے تنقیدی مضمون کو پڑھتے پڑھتے اپنی اس پیرانہ سالی کے باوجود مبہوت ہو کر رہ گیا ہوں۔کاش اسے پڑھا جاسکے"

عالی صاحب نے آخری جملے میں یہ کہہ کر گویا بات ہی ختم کردی کہ ’ کاش اسے پڑھا جاسکے ‘

جناب جمیل الدین عالی اس پیرانہ سالی میں بھی غضب کے بذلہ سنج ہیں!

جگجیت سنگھ۔ گرنے دو تم مجھے میرا ساغر سنبھال لو

23 ستمبر 2011 کی شام جگجیت سنگھ ،پاکستانی غزل گائیک غلام علی کے ہمراہ، ممبئی کے ایک ہال میں غزل سرا ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ان دونوں نابغہ روزگار شخصیات کی تصاویر سے مزین اشتہار چھپ چکے تھے ساری دنیا میں ، غزل کے قدردان اس محفل کے بے چینی سے منتظر تھے ،غلام علی سے جگجیت سنگھ کی دوستی 1980 سے چلی آرہی تھی جس کا آغاز برطانیہ میں ہوا تھا۔ محفل سے ایک رات قبل جگجیت سنگھ کہہ چکے تھے کہ غلام علی جیسے استاد کے ہمراہ گانا، ان کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہوگا اور یہ ان کے لیے ایک اعزاز کی بات ہے۔

غلام علی کے بارے میں انہوں نے کہا تھا:

" جب وہ بھارت آتے ہیں تو ممبئی میں میرے گھر آتے ہیں۔ہم موسیقی کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں لیکن زیادہ تر وقت گھر اور خاندان کے بارے میں بات ہوتی ہے۔ہم انیس سو اسی میں لندن میں ایک موسیقی کی محفل کے دوران ملے تھے اور تب سے ہی یہ دوستی چلی آرہی ہے۔"

تقریب سے ایک رات قبل ان کو برین ہیمبرج ہوا، ہنگامی طور پر دماغ کی سرجری

کی گئی۔۔۔ بلاآخر ریاست راجھستان کے شری گنگا نگر میں سرکاری ملازم امر سنگھ اور ان کی پتنی بچن کور کے یہاں پیدا ہونے والے جگموہن عرف جگجیت سنگھ کا 8 فروری 1941 کو شروع ہونے والا سفر 10 اکتوبر 2011 کی صبح آٹھ بجے ممبئی کے لیلا وتی اسپتال میں تمام ہوگیا!

لوگ کہتے ہیں کہ جگجیت سنگھ کے لہجے سے سماعت کو ایک سکون ملتا ہے اور ان کی گائی ہوئی غزلوں کا تاثر ایک طویل عرصے تک قائم رہتا ہے، اداسی کا رنگ رومانوی رنگ میں بدل جاتا ہے، ان کی غزل سنئے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی پچھلے پہر خالی گھر کی سیڑھیاں اتر رہا ہو۔۔۔ وہ زندگی کی راہ میں خوابوں کے متلاشی افراد کے پسندیدہ گلوگار تھے!

ایک وقت میں وہ اپنی بیگم چترا سنگھ کے ساتھ مل کر گایا کرتے تھے، دونوں کی شادی 1970 میں ہوئی تھی، اپنے وقت کی یہ مقبول جوڑی اس وقت ٹوٹ گئی جب نوے کی دہائی کے اوائل میں ان کا اکلوتا بیٹا لندن میں ایک حادثے میں چل بسا۔ چترا سنگھ نے اپنے شوہر کا گھر بھی چھوڑا اور گانا بھی! پھر کئی برس گزر گئے جب چترا سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ جواب تک اپنے شوہر کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی، دراصل غلطی پر تھی، تب وہ گھر لوٹ آئی!

ممبئی سے راقم کے شناسا ایک انگریزی رسالہ لیتے آئے تھے، رسالے میں چترا سنگھ کا انٹرویو شائع ہوا تھا، یہ انٹرویو وہ اپنے بیٹے کی موت کے ایک طویل عرصے بعد دینے پر رضامند ہوئی تھی، چترا سنگھ کے مطابق اس سانحے کے بعد جیسے اس کا گلا ہی بند ہوگیا تھا اور یہ کیفیت چودہ برس تک قائم رہی، اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا اور عملی طور پر گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اس نے کہا: " چودہ برس تک یہ کیفیت رہی، پھر ایک صبح میں اپنے بیٹے کی تصویر کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں خدا کے دیے ہوئے تحفے (آواز) سے ناانصافی برت رہی ہوں، ہمارا بیٹا ویویک بھی تو ہماری آوازوں کا مداح تھا، پھر میں نے تہیا کیا کہ میں اپنے بیٹے کے لیے گاؤں گی لیکن ریاض چھوڑے مدتوں بیت چکی تھی اور اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد میری آواز نے میرا ساتھ نہ دیا۔"

سن 2005 میں چترا سنگھ اپنے شوہر کے ہمراہ آسٹریلیا گئی، مداحوں کا خیال تھا کہ وہ گائے گی لیکن وہ حاضرین کی پہلی رو میں بیٹھی رہی اور اپنے شوہر کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ جگجیت نے اس محفل کا آغاز اپنی اس غزل سے کیا، ''کچھ نہ کچھ تو ضرور ہونا تھا، سامنا آج ان سے ہونا تھا"۔ جگجیت کی دوسری غزل تھی" جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں"، اور حاضرین موقع کی مناسبت سے گائی گئی ان غزلوں پر داد دیتے رہے۔

: جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی چند مشہور غزلیں و گیت یہ ہیں

۔اپنی آنکھوں کے سمندر میں اتر جانے دے

۔اپنے ہونٹوں پر سجانا چاہتا ہوں

۔آدمی، آدمی کو کیا دے گا

۔ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی

۔چراغ و آفتاب گم،بڑی حسین رات تھی

۔اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

۔چاک جگر کے سی لیتے ہیں

۔پتھر کے خدا، پتھر کے صنم، پتھر ہی کے انساں پائے ہیں

۔تو نہیں غم نہیں شراب نہیں، ایسی تنہائی کا جواب نہیں

۔یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو

۔ تیرے خوشبو میں بسے خط میں جلاتا کیسے

۔تم اتنا جو مسکرا رہے ہو

۔ جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا

۔آپ کو دیکھ کر دیکھتا رہ گیا

۔وہ خط کے پرزے اڑا رہا تھا

۔ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہو گا چاند
۔کل چودھویں کی رات تھی
۔گلزار کی ٹیلی فلم مرزا غالب کی غزلیں
۔میری زندگی کسی اور کسی
(۔دن گزر گیا انتظار میں (چترا سنگھ کے ساتھ
(۔اللہ جانتا ہے (لتا منگیشکر کے ساتھ
۔عشق کی داستان ہے پیارے
(۔غم کا خزانہ تیرا بھی ہے میرا بھی (لتا منگیشکر کے ساتھ
(۔عشق میں غیرت جذبات نے رونے نہ دیا (چترا سنگھ کے ساتھ
۔ڈھل گیا آفتاب اے ساقی
۔اپنی مرضی کے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں

سن 1976 میں جگجیت سنگھ نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا جب ان کی پہلی البم ریلیز ہوئی، ان کی غزلوں اور گیتوں پر مشتمل 80 لیسٹس منظر عام پر آئیں، دنیا بھر میں گھومے اور داد سمیٹی، 2003 میں بھارتی حکومت نے انہیں تیسرے بڑے اعزاز پدم بھوشن سے نوازا۔

لتا منگیشکر، آشا بھونسلے، جاوید اختر، شبانہ اعظمی، مہیش بھٹ، پنکج ادھاس

اور من موہن سنگھ نے جگجیت سنگھ کی موت پر اظہار افسوس کیا۔

پاکستان کے دنیا ٹی وی چینل پر آج 10 اکتوبر 2011 کی رات 8 سے 9 کے درمیان مبشر لقمان کا پروگرام جگجیت سنگھ پر تھا، پروگرام میں لتا منگیشکر، رضا مراد، پنکج ادھاس، دیپک گٹانی، جاوید صدیقی (جگجیت سنگھ کے دوست اور کہانی کار: دل والے دلہنیا لے جائیں گے)، دلیر مہدی اور گلزار کے تاثرات سنوائے گئے، یہ تمام لوگ پروگرام کے میزبان کے ہمراہ ہندوستان سے آن لائن تھے۔

گلزار کہہ رہے تھے کہ

غم ابھی تازہ ہے، گلے سے اترا نہیں، مردہ خانے میں ان کی میت رکھی ہے، ان کے" بھائی کے پہنچنے پر کل آخری رسومات ادا کی جائیں گی، میں ابھی ابھی وہیں سے لوٹا ہوں، کل صبح دوبارہ جاؤں گا، مٹی ابھی تازہ ہے، ٹھنڈی نہیں ہوئی (یہاں گلزار کی آواز بھرا گئی)۔۔۔ مہدی حسن وہاں غزل کے شہنشاہ بیٹھے ہیں، وہ (جگجیت سنگھ) ان کے لیے دعا کیا کرتا تھا اور دعا کرتے کرتے خود چلا گیا، وہ بہت بڑا مداح تھا مہدی حسن کا، "ہم بھی عبادت کی طرح مہدی حسن صاحب کا نام لیتے ہیں

ٹیلی فلم مرزا غالب کے تعلق سے گلزار نے کہا کہ

""دیکھئے میں تو جگجیت سنگھ کو مرزا جگجیت سنگھ کہتا تھا""

یاد رہے کہ جگجیت سنگھ چند برس پیشتر مہدی حسن صاحب سے ملاقات کی غرض سے کراچی آئے تھے اور علاج کے لیے پانچ ہزار ڈالر دے گئے تھے۔

مبشر لقمان، جگجیت سنگھ کی حس مزاح کا ذکر کرتے ہوئے دیپک گنانی سے کہہ رہے تھے کہ جگجیت سنگھ لاہور آئے تو میں انہیں ویلج ریستوران میں رات کے کھانے پر لے گیا، وہاں ایک فنکار گا رہا تھا، جگجیت سنگھ کو دیکھ کر وہ ان کے احترام میں انہی کی ایک غزل گانے لگا، جگجیت سنگھ سنتے رہے اور پھر چپکے سے میرے (مبشر لقمان) کان میں کہا:

""اینوں پچھو، پوری تے نیں سنائے گا؟""

مبشر لقمان کہہ رہے تھے کہ جگجیت سنگھ پاکستان میں کئی خیراتی اداروں کو پیسے دیا کرتے تھے، اس شرط پر کہ ان کا نام کہیں نہ آئے۔

جاوید صدیقی کہہ رہے ہیں کہ جگجیت سنگھ ایک عمدہ انسان تھے، ان کا خمیر خلوص اور محبت سے گندھا تھا، جس کو ملے اس کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں غزل کے ذریعے اردو کو زندہ

رکھا۔

دیپک گٹانی نے کہا کہ ان کا آخری وقت تکلیف میں گزرا، وہ ایک خوش لباس انسان تھے، ہم نے ان کو ہمیشہ ہنستے بولتے ہی دیکھا تھا، جب یہ خبر سن کر ہم لیلا وتی اسپتال پہنچے تو ان کو اس حالت میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔

جاوید اختر اور شبانہ اعظمی، جگجیت سنگھ کی رہائش گاہ پر پہنچے ہوئے تھے اور مختلف ٹی وی چینلز کو اپنے تاثرات ریکارڈ کروا رہے تھے۔

ان کی گائی ہوئی ایک مشہور غزل ’ ٹھکراؤ اب کہ پیار کرو، میں نشے میں ہوں‘ کا مصرع ہے:

گرنے دو تم مجھے میرا ساغر سنبھال لو

اب یہ ساغر کون سنبھالے گا؟

صاحب اختیار ہو، ڈگری دے دیا کرو

دوبئی میں مشاعرے کے شرکاء واہ واہ کر رہے ہیں، داد دیتے دیتے وہ جیسے تھک سے گئے ہوں ، سلیم جعفری مرحوم نے ریگزاروں میں پھول جو کھلا دیے تھے ، ہر سال جشن برپا ہوتا تھا، دنیا بھر سے شعراء کی آمد رہتی تھی۔ کبھی جشن فیض تو کبھی جشن فراز، کبھی جشن خمار تو کبھی جشن مجروح۔ ایک جشن میں تو دلیپ کمار تک کھنچے چلے آئے تھے اور اپنی خوبصورت اردو اور لب و لہجے سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان مشاعروں میں یوں تو داد دینے والوں کی کمی کبھی نہ رہی لیکن ایک شاعر ایسے تھے جن کو ہر مرتبہ شرکاء جاتے جاتے روک لیا کرتے تھے، یہ پیرزادہ سید قاسم رضا صدیقی تھے، شخصیت بھی دلکش اور کلام کے تو کیا کہنے. ایک کے بعد ایک غزلیں سناتے جاتے تھے اور لوگوں کے دل موہ لیتے تھے۔ یادش بخیر، ایسے ہی ایک جشن کے دوران صاحب صدر کنور مہندر سنگھ بیدی نے یہ کہہ کر پیرزادہ قاسم کو دعوت دی کہ " اب میں جن شخصیت کو بلا رہا ہوں ان کا میں بیحد احترام کرتا ہوں، اس لیے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں اور آل رسول ہیں"۔

نوے کی دہائی میں دوبئی کے یہ مشاعرے اور کراچی کے خراب حالات، دونوں عروج

پر تھے۔ایسے میں پیرزادہ قاسم نے دوبئی کے ایک مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جو بہت تیزی سے زبان زد عام ہو گئی۔ اس کا یہ شعر تو مقبولیت کے بام عروج تک پہنچا :

شہر کرے طلب اگر تم سے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو، آگ لگا دیا کرو

آج بھی اس شعر کا حوالہ جابجا دیا جاتا ہے۔ سیاست دانوں نے بھی بڑھ کر اس شعر کو اچک لیا اور گرہ میں باندھ کر رواں ہو گئے۔

پھر ایک روز ہم نے سنا کہ پیرزادہ قاسم ، جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں۔ ایک معتبر ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے مزید نیک نامی سمیٹی۔ جامعہ کراچی نے اختر حمید خان، جمیل الدین عالی، عبدالستار ایدھی، پروفیسر احمد علی، مشتاق احمد یوسفی جیسے شخصیات کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کی۔ یہ تمام نام معتبر ہیں ، معاشرے کے ہر طبقے نے ان فیصلوں کو سراہا۔

صاحبو! اعزازی ڈگری دینے کا رواج کوئی نئی بات نہیں، قرون وسطی میں اس کا آغاز
ہوا تھا، یہ بات ہے سن 1470 کی جب آکسفورڈ یونیورسٹی نے برطانیہ کے Lionel
Woodville کو یہ ڈگری عطاء کی گئی تھی، موصوف بعد میں Bishop of
Salisbury. ہوئے تھے۔
گویا Bishop سے آغاز ہوا اور Butcher پر اختتام۔
2007 میں مظاہرین نے ایڈنبرا یونیورسٹی کے اس فیصلے پر احتجاج کیا جس میں یو
نیورسٹی انتظامیہ نے زمبابوے کے صدر رابرٹ موگابے کو 1984 میں یہ ڈگری دی
گئی تھی، عوامی احتجاج کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے انتظامیہ نے اس ڈگری کو دیے جانے
کے طریقہ کار میں تبدیلی کردیا، نئے طریقہ کار کے مطابق ڈگری کے وصول کنندہ پر
انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور مالی بے ضابطگیوں میں ملوث ہونے کے الزامات کو
بھی مد نظر رکھا جانے لگا۔ رابرٹ موگابے سے ڈگری واپس لے لی گئی۔ اس سلسلے میں
ایک حالیہ باوقار مثال اس وقت سامنے آئی جب ایریزونا اسٹیٹ یونیورسٹی کے صدر
مائیکل ایم کرو نے امریکی صدر بارک اوبامہ کو یہ ڈگری دینے سے انکار کردیا۔

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم اس شہر میں رہتے ہیں جہاں جامعہ کراچی جیسے ادارے موجود ہیں، مندرجہ بالا ادبی و علمی شخصیات کو اعزازی ڈگری ملنے پر ہمارا دل بھی باغ باغ ہوا تھا، یہ پیرزادہ قاسم کی شاعری ہی کا فیضان ہے کہ ہم میں اتنا سیاسی شعور پیدا ہوگیا ہے کہ ہم ہر سیاست دان کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جب پیرزادہ صاحب بحیثیت وائس چانسلر، اس مملکت خداداد کے اعلیٰ و بااختیار عہدے پر فائز ایک سیاسی شخص کو پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو ہم پیرزادہ سید قاسم رضا صدیقی صاحب کو بھی شبہے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

گویا جامعہ نہ ہوئی، خالہ جی کا گھر ہوگیا!

چند ہفتوں سے دبے لفظوں میں انگلیاں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں ، وہ شعراء جو اخباری کالمز بھی لکھتے ہیں، چپ سادھے پڑے ہیں، کچھ لکھتے ہیں تو تعلقات پر ضرب پڑتی ہے، اگلے کسی مشاعرے میں پیرزادہ قاسم سے ملاقات ہونی تو لازمی ہے۔ بلاآخر بی بی سی (وسعت اللہ خان) بھی بول پڑا:

"پراسرار تعلیمی قابلیت کے حامل پراسرار وزیر داخلہ کی پراسرار خدمات کے عوض کراچی یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے

پراسرار فیصلے کی خبر پر اس یونیورسٹی کے مشفق وائس چانسلر ہی کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائیں گے
اگر یونہی جیا کیے، ضرورتوں کے درمیان

اور تب سے ہم پیرزادہ صاحب ہی کا یہ مصرع کچھ ترمیم کے ساتھ گنگنا رہے ہیں:

صاحب اختیار ہو، ڈگری دے دیا کرو

حمید اختر۔آگے چلیں گے دم لے کر

حمید اختر نے اپنی کتاب ' آشنائیاں کیا کیا' کے آغاز میں شان الحق حقی کا یہ شعر درج کیا تھا:

آیا نہیں پلٹ کے کوئی بھی گیا ہوا
میں خود ہی جاؤں گا اب انہیں ڈھونڈتا ہوا

اپنے یاران گم گشتہ کی تلاش میں حمید اختر لاہور کے شوکت خانم اسپتال میں سولہ اکتوبر دو ہزار گیارہ کی رات ساڑھے نو بجے یہ دنیا چھوڑ گئے۔
لاہور کی آخری اور توانا 'ترقی پسند' شمع بجھ گئی۔
چند ماہ کے وقفے سے اہل لاہور کو پہلے اے حمید اور پھر اب حمید اختر کی رحلت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ گزشتہ کئی برس سے وہ ایکسپریس اخبار میں 'پرسش احوال' کے عنوان سے کالم لکھ رہے تھے۔ اپنے کالم میں وہ جہاں روز مرہ کے سماجی اور سیاسی مسائل کو موضوع بحث بنایا کرتے تھے، وہاں کبھی کبھی ان کا قلم یاد ماضی کو کریدنے میں بھی مصروف ہو جایا کرتا تھا اور وہ فیض احمد

فیض، ساحر لدھیانوی، احمد راہی، اے حمید جیسے تخلیق کاروں کے بارے میں انواع اقسام کی معلومات کے ڈھیر لگاتے چلے جاتے تھے۔اپنے انہی کالمز میں وہ فلاحی کاموں کے لیے بھی اپنے پڑھنے والوں سے تعاون کی درخواست کرتے تھے۔فروری 2011 کے ایک کالم سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"چند روز قبل ہم نے پشاور کے نواح کے رہائشی ناصر کے دو سالہ بیٹے عباس کے بون میرو کے لاکھوں روپوں کے اخراجات کے بارے میں اپنے قارئین سے اپیل کی تھی۔ہمیں خوشی ہے کہ اس کا انتظام ہوگیا ہے، تمام ٹیسٹ ہوچکے ہیں اور دوایک روز میں علاج شروع ہوجائے گا"

ان کے کالمز پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پشاور کے ناصر جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کی دعائیں انہوں نے لی ہوں گی!

حمید اختر 4 جون 1924 میں ضلع لدھیانہ کی ریاست فرید کوٹ میں پیدا ہوئے تھے، لدھیانہ میں ان کی دوستی ساحر لدھیانوی اور ابن انشاء سے ہوئی۔1946 میں ساحر لدھیانوی انہیں اپنے ہمراہ بمبئی لے گئے، حمید اختر نے بمبئی کی فلمی دنیا میں بھی قسمت آزمائی کی تھی۔1948 میں بننے والی فلم 'آزادی کی راہ پر' میں انہوں نے پرتھوری راج کپور، جے راج اور جگدیش سیٹھی کے ہمراہ ایک کردار

ادا کیا تھا۔ اس فلم کے مکالمے لکھنے کا کام ساحر لدھیانوی کے ذمے تھا۔ اسی اثناء میں انہیں فلموں میں کام کرنے کی پیشکش ملنے لگی لیکن حمید اختر نے بمبئی میں مزید قیام نہیں کیا، برصغیر کی تقسیم کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے، وہ پہلے نکودر کیمپ اپنے اہل خانہ کو لینے پہنچے اور انتہائی نامساعد حالات کا شکار رہنے کے بعد بلاآخر لاہور پہنچنے میں کامیاب ہوئے ۔ نکودر سے لاہور پہنچنے میں انہیں تین ماہ کا عرصہ لگ گیا، لاہور میں ان کے مارے جانے کی خبر عام ہو چکی تھی، وہ سیدھے مکتبہ اردو پہنچے، مکتبہ کے مالک چودھری نذیر احمد کے پاس حمید اختر کی جوانمرگی پر رضیہ سجاد ظہیراور کرشن چندر کے تعزیتی خطوط پہنچ چکے تھے۔بقول احمد سلیم ''نکودر کیمپ حمید اختر کی روح کے نہاں خانے ہی میں نہیں بلکہ ان کی تحریروں میں بھی امر ہو چکا تھا۔''

حمید اختر، ساحر لدھیانوی پر 'اتھارٹی' سمجھے جاتے تھے، جس قدر وہ ساحر کو جانتے تھے، شاید ہی کوئی دوسرا یہ دعوی کرسکا ہو۔اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں انہوں نے ساحر لدھیانوی کا بے مثال خاکہ تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں جن مشاہیر ادب کے خاکے شامل ہیں ان میں سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، سید سبط حسن، کرشن چندر، ابن انشائ، اخلاق احمد دہلوی اور ابراہیم جلیس شامل ہیں۔

کال کوٹھری، لامکاں،احوال دوستاں ،آشنائیاں کیا کیا (احوال دوستاں کا اضافی نسخہ) ، ان کی چندیادگار کتابیں ہیں ۔روداد انجمن کے نام سے ان کی کتاب منظر عام پر آئی جو سے 1947 تک انجمن ترقی پسند مصنفین ممبئی شاخ کے ہفتہ وار جلسوں کی 1946 کاروائی پر مبنی ہے، حمید اختر یہ کاروائی سیکریٹری کی حیثیت سے قلم بند کرتے رہے تھے اور یہ بمبئی کے ہفتہ وار رسالے نظام میں دو برس تک شائع ہوتی رہی تھی۔ بمبئی کے ان سنہرے دنوں اور حمید اختر کو یاد کرتے ہوئے ہندوستانی ادیب رفعت سروش اپنی خودنوشت 'بمبئی کی بزم آرائیاں' (نورنگ کتاب گھر، دہلی، 1986) میں لکھتے ہیں: ہفتہ وار نظام کا دفتر ہم چند ادیبوں کا اڈا بن گیا تھا۔ نظام کسی پارٹی کا آرگن نہ ہوتے" ہوئے بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا آرگن بن گیا تھا اور اس کی ہفتہ وار میٹنگوں کی تفصیلی رپورٹیں باقاعدگی سے اس میں چھپتی تھیں۔ یہ پرچہ کئی سال تک بڑے کروفر سے چلا۔ اگر آج اس کے فائل کسی کے پاس ہوں تو اس زمانے کی ادبی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ نظام کے دفتر میں روز شام کو آنے والوں میں ابراہیم جلیس، ساحر لدھیانوی، حمید اختر شامل تھے۔ساحر لاہور چھوڑ کر بمبئی آگئے تھے اور ان کے ساتھ ان کے جگری دوست حمید اختر بھی تھے۔حمید اختر نے

انجمن کے سیکریٹری کا کام سنبھالا ہوا تھا اور باقاعدہ سچی سچی اور دلچسپ رپورٹ لکھتے تھے۔ حمید اختر کی رپورٹنگ میں واقعہ نگاری کا عنصر آ جاتا تھا، اس لیے نہ صرف بمبئی بلکہ "ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان رپورٹوں کو دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

رفعت سروش کی یہ خواہش کہ انجمن ترقی اردو کی حمید اختر کی تحریر کردہ رپوٹس کبھی شائع ہو سکیں، کئی برس بعد اس وقت پوری ہوئی جب مذکورہ رپورٹس کتابی شکل میں رودادِ انجمن' کے عنوان شائع ہوئیں۔ اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ ہفتہ وار ' نظام'' کے مالکان تقسیم ہند کے ہنگاموں کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے اور اس دوران نظام کی فائلیں اپنے ہمراہ نہ لا سکے۔ حمید اختر نے ان فائلوں کی تلاش میں خاصا سر مارا لیکن پھر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ 1995 میں اسلام آباد میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران پشاور کے معروف ادیب و شاعر خاطر غزنوی مرحوم نے حمید اختر کو یہ مژدہ سنایا کہ نظام کی دو فائلیں ان کے کتب خانے میں محفوظ ہیں، غزنوی صاحب نے مذکورہ فائلیں 1998 میں حمید اختر کو سونپ دیں اور یوں 'ترقی پسندانہ' تاریخ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔

2010 میں لاہور کے ناشر بک ہوم نے ان کی سوانح عمری شائع کی جسے معروف ادیب

احمد سلیم نے تحریر کیا ہے۔

جیل میں قید کی روداد پر مبنی کال کوٹھری نامی ان کی کتاب 1953 میں شائع ہوئی تھی، تاحال اس کے کئی نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ کتابی شکل میں اپنی پہلی اشاعت سے قبل یہ داستان امروز میں سرگزشت اسیر کے عنوان سے قسط وار شائع ہوتی رہی تھی۔ ایک ایڈیشن میں حمید اختر نے بھی اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ آخر اس کتاب کی مقبولیت کی وجہ کیا ہے، اس کا جواب بھی انہوں نے خود ہی پیش کیا، ان کے مطابق پاکستان میں جیلوں کی حالت زار میں قیام پاکستان کے بعد سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ، یہی وجہ ہے کہ 'کال کوٹھری 'کی مانگ آج بھی اتنی ہی ہے جتنی اس کی پہلی اشاعت کے وقت تھی۔ جیلوں میں قیدیوں سے جس طرح کا بہیمانہ سلوک ہوتا ہے اس کا احوال کئی اسیروں نے قلم بند کیا ہے لیکن کتاب مذکورہ کا انداز بیان سب سے جدا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری مقرر کیے گئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب مملکت خداداد پاکستان اس بات کا تعین کر چکی تھی کہ اسے دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے کس کا ساتھ دینا ہے، لہذا بیک جنبش قلم، تمام ترقی پسند مصنفین مشکوک قرار پائے۔

دائیں اور بائیں بازو کی بحث میں بہتیرے خوشحال ادیبوں کے معاشی بازو ہی کٹ

کر رہ گئے!

کال کوٹھری اس قید کی روداد ہے جب حمید اختر کو 'سیفٹی ایکٹ' کی دفعہ تین کے تحت گرفتار کرکے چھ ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا تھا۔

کال کوٹھری سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

" جمعدار نے تالہ کھولا، میں دروازے سے گزرتا ہوا احاطے میں داخل ہوا، ایک مٹکا پانی، ایک مٹی کا لوٹا، ایک پیالہ اور کھجور کی ایک چٹائی میرے حوالے کرکے جمعدار نے دروازہ بند کردیا اور باہر سے تالہ لگا دیا۔ احاطہ میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ لطف یہ ہے کہ کمرے میں سلاخوں والے جنگلہ کا دروازہ تھا مگر احاطہ کا دروازہ لکڑی کے دوپٹ کا دروازہ تھا جس میں سے کچھ دکھائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس چار دیواری میں چٹائی بچھا کر، مٹی کے لوٹے کو سامنے رکھ کر جب میں لیٹا تو پہلی بار اس تنہائی کے احساس نے مجھے ڈس لیا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن انہیں پیتے ہوئے جیسے میں نے اپنے آپ سے مذاق کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا، حمید اختر! اگر کھجوریں بھی ہوتیں تو شاید تم پیغمبر ہوجاتے۔"

حمید اختر کی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' اردو ادب سے تعلق رکھنے والی نامور شخصیات سے متعلق لاتعداد دلچسپ واقعات کا مرقع ہے۔ 1988 میں احوال دوستاں شائع ہوئی اور جلد ہی اس کا ایک بھی نسخہ فروخت کے لیے باقی نہ رہا، چند برس بعد 'آشنائیاں کیا کیا منظر عام پر آئی جس میں سید سجاد ظہیر، اخلاق احمد دہلوی اور ابراہیم جلیس کے خاکے' شامل کیے گئے تھے۔

:آشنائیاں کیا کیا' میں حمید اختر، اخلاق احمد دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں'

مارچ کا مہینہ لاہور میں آمد بہار کا پیغام لاتا ہے، چیت کی ہوائیں درختوں سے لپٹ " کر موسم سرما کے خاتمے کا اعلان کرتی ہیں۔ ایسے موسم میں مارچ 1992 کے وسط میں تین آدمی لاہور کے بہت سے قبرستانوں میں سے ایک قبرستان میں دفنانے کے لیے ایک میت لے کر پہنچے، گورکن نے ان کی طرف غور سے دیکھا، دیکھنے میں وہ اچھے بھلے شریف آدمی نظر آرہے تھے مگر اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس شہر میں کوئی جنازہ اتنا چھوٹا اور کوئی آدمی اتنا بے وقعت ہوسکتا ہے کہ اس کے آخری سفر کے لیے صرف تین آدمی اس کی میت لے کر قبرستان پہنچیں۔

آپ کسی کو قتل کرکے لاش دفنانے تو نہیں لائے" ۔ گورکن نے ڈرتے ڈرتے سوال "
کیا

جب اسے یقین دلایا گیا کہ جنازے کے اس مختصر جلوس میں متوفی کے صاحبزادے جو ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہیں، شامل ہیں تو اس نے رسمی خانہ پری کی اور مقرر فیس وصول کرکے لاش کو دفنانے کے انتظامات کردیے۔

لاہور کی خاک نے کھلتے ہوئے پھولوں اور بہار کی خوشیوں سے لبریز اس دن جس میت کو اپنی آغوش میں سمیٹا وہ تہتر برس پہلے دلی میں پیدا ہونے والے سرتاپا دہلوی اخلاق " احمد تھے۔

ابراہیم جلیس کے خاکے میں لکھتے ہیں کہ وہ انتہائی باغ و بہار شخصیت تھے، کتنی ہی سنجیدہ محفل ہو اس کے آتے ہی اس کا رنگ بدل جاتا تھا۔ کسی محفل میں ایک صاحب کوئی بہت ہی خطرناک قصہ بیان کررہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ منظر دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

تو پھر کیسے بٹھائے رونگٹے آپ نے" ۔ جلیس نے پوچھا اور قصہ بیان کرنے والے کی "
بات ختم ہوگئی۔

ابن انشاء، اے حمید اور حمید، دونوں ہی کے بے تکلف دوست تھے۔اے حمید صاحب نے
تو ابن انشاء پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو 1979 میں لاہور سے شائع ہوئی تھی ۔
آشنائیاں کیا کیا 'میں حمید اختر نے انشاء جی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک دانشور '
بیوہ خاتون کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے اور اسے بری طرح دل دے بیٹھے تھے۔ یہ
سلسلہ دو برس چلا اور اس کے بعد ایک دلچسپ واردات ہو گئی۔ یہ واردات کیا تھی،
: آیئے حمید اختر کے الفاظ میں پڑھتے ہیں

میں سبط حسن کو لے کر ان خاتون کے گھر پہنچا، سخت سردی کا موسم تھا، ہم ڈرائنگ "
روم میں جا بیٹھے، خاتون لباس تبدیل کرنے اندر گئی ہوئی تھی، وہاں خفیہ پولیس کا ایک
اعلی افسر بیٹھا تھا جو عمر میں اس خاتون سے چھوٹا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا،
میں اس افسر کو جانتا تھا، وہ سرخ و سفید رنگت والا ایک خوبصورت شخص تھا۔ میرے
:بیٹھتے ہی اس افسر نے مجھ سے سوال کیا

" یہ ابن انشاء کون ہے اور یہ نام کیا ہے؟ "

میں نے مختصراً ابن انشاء کا تعارف کرایا اور نام کے فارمولے کا بھی تذکرہ کیا کہ اس کا
نام شیر محمد ہے مگر چونکہ اس کے والد کا نام منشی خان ہے جو

انشاء سے مشتقق ہے، لہٰذا اس نے یہ فیشن ایبل نام رکھ لیا۔

یہ صاحب (افسر) دو منٹ تک خاموش رہے۔ پھر انھوں نے اپنی بھوری مونچھوں کو تاؤ دیا اور خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے:

"اچھا شیر محمد ولد منشی خان، میں تجھے تجھ سے بھی سمجھ لوں گا۔"

میں نے (حمید اختر) اس کی تفصیل ابن انشاء کو بتائی تو پہلے تو اس نے ہنس کر ٹال دیا، پھر بہت پریشان ہوا، کہنے لگا: "یار یہ رقیب سرح رو تو چھ مہینے کے لیے نظر بند بھی کرسکتا ہے۔"

اس کے بعد اس گھر میں ابن انشاء کی آمدورفت ختم ہو گئی۔

غرض 'آشنائیاں کیا کیا' اردو ادب کی آبرو کہلائے جانے والی شخصیات سے متعلق رنگا رنگ واقعات سے بھرپور ایک پورے عہد کو اپنے اندر سموئے ہوئی ہے اور ایک بلاشبہ ایک ایسی کتاب کہلائے جانے کی مستحق ہے جو ہمیشہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اے حمید نے اپنے دوست حمید اختر کا خاکہ تحریر کیا تھا، یہ اے حمید کی کتاب

:گلستان ادب کی سنہری یادیں' میں شامل ہے، وہ لکھتے ہیں'

حمید اختر ان دنوں امروز اخبار میں کام کرتا تھا، اس کے بڑے بھائی نے سنت نگر میں "
مکان الاٹ کروالیا تھا، ہم اکثر وہاں چلے جایا کرتے تھے۔ مکان کی پہلی منزل میں
بازار کے رخ ایک چھوٹا سا دیوان خانہ تھا۔ ہم وہاں بیٹھ کر چائے پیتے۔ حمید اختر کی
گفتگو کا انداز سادہ، بے لاگ اور شگفتہ ہوتا۔ آواز پر جوش اور زندگی سے بھرپور ہوتی۔
اس کے افکار، اس کی ساری شخصیت، ایک خاص نظریے کے رنگ میں رنگے ہوتے
تھے۔ وہ اپنے فکر اور عمل میں یک جان تھا۔ زمانہ سازی اور مصلحت کوشی اسے بالکل
"نہیں آتی تھی۔

پاکستان بننے کے بعد بارشوں اور سیلاب کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، لاہور میں سیلاب
آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سنت نگر کی گلیاں سات سات فٹ پانی میں ڈوب گئیں۔ کسی
نے آواز لگائی کہ حمید اختر کے اہل خانہ سیلاب میں پھنس گئے ہیں، سید سبط حسن نے یہ
سنتے ہی پانی میں چھلانگ لگائی اور اپنے نفیس پائپ اور کلف لگی سفید براق قمیض کے
!ہمراہ تیرتے ہوئے اس طرف چلے

! اے حمید لکھتے ہیں کہ حمید اختر کے لیے سبط حسن کی محبت میں کھوٹ نہیں تھا

اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ جناب اے حمید نے بھی تمام عمر قلم کی مزدوری کی اور بدقسمتی سے آخری دنوں میں وہ بھی بیماری اور اپنے معاشی حالات، دونوں سے جنگ کرتے نظر آئے۔ حمید اختر 2010 میں ایک روز اپنے دوست اے حمید سے ان کی بیماری کے دوران ملاقات کرنے گئے اور ان کی دگرگوں معاشی حالت دیکھ کر خاصے پریشان رہے، اپریل 2011 میں اے حمید انتقال کرگئے۔اس سانحے پر حمید اختر اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

"اے حمید ہمارے ان دوستوں میں شاید آخری تھا جن کے ساتھ ہم نے اس نئے ملک میں نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔1948-49 کا زمانہ ہم کیسے بھول سکتے ہیں جب احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، احمد راہی، اے حمید، صفدر میر، عبداللہ ملک اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں سے ہمارا روز مرہ کا ساتھ رہتا تھا۔احمد راہی ہوں، صفدر میر ہوں، حمید اختر ہوں یا اے حمید، ان میں سے کسی نے بھی شاید ہی کوئی پلاٹ الاٹ کرانے کی کوشش کی ہو۔ گزشتہ تین برس سے وہ (اے حمید) گوشہ نشین تھا، وہ ایک نہایت بھولا بھالا انسان تھا، ایک اخبار میں برسوں کالم لکھا مگر معاوضہ کبھی پورا نہ پایا۔شروع میں اسے اپنے کالم کے تین سو اور بعد میں پانچ سو روپے ملتے تھے۔ساتھ آٹھ برس پہلے جب ہم نے ایکسپریس جوائن کیا تو اس وقت کے ایڈیٹر سے اے حمید کو ملنے والے کم معاوضے کی بات کی، ایڈیٹر صاحب نے ہمیں فوراً اس سے ملنے اور ہفتہ وار کالم

لکھنے کا کہا اور ایک کالم کے پانچ گنا زیادہ معاوضے کی پیشکش کی۔ ہم اے حمید کے گھر پہنچے اور اسے اس پیشکش سے آگاہ کیا مگر مروت کے اس مجسمے نے معذرت کرتے ہوئے کہا، یار حمید اختر تمہارا بہت بہت شکریہ، مگر میں برسوں سے جس اخبار سے منسلک ہوں اس سے علیحدہ ہونا کچھ درست نہیں لگتا۔"

ایکسپریس اخبار کا کالم حمید اختر کو ان کے قارئین سے رابطے میں رکھتا تھا۔ ان کالمز کے ذریعے وہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنی یادوں میں شریک رکھتے تھے۔ 17 ستمبر 2011 کے کالم میں لکھتے ہیں:

"پاکستان نیا نیا بنا تھا، کراچی میں ہم نے اسٹیٹ بینک کی تقریب میں اس وجہ سے شرکت کی کہ وہاں خطاب کے لیے قائد اعظم نے آنا تھا، وہ اسٹیج پر آئے تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے، افسانہ نگار انور نے خدشہ ظاہر کیا کہ قائد اعظم ڈیڑھ دو مہینوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ اس بات کے بعد ہم لاہور آ گئے۔ لاہور میں ہمارا اڈہ، ابن انشاء کا پگوڈا نامی گھر ہوا کرتا تھا، ان محفلوں میں حفیظ قندھاری نامی ایک فوٹو گرافر بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ اخباری تصویر بنانے میں کافی مہارت رکھتا تھا مگر اس کی زیادہ تصویریں نیگیٹو تک ہی محدود ہوا کرتی تھیں۔ دوست اسے عام طور پر نیگیٹو فوٹو گرافر کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں ہم قائد اعظم کی بیماری کا بھی

ذکر کیا کرتے تھے۔ قائد اعظم کی بیماری کا سن کر حفیظ نہ صرف بے تحاشا غصے میں آیا بلکہ ہمیں بہت برا بھلا بھی کہتا رہا۔ چند دنوں بعد گیارہ ستمبر کو قائد اعظم وفات پا گئے۔ ہم سو رہے تھے کہ حفیظ قندھاری غصے اور صدمے سے گھبرایا وہاں پہنچا اور اس نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ وہ تقریباً گالیاں دے رہا تھا اور ہماری کالی زبان پر لعنت بھیج رہا تھا جیسے کہ قائد اعظم کی وفات کے ہم ذاتی طور پر ذمہ دار ہوں۔ ایبٹ روڈ کی اس سینما والی سڑک پر صبح صبح ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے حفیظ قندھاری کو وہاں سے چلتا کر کے ہمیں رہائی دلائی۔ اس بے چارے کو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ہمیں قائد اعظم کی رحلت کا شاید اس سے زیادہ صدمہ تھا۔ "

اپنے کالم امرتسر میں چھ گھنٹے میں حمید اختر لکھتے ہیں ':

" گولڈن ٹیمپل دیکھنے گئے تو اس مقدس مقام کے دروازے سے کوئی پچیس گز پہلے ایک بہت بوڑھے سکھ نے جس کے ہاتھ میں کڑاہ پرشاد کا ڈونا تھا، مجھے اور احمد سلیم کو پکڑ کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا ' کتھوں آئے او ؟ '، جب ہم نے لاہور کا نام لیا تو اس نے کڑاہ پرشاد کا ڈونا وہیں ہجوم کے درمیان زمین پر رکھ دیا، ہم سے بغلگیر ہوا اور روتے ہوئے بولا ' اوے میں سید مٹھا بازار دا آں، ظالمو، میرے نال دو اکھر (الفاظ) تاں بول لؤ۔'

حمید اختر 1996 میں کینسر کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے اور ایک طویل عرصے سے ان کا علاج جاری تھا، اپنے کالمز میں وہ اس بارے میں کبھی کبھی لکھ دیا کرتے تھے ، اپنا آخری کالم انہوں نے 20 ستمبر 2011 کو لکھا، عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے مذکورہ کالم کا عنوان ' جنم بھومی کی طرف' رکھا، یہ کالم اخبار سے ان کی آٹھ سالہ رفاقت کا اختتام ثابت ہوا،اپنے اس کالم میں یہ خوددار انسان قدرے مایوس نظر آیا:

اپنی صحت کی طرف سے ہم خاصے مایوس ہو چکے ہیں اس لیے شاید اب کالم نویسی ترک " کرنے پر مجبور ہو جائیں۔یہ درست ہے کہ ہم نے آٹھ سال اس اخبار کی خدمت کی ہے اور کراچی سے باہر آنے کے بعد اس کی اشاعت بڑھانے میں پوری پوری مدد بھی کی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب بغیر کام کیے معاوضہ وصول کرتے رہیں۔اب تک ہم نے قارئین کے اصرار پر اور کچھ اپنے علاج کی مجبوری کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری رکھا مگر اب یہ بیماری اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ اب اسے جاری رکھنا شاید ممکن نہ ہو، بہرحال "اس کا فیصلہ یہ مہینہ گزرنے کے بعد ہوگا۔

لیکن ہوا یہ کہ ستمبر کا مہینہ بھی گزرا اور حمید اختر بھی گزر گئے!

اس وقت جب یہ سطور سپرد قلم کی جارہی ہیں، منصب اقتدار پر فائز اعلی شخصیات نے وہ تعزیتی بیان جاری کر دیا ہے جسے انہوں نے دو روز قبل ادیب منشا یاد کے انتقال کے وقت بھی جاری کیا تھا، وہ جسے ایسے تمام موقعوں پر بلاتاخیر جاری کر دیا جاتا ہے، اور جو قیام پاکستان کے وقت سے سرکار کی فائلوں میں سب سے نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ فی الفور یہ بیان جاری کیے جانے سے پہلے اگر ہمارے اہل قلم کو درپیش معاشی مصائب کا جائزہ لیے جانے کی بھی روایت ہوتی تو بہتیرے دم توڑتے خودار ونادار ادباء و شعراء کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ اگر یہ توجہ بروقت دی جاتی تو لاکھوں افراد کے محبوب مصنف اے حمید، 2010 میں لاہور کی جان لیوا گرمیوں میں اپنے کمرے میں بغیر ائیر کنڈ شہر کے، محض اس لیے اذیت میں نہ پڑے رہتے کہ ان کے پاس بجلی کا بل دینے کے پیسے نہیں تھے!

سفر گزشت۔ ہندوستان کا ایک سفر نامہ

ہندوستان کے سفر نامے 'سفر گزشت' کی اشاعت سے قبل جناب عتیق صدیقی کا نام ادبی حلقوں میں یقیناً تعارف کا محتاج تھا لیکن اب یقیناً ایسا نہیں رہے گا۔ 1979 میں کیے گئے اس سفر کی روداد گزشتہ برس کراچی کے اخبار روزنامہ اسلام میں شائع ہوتی رہی تھی۔ مذکورہ اخبار کے قارئین کا ایک مخصوص حلقہ ہے لہٰذا یہ منفرد اور انتہائی دلچسپ سفری روداد اکثریت کی دسترس سے دور ہی رہی۔ مذکورہ اخبار میں یہ سفر نامہ سو اقساط میں مکمل ہوا۔ جون 2010 میں اسے کراچی کے ایک غیر معروف ناشر ایم آئی ایس نے شائع کیا اور تب بھی قارئین کی اکثریت 'جو رہی سو بے خبری رہی' کے مصداق اس سے بے خبر ہی رہی۔ پھر یوں ہوا کہ ایک بڑے اخبار نے اکتوبر 2011 میں 'سفر گزشت' کا ایک مختصر تعارف شائع کیا اور ہندوستانی سفر ناموں کے شائق ہم اپنے دفتر سے واپسی پر ناشر کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے اس تک پہنچ ہی گئے۔ ادارے کے منتظم سے عرض کیا کہ رکشے والے نے یہاں پہنچانے کے جو پیسے لیے ہیں وہ کس کھاتے میں جائیں گے؟ انہوں نے جواب میں 350 کی کتاب پر پچاس فیصد رعایت دے دی۔

ہندوستان کے سفر ناموں میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں :

ہند یاترا۔ ممتاز مفتی

دیکھا ہندوستان ۔ حسن رضوی

دیواروں کے پار ۔ منیر فاطمی

دلی دور ہے ۔ قمر علی عباسی

سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان ۔ سید انیس شاہ جیلانی

تین شہروں کی کہانی ۔ شہزاد منظر

اے آب رود گنگا ۔ رفیق ڈوگر

دلی دور است ۔ عطاء الحق قاسمی

سفرنامہ وہ ہے جو 'سرسری ہم جہان سے گزرے' کے بجائے 'ہر جا جہان دیگر' کی مثل ہو۔ 1979 کے اس سفرنامے کو 2011 میں پڑھیے یا پھر 2021 میں، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کا اسلوب کبھی پرانا محسوس نہیں ہوگا۔ عتیق صدیقی اپنے پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں، اس کی زبان رواں اور سلیس ہے، انداز بیاں دل نشیں اور جاذب نظر ہے، واقعات میں زیب داستان کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ صنف نازک کا ذکر نہ ہونے کے باوجود بھی یہ ابتدا سے اختتام تک اپنی دلچسپی برقرار رکھتا ہے حالانکہ لکھنو میں اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کی خاطر یہ سفر انھوں نے اس وقت کیا تھا جب وہ نوجوان تھے ۔ جملہ معترضہ ہی سہی لیکن ہمارے بعض لکھنے والوں نے تو صنف نازک کے ذکر کو اپنے سفرناموں کا ایک لازمی جز بنایا ہوا ہے۔ اس طرح

سفر ناموں کی مانگ اور نئے نسخوں کی اشاعت مسلسل میں کبھی کمی نہیں آتی۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ انہوں نے ایک سفر نامہ لکھ رکھا ہے لیکن اسے شائع اس لیے نہیں کرواتے کہ اس میں ذکر صنف نازک عنقا ہے۔ برسوں پہلے ایک واقعہ پڑھا تھا کہ لاہور کے یعقوب ناسک لندن علاج کی غرض سے گئے، وہ ٹیوب میں سفر کر رہے تھے، ان کے برابر میں ایک انگریزی خاتون محوخواب تھیں، سوتے سوتے ان کا سر یعقوب صاحب کے کندھے سے آ لگا۔ انہوں نے خاتون کو جگاتے ہوئے کہا" بی بی اٹھو! میں یقوب ناسک ہوں، مستنصر حسین تارڑ نہیں"۔

ہندوستان ہمارا پڑوسی ملک ہے اور وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بستی ہے۔

ہندوستان کے ان سفر ناموں کی مدد سے قاری وہاں کے عوام کے جذبات واحساسات اور ان کی سوچوں کے رخ سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین کی ایک بڑی تعداد ان سفر ناموں کی ہمہ وقت منتظر رہتی ہے۔

عتیق صدیقی صاحب کے سفر ہندوستان کے ابتدا ہی میں انہیں ایک حادثہ درپیش آگیا تھا، وہ بذریعہ بس لاہور جا رہے تھے کہ راستے میں رات کے وقت بس الٹ گئی، کھڑکی کا شیشہ توڑ کر وہ باہر نکلے اور ایک دوسری بس میں بیٹھ کر لاہور پہنچے جہاں سمجھوتہ ایکسپریس میں سوار ہو کر ہندوستان کی راہ لی۔ عتیق

صدیقی امرتسر پہنچے اور وہاں سے لکھنو کا قصد کیا، لکھنو کے لیے وہ ایک ٹرین میں بیٹھے جس کی مدد سے انہیں پہلے جالندھر اور پھر وہاں سے سیالدا ایکسپریس کے ذریعے لکھنو پہنچنا تھا۔ مسافروں سے بھری اس ٹرین میں ہر مسافر کی ایک کہانی تھی لیکن ایک ایسی پاکستانی خاتون بھی سفر کر رہی تھیں جن کی کہانی سن کر دوسرے مسافر بھی آبدیدہ ہوگئے۔ لاہور کی رہائشی یہ خاتون برصغیر کی تقسیم کے وقت کا ایک عہد نبھانے کے لیے انبالہ جارہی تھیں، ان کے ہمراہ برتنوں سے بھرا ایک تھیلا تھا، یہ برتن انہوں نے برسوں سے سنبھال کر رکھے تھے۔ تقسیم کے وقت لاہور میں انہیں ایک سکھ خاندان نے پناہ دی تھی جو بعد ازاں ہندوستان روانہ ہوگیا تھا لیکن جاتے جاتے اس گھرانے کی بہو نے اپنے برتنوں پر اس طرح ایک نگاہ حسرت کی جیسے کوئی اپنے کسی پیارے کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔ اس لمحے ان خاتون نے خود سے عہد کیا کہ وقت آنے پر یہ امانت انبالہ ضرور پہنچائیں گی۔ ٹرین میں بے انتہا رش کی وجہ سے وہ ایک سردار جی پر خفا ہو رہی تھیں جن کی پتلون پر خاتون کے ٹرنک کا کونا لگ جانے کی وجہ سے کھرونچا پڑ گیا تھا، رفتہ رفتہ دوسرے مسافروں نے بھی اس نوک جھونک میں دلچسپی لینا شروع کردی، آیئے یہ منظر دیکھتے ہیں :

آپ پاکستان سے آئی ہیں اماں "۔۔ کسی نے پوچھا "

ہاں" ۔ خاتون نے مختصر سا جواب دیا"

کیا حال ہیں پاکستان کے" ؟۔۔ ایک لہکتی آواز آئی"

”بہت اچھے۔ کرم ہے سوہنے رب کا“

سنا ہے مہنگائی بہت ہے پاکستان میں ” ایک نئی آوازابھری“

مہنگائی۔۔ مہنگائی کہاں نہیں ہے؟ تمہارے انڈیا میں مہنگائی نہیں ہے ؟ مہنگائی سے تو دنیا“
”پریشان ہے

مگر وہاں آمدنی بھی زیادہ ہے جی۔” کسی نے اعتراف حقیقت کیا۔“ لوگ باگ زیادہ“
”خوش ہیں ہمارے ملک سے

خاتون بولیں “ تو اور کیا۔ مہنگائی ہو بھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بازار بھرے رہتے ہیں خریداروں سے۔” خاتون کے لہجے میں فخر تھا۔“ آج کل ہی دیکھو، وہاں آلو دس روپے کلو بک رہے ہیں مگر لوگوں نے کھانا نہیں‌چھوڑ دیتے، اسی طرح خرید رہے
”ہیں جیسے روپے ڈیڑھ روپے میں خریدے جاتے تھے۔

دس روپے کلوآلو” ۔۔ کئی تحیر آمیز آوازیں ایک ساتھ ابھریں اور چند لمحوں کے لیے“
خاموشی چھا گئی۔

واہ بھئی واہ پاکستان” کھرونچازدہ پتلون والے سردار جی بدبدائے تھے۔“

خاتون نے ان کی بات سن لی اور بھنا کر زور سے بولیں “ وہاں تیری طرح کپڑے پر ذرا سی لکیر آ جانے سے کوئی اتنی بدتمیزیاں بھی نہیں کرتا عورت ذات سے۔ایک تو کیا
”دس پتلونیں پھٹ جائیں، کسی کو پرواہ نہیں ہوتی۔

ان کی اس بات پر زور کا قہقہہ پڑا۔

جالندھر ریلوے اسٹیشن پر ’کنڈکٹر گارڈ‘ کو عتیق صدیقی کا سوا روپے کا

نقصان برداشت نہ ہوا اور وہ اس بات پر افسوس کرتا رہا، ادھر صدیقی صاحب کو سوا روپے کے نقصان سے زیادہ وقت کی بربادی کی فکر لاحق تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس بات پر حیرت بھی کہ پاکستان میں تو ریلوے کا وہ حال ہے کہ سوائے مسافروں کو لوٹنے کے، اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا اور ادھر اس فرض شناس انسان کو سوا روپے کے ضائع ہونے کا اس قدر افسوس تھا۔ عتیق صدیقی ہندوستان اور پاکستان کے ریلوے کے نظام میں فرق محسوس کرتے رہے۔ گارڈ صاحب کو ان سے ایسی ہمدردی ہوئی کہ سفر کے آغاز میں انہیں اپنا بستر دے گئے، صدیقی صاحب کو احساس ہوا کہ دوران گفتگو ان کا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ ہوگیا تھا۔ یہ تھے بارہ بنکی کے رہائشی ایس ایم علی جو لکھنو کی روایات کے امین ہونے کے ناتے سلام کے بجائے آداب کہتے تھے اور عتیق صدیقی یہ سوچتے رہ جاتے کہ آداب کے جواب میں کیا کہنا مناسب ہوگا۔ سفر کے اختتام پر ایس ایم علی صاحب نے عتیق صدیقی کو اپنے گھر کا پتہ دیا اور یہ ایک اتفاق تھا کہ اس کے کئی روز بعد لکھنو میں علی صاحب سے ان کی اچانک ملاقات بھی ہوئی اور وہ لکھنو میں ان کے بھانجے کے مہمان بھی بنے۔

عتیق صدیقی کو سیالدا ایکسپریس میں سفر کے دوران ہندو معاشرے کی ایک جھلک اس وقت دکھائی دی جب ایک تعلیم یافتہ شخص نے ان کی ناشتے کی دعوت کے جواب میں سخت رویے کا مظاہرہ کیا اور اپنا منہ پھیر لیا، عتیق صدیقی حیران رہ

گئے، کچھ دیر بعد وہ صاحب گویا ہوئے:

"مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، خصوصاً اس لیے کہ مجھے تمہارے بارے میں یقین تھا کہ تم پاکستانی ہو۔ مگر میں ہندو ہوں۔۔اور ہم ہندوؤں میں اس طرح ایک برتن میں کھانے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔اس لیے تمہاری دعوت پر میرا ردِّ عمل فطری تھا، بہرحال اس سے تمہیں تکلیف پہنچی جس کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ یہ ہندو غیر ہندو کا معاملہ نہیں ہے، ہم ہندو بھی آپس میں اس طرح نہیں کھاتے پیتے"۔

عتیق صدیقی لکھنو کے مضافات میں واقع بستی 'اسیاء مؤ ع' میں مقیم اپنے چچا کے گھر پہنچے، رات ہو چکی تھی،سب لوگ انہیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے، سفر کی تکان سے چوُر عتیق صدیقی اپنے چچا سے غسل خانے کا پوچھ بیٹھے اور یہ معلوم ہونے پر کہ ایسی کوئی چیز اس گھر میں ہے ہی نہیں، عتیق صدیقی سٹپٹا گئے۔ غسل خانہ صحن میں واقع ایک چبوترے کو کہا جاتا تھا جہاں گھر کے مرد تہمد باندھ کر غسل کرتے تھے۔ ان کی چچی بولیں "تو تمہارے چچا مکان بنوا رہے تھے تو کتنا کہتی رہی کہ ایک غسل خانہ بھی بنوا لو، محل کھڑا کر لیا مگر بالشت بھر کا ایک غسل خانہ نہ بنوایا، اب دیکھو بچہ خیر سے کیسا پریشان ہو رہا ہے، تمہارے گھر میں خیر سے غسل خانے ہوں گے، کراچی تو سنتے ہیں بہت بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے۔"

اسیاء م؛ؤع میں ایک روز قیام کے بعد عتیق صدیقی ملیح آباد میں مقیم اپنے دوسرے چچاؑ اور ناناکے گھر پہنچے۔

!ملیح آباد۔۔ جوش ملیح آبادی کا شہر۔۔۔ سرپھرے، غصہ ور باسیوں کی بستی

ناناکے گھرکے اطراف میں رات کو گیدڑ چلایا کرتے اور جگنو چمکا کرتے تھے۔ کراچی کے باسی مسافرکے لیے جگنوایک نئ چیز تھا، مبہوت ہو کر دیکھا کیے۔۔بڑی نانی نوے برس کی تھیں لیکن سوئی میں دھاگا بنا کسی کی مدد کے ڈالتی تھیں۔ ناناکے گھر میں عتیق صدیقی کی اکثر فرمائش بیسن کی روٹی ہوا کرتی تھی اور ان کی نانی اپنی نند (چھوٹی نانی) سے کہتیں: " شکر کرو مریم! اللہ نے سستا مہمان بھیجا ہے۔ کہیں مرغ مسلم ،پلاؤ تنجن "کی فرمائش کرنے والا ہوتا تو پتہ چل جاتا۔

ناناکے گھرایک معصوم سی غلطی بھی عتیق صدیقی سے سرزد ہوئی۔انہوں نے اپنے نانا کو تحفے میں ’پروفیسی‘ خوشبو کی دو عدد بوتلیں دیں جو انہوں نے کراچی صدر کے علاقے سے پندرہ روپے فی بوتل کے حساب سے سرحد (اب خیبر پختونخوا) کے ایک پٹھان سے خریدی تھیں، جواب میں ان کے نانا ان کو دو سو روپے پکڑا دیتے ہیں۔ سرحدکے پٹھان سے خریدی ہوئی چیز ملیح آبادکے پٹھان تک جا پہنچی

!۔ بتیس برس پرانی اس ناجائز 'منافع خوری' پر عتیق صدیقی آج تک شرمندہ ہیں
ملیح آباد میں عتیق صدیقی کو فلم جنون کی فلم بندی کے دوران پیش آنے والا واقعہ سنایا گیا، ستر کی دہائی کے آخر میں جنون کی فلم بندی ہو رہی تھی، ملیح آباد کے کچھ پٹھان بھی وہاں موجود تھے، ہیرو (ششی کپور) نے اپنا کام مکمل کروایا اور اپنی قیام گاہ کی طرف جانے کو مڑا، خان صاحبان سے کہہ بیٹھا کہ بھائی ذرا راستہ دے دیجیے ۔اس کے بھائی کہنے پر خان صاحبان کو سخت غصہ آگیا اور انھوں نے ہیرو کی پٹائی کر دی۔
سالے نچنئے،، تیری ایسی کی تیسی، ہمیں بھائی کہتا ہے"۔ ہیرو کے چہرے پر ہوائیاں " اڑنے لگیں ،بڑی مشکل سے علاقے کے بڑوں نے درمیان میں پڑ کر اس کی گلو خلاصی کروائی۔
ملیح آباد کے اسی مزاج کی ایک مثال اس وقت سامنے آتی ہے جب مصنف اپنے خالو سے مرگھٹ پر کسی مردے کو نذر آتش کیے جانے کا منظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔
:ان کے خالو جواب میں کہتے ہیں
اماں لاحول بھیجو! وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔ اچھا ٹھیک ہے، مرنے تو "

" دو کسی کو۔ یا جلدی ہے تو بولو، مار دیں کسی کو؟

عتیق صدیقی ملیح آباد اور لکھنو کے درمیان آتے جاتے رہے۔ دن کا آغاز مریم نانی کے ہاتھ کے پر تکلف ناشتے سے ہوتا تھا اور دن بھر رشتہ داروں کے ساتھ گھومتے پھرتے گزر جاتا تھا۔ دن گزرتے گئے اور ان کے تیس روزہ ویزے کی مدت ختم ہونے کو آئی۔ ان کا دل کرتا تھا کہ وہ چند دن مزید اپنے آباء کی سرزمین پر اپنے پیاروں کے درمیان گزار لیں، سو ویزے کی میعاد مزید بیس روز کے لیے بڑھوا لی گئی۔ نانا کے گھر ایک روز ان کے دوست آفاقی صاحب آ گئے، محفل جم گئی۔ آفاقی صاحب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، اپنی جوانی کا ایک قصہ سنانے لگے۔ تقسیم ہند کا زمانہ تھا، آفاقی صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ اسی اثناء میں گاندھی جی قتل کر دیے گئے، یونیورسٹی میں چھٹیاں ہو گئیں، وہ اپنے چار دوستوں کے ساتھ دہلی کی سیر کو روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر ایک دوست کے گھر میں ڈیرے ڈالے۔ چند ہی روز میں پیسے ختم ہو گئے، ان کے دوست کے معاشی حالات بھی اچھے نہ تھے، آفاقی صاحب اور ان کے دوستوں نے اس کو مزید زیر بار کرنا مناسب نہ سمجھا، ادھر بس کا واپسی کا کرایہ بھی پلے نہ تھا۔ ایک روز تمام دوست مایوسی کے عالم میں بیٹھے تھے کہ ایک نے نعرہ مستانہ بلند کیا اور کہا کہ ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے، چلو میرے ساتھ، عیش کرواؤں گا۔ چار کے ٹولے نے اپنے اپنے حلیے درست کیے، لباس درست کیے اور

بالوں میں کنگھی کرکے دہلی کے ہندو کمشنر کے پاس پہنچ گئے۔ کمشنر کے سامنے ترکیبی دوست نے عاجزانہ لیکن پر اعتماد لہجے میں کہا کہ صاحب! گاندھی جی کا قتل انسانیت کا قتل ہے اور ہم مسلمان ہونے کے ناتے اس سوگ میں برابر کے شریک ہیں اور ان کی آتما کی شانتی کے لیے ان کا 'تیجا' (سوئم) کرنا چاہتے ہیں، ہم گھروں سے دور ہیں اور اکثر ہمارا ہاتھ تنگ ہی رہتا ہے، براہ کرم اس کارِ خیر کے لیے آپ ہمیں رقم عنایت کردیں۔ کمشنر بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنا صوابدیدی اختیار استعمال کرتے ہوئے چار سو روپے کی خطیر (اس زمانے میں) رقم انہیں دے دی۔ یاروں کا ٹولہ خوش خوش دہلی کے کمشنر کے دفتر سے باہر نکلا۔ ان روپوں سے تمام دوستوں نے دہلی میں بقیہ چھٹیاں ٹھاٹھ سے گزاریں۔

ہندو معاشرے میں گائے کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ماں کے نام پر اکثر فساد بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یہ گاؤ ماتائیں بازاروں میں گھومتی پھرتی ہیں، جہاں جی چاہا، بلا تکلف منہ مار دیا، یہ الگ بات ہے کہ دکاندار اگر ہندو ہے تو زبان سے تو کچھ نہیں کہتا لیکن اپنا دل تھام کر بیٹھ جاتا ہے۔ عتیق صدیقی نے اس سے متعلق کتاب میں ایک مزیدار واقعہ درج کیا ہے۔ ایک روز بس میں سوار ہو کر وہ لکھنو جا رہے تھے کہ رستے میں ایک جلوس کی وجہ سے بس رک گئی، عتیق صدیقی بس سے اتر گئے۔ کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا سبزیوں سے بھری ٹوکری لیے بیٹھا تھا

۔ اسی وقت ایک آوارہ گائے ادھر آ نکلی ۔ سجی سجائی 'ڈش' دیکھ کر اس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ بوڑھے کی پشت اس کی جانب تھی، اس لیے وہ نہ دیکھ سکا، گائے نے سبزی پر منہ مارا تو اسے علم ہوا، تیزی سے ٹوکری اپنی جانب کھینچنا چاہی، گائے نے جارحانہ انداز میں سر کو حرکت دی تو وہ بوکھلا کر پیچھے کی جانب الٹ گیا مگر فوراً ہی سنبھلا اور ہاتھ جوڑ کر خوشامدی انداز میں 'ہے ماتا ۔ ہے ماتا' کرنے لگا۔ مگر ماتا یہ تر مال چھوڑنے کو آمادہ نہ تھیں اور اس وقت تک ڈھائی تین کلو سبزی چٹ فرما چکی تھیں۔ بوڑھے کی برداشت جواب دے گئی۔ دانت کچکچاتے ہوئے بولا :

" اچھا ۔ ۔ہم ماتا ماتا کرت ہیں پن ان کے دماگ ہے نہیں ملتے ۔ ۔ تنی تھمو تو ۔ ۔ ۔ "

اس نے قریب پڑی ہوئی لاٹھی اٹھائی اور دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر سے بلند کرکے ماتا جی کی کمر پر رسید کی۔ وار بھرپور اور ریڑھ کی ہڈی پر پڑا تھا۔ ماتا جی نے ایک بھیانک آواز نکالی اور ادبدا کر بھاگیں۔ سامنے ہی جلوس تھا، اس میں جا گھسیں، کئی لوگ اس کی زد میں آ کر گرے، کچھ بھگدڑ میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ کچھ دوسروں کے قدموں تلے آئے۔ایسی چیخ پکار پڑی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

سفر گزشت 'میں کئی ایسے جملے ہیں جن کو پڑھ کر قاری مصنف کے شگفتہ انداز'

: تحریر سے لطف اندوز ہوتا ہے، چند مثالیں پیش خدمت ہیں

۔سائیکل رکشے والا کتوں کو دھتکارتا رہا اور ساتھ ہی ایسے رکیک جملے بھی ادا کیے کہ اگر کتے سمجھنے کے قابل ہوتے اور ان میں تھوڑی سی بھی غیرت ہوتی تو اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔

۔ چچی نے آگے بڑھ کر سر پہ ہاتھ رکھا، دعائیں دیں، اماں باوا کی خیریت پوچھی اور چونک کر بولیں ' 'لو میں بھی دوانی ہوئی ہوں، باوا تو خیر سے کب کے گزر گئے۔" ۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ 'خیر سے' ان کا تکیہ کلام ہے۔

۔بوگی میں ایک چھوٹے قد کے منحنی سے سردار سوار ہوئے، قلی سے اپنا سامان پھرتی سے لیا، وہ ہر کام نہایت تیزی سے کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے،ہم نے اتنا 'مختصر مگر جامع' سردار پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

۔پہلے تو خاتون نے سردار جی کے جثّہ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ اگر وہ حرام کھا کھا کر دنبہ نہ ہوگئے ہوتے تو خاتون کے ٹرنک سے سردار جی کی پتلون پر کھرونچا پڑنے کا یہ حادثہ پیش ہی نہ آیا ہوتا۔

لکھنو میں پچاس روز گزر چکے تھے اور اب واپسی کی تیاری تھی۔ کون پڑھنے والا عتیق صدیقی کی اپنے رشتہ داروں خاص کر نانا اور چھوٹی و بڑی نانی سے الوداعی ملاقات کے بیان پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا، ان کے یہ تقریباً تمام ہی رشتہ دار اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ۔ایسے منظر تقسیم ہند کے بعد پاک و ہند

میں اس وقت تک دیکھے جاتے رہیں گے جب تک دونوں ملکوں کے درمیان ویزے کی شرائط میں نرمی نہیں کی جائے گی۔ لوٹ کر جانے والے کی واپسی کا یقین ہو تو دل کو ایک ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ آیئے ہم بھی اس الوداعی منظر میں شریک ہوجاتے ہیں:

مریم نانی، پھوپھی جان سے لپٹی زار و قطار رو رہی تھیں۔اچانک انہوں نے پھوپھی جان کو دیر سے انتظار میں کھڑی بڑی نانی کے حوالے کیا اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوئی بولیں:

"ارے میرا بچہ (عتیق صدیقی) کہاں ہے۔۔ میری بٹیا کی نشانی۔۔آخری دفعہ جی بھر کر دیکھ لوں"

ہمارے قریب کھڑے نانا نے کہنی سے ٹھوکا دے کر ہمیں ان کے قریب جانے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت نانی نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور دونوں بازو پھیلائے ہماری طرف جھپٹیں:

"ہائے میرا لعل۔۔۔ کیسا ہماری محبت میں کوسوں دوڑا چلا آیا۔۔۔ کس دل سے رخصت کروں"۔

وہ ہم سے لپٹ کر آنسو بہانے لگیں۔ہماری آنکھوں کے گوشے بھی نم ہوگئے

اب کب دیکھ پائیں گے یہ صورت" انہوں نے دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں ہمارا" چہرہ لے کر پوچھا۔"آئے تھے تم تو بہت خوشی تھی۔اب جانے کا غم نہیں سہا جارہا۔اللہ ملائے تو اور بات، ورنہ اب یقین نہیں کہ مل سکیں گے" وہ ہچکیوں

!ا کے درمیان کہہ رہی تھیں

عتیق صدیقی کے سفرنامے سے متعلق چند باتوں کی نشان دہی ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں پیش لفظ موجود نہیں جس کی وجہ سے اس سفر کے اغراض و مقاصد سے قاری بے خبر رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کتاب میں مصنف کا تفصیلی تعارف نہیں دیا گیا جس کے بغیر یہ کتاب کچھ ادھوری سی محسوس ہوتی ہے۔ ہم یہاں اپنے پڑھنے والوں کو آگاہ کرتے چلیں کہ عتیق صدیقی کراچی سے نکلنے والے روزنامہ اسلام کے چیف نیوز ایڈیٹر ہیں۔ 400 صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ آدم جی نگر کراچی میں واقع ایم آئی ایس پبلکیشنز کے دفتر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ناشر کا رابطہ نمبر اور پتہ یہ ہے

92-21-34931044 523-C, Block Z, AdamJi Nagar, Karachi

اس کے علاوہ دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی اور اردو بازار کی کئی کتب خانوں پر بھی دستیاب ہے۔

جگجیت سنگھ۔ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

آخری سفر اور کچھ متفرق باتیں

ممبئی کی میرین لائن میں واقع چندن وادی برقی شمشان کے اطراف میں بسنے والوں کو شمشان کی انتظامیہ سے شکایت رہتی ہے کہ ایک ناخوشگوار بُو ہر وقت ان کو اپنے نرغے میں لیے رہتی ہے، اس فضائی آلودگی نے ان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ لیکن دس اکتوبر سن دو ہزار گیارہ کی سہ پہر وہ اس بارے میں کوئی حرف شکایت اپنے لبوں پر نہ لائے ۔ اس روز چندن وادی برقی شمشان میں ڈھلتی سہ پہر کے وقت اردو زبان کے سفیر کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اردو زبان کا یہ سفیر آج چندن وادی شمشان کے ریکارڈ میں چار عدد ہندسوں پر مشتمل ایک نمبر تھا جبکہ بجلی کی طاقتور اور بے رحم بھٹی کے لیے صرف ایک گوشت پوست کا مردہ جسم جسے اس نے چشم زدن میں راکھ میں تبدیل کر دیا۔

اس کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اس عظیم فنکار کے ان گنت مداحوں کے دل بھی جل کر راکھ ہو گئے۔

چندن وادیشمشان انتظامیہ کے پاس موجودdeath register میں یہ کوائف درج ہوئے

:

تاریخ: 10 اکتوبر 2011

(Dhiman) نام: جگجیت سنگھ دھیمان

عمر: 70 برس

(مذہب: ہندو (لواحقین کی مرضی سے لکھوایا گیا

نذرآتش کرنے کا متوقع وقت: 3.30

نمبر اندارج میت: 1510

ممبئ فلمی صنعت سے وابستہ شاعر و کہانی کار جاوید اختر کے موبائل فون پر جگجیت سنگھ کی آخری فون کال کا ریکارڈ ابھی تک موجود ہے، دوپہر تین بجکر کر چار منٹ پر آنے والی اس کال کے دوران وہ جاوید اختر کے ساتھ اگلے سال کے مشترکہ منصوبوں پر دیر گئے بات کرتے رہے تھے۔

دوپہر کے وقت ممبئ میں جگجیت سنگھ کی ارتھی کو ان کی رہائش گاہ سے اٹھایا گیا، درجنوں کیمرے اس منظر کو دنیا بھر میں دکھا رہے ہیں، ارتھی کو چار خوش لباس سرداروں نے کاندھے پر اٹھا رکھا ہے، ان کی سرخ و نیلی پگڑیاں دھوپ میں چمک رہی ہیں، ارتھی پر پھولوں کی برسات ہو رہی ہے، ان پھولوں کو کچھ

:دیر بعد شعلوں کی نذر ہو جانا ہے

پھول دشمن کے ہوں یا اپنے ہوں

پھول جلتے نہیں دیکھے جاتے

ایک لحظے کو کیمرہ پنکج ادھاس کے چہرے پر ٹھہر گیا جو آنسو بہاتے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پھر ایک دوسرا منظر جس میں چندن وادی شمشان میں جگجیت سنگھ کے دیرینہ دوست مشہور پاکستانی گلوکار غلام علی نڈھال قدموں سے اپنے دوست کو الوداع کہنے چلے آ رہے ہیں، غلام علی کو دو افراد نے سنبھالا ہوا ہے۔ وہ اپنے دل میں ایک گہرا دکھ اور اپنے دوست کی یادیں لیے لاہور واپس لوٹیں گے ۔ ممبئ کی اس تقریب میں جگجیت سنگھ کے !ہمراہ گانے کی ان کی خواہش اب کبھی پوری نہیں ہو سکے گی

جگجیت سنگھ 10 اکتوبر 2011 کی صبح آٹھ بجے اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ان کے جسم میں موجود خون ، رگوں میں مزید دوڑنے پھرنے کا قائل نہ رہا تھا اور اس نے اپنے مسکن سے فرار ہونے کے لیے جسم کا وہ حساس ترین گوشہ منتخب کیا جہاں سے ایک !مرتبہ اخراج کے بعد اس کو کم کم ہی واپس آتے دیکھا گیا ہے

پاکستانی گلوکار غلام علی، گلزار، ونود کھنہ، جاوید اختر، روپ کمار راٹھور، سونو نگم، شان، رضا مراد، مدھر بھنڈارکر اور راج ببر کی آنکھیں مستقل نم ہیں۔
ایک کونے میں جگجیت سنگھ کی اہلیہ چترا سنگھ اداس کھڑی ہیں، آنسوؤں کو چھپانے کے لیے انھوں نے سیاہ شیشوں والی عینک کا سہارا لیا ہے جو ممبئی میں ان موقعوں پر ایک لازمی ضرورت بن کر رہ گئی ہے۔ کچھ دیر بعد اخباری نمائندے تصاویر کی تلاش میں چندن وادی شمشان کے اس اندرونی کمرے تک جا پہنچتے ہیں جہاں چترا سنگھ اپنے شوہر کے ساتھ کچھ وقت خاموشی کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں، ان کی خفگی کے باوجود تصاویر محفوظ کی جاتی ہیں۔
چندن وادی برقی شمشان میں میت کو نذر آتش کرنے کے پیسے نہیں لیے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی دینا چاہے تو 250 روپے دے سکتا ہے، یہ اختیاری رقم ہے۔
جگجیت سنگھ کے لواحقین نے 250 روپے پیشگی ادا کر دیے!
جگجیت سنگھ ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن آخری رسومات ہندو اور سکھ، دونوں مذاہب کے مطابق سرانجام دی گئیں۔ آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے امریکہ سے ایک سندھی پنڈت راجیشور مہاراج کو بلایا گیا تھا، جگجیت سنگھ

کی آخری رسومات میں ان کے چھوٹے بھائی کرتار سنگھ دھیمان نے حصہ لیا۔ میت کو چندن وادی شمشان کے مرکزی ہال میں آخری دیدار کے لیے رکھا گیا۔ سہ پہر تین بجے لوگوں سے درخواست کی گئی کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں کہ جگجیت سنگھ کو نذر آتش کرنے اندر لے جایا جا رہا ہے۔ ارتھی اٹھائی گئی اور فضا " جو بولے سو نہال، ست سری اکال' اور رام نام ست ہے' کی ملی جلی آوازوں سے گونج اٹھی۔ تین بجکر چالیس منٹ پر انہیں ' نذر آتش کر دیا گیا۔

: ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار جگجیت سنگھ کی موت پر تبصرہ کیا

"گزشتہ پیر (10 اکتوبر 2011) کو شرد پورنیا کی رات تھی، سال کی وہ رات جب چاند کی چمک اپنے عروج پر ہوتی ہے، یہ چمک کچھ مزید بڑھ گئی جب ایک اور ستارہ ان میں جا ملا۔"

☆

دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی جگجیت سنگھ کے چاہنے والوں میں کمی نہیں ۔ زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں نے ان کی موت پر اظہار افسوس کیا۔ جناب آصف نورانی نے حال ہی میں مہدی حسن پر ایک کتاب لکھی ہے ، اس کتاب میں انہوں نے جگجیت سنگھ کی رائے کو بھی شامل کیا ہے۔ جگجیت سنگھ ، مہدی حسن کے بہت بڑے مداح تھے ، کئی بار تو لوگوں نے انہیں مہدی حسن کے قدموں میں

: بیٹھا دیکھا۔ آصف نورانی بیان کرتے ہیں

جگجیت سنگھ ، مہدی حسن کو اپنا روحانی گرو مانتے تھے۔ سن 1979 میں جگجیت اور "
چترا، پاکستان آئے تھے، کراچی پریس کلب میں انہوں نے یادگار غزلیں پیش کیں،
لوگوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ اپنے اس دورے کے دوران، جگجیت سنگھ
نے مہدی حسن سے ' آشیرواد' لیا۔ مہدی حسن پر کتاب لکھنے کے دوران جگجیت سنگھ وہ
پہلے شخص تھے جنھوں نے آصف نورانی کو اپنی رائے پیش کی، لکھ کر اور اپنی آواز میں
ریکارڈنگ کروا کر بھی۔ ایک مرتبہ جگجیت سنگھ سے فون پر بات ہوئی، وہ مہدی حسن کی
بیماری پر اظہار تشویش کرتے رہے، جگجیت سنگھ کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ مہدی
حسن کو دوبارہ گاتا دیکھ سکیں۔ افسوس کہ وہ یہ حسرت لیے اس دنیا سے چلے گئے، میں
آصف نورانی) یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ مہدی حسن کو ان کے اہل خانہ نے جگجیت)
سنگھ کی موت کی خبر سے آگاہ نہیں کیا ہے، وہ ان کو اس حالت میں کوئی مزید صدمہ
"نہیں پہنچانا چاہتے۔

جگجیت سنگھ نے مہدی حسن پر آصف نورانی کی کتاب ('Mehdi Hasan: The Man and his Music) میں اپنی یہ رائے پیش کی تھی ::

"Mehdi sahib's selection of ghazals is remarkable. His

pronunciation is

flawless and the magic of his rendition is heightened by the impeccable manner in which he enunciates the words. His voice retains its balance whether he touches the low notes or hits the high ones."

کراچی میں مقیم محقق، شاعر و ادیب جناب عقیل عباس جعفری نے انٹرنیٹ پر ایک گوشہ تخلیق کیا جہاں احباب اپنے تاثرات درج کرتے رہے۔ اسی گوشے سے ایک انتخاب پیش خدمت ہے:

" سن انیس سو انہتر میں جگجیت اور چترا پاکستان آئے تو میں کیا پورا پاکستان ان کی آواز کے سحر میں گرفتار ہوگیا۔ کہیں سے ان کی ایک کیسٹ Unforgettable ہاتھ لگ گئی، اس کی ہر غزل اتنی مرتبہ سنی کہ ایک ایک شعر یاد ہوگیا، بلکہ اب تک یاد ہے۔ انہی دنوں مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے اپنے ایک عزیز سے کہا کہ جگجیت سنگھ کا کوئی کیسٹ آیا ہو تو مجھے دلوا دیں۔ ان عزیز نے بڑی حیرانی سے پوچھا: کون جگجیت؟" ۔۔ میں نے بیان کرنا چاہا تو وہ بولے کہ تم پاکستانی تو ہر ہندوستانی فنکار کو ایسے ہی سر چڑھا لیتے ہو، ہوگا کوئی تھرڈ ریٹ فنکار ۔۔ میں انہیں دیکھتا رہ گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میرے وہ عزیز امریکا منتقل ہو گئے۔ 24 برس بعد 2003 میں، میں امریکا گیا تو میرے وہی عزیز مجھے لینے ایئر پورٹ آئے ہوئے تھے۔ گاڑی ایئر پورٹ سے

روانہ ہوئی تو ان کی گاڑی میں جگجیت کی آواز گونج اٹھی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا: "
" ارے، آپ کی گاڑی میں جگجیت کیا کر رہے ہیں ؟
انہیں ایک ہی لمحے میں چوبیس برس پرانا واقعہ یاد آگیا، پھر انہوں نے جس شرمندگی
"سے مجھے دیکھا، میں وہ منظر کبھی نہیں بھلا سکتا
(عقیل عباس جعفری)

کالج کی رنگین دنیا، ناصر کاظمی کی پہلی بارش اور جگجیت کی غزلوں میں سے پہلا تعارف" کس سے ہوا، ٹھیک سے یاد نہیں۔شاید یہ تینوں چیزیں چپکے سے زندگی میں اکھٹے ہی داخل ہوگئیں۔غالب کی غزلیں گنگنانا بھلا کس نے سکھایا، یہ بھی کبھی نہیں سوچا۔اور آواز کا یہ سحر کب تک چھایا رہا، اسکی بھی کچھ خبر نہیں۔ابھی سات برس پہلے تک تو آفس کے ڈیسک ٹاپ پر اسی من موہنے گائیک کا ایک گیت بار بار خود کو دوہراتا رہا تھا۔چائے کی پیالی اور بیسمنٹ کی گیلی خوشبو، آواز کی لہروں کے ساتھ مل کر عجیب ماحول بنا دیتے تھے۔ کبھی کبھی رات کے نو بج جاتے اور بالکل پتہ نہ چلتا۔ اس فسوں کے تحت کئی مرتبہ اوپر کمپاؤنڈ میں درخت سے اٹکے چاند کو دیکھ کر کچھ نظمیں بھی ہوئیں۔کیا کہیں۔فن اور فنکار دلوں میں ہنستے بستے ہیں اور ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔کیا جانے کل کسی اور ماحول میں یہ آواز اسی مدھرتا کے ساتھ روح میں گھلنے لگے۔بس اتنا فرق ہے کہ اب کوئی نیا گیت نہیں دھڑکے گا، پرانی تانیں خود کو دوہراتی رہیں

"گی۔

(گلناز کوثر)

Music alone with sudden charms can bind the wandering

sense and calm the troubled mind

جگجیت کی سحر انگیز آواز مجھے ہمیشہ اوپر کی اس کہاوت کو سچ کا روپ دیتی محسوس ہوئی۔اس بھلے انسان نے جو چیز بھی گائی، یوں لگا جیسے وہ امر ہو گئی۔آواز میں اس بلا کا بیں، غضب کا سوز، خال خال ہی نصیب ہوا گلوکاروں کو۔اب کون ہے جگجیت جیسا؟۔'

"

(ضیاءالدین نعیم)

لیجیے جناب، لطافت کا ایک اور باب تمام ہوا۔مائیکل انجلو نے کہا تھا کہ حسن تو پتھر میں خوابیدہ ہوتا ہے، سنگ تراش اسے جگا دیتا ہے۔گلوکار کے لیے سر اور آواز کی وہی حیثیت ہے جو سنگ تراش کے لیے پتھر، ہتھوڑی اور چھینی کی ہے۔اس کی آواز، اس کی اپنے فن سے محبت الفاظ میں سموئے ہوئے معنی اور موسیقی کو جگا دیتی ہے۔جگجیت سنگھ بھی ایسے ہی گلوکاروں میں سے ایک تھے۔ جو چیز جگجیت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی آواز کے مدھم رنگ ہیں۔ان کی غزلوں میں گداز دل اور لطافت اظہار کا خوشگوار اور فنکارانہ امتزاج

ہے۔الغرض جگجیت سنگھ اپنے اندر لحن کی وہ اکائی تھے جو موسیقی کا الہامی سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔"

(فرحان صادق)

"جگجیت سنگھ کی آواز، انداز گائیکی اور الفاظ پر ان کی گہری گرفت ان کو بہت سارے گلوکاروں سے ممتاز کرتی تھی۔پانی میں آگ لگانے والی آواز۔ مجھے اس عظیم فنکار کی موت کا بہت غم ہے۔فنکار سرحدوں سے مبرا ہوتا ہے۔ان کی غزل گائیکی کے منفرد انداز کو تمام دنیا کے سُر شناس پسند کرتے تھے۔"

(شاہین رضوی)

بھارت میں اردو کی بقا کے بارے میں اکثر بات ہوتی رہتی ہے، اس سلسلے میں مخلصانہ کوششیں کرنے والوں کی بھی کمی نہیں، جگجیت سنگھ نے بھارت میں اردو کے سفیر کی حیثیت سے اپنا کردار بہ احسن طریق نبھایا اور بحیثیت ایک گلوکار ہمیشہ اردو زبان کے درست لب و لہجے کا خیال رکھا، انہیں اردو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سمپورن سنگھ گلزار کی ٹی وی سیریل مرزا غالب کی شہرہ آفاق مقبولیت میں جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزلوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ڈرامے میں شامل ان تمام غزلوں کا لب و لہجہ ڈرامے میں مرزا غالب کے جوانی سے بڑھاپے تک کے کرداروں کی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے۔ مذکورہ

ڈرامے کی تمام غزلیں سن جایئے، کہیں تلفظ میں کوئی جھول نہ پائیں گے۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا چلوں، صرف ایک ایسا موقع تھا جب ہم نے جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی ایک غزل میں تلفظ کی ایک غلطی کو محسوس کی، وہ مشہور غزل ہے:

آدمی، آدمی کو کیا دے گا

جو بھی دے گا وہی خدا دے گا

اس غزل کا ایک شعر ہے:

میرا قاتل ہی میرا مُنصف ہے

کیا میرے حق میں فیصلہ دے گا

یہ غزل جب پہلی بار انھوں نے گائی تو لفظ 'منصف' کو واضح طور پر وہ 'مُنصَب' (مُن۔صب ! زبر کے ساتھ) گا رہے تھے جو شاید کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔

قابل غور اور قابل قدر بات یہ ہے کہ اس کے کچھ عرصے بعد انھوں نے اس غزل کو دوبارہ گایا اور اس مرتبہ اس غلطی کو درست کرلیا۔

غزل گانے کے دوران لطیفے سنانا، جگجیت سنگھ کا ایک ایسا انداز تھا جس کو ان کے مداح بہت پسند کیا کرتے تھے۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو اور چھوٹے چھوٹے

چٹکلوں سے سامعین کو محظوظ کیے رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ غزل سرا تھے، "حضور آپ کا بھی احترام کرتا چلوں"، درمیان میں موسیقی مدھم ہوئی اور جگجیت سامعین سے کہنے لگے:

ایک صاحب اپنے گھر کے لان میں صبح سویرے بیٹھے تھے، ساتھ ہی ان کی بیوی بھی اخبار پڑھ رہی تھیں، بیوی نے شوہر سے کہا، دیکھئے اخبار میں کیا لکھا ہے، آپ کو پتہ ہے یہ شراب نوشی کی عادت صحت کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے، شوہر کو رات کی شراب نوشی کا خمار تھا، بیوی سے کہنے لگے " ٹھیک کل سے بند کردیں گے"

اگلے دن سے گھر میں اخبار آنا بند ہوگیا!

سامعین کے قہقہوں اور تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔

ایک دوسرے موقع پر جگجیت، امریکہ کے کسی شہر میں غزل سرا تھے، سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی، غزل گاتے گاتے کہنے لگے "، بھئی یہاں ہم سے بہت لوگ ملنے آرہے ہیں، ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ کالج میں تھے، اب مجھے تو یاد نہیں آتا، پھر سوچتا ہوں کہ کالج میں ایک کلاس میں دو دو، تین تین سال جو لگائے تھے، یقیناً یہ سب لوگ سچ کہتے ہوں گے۔"

کراچی میں واقع فنون لطیفہ کی درسگاہ 'ناپا' کے استاد نفیس احمد نے جگجیت سنگھ کی موت پر کہا:

"جگجیت کی موت سے غزل گائیکی کے فروغ کو شدید دھچکا لگا ہے۔ مہدی حسن خاں اب گاتے نہیں، غلام علی بھی بہت زیادہ کام نہیں کر رہے، تو ایسے میں، میں سمجھتا ہوں کہ جگجیت سنگھ ہی ایک واحد فنکار تھے جو غزل کو پوری مہارت، اس کے تقدس اور معیار کے ساتھ پیش کر رہے تھے۔"

سچ تو یہ ہے کہ جگجیت سنگھ کی موت محض ہندوستان ہی کا نہیں، پاکستان کا بھی نقصان ہے!

رام لعل۔ زرد پتوں کی بہار میں گھرا کوچہ قاتل

گفتگو کے دوران جون ایلیا اور چائے بناتے ہوئے سفید سر والے رام لعل کی چھیڑ خانی مستقل جاری رہی۔

"یار رام لعل، چہرہ تو تیرا معشوق کی طرح حسین ہے مگر بال بالکل تیرے باپ جیسے ہیں۔"

رام لعل نے مجلس کے قہقہوں میں شریک ہوتے ہوئے جون کی جانب پیالی بڑھاتے ہوئے کہا 'لو پیو'

'میں کیوں ؟ پہلے خمار بھائی کو دو۔' جون ایلیا نے کہا

'نہیں تم پہلے پیو، کیونکہ تم پاکستانی مہمان ہو'

'مگر رام لعل پاکستانی تو تم بھی ہو۔ صرف تمہارا جسم ہی ہندوستانی ہے، روح تو پاکستانی ہی ہے'۔ جون ایلیا نے جواب میں کہا

جون ایلیا کے اس جملے پر رام لعل خاموش ہو گئے جیسے بھولا وطن یاد آ جائے۔

وسعت اللہ خان کے مندرجہ بالا مضمون میں رام لعل کے بیان کو پڑھنے کے بعد ان کی خودنوشت کوچہ قاتل اور پاکستانی سفرنامے زرد پتوں کی بہار کی تلاش شد و مد سے جاری تھی کہ اچانک بیمار کو قرار آ گیا، ایک کرم فرمانے 1993 میں

لکھنو کے نصرت پبلشر کی شائع کردہ ’کوچہ قاتل‘ کی نقل مہیا کر دی جبکہ زرد پتوں کی بہار لاہور سے آئی۔ رام لعل نے اپنی خودنوشت کا عنوان علی سردار جعفری کے اس شعر سے اخذ کیا تھا:

کام کوئی اب نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

رام لعل:

پیدائش 3 مارچ 1923

وفات: 16 اکتوبر 1996

ہندوستانی افسانہ نگار رام لعل کو ہندوستانی کہا جائے یا پاکستانی، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ان کے تحریر کردہ افسانوں میں ہندو مسلم بھائی چارے کی ایک ایسی فضا ملتی ہے جو برصغیر کی تقسیم کے دوران پیش آنے والے خون آشام فسادات کی مذمت کرتی نظر آتی ہے۔ تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے بارے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کا جیسا درست نقشہ رام لعل نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، شاید ہی یہ وصف کسی اور کے حصے میں آیا ہو۔رام لعل میانوالی میں پیدا ہوئے تھے جہاں ان کے

اجداد صدیوں پہلے راجھستان کے ریتیلے میدانوں میں گھوڑوں پر عرب حملہ آوروں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے وہیں جا کر پناہ گزین ہوئے تھے۔ نقل مکانی ان کو وراثت میں ملی تھی۔ رام لعل لاہور سے اکھڑے اور لکھنو میں جمے لیکن بقول آغا سہیل دل کا ایک کونا اجڑا تو پھر نہ بسا، لکھنو، لکھنو سہی لیکن لاہور نہ بن سکا۔ عجب اتفاق ہے کہ آغا سہیل خود لکھنو سے ہجرت کرکے لاہور آئے تھے، ان کے لیے لکھنو، لاہور نہ بن سکا۔ ایک محفل میں افسانہ نگار مسیح الحسن نے اپنا افسانہ مٹی سنایا تو اسے سننے کے بعد ہندوستانی ادیب رتن سنگھ زار و قطار رونے لگے اور محفل میں موجود رام لعل کا رنگ اتر گیا، ان کا دل تو رویا لیکن آنکھیں خشک رہیں۔ وہ بھی ایک وقت تھا جب رام لعل نے بازار سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ایک بڑی سی تصویر خرید کر اپنے گھر میں لگالی تھی۔

1938 میں رام لعل نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ریلوے میں ملازمت اختیار کی، یہ ایک معمولی سی ملازمت تھی ، آہنی لوہے کے بیچوں بیچ لاہور ریلوے رکشاپ میں وہ نیک نیتی سے اپنا کام کرتے رہے اور یہی نیک نامی کما کر 30 مارچ 1981 میں انڈین ریلوے سے کلیم افسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی پہلی کہانی تھوک لاہور کے ہفتہ وار جناح میں شائع ہوئی۔ رام لعل نے اپنی ادبی زندگی میں کم از کم بیس افسانوی مجموعے تحریر کیے، ناول اور سفر نامے اس کے علاوہ ہیں۔ ہندوستان کی مختلف درسگاہوں میں ان پر تحقیق کام

ہوا۔انہوں نے ہندوستان میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دلوانے میں خدمات انجام دیں۔اس سلسلے میں کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کا انعقاد ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

تقسیم ہند کے دوران پیش آئے ہندو مسلم فسادات پر کئی پاکستانی اہل قلم نے لکھا ہے جن میں سعادت حسن منٹو، مشکور حسین یاد، نسیم حجازی، اے حمید و دیگر شامل ہیں۔ ہندوستانی ادیبوں میں میانوالی سے تعلق رکھنے والے رام لعل کی خودنوشت کوچہ قاتل کو بلاشبہ تسقیم ہند کی یادیں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔اس خودنوشت میں رام لعل کی بیان کردہ سچائیاں دوسری اصناف کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی کھردری اور تکلیف دہ ہیں۔کوچہ قاتل کی 'پیشانی' پر خودنوشت سوانح حیات حصہ اول درج ہے، غالباً اس خودنوشت کا دوسرا حصہ شائع نہ ہوسکا۔

رام لعل پاکستان آئے تو واپسی پر 'زرد پتوں کی بہار' کے عنوان سے سفرنامہ لکھا، سفرنامہ کیا تھا، اپنے سابقہ وطن کا نوحہ تھا۔پاکستان کا یہ سفر انہوں نے 8 فروری کو اس وقت اختیار کیا جب ان کی عمر 56 برس تھی۔اس سے قبل 1978 1980 میں ان کے ویزے کی درخواست پاکستانی سرکار نے مسترد کردی تھی، دوسری مرتبہ کوشش کرنے پر منیر احمد شیخ نے ویزے کے حصول میں ان کی مدد کی جو اس وقت ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر کے عہدے پر

فائز تھے۔ پاکستان میں ان کے میزبانوں میں لاہور کے قیام کے دوران آغا سہیل اور کراچی میں محمد علی صدیقی اور جون ایلیا شامل تھے۔ واہگہ کے راستے لاہور کی جانب بڑھتے ہوئے انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے نتھنوں میں جو تازہ ہوا آرہی ہے وہ ان کی جانی پہچانی ہے اور جسے سونگھ کر ہی وہ بتا سکتے تھے کہ یہ ہوا 'ان کے لاہور' سے آرہی ہے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قلی بھی ان کو اپنے اپنے سے لگے، میزبانوں کی بھیڑ میں طاہر تونسوی بھی تھے جن کے گالوں پر بے اختیار ہو کر انھوں کئی بوسے دیے طاہر تونسوی کے گال شرم سے 'لعل' ہوگئے۔

میں نے آخری بار یہاں سے تنخواہ لی تھی، 6 اگست 1947 کو۔" رام لعل ایک " عالم وارفتگی میں پلیٹ فارم پر بنے کیش آفس کی جانب اشارہ کرکے اپنے میزبانوں کو بتا رہے تھے۔

شہر لاہور میں بجلی کے کھمبوں سے چھوٹے چھوٹے بورڈ بندھے تھے جن پر لکھی عبارتوں کو پڑھ کر رام لعل کو احساس ہوا کہ وہ ایک اسلامی ملک میں ہیں۔ شر سے بچو، ہر مہینے زکوۃ نکالنامت بھولو! اور رام لعل نے دل ہی دل میں 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' پڑھا۔ سفرنامے ہیں اس موقع پر انھوں نے سورۃ اخلاص کا

مکمل اردو ترجمہ درج کیا ہے۔لاہور میں احمد ندیم قاسمی سے ان کی بات فون پر ہوئی تو یاد آیا کہ ندیم قاسمی کی آواز وہ 1942 کے بعد سن رہے ہیں۔لاہور میں رام لعل نے امجد اسلام امجد کے ڈرامے وارث کی ایک قسط دیکھی اور محبوب عالم مرحوم کی اداکاری پر فدا ہوئے، اردو اخبار شوق سے پڑھے، انتظار حسین کے ناول بستی کی تقریب میں شرکت کی اور دوستوں کی سنگت میں جی بھر کے قہقہے لگائے۔بلند شہر سے تعلق رکھنے والی کشور ناہید کو فرفر پنجابی بولتا دیکھ کر حیران ہوئے۔لاہور سے ایک روز کے لیے وہ ملتان ایک شادی میں شرکت کی غرض سے بھی گئے تھے اور وزیر آغا کے پاس سرگودھا بھی!

فروری 1980 کی ایک صبح رام لعل کو آغا سہیل نے صبح سات بجے جگایا، لکھتے ہیں 11 کہ 33 برس کے بعد پہلی بار کسی نے مجھے لاہور میں جگایا تھا۔

ایک روز رام لعل پاک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ دوستوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے صاحب ان کی میز پر آئے، یہ مبارک احمد تھے جو ہیما مالنی کے 'سخت' پرستار نکلے، انہوں نے اپنے بیگ سے ایک نظم نکالی اور رام لعل سے کہنے لگے کہ وہ اسے ہیما مالنی کو بمبئی جا کر دے دیں ورنہ انہیں خود بمبئی جانا پڑے گا، مبارک احمد نے نظم رام لعل کے سامنے رکھ دی، اس کا عنوان تھا 'گیتوں کا گیت':

ہیما مالنی
تم جو کوئی بھی ہو
میں پنجابی ہوں
اور تم سے مخاطب
چناب کنارے گجرات میرا شہر ہے
اور راوی کنارے لاہور بھی

رام لعل نے مبارک احمد سے کہا: " اس سے پہلے کوئی اور پاکستانی شاعر بھی ہیما مالنی سے ملنے کے لیے بمبئی گیا تھا، جب وہ اسے نہیں ملی تو اس نے خود کشی کر لی اور وہ وصیت کر گیا تھا کہ اس کی آنکھیں نکال کر اور انہیں ایک پلیٹ میں سجا کر ہیما مالنی کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔ اس کی وصیت کے مطابق جب اس کی آنکھیں ہیما مالنی کے سامنے لے جائی گئیں تو وہ چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی اور ایک ہفتے تک ہوش میں نہ آ سکی۔ کہیں آپ کو بھی وہاں جا کر خود کشی نہ کرنی پڑے۔"

مبارک احمد گھبرا گئے اور کہا" تو پھر آپ ہی میری نظم لے جایئے اور میری یہ تصویر بھی۔"

رام لعل میانوالی اپنے آبائی گھر کو دیکھنے پہنچے اور دل ہی دل میں اپنے آباء واجداد کو گواہ بنا کر کہا یاد رکھنا کہ میں ایک بار لوٹ کر آیا تھا۔ بھیگے چہرے کے ساتھ انہوں نے اپنے آبائی گھر میں مقیم افراد سے گھر کی مٹی کی فرمائش کی جو انہیں ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر پیش کی گئی۔ فرمائش پوری کرنے والوں لڑکوں کی آنکھوں میں بھی !آنسو تھے

:کوچہ قاتل سے ایک انتخاب پیش خدمت ہے

:راجپورہ اسٹیشن پر ملک وزیر چند نے مجھے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا

"رام لعل، ذرا ادھر آنا۔"

میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے ایک گروہ نے نرغے میں لیا ہوا ہے، مجھے بھی لوگوں نے ہاتھ سے پکڑ کر درمیان میں گھسیٹ لیا اور کئی بیک زبان :بولے

ہاں ہاں، تم دونوں مسلمان ہو، پاکستان جانے کا راستہ نہیں ملا تو دلی کی طرف بھاگ" "رہے ہو۔

ہم دونوں نے شلواریں پہن رکھی تھیں، ملک وزیر چند کے بڑے بڑے گل مچھے تھے ۔ اور پھر اچانک میری زبان سے یہ بھی نکل گیا" قرآن سان (قرآن کی قسم) ہم

"ہندو ہیں۔

"دیکھا دیکھا، سالے مُسلے ہیں، قرآن کی قسم کھاتے ہیں، میں نہ کہتا تھا۔ "

میں نے انہیں سمجھایا" یہ ہمارا رویہ ہے، اسی علاقے کا، ہم وہاں قرآن ہی کی قسم

"کھاتے تھے، لیکن ہم مسلمان نہیں ہیں، ہمارا یقین کرو۔

انہیں تب تک یقین نہیں ہوا جب تک انہوں نے ہماری شلواریں کھلوا کر اطمینان نہیں کرلیا۔ لیکن یہ واقعہ ہم دونوں کے لیے بیحد باعث شرم تھا۔ ملک صاحب مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ میں انہیں چاچا جی کہہ کر بلاتا تھا لیکن فسادیوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے سامنے ننگے ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اسی راستے پر ایک چینوٹ کے قریب ایک شخص گرمیوں کی راتوں میں گاڑیوں کے " آنے جانے کے وقت ایک لمبی کانٹے دار جھاڑی لے کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ پنجاب کے لوگ جو سروں پر پگڑیاں باندھے کھڑکیوں میں سر رکھ کر سو جایا کرتے تھے، ان کی پگڑیاں جھاڑیوں سے لگ کر درجنوں کی تعداد میں نیچے گر جایا کرتی تھیں اور وہ شخص پگڑیاں اکھٹی کرکے اپنے وارے نیارے کرلیا کرتا تھا۔ میں نے اس کردار پر بیس پچیس برس کے "بعد ایک کہانی تیرے بچے جئیں لکھی تھی۔

میں لاہور میں راوی کے کنارے کانگریس اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرچکی تھی 1931 اور اسی دریا کے کنارے ترنگا لہراتے ہوئے پنڈت نہرو بطور صدر کانگریس مکمل آزادی کا مطالبہ کر چکے تھے۔جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور کی سڑکوں پر جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے تو اچانک پھسل کر گر پڑے اور زمیندار اخبار کے پہلے صفحے پر مولانا ظفر علی خان نے یہ معروف شعر چھاپا:

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

میں ریلوے اسٹیشن کی جالندھر جانے والی لوہے کی پٹری کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چلتا گیا۔ آبادی سے باہر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ کہیں کہیں کسی بڑے قطعے کے ارد گرد چار دیواری بھی تعمیر کرالی گئ تھی۔ کہیں کہیں گڑھوں میں اور نچلی سطح پر بارش کا پانی بھی بھرا ہوا تھا۔ ایک جگہ انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ چیلیں اور کوے اس کا سارا ماس نوچ نوچ کر کھا چکے تھے، اس کے ایک پاؤں کے اندر ابھی تک ایک کالا بدرنگ بوٹ فیتے سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے سفید بال اس کی کھوپڑی سے الگ ہو کر ایک طرف پڑے تھے۔خدا جانے وہ کون تھا۔ کس نے کب اسے مار کر یہاں ڈال دیا تھا۔

ایک روز نواں شہر (جالندھر کے قریب) کے بازار سے گزرتے ہوئے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے بھیڑ دیکھی تو میرے قدم رک گئے۔ معلوم ہوا کہ اس مکان کے ایک کمرے میں بہت سے لوگوں کو ٹھونس کر کھڑکی کے راستے سے ایک بہت طاقتور بم پھینک دیا گیا ہے اور یہ کام ایک ریٹائرڈ فوجی حوالدار نے کیا ہے۔ وہاں میری موجودگی میں ایک تھانیدار آگیا۔ اسے پورا واقعہ بتایا گیا تو وہ بڑی خاموشی سے کھڑا سنتا رہا، پھر اس نے ان لوگوں کو مشورہ دیا 'اندر جاکر ہلاک ہونے والوں کو چھرے کے زخم لگادیے جائیں تاکہ یہ معاملہ چھرے بازی کا ہی درج کیا جاسکے، بم کا نہیں۔

یہ سن کر ایک نوجوان قصاب چھرا لے کر اندر چلا گیا اور دس پندرہ منٹ کے بعد واپس آکر بولا: " حضور یہ کام بھی ہوگیا لیکن ایک شخص میرے ہاتھ میں چھرا دیکھ کر رونے لگا۔ بولا ' میں تو مرچکا ہوں، مجھے چھرا مت گھونپو۔

یہ سن کر بہت سے لوگ ہنس پڑے لیکن میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں وہاں سے چلا آیا۔ اس بات کو اگر سعادت حسن منٹو کی سیاہ حاشیے کتاب کے لطیفوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو دونوں ملکوں میں ہوئے مظالم میں ایک

یکسانیت نظر آئے گی۔

شاعروں اور ادیبوں کے چونکا دینے والے اسکینڈلز

اس مرتبہ کراچی کے اتوار بازار میں پرانی کتابوں کی کھوج کرتے کرتے ایک چونکا دینے والی کتاب پر نظر پڑی، کتب فروش کو رقم تھمائی اس نے بنا کسی بحث کے، بخوشی قبول کر لی، کتاب ہمارے حوالے کرنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں پر اس انداز میں پھونک ماری جیسے ہم آپ کسی گرم شے کو ہاتھوں میں تھامنے اور یک لخت چھوڑنے کے بعد کرتے ہیں۔

کتاب کا عنوان ہی حدت اور جدت آمیز تھا

"شاعروں اور ادیبوں کے چونکا دینے والے اسکینڈلز"۔۔۔۔۔کتاب 2002 میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔۔ ناشر کا "عنوان" ہے: شام کے بعد

یہ ناشرین کی اس صنف سے تعلق رکھتے ہیں جس میں "نا" کا عنصر کم اور شر کا زیادہ ہے۔

کتاب کے مرتب زاہد گوگی، بلیک بیلٹ ہیں لہذا ہماری اطلاع کے مطابق تاحال کسی قسم کا ہتک عزت کا کوئی دعوی سامنے نہیں آیا۔ یوں بھی کتاب میں جن

مشاہیر کے بارے میں سنسنی خیز اور "راتوں کی نیند اڑا دینے والے" انکشافات درج ہیں، ان میں اکثر اب اس دنیا میں نہیں رہے، مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی، عدیم ہاشمی، انیس ناگی، منیر نیازی، مظفر وارثی، احمد راہی، احمد بشیر، جاوید شاہین، اقبال ساجد وغیرہ

کتاب کے بغور مطالعے کے بعد میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں کسی شاعر یا ادیب کا کوئی اسکینڈل نہیں ہے، یہ محض ادبی چپقلش کی روداد ہیں اور زیادہ تر ایسے انٹرویوز پر مشتمل ہے جو زیادہ تر لاہور کے مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں بہت کچھ ایسا ہے جو پڑھنے والے کے لیے ادبی معلومات کے اعتبار سے نہ صرف نیا ہے بلکہ معلوماتی بھی ہے۔

ایک اہم بات البتہ یہ ہے کہ کتاب کے مرتب نے اس کی فروخت کو یقینی بنانے کے لیے عنوان ہی کچھ ایسا منتخب کیا ہے اور جو کمی رہ گئی تھی اسے کتاب کے معنی خیز سرورق سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت انسان کی سرشت میں تجسس کا عنصر ہمیشہ سے شامل رہا ہے اور تا قیامت رہے گا۔ شاید ابن صفی صاحب نے کہیں لکھا تھا کہ اگر آپ جوش پر کتاب لکھیں

اور اس کا روایتی سا عنوان رکھیں تو لوگ متوجہ ہوں گے لیکن اگر کتاب کا عنوان "جوش اور پاپوش" رکھیں تو پڑھنے والوں کی دلچسپی یک دم بڑھ جائے گی۔ زاہد گوگی نے بھی یہی حربہ اپنایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتاب بازار میں ناپید ہو گئی۔

کتاب مذکورہ کو پڑھ کر دنیا سے گزر جانے والے لوگوں کی تفصیل سے بھی ہم ناواقف ہیں۔

کتاب کی شروعات ہی میں گوگی صاحب نے ساقی فاروقی کے چند "کھلے" خطوط بنام احمد ندیم قاسمی شامل کیے ہیں، غالباً انہی خطوط کی کتاب میں موجودگی کی بنا پر کتب فروش اپنے ہاتھوں کو ٹھنڈا کرتا رہا تھا۔

توبہ توبہ، الامان الحفیظ

لیکن صاحب یہاں شامل نہیں کر سکتا، ہرگز نہیں، ایسی کسی قبیح حرکت میں ملوث نہیں ہونا چاہتا، کسی کا اخلاق نہیں بگاڑنا چاہتا۔

ہاں ! البتہ طلبگار کی فرمائش پر ای میل کر سکتا ہوں

گزشتہ دنوں ایک دوست نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک خط ساقی فاروقی بنام افتخار عارف ارسال کیا، اس کا عنوان تھا:

اس قدر اناڑی ہو
تم بھی افتخار عارف
بارھویں کھلاڑی ہو

خط کا بغور مطالعہ کرنے اور صرف ایک قابل اعتراض لفظ کی موجودگی کی بنا پر اسے کہیں بھی شامل کرنے میں ہچکچاہٹ تھی، "اسکینڈلز" میں شامل ساقی کے خطوط کو پڑھ کر پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ ہم نے خط بنام افتخار عارف کو حفظ ماتقدم کے طور پر بزم میں شامل کرنے کا ارادہ سرے ہی سے ترک ہی کر دیا۔

"فیس بک پر ایک صاحب نے دریافت کیا: " مجھے یقین ہے میرا نام نہیں ہوگا ان میں میں نے تسلی کرکے ہی آپ کو ٹیگ کیا ہے" میرا جواب تھا"

گمان ہے کہ کسی صاحب کا ذکر نہیں ہے اور اگر ہے تو بلیک بلیٹ یافتہ جناب گوگی اس کے ذمے دار ہیں۔ گوگی صاحب نے اس نسخے میں اگلے ایڈیشن کی اشاعت کا

عندیہ دیا تھا، لیکن آج ناشر سے بات ہوئی، اگلے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی۔ ناشر صاحب سے علم ہوا کہ گوگی صاحب ان دنوں ایکسپریس اخبار سے وابستہ ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں کے چونکا دینے والے اسکینڈلز" میں منیر نیازی کا وہ انٹرویو" شامل ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ کراچی کے شاعر، سرے سے شاعر ہی نہیں ہیں اور اس انٹرویو اور بالخصوص فقرے کو بنیاد بنا ایک عدد کالم لکھا تھا۔ منیر نیازی نے اپنے انٹرویو میں مظفر وارثی پر دشنام طرازی کی اور انٹرویو کی شاعت کے بعد اس سے مکر گئے، ادھر اخبار والوں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، انھوں نے وارثی صاحب کو ریکارڈ شدہ کیسٹ سنوا دی جسے سن کر مظفر وارثی دم بخود رہ گئے۔

کتاب میں اقبال ساجد کے بارے میں ایک طویل مضمون شامل ہے جو کتاب عنوان یعنی شاعروں اور ادیبوں کے اسکینڈلز سے بالکل میل نہیں کھاتا، اقبال ساجد کی زندگی کم و بیش اسی ڈگر پر رہی جن راہوں پر ساغر صدیقی چل نکلے تھے، مضمون خاصا معلوماتی ہے۔ اسی طرح جاوید شاہین کی خودنوشت " میرے ماہ و سال" سے بھی ایک اقتباس شامل کیا گیا ہے۔

"اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "اسکینڈلز" میں سب کچھ ہے سوائے "اسکینڈلز

سکے۔

اس بات کا تذکرہ بھی اہم ہے کہ اس کتاب میں شامل بعض انٹرویو ادیبوں اور شاعروں نے یقینی طور پر خود اپنی مرضی سے دیے تھے، گویا کہ انہوں نے اپنے اور دوسروں کے بارے میں بے لاگ تبصرے کرکے تنازعات کو خود دعوت دی۔ ملتان کی شاعرہ (؟) ڈاکٹر غزالہ خاکوانی جب چٹ پٹی خبریں شائع کرنے والے ایک اخبار نویس ادیب جاودانی) کو دوران انٹرویو اپنے منہ سے کہہ رہی ہوں کہ " مجھے میرے) عاشقوں نے بہت نقصان پہنچایا ہے" تو اس رویے کو ہم کیا کہیں گے۔

بات منہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی

اس کتاب میں اسلام آباد کی معروف (؟) ادیبہ شہابہ گیلانی کا روزنامہ اوصاف کو دیا ہوا انٹرویو بھی شامل ہے، یہ 30 جولائی 2000 کو شائع ہوا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ انٹرویو سے کیا شامل کیا جائے اور کیا چھوڑا جائے، کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

جن احباب نے مظفر وارثی کی خود نوشت "گئے دنوں کا سراغ" پڑھی ہے وہ یہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ اس کتاب میں وارثی صاحب نے اپنے اور دوسروں کے بارے میں

کیسے کیسے انکشافات کیے ہیں۔

صاحبو! کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے ادبی چپقلشوں اور تنازعات کا بہ رضا و رغبت حصہ بن کر جتنا نقصان خود اپنے آپ کو پہنچایا ہے، اتنا ان کے نقادوں نے نہیں پہنچایا ہوگا۔

عدیم ہاشمی نے اپنی شاعری کی دو کتابوں "فاصلے ایسے بھی ہوں گے" اور "ترکش" کے دیباچے کچھ اس ڈھنگ سے لکھے کہ دونوں کتابوں سے زیادہ دیباچے مقبول ہو گئے۔

اسکینڈلز" میں شامل ان دیباچوں میں عدیم ہاشمی نے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں " اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے اور ان پر اپنی انہی دونوں کتابوں کی اشاعت میں تاخیر کا الزم لگایا ہے، الزامات کتاب سے شروع ہوئے اور منصورہ احمد پر ختم ہوئے۔

کیا عجب بات ہے کہ احمد ندیم قاسمی، عدیم ہاشمی اور منصورہ احمد، تینوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

انیس ناگی کا وہ مشہور انٹرویو بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے جس کا ایک فقرہ بہت مشہور ہوا تھا۔

"ہمارے شاعر و ادیب کمینے ہیں"
یاد رہے کہ اس انٹرویو پر بھی خامہ بگوش کا کالم موجود ہے۔
کتاب میں نوشی گیلانی اور بہاولپور کی پراسرار ڈاکٹر دلآویز کے بارے میں مضامین شامل ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس وقت کے وزیر اعظم اسے فون کیا کرتے تھے۔ اسی طرح غزالہ خاکوانی کی کھلی باتوں پر مبنی انٹرویو بھی کتاب کا حصہ ہے۔
کتاب میں جاوید شاہین کی خودنوشت "میرے ماہ و سال" کے منتخب حصے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ جاوید شاہین نے اپنی خودنوشت میں منیر نیازی کے بارے میں کچھ ایسا لکھ دیا تھا جسے پڑھ کر نیازی صاحب آگ بگولہ ہوگئے اور انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں جوابی حملوں کا طومار باندھ دیا، کتاب میں نیازی صاحب کا انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کے چونکا دینے والے اسکینڈلز" پر اس سے زیادہ "بچ بچا کر" "
تبصرہ ناممکن تھا !

انتظار حسین اور رضا علی عابدی کی یادداشتیں

ٹرین لاہور سے کتابوں کے بنڈل لے کر روانہ ہوئی اور دو دن کا سفر طے کرکے پندرہ نومبر 2011 کی صبح کراچی پہنچی۔ اردو بازار کراچی کے سب سے بڑے کتب فروش نے کتابوں کے کچھ پلندوں کو دیگر کتب فروشوں کو بھجوا دیا۔ خبر پھیلی اور طلبگار جوق در جوق بازار کا رخ کرنے لگے۔ صبح دس بجے کتب فروش کے یہاں ملازمت کرنے والے ہمارے 'ہرکارے' نے اطلاع دی کہ جناب رضا علی عابدی اور جناب انتظار حسین کی خودنوشت سوانح حیات آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ انتظار حسین کی سوانح حیات کی اطلاع ایک چونکا دینے والی خبر تھی، اس لیے کہ انتظار حسین 1999 میں اپنی خودنوشت 'چراغوں کا دھواں' کے عنوان سے تحریر کرچکے ہیں جو خاصے کی چیز ہے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہے؟ خیال آیا کہ ہری پور ہزارہ میں مقیم ہمارے دوست زاہد کاظمی، انتظار حسین سے رابطے میں رہتے ہیں اور جب بھی لاہور جاتے ہیں ان سے ضرور ملاقات کرتے ہیں، سو ان سے دریافت کیا جائے۔ زاہد کاظمی سے معلوم ہوا کہ انتظار حسین نے رواں برس ستمبر میں انہیں اپنی سوانح حیات کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس پر کام کررہے ہیں اور جلد ہی یہ کتاب شائع ہوجائے گی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چراغوں کا دھواں کی اشاعت کے بعد انتظار حسین کے دوستوں اور قدردانوں نے انہیں تقسیم ہند سے قبل پیش آنے

والے واقعات اور یاداشتوں کو سپرد قلم کرنے کی درخواست کی تھی۔ بلند شہر کا قصبہ ڈبائی انتظار حسین کا آبائی گھر تھا۔ دوستوں کے اصرار پر انتظار حسین نے یادوں کی راکھ کریدی اور اسی مناسبت سے کتاب کا عنوان ' جستجو کیا ہے ' تجویز ہوا۔

پریم چند فیلوشپ کے سلسلے میں انتظار حسین ہندوستان گئے اور اپنی بستی کو ڈھونڈ نکالا لیکن بقول ان کے " اس بستی میں وہ کون سی گلی تھی اور وہ کون سا گھر جہاں اس خانہ خراب کی نال گڑی ہے " ۔۔۔۔بالاآخر انہوں نے وہ گھر تلاش کر ہی لیا۔ اپنی اس کتاب کے آخر میں انتظار حسین نے چند بہت ہی نادر تصاویر شامل کی ہیں، ان میں کہیں وہ اور ناصر کاظمی 1950 میں ایک ساتھ بیٹھے نظر آتے ہیں تو کہیں 1959 میں محمد حسن عسکری کے ساتھ ایک پلیا سے کمر ٹکائے دیکھے جا سکتے ہیں، کہیں وہ دیگر مشاہیر ادب کے ہمراہ 1957 میں کافی ہاؤس میں فراق گورکھپوری کے ساتھ موجود ہیں تو کہیں ریوتی سرن شرما، عبدالمجید بھٹی، راجندر سنگھ بیدی، مولانا صلاح الدین احمد، آل احمد سرور اور ڈاکٹر مالک رام محفل آرا ہیں۔ پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کے ساتھ انداز بے تکلفانہ میں ایک تصویر شامل ہے تو کہیں مظفر علی سید اور احمد مشتاق ایک انداز محبوبانہ لیے براجماں ہیں۔

تین صد صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت اس کے ناشر سنگ میل پبلیکیشنزلاہور نے مقرر کی ہے۔یاد رہے کہ سنگ میل سے آن لائن خریداری بھی کی جا سکتی ہے، 900 ان کے دیے ہوئے بینک اکاؤنٹ میں کتابوں کی کل قیمت کو منتقل کیا جاتا ہے اور ڈاک خرچ کی ادائیگی کے بعد کتابیں اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہیں۔کتابوں کی بیرون ملک ترسیل کی سہولت بھی موجود ہے جس کی تفصیلات مندرجہ ذیل پتے پر دیکھی جا سکتی ہیں:

http://www.sangemeel.com/InfoPage.aspx?Info=Shipping

دوسری کتاب جناب رضا علی عابدی کی "اخبار کی راتیں' ہے، ناشر سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، صفحات 190 اور قیمت 400۔

قارئین کو عابدی صاحب کی اس کتاب کا انتظار دو ماہ سے تھا، وہ اس کتاب کا عندیہ یاداشتوں پر مبنی کتاب 'ریڈیو کے دن' میں دے چکے تھے۔کتاب کے پس ورق پر 9 نومبر 1959 کی ایک تصویر دی گئی ہے، اس رات کراچی سے اخبار والوں کا قافلہ راولپنڈی پہنچا تھااور ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں شوکت تھانوی بھی موجود تھے۔ رضا علی عابدی صاحب کہتے ہیں کہ " کچھ نامور لوگوں نے اپنی زندگی کے حالات

لکھے، کچھ غیر معمولی واقفیت رکھنے والوں نے درون خانہ معاملات پر پڑے ہوئے پردے "اٹھائے لیکن عام لوگوں نے اپنے ماحول اور اطراف کو قلم بند نہیں کیا۔

اخبار کی راتیں' دوران ملازمت اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات کا' مرقع ہے، اس میں ان عام لوگوں کا بیان بھی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر خاص کہلائے، اپنی تخلیقات کے زور پر لوگوں کے دلوں تک پہنچے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں اخبار سے وابستہ ان ساتھیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو وقت کی گرد میں کہیں کھو گئے۔ ایسے رفیقوں کی تعداد پچاس تھی اور پورے پچاس برس بعد رضا علی عابدی انہیں تلاش کرنے نکلے، پتہ چلا کہ ان میں سے بمشکل دس زندہ ہیں اور وہ بھی بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔

رضا علی عابدی زیر موضوع کتاب کو سوانح حیات سے زیادہ ایک مخصوص دور کے ماحول کی عکاسی مانتے ہیں۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں اس دور سے وابستہ یادیں اور اپنے رفقائے کار گویا چلتی پھرتی حالت میں محفوظ ہیں، ان کیفیات کو انہوں نے بقول ان کے ایک گراں قدر سرمایہ اور گزرے وقت کی سوغات سمجھا، انہیں سمیٹا، یکجا کیا اور کاغذ پر اتار دیا۔

جناب رضا علی عابدی نے نوجوانی میں صحافت میں قدم رکھا تھا۔ یہ سن پچاس کی

دہائی کا اواخر تھا۔ روزنامہ جنگ میں دیدہ ریزی پر مامور ہوئے جس کی تفصیل انہوں نے پہلی باب ' ہاں، میں پروف ریڈر تھا' میں درج کی ہے۔ دوران ملازمت کراچی کے علاوہ راولپنڈی میں بھی مقیم رہے، اخبار جنگ کو خیر باد کہا تو اخبار حریت میں برا جے۔ مشرقی پاکستان میں شورش اپنے عروج پر تھی، ایک رات جب عابدی صاحب اخبار کی شہ سرخی جما چکے تھے کہ ڈھاکہ سے نامہ نگار کا فون آیا، کہنے لگا، لیجیے عابدی صاحب خبر لکھیے، میں اس وقت مسجد بیت المکرم کے سامنے موجود ہوں اور یہاں مجمع مجیب بھٹو بھائی بھائی کے نعرے لگا رہا ہے۔ عابدی صاحب جھٹ دوڑے اور شہ سرخی تبدیل کردی ، نئی سرخی تھی ' مجیب بھٹو بھائی بھائی' ۔ اگلی شام کو عابدی صاحب سینہ تانے اپنی جمائی شہ سرخی کی اچھوتی اصطلاح پر نازاں دفتر پہنچے تو ایڈیٹر کو بجھا بجھا پایا، انہوں نے عابدی صاحب سے کہا کہ انہیں صبح صبح مالکان نے طلب کیا اور سرخی کی جانب اشارہ کرکے کہنے لگے کہ یہ اخبار ہم نے اس لیے تو نہیں نکالا تھا۔

رضا علی عابدی نے بی بی سی لندن میں ملازمت کی درخواست ڈال دی۔

اخبار کی راتیں' میں کئی جانے پہچانے نام نظر آتے ہیں جن میں سحاب قزلباش ، ساقی ' فاروقی، کارٹونسٹ نجمی، شفیع عقیل، عرش تیموری، اطہر علی، شوکت تھانوی، حبیب الرحمان، یوسف صدیقی، رفیع الزماں زبیری، غازی صلاح الدین ، فخر

ماتری، جعفر طاہر، مولانا حسن مثنی ندوی، محمد صلاح الدین (بعد میں مدیر تکبیر) وغیرہ شامل ہیں۔

رضا علی عابدی کو راولپنڈی میں دوران ملازمت اپنے دیگر فرائض کے علاوہ دو مرتبہ رپورٹنگ بھی کرنی پڑی۔ ایک تب جب حویلیاں جانے والی ٹرین پل سے اتر کر برساتی نالے میں گر پڑی تھی، وہ اسپتال کے مردہ خانے پہنچے اور وہاں کا منظر دیکھ کر لپک کر باہر آئے اور ایک کان کو ہاتھ لگایا۔ دوسری مرتبہ عدالت پہنچے جہاں ایک شریف گھرانے کی لڑکی اور اسی گھر کے ملازم کا معاملہ پیش کیا گیا۔ ملازم پر الزام تھا کہ وہ لڑکی کو ورغلا رہا ہے لہٰذا لڑکی کو بچایا جائے۔ مجسٹریٹ نے لڑکی سے کہا کہ تم اس لڑکے سے بچ کر رہو، یہ تمہاری عزت خاک میں ملا دے گا۔ لڑکی نے مجسٹریٹ کی آنکھوں میں "آنکھیں ڈال کر کہا' جناب ! وہ سب تو ہو چکا ہے، آپ ہمارا نکاح پڑھوا دیجیے۔

! عابدی صاحب لپک کر باہر آ گئے اور دوسرے کان کو ہاتھ لگایا

روزنامہ حریت کی ملازمت کا دورانیہ مختصر ہی رہا، گرچہ اخبار فخر ماتری کی ادارت میں 'بڑے طمطراق سے نکلا تھا لیکن بقول عابدی صاحب 'زیادہ عرصے جیا نہیں۔

پی آئی اے کی پرواز پہلی مرتبہ قاہرہ جانے کو تھی، عابدی صاحب کو دنیا دیکھنے کا شوق تھا، وہ فخر ماتری کے سامنے مصر ہوئے کہ انہیں بھی اس پرواز کے ذریعے قاہرہ کے سفر پر بھیجا جائے، فخر ماتری خاموش رہے کہ جعفر منصور کو بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے، جعفر منصور حریت میں قطعہ لکھتے تھے۔ 20 مئی 1965 کے روز قاہرہ جانے والی اس پرواز کے مسافر، چار پانچ کے سوا، تمام کے تمام اگلے جہان کو سدھارے تھے!

دوران ملازمت ، رضا علی عابدی حریت کی جانب سے دولت مشترکہ کے ایک تربیتی کورس میں لندن گئے۔ یہ بات ہے جنوری 1968 کی۔

لندن میں ایک روز وہ بس میں کہیں جارہے تھے۔ لکھتے ہیں : " میرے برابر والی نشست خالی تھی، اتنے میں ایک لڑکی آکر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کے بدن کی گرمی مجھے محسوس ہو رہی تھی، وہ بھی اس شان بے نیازی سے بیٹھی تھی کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں اور میرا یہ حال کہ سارے شرعی احکام ایک ایک کرکے یاد آنے لگے اور میں اپنے کونے میں سکڑ گیا۔

(نہ ہوئے مستنصر حسین تارڑ۔" (ص: 134

یہاں ہمیں برسوں پہلے کا پڑھا ایک واقعہ یاد آگیا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ لاہور کے یعقوب ناسک دل کے آپریشن کی غرض سے لندن گئے، ایک روز ٹیوب میں سفر کر رہے تھے کہ ایک لڑکی ان کے برابر آ کر بیٹھ گئی، سفر طویل تھا، لڑکی کی آنکھ لگ گئی اور اس کا سر دھیرے دھیرے یعقوب صاحب کے کاندھے سے آ لگا۔ یعقوب صاحب نے کچھ دیر برداشت کیا اور پھر اسے جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا: " اٹھو بی بی ! میں یعقوب ناسک ہوں، مستنصر حسین تارڑ نہیں !

لندن میں تربیتی کورس کے سلسلے میں قیام کے دوران ان کا ایک ہندوستانی ساتھی اوم کمار جوشی تھا، جوشی کمال کا صحافی تھا، اسے ان گنت لطیفے یاد تھے۔ رضا علی عابدی کے سوڈانی دوست محمود نے ہندوستانی گالیاں سیکھ لیں، شام کو جب یہ ٹولہ گھومنے نکلتا اور کسی گوشے میں بوس و کنار میں مصروف لڑکے لڑکیاں ملتے تو محمود انہیں ہندوستانی گالیاں دیتا تھا۔ اوم کمار جوشی کو ایک ہی غم کھائے جاتا تھا کہ یہ لڑکے لڑکیاں آخر آپس میں اتنی جلدی اور آسانی سے کیسے دوستی کر لیتے ہیں ۔کچھ دن بعد سب نے یہ محسوس کیا کہ جوشی غائب رہنے لگا ہے۔، نہ ان کے ساتھ گھومنے جاتا ہے اور نہ ہی آپس میں مصروف جوڑوں کو گالیاں دیتا ہے۔ ایک دن جوشی کہنے لگا کہ کوئی اردو گالی بتاؤ۔ رضا علی عابدی لکھتے ہیں : "وہ گالی ہم نے اسے بتائی، معلوم ہوا کہ جوشی لڑکیوں کو یہ کہہ بیٹھے کہ میں مشرق سے آیا ہوا ہندو پنڈت ہوں اور تمہیں

قسمت کا حال بتا سکتا ہوں، بس پھر غضب ہوگیا، انٹر نیشنل ہاؤس میں جوشی کے کمرے کے باہر لڑکیوں کی قطار لگ گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جوشی کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ رہی۔

ایک روز ہم چھ سات کی ٹولی آرام گاہ میں بیٹھی تھی کہ جوشی دو لڑکیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا

میں نے اور مرزا نے کہا: جوشی، اردو گالی سنو گے ؟

بولا: سناؤ

(ہم نے بیک آواز کہا: ××××× (ص: 137

حریت میں ملازمت کے بیان میں عابدی صاحب نے اپنے ساتھی عنایت اللہ کا ذکر کیا ہے جو اخبار کو پریس میں بھیجنے سے قبل ہمیشہ کہا کرتے تھے: " اس پہ یں شک ڈالو"۔۔ مطلب یہ کہ اچھی طرح دیکھ لو کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں۔

'بقول رضا علی عابدی، ' وہ کم بخت ہمیشہ نکلتی تھی۔

اسی ضمن میں لکھتے ہیں: " ایک بار میں اخبار پر آخری نظر ڈال رہا تھا، دیکھا کہ ایک چھوٹی سی خبر پر سرخی لگی ہے جس میں لکھا ہے 'علامہ رشید شرابی علیل ہیں،' رشید ترابی کے نام کا یہ حشر پہلے تو کاتب نے کیا، پھر

پروف ریڈر نے کیا۔

ایک مرتبہ ایک اور سانحہ ہوتے ہوتے رہ گیا، رات پوری طرح ڈھل چکی تھی، آنکھیں منتظر تھیں کہ کام ختم ہو اور گھر جائیں، آخری دو صفحات پر کڑی نظر ڈالی جارہی تھی، سرخی لگی تھی:

صدر ایوب غلیل ہوگئے۔

اگر یہ خبر یونہی چھپ جاتی تو تو میں اپنی زندگی کا آخری مصرعہ کہتا:

(ایک غُلہ میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے (ص: 145

رضا علی عابدی نے مصطفیٰ زیدی کے ساتھ نیم مردہ حالت میں پائی جانے والی خاتون شہناز کا احوال بھی اپنے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ پہلے یہ خبر بطور ایک چھوٹی خبر موصول ہوئی کہ ایک سرکاری افسر نے خودکشی کرلی ہے، جب خبر پھیلی کہ متوفی مصطفیٰ زیدی ہیں تو تمام اخبارات اس خبر کی تفصیل کے پیچھے پڑ گئے اور بقول عابدی صاحب ایسی ایسی داستانیں نکال کر لائے کہ مصطفیٰ زیدی اگر اس وقت بچ جاتے تو اب مرجاتے۔ عدالت میں حریت کے فوٹو گرافر نے شہناز گل کی ایک قد آدم تصویر کھینچ لی۔ رضا علی عابدی بیان کرتے ہیں کہ اس واقعے کے کافی عرصے کے بعد افتخار عارف نے ایک تقریب میں شہناز گل سے کہا کہ 'ابھی تو آپ پر دس بیس شاعر اور قربان ہو سکتے ہیں'۔

'اخبار کی راتیں' کی فہرست ابواب ملاحظہ کیجیے:

ہاں، میں پروف ریڈر تھا، ہندو اخبار میرے دوست ٹھہرے، سمندر کدھر ہے ؟، پہلی کتاب، پہلی ملازمت، مشقت شروع ہوتی ہے، میری پیٹھ پر پہلی تھپکی، دفتر اور تکیہ، جنگ کی جنگ، کیا کیا آشنا، اردو صحافت کا تاج محل، کیسی اڑان، گردن پر موت کی گرم گرم سانسیں، آگے سمندر ہے، صحافیوں کی پوری فصل، تیسرا قدم، دوسری ہی دنیا، راہ میں پھول پڑے، جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، بڑی سرخی، بڑی تصویر، زبان کا فن، زبان کو برتنے کا ہنر، ترجمے کے رموز، یہ مسائل تلفظ۔ آخر الذکر باب میں مصنف نے حروف تہجی کے اعتبار سے اردو زبان کے چند الفاظ اور ان کے تلفظ درج کیے ہیں اور قاری کو ترجمے کے رموز اور اس زبان کو برتنے کا ہنر سکھایا ہے جس کے مٹنے کا غم سینے سے لگائے وہ دنیا بھر میں اکثر سفر کرتے ہیں۔

کچھ نعت رنگ و نعت ریسرچ سینٹر کے بارے میں

بہت سال گزرے جب پانچویں کلاس کا ایک طالب علم حیدرآباد سندھ کے علاقے لطیف آباد کی ایک مسجد میں لہک لہک کر مسدس حالی کے اشعار پڑھ رہا تھا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا

ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

لفظ بیڑے کو وہ بیٹرے پڑھ گیا، لاوڈ اسپیکر کھلا تھا اور محلے والے سن رہے تھے۔ قریب بیٹھے ایک صاحب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے تصحیح کی۔ اس نے بوکھلا کر شعر دوبارہ پڑھا۔

وقت گزرتا گیا، فن نعت گوئی کا احترام دل میں رہا! گرچہ اس طالب علم نے دوبارہ کبھی نعت نہیں پڑھی لیکن اس جانب ایک انسیت اس کے دل میں موجود رہی۔

صاحبو! یہ ذکر میرا اپنا ہی تو ہے۔ کالج کا زمانہ آیا، کراچی میں زیر تعلیم تھا کہ ایک روز ایک مسجد سے باآواز بلند کوئی صاحب نعت پڑھ رہے تھے۔

میں نے چونک کر اپنے ساتھی سے کہا کہ بھائی ذرا دیکھنا تو، یہ صاحب تو نور جہاں کا گانا گا رہے ہیں:

قدموں میں تیرے جینا مرنا

پھر یوں ہوا کہ راہ چلتے بھی نعت کے اشعار میں فلمی گانوں کو کھوجنے کی عادت سی ہو گئی ۔ محمد رفیع سے لے کر مکیش تک، کیا کیا نہ یاد آ جاتا تھا۔

یہ رنگ دیکھ کر ایسے لوگوں سے طبیعت کچھ بیزار سی ہو گئی !

بقول شخصے، نعت گوئی، نبی کریم ﷺ کا ذکر بلند کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ لیکن نعت کہنے کے لیے جس احتیاط کی ضرورت ہے اور مدحت نگاری کے لیے موضوع سے جس قدر باخبری درکار ہے وہ بیشتر نعت گو شعرا کے کلام سے ظاہر نہیں ہوتی، اس پر مستزاد مساجد سے بلند آواز میں فلمی گانوں کی طرز پر نعت پڑھنے والے یہ لوگ جن کے کلام کو سن کر دھیان صرف اور صرف فلمی گانوں کی طرف جاتا ہے۔

ایک روز ایک دوست نے انکشاف کیا کہ ان دنوں تو نعت گوئی میں بہت پیسہ ہے، پھر دیر گئے وہ مکمل طریقہ کار بتاتے رہے۔ اتنی رقم نعت خواں کو دیجیے، لندن جا کر سی ڈی تیار کروایئے اور ایک کروڑ جیب میں۔ انہی دنوں مشہور نعت

خواں مظفر وارثی کی خودنوشت ' گئے دنوں کا سراغ' نظر سے گزری۔ وارثی صاحب نے ایک جگہ اپنی شراب نوشی کا ذکر کیا، اس علت سے وہ تائب ہو چکے تھے۔ حیرت ہوئی کہ نعت گوئی کے تعلق سے اتنا مشہور شخص اور یہ عادت۔ پھر خیال آیا کہ کم از کم مظفر وارثی میں اتنی ہمت تو تھی کہ اپنی کتاب میں اس کا اعتراف کیا۔

وقت کچھ اور گزرا، نوے کی دہائی کا ایک مشہور فنکار، گانے سے تائب ہوا، وہ اب ٹی وی اکثر نعت پڑھتا نظر آتا ہے۔ چند برس قبل کراچی میں یہ ہوا سی چل پڑی تھی، کئی اور گلوکار بھی گلوکاری سے گریزاں تو ہوئے لیکن روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر کے مصداق اور کچھ نہیں تو نعت گوئی کی جانب آ گئے۔ ٹی وی چینلز نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ تمام فنکار اپنی گائی نعتوں میں موسیقی کے نام پر صرف دف کے علاوہ تمام آلات موسیقی کو ناجائز قرار دیتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ دلچسپ امر کہ ٹی وی پر رونق افروز ہونا ان کے نزدیک سراسر جائز ہے۔

یہ جمود اس وقت ٹوٹا جب ایک روز صبیح رحمانی صاحب تشریف لائے۔ کتابوں اور رسالوں سے لدے پھندے۔ اب جب ان کتابوں کو بغور دیکھا تو حیران بھی ہوا اور پشیمان بھی کہ میں ایسے لوگوں سے بیزار ہوا جنھوں نے سرکار دو عالم ﷺ سے

وابستہ اس صنف کو بھی پیسہ کمانے کا ذریعہ بنالیا ہے اور اسی کیفیت میں فن نعت گوئی
کی جانب کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ کیسے کیسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی فن نعت گوئی
کے سنجیدہ فروغ کے لیے وقف کردی ہے۔

ذکر ہے رسالہ نعت رنگ و نعت ریسرچ سینٹر کا۔ محترم صبیح رحمانی نے اس کا ڈول نوے
کی دہائی میں اس وقت ڈالا جب نعت رنگ کا پہلا شمارہ اپریل 1995 میں شائع ہوا جبکہ
میں اقلیم نعت کے زیر اہتمام کراچی میں نعت ریسرچ سینٹر کا عمل میں آیا۔ 2002
نعت ریسرچ سنیٹر کی شاخیں بھارت اور لندن میں بھی قائم ہوچکی ہیں۔ ان تمام
کاوشوں کے پیچھے صبیح رحمانی کی کاوشیں کارفرما ہیں۔ صبیح رحمانی 28 جون 1965
میں پیدا ہوئے اور محض تیس برس کی عمر میں نعت رنگ کا پہلا شمارہ شائع کرکے عاشقان
مصطفیٰ میں نام لکھوالیا۔

سن و ماہ اشاعت کے اعتبار سے نعت رنگ کے تاحال شائع ہوئے شماروں کی تفصیل کچھ
یوں ہے:

پہلا شمارہ: اپریل 1995

دوسرا شمارہ: دسمبر 1995

تیسرا شمارہ: ستمبر 1996

چوتھا شمارہ: مئی 1997

پانچواں شمارہ: فروری 1998

چھٹا شمارہ: ستمبر 1998

ساتواں شمارہ: اگست 1999

آٹھواں شمارہ: ستمبر 1999

نواں شمارہ: مارچ 2000

دسواں شمارہ: اپریل 2000

گیارھواں شمارہ: مارچ 2001

بارھواں شمارہ: اکتوبر 2001

تیرھواں و چودھواں شمارہ: دسمبر 2002

پندرھواں شمارہ: مئی 2003

سولہواں شمارہ: فروری 2004

سترھواں شمارہ: نومبر 2004

اٹھارواں شمارہ: دسمبر 2005

انیسواں شمارہ: دسمبر 2006

بیسواں شمارہ: اگست 2006

اکیسواں شمارہ: 2006

بائیسواں شمارہ: ستمبر 2011

نعت رنگ کے پہلے شمارے میں درج ہے کہ نعت رنگ کی اشاعت کا مقصد نعت نگاری کی طرف رجوع عام کے اس دور میں نعت کو رطب ویاس اور شعراء کے غیر محتاط رویوں سے محفوظ رکھنے کی سنجیدہ کوشش ہے۔

:بقول ریاض مجید

"نعت رنگ کے کچھ مقاصد آغاز کار ہی سے اور طرح کے ہیں۔ تخلیق نعت اور تعارف شعرا و کتب نعت کے علاوہ اس جریدے نے تنقیدات نعت کے حوالے سے گراں قدر کام پیش نظر رکھا ہوا ہے۔ تنقیدات نعت کے باب میں نعت رنگ کی کارکردگی کو دیکھ کر صبیح رحمانی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ ان کی محنت اور مختلف مسالک سے جڑے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کے شائستہ رویوں کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تنقید نعت جیسے نازک مسائل سے جڑے ہوئے ہوں۔"

نعت رنگ کے اب تک شائع ہونے والے پندرہ شماروں میں دنیا بھر کے معتبر شاعروں اور ادیبوں کے اشعار، مضامین، مقالے، تنقید مضامین شامل ہیں۔ مذکورہ پرچے میں نعت گوئی سے متعلق اختلافی مسائل کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔

نعت رنگ کے وہ عنوانات جن کے تحت مضامین شامل کیے جاتے ہیں، کچھ اس طرح ہیں:

تحقیق نعت، تنقید نعت، فکر و فن، مقالات، مدحت منظوم، تراجم، خاکہ، خطوط، فیچر، مطالعات کتب، مضامین، تجزیاتی مطالعے وغیرہ

ان عنوانات میں تنقید و تحقیق کی مہم کو سر کرنے کے لیے نعتیہ ادب کے جو مہم جو تلاش بسیار کے بعد ہاتھ آئے وہ ان اسماء گرامی یہ ہیں:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر اسحاق قریشی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر سحر انصاری، ادیب رائے پوری، ڈاکٹر عاصی کرنالی، رشید وارثی، عزیز احسن، مولانا شاہ محمد تبریزی، پروفیسر افضال احمد، پروفیسر شبیر قادری، ڈاکٹر ہلال نقوی، مولانا سید ابوالحسن ندوی، ڈاکٹر وقار احمد رضوی، جاذب قریشی، حفیظ تائب، سعید بدر، سید آل احمد رضوی، ڈاکٹر آفتاب نقوی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق وغیرہ۔

تحقیق و تنقید کے عنوانات سے ہٹ کر دیگر عنوانات پر نگارشات پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر اسلم فرخی، عطاء الحق قاسمی، پروفیسر آفاق صدیقی، ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی و دیگر شامل ہیں۔

:نعت رنگ و نعت ریسرچ سینٹر کے بارے میں اہل علم کی آراء ملاحظہ ہوں

نعت رنگ میں نعت گوئی کے تاریخی، فکری، جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کے بارے میں بصیرت افروز مباحث ملتے ہیں

(مشفق خواجہ)

☆

آپ نے جس سلیقے اور عمدگی سے نعت رنگ مرتب و شائع کیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ معیار اور حسن طباعت کے اعتبار سے بھی ایسا کوئی دوسرا رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

☆

نعت رنگ کی جو جلدیں مجھے موصول ہوئیں انہیں تو میں انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتا ہوں

(پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

☆

نعت رنگ جس شان سے نکلا ہے وہ جناب آپ اور آپ کے رفقائے کار ہی کا حصہ ہے۔ جو کچھ بھی رسول عالی مقام ﷺ کے تعلق سے لکھا جائے گا وہ محترم تو ہو ہی جائے گا۔ ان معنوں میں نعت رنگ احترام سے پڑھی جانے والی کتاب ہو گی۔

(کالی داس گپتا رضا)

☆

نعت رنگ سے نعت کے ادبی پہلوؤں کے جائزے کا جو ادبی سلسلہ شروع ہوا ہے اس نے ارباب نظر کو تفہیم نعت کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔
(ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی)

☆

نعت رنگ نے پرانی لکیر کو نہیں پیٹا بلکہ نعت کی پیشکش کا نیا انداز نکالا ہے۔ جب تک اس پیشکش کا اس سے بہتر نقش سامنے نہیں آتا، اس اقلیم میں اسی کا نام منور نظر آئے گا۔

(ڈاکٹر انور سدید)

☆

درج بالا آراء کے حوالے مرتب کرتے ہوئے کتاب ' نعت رنگ اہل علم کی نظر میں ' میں ڈاکٹر انور سدید کے مضمون سے بھی اقتباس لیا گیا۔ دلچسپ بات دیکھیے کہ نعت رنگ کے بارے میں لکھتے وقت بھی وہ ڈاکٹر سلیم اختر سے اپنے سنگین تنازعے کو درمیان میں لے آئے، کہتے ہیں:
ڈاکٹر سلیم اختر جس ذہن کے ادیب ہیں، اس کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں۔ غنیمت ہے " کہ ایک سرکاری ابلاغی ادارے نے ان سے نعت کے موضوع پر مضمون لکھوایا اور

صبیح رحمانی نے اسے نعت رنگ میں محفوظ کر لیا۔ اس مقالے سے روپے پیسے کی بو بھی آتی ہے۔ لیکن ضعیف العمری قبر کا خوف پیدا کر دیتی ہے۔ تو یہ خوف سیکولرازم اور اسلام گریزی کی عادت پر بھی غالب آجات ہے اور پھر کئی بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست بھی مل جاتی ہے۔ اگر سلیم اختر کو بھی جادہ مستقیم نظر آگیا ہے اور وہ زمانے اور نفع پسندی کی دھول سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان سے اگلی ملاقات اقبال ٹاؤن کی عید گاہ میں ہو اور میں انہیں خدا کے حضور میں سر جھکائے ہوئے سجدہ کناں دیکھ لوں۔ اس کے بعد مجھے موت بھی آجائے تو کوئی بات نہیں۔" (جسارت۔13 جون 1997)

ڈاکٹر انور سدید نے یہ رائے 1997 کے ایک مضمون میں لکھی تھی۔ کچھ ہی عرصہ قبل راقم کی ڈاکٹر انور سدید سے بات ہوئی تھی، ماشاءاللہ وہ صحیح سلامت ہیں۔ چنانچہ ایک بات توثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ڈاکٹر سلیم 1997 سے تاحال مسجد نہیں گئے ہیں۔ دونوں بزرگوں میں جس غضب کی دشمنی ہے، اور جس طرح وہ ایک دوسرے کی جان کے درپے رہتے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے تو ڈاکٹر سلیم اختر کے پاس ڈاکٹر انور سدید سے گلو خلاصی کا ایک نہایت آسان طریقہ ہے، بس انہیں صرف ایک بار اقبال ٹاؤن لاہور کی عید گاہ میں نماز کے لیے جانا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں یہ راستہ دکھانے والے خود ڈاکٹر انور سدید ہی ہیں۔

نعت ریسرچ سینٹر کا پتہ یہ ہے:

بی۔ 50۔ سیکٹر ۱۱ اے۔ نارتھ کراچی۔ 5858•

جناب صبیح رحمانی اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اگر کسی کرم فرما کے پاس فن نعت گوئی کے تعلق سے کوئی نادر کتاب موجود ہے تو اسے نعت ریسرچ سینٹر کے مندرجہ بالا پتے پر ارسال کردیں، کتاب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے گا۔ کتاب ارسال کرنے سے قبل ذیل میں درج ای میلز پر رابطہ کیا جاسکتا ہے:

naatrc@gmail.com

naatrang@yahoo.com

نعت گوئی کے فن سے متعلق صبیح رحمانی کی نگرانی میں انٹرنیٹ پر چار ویب سائٹس دستیاب ہیں:

www.sabihrehmani.com

www.naatresearchcenter.com

www.naatrang.net

www.visaaleyar.com

اردو کے ضرب المثل اشعار۔ایک اہم کتاب ، ایک اہم کارنامہ

نوے برس کے محمد شمس الحق صاحب کو خدا سلامت رکھے کہ باوجود اپنی پیرانہ سالی ، زبان زد عام ہوئے اشعار کی کھوج میں شہر کراچی میں در در بھٹکتے ہیں۔ یہ دو چار برس کی بات نہیں ،اس آشفتہ سری یں وہ پورے ساٹھ برس بتا چکے ہیں۔ آپ سے پہلی ملاقات جناب سید معراج جامی کے گھر اس وقت ہوئی جب ایک روز اتوار کی صبح وہ ہاتھ میں تھیلا لیے آن پہنچے۔ تھیلے سے کتابیں برآمد ہوئیں جنہیں جامی صاحب کو سونپ، ان کے کتب خانے سے کتابوں کی اگلی کھیپ کو کھوجنے کی فکر میں لگ گئے۔ اس سے قبل ایک مرتبہ ان سے فون پر اس وقت بات ہوچکی تھی جب راقم کو ایک شعر کے خالق کی تلاش تھی، شعر یہ تھا:

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود، نہ ہوشیار ہوا

شمس الحق صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ شعر اصغر گونڈوی کا ہے!

اتوار کی صبح وہ باقاعدگی سے جامی صاحب کے گھر تشریف لاتے ہیں، کتابوں سے اپنے مطلب کے اشعار نکالتے ہیں ۔ کراچی کے تمام اہم کتب خانوں سے استفادہ

حاصل کرتے کرتے جناب محمد شمس الحق نے 2003 میں 'اردو کے ضرب المثل اشعار ۔ تحقیق کی روشنی میں' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی، کتاب ادارہ یادگار غالب سے شائع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نایاب بھی ہو گئی۔2011 میں اس کے حقوق اشاعت لاہور کے ناشر فکشن ہاؤس (رابطہ نمبر:042-37249218) نے حاصل کیے اور دوسرے ایڈیشن کی چند ہی مہینوں کے اندر فروخت کے بعد حال ہی میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا۔ 438 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 560 مقرر کی گئی ہے۔اس سے قبل جناب شمس الحق 'گل ہائے رنگ رنگ' کے عنوان سے تین جلدوں پر مبنی کتاب مرتب کرچکے ہیں، ان تینوں جلدوں میں تقریبا پندرہ ہزار اشعار مختلف عنوانات کے تحت درج ہیں۔

اردو کے ضرب المثل اشعار' میں معروف شعراء کرام کے 798 اشعار جمع کیے گئے ہیں' جبکہ اسناد و حواشی، شعراء کا مختصر تعارف، فہرست شعراء، فہرست اشعار اور اشاریہ کے عنوانات سے مختلف ابواب بھی شامل ہیں۔کتاب کی ترتیب و تہذیب، جناب رفیق احمد نقش کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔ شمس الحق کے مطابق "اردو کے وہی اشعار ضرب المثل بن گئے جن کا طرز بیاں عام فہم، سادہ اور دل نشیں ہو، جو پڑھنے والے یا سننے والے کے حافظے پر فورا نقش ہو جائے اور جو زندگی کے مختلف حقائق اور مسائل کی آسان لفظوں میں ترجمانی کرے۔"

کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض شعراء کے ایسے اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں جن سے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر خاص و عام واقف ہے لیکن شاعر کے نام سے واقفیت بالکل نہیں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں (لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی)

☆

کب ہے عریانی سے بہتر کوئی دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا (صاحب مرزا شناور)

☆

پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے
اک دھوپ تھی کہ گئی ساتھ آفتاب کے (خوش وقت علی خورشید)

☆

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی
ساقی ادھر اٹھا تھا، ادھر ہاتھ اٹھ گئے
بوتل سے کاگ اڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی (گستاخ رام پوری)

مذکورہ بالا تمام مثالیں ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس قول کی صداقت پر پورا اترتی ہیں جس میں وہ بیان کرتے ہیں :

" شاعری میں وہی اشعار ضرب المثل بن سکتے ہیں جن میں انسانی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے کی یہ صلاحیت پوشیدہ ہو ، جن میں خیال کچھ ایسا اور کچھ اس طور پر ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ سب یہ کہہ اٹھیں کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

کتاب میں بعض اشعار کے ایسے مصرعے بھی شامل کیے گئے ہیں جن کے پہلے یا دوسرے مصرعے کا باوجود کوشش ، علم نہیں ہو سکا ہے، کتاب میں درج ایسے تمام مصرعے پیش خدمت ہیں کہ زیر نظر مضمون پڑھنے والے اگر ان سے واقف ہوں تو مرتب سے رابطہ (021-34618521 کتاب میں درج ہے) کرکے مستند حوالے کے ساتھ انہیں اس بارے میں آگاہ کر سکتے ہیں :

آثار کہہ رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی

×

میرا وقت آیا تو چلمن ڈال دی

×

وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

×

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے

×

باغ باں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی

×

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

×

ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے ہیں

×

اگر اب بھی نہیں سمجھے تو پھر تم سے خدا سمجھے

×

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

×

ہم کو دعائیں دو، تمہیں قاتل بنا دیا

×

آبرو چاہے تو دریا سے کنواں دور رہے

....

کتاب کو مرتب کرتے وقت جناب شمس الحق کا خیال تھا کہ صرف ان اشعار کے ماخذ کی نشان دہی کی جائے جن کے متعلق یہ علم ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں تصرف پیدا ہوگیا ہے، یا وہ اشعار اپنے اصلی خالق کے بجائے کسی دوسرے شاعر کے نام سے منسوب ہوگئے ہیں۔ اس مجموعے کے دوران ترتیب جناب شمس الحق کے سامنے ایسے اشعار بھی آئے جن سے متعلق ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ان میں بھی تصرف ہو سکتا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں کرتے (آتش)

آتش کے مذکورہ بالا شعر کا مصرع ثانی اس طرح مشہور ہے:

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

مصحفی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہما بسے

یہ شعر اس طرح زباں زد عام ہے:

بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا

اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

....

جناب محمد شمس الحق نے کتاب میں کئی اشعار کی شان نزول کا پس منظر بھی شامل کیا گیا ہے۔ میر تقی میر کے متعلق آب حیات سے یہ واقعہ نقل کیا ہے: "لکھنو میں پہنچ کر، جیسا کہ مسافروں کا دستور ہے، ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے، رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا شامل ہوئے۔ جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنو، نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع! انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے، اور بھی تنگ دل ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع جب ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے، ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے
"سب کو معلوم ہوا، بہت معذرت کی۔

کتاب میں وہ اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں جن کے خالقوں کے نام باوجود کوشش
:بسیار، معلوم نہ ہو سکے، ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے

ایسی ضد کا کیا ٹھکانہ، اپنا مذہب چھوڑ کر
میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

☆

بے کار مباش کچھ کیا کر
خون دل عاشقاں پیا کر
از رشتہ زلف خویش ہر دم
چاک دل عاشقاں سیا کر

☆

خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر
آدمی پہچان لیتے ہیں قیافہ دیکھ کر

☆

مانیں، نہ مانیں، آپ کو یہ اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

☆

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی، بری نظر ڈالی

☆

جان بچی سو لاکھوں پائے
خیر سے بدھو گھر کو آئے

☆

ازل سے حسن پرستی لکھی ہے قسمت میں
مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے

☆

نور حق، شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی خدا ہو، اس کو مٹا سکتا ہے کون

☆

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی، خدا کی قسم، لاجواب کی

....

اردو کے ضرب المثل اشعار۔ تحقیق کی روشنی میں ' میں شامل تمام اشعار بڑی چھان'
پھٹک کے بعد اور شعراء کے کلیات، دواوین، تذکروں تاریخ ادب کی مستند کتابوں اور
تحقیقی مضامین سے لیے گئے ہیں۔ مرتب کی جانب سے حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ
دور قدیم سے دور جدید تک کے تمام ضرب المثل اشعار کتاب میں شامل ہو جائیں۔
کتاب میں 'ضمیمہ' کے عنوان سے باب شامل کیا گیا ہے جس میں اردو کے وہ اشعار
درج کیے گئے ہیں جو بقول مرتب، فی الحال زبان زد عام نہیں ہیں مگر ان میں ایسا
ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔مذکورہ باب کتاب کے پہلے ایڈیشن (2003) میں
شامل نہ ہو سکا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسا مشفق خواجہ مرحوم کی ایما پر ہوا تھا،
میں کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت میں اس باب کو شامل کرکے شمس 2011
الحق صاحب نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کر لی۔ مشفق خواجہ نے اسے اصل مسودے
سے کیوں حذف کیا، کتاب میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ضمیمہ سے چند اشعار
:ملاحظہ ہوں

اٹھو، وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
(دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا (جسٹس ہمایوں
×
اپنے قول وفا کو بھول گئے

(تم تو بالکل خدا کو بھول گئے (مضطر خیر آبادی۔ والد: جاں نثار اختر

×

راہ میں ان سے ملاقات ہوئی

(جس سے ڈرتے تھے، وہی بات ہوئی (مصطفیٰ ندیم۔ ترکی سے تعلق رکھنے والے جناب محمد شمس الحق کہتے ہیں کہ جب وہ کوئی غیر معمولی شعر سنتے ہیں تو مہینوں اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ خدا کرے کہ ان پر لطف و کرم کی یہ کیفیت برقرار رہے اور اردو کے ضرب المثل اشعار میں یونہی اضافہ ہوتا رہے۔

رفت و بود۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی خودنوشت

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی خودنوشت 'رفت و بود' مرزا ظفر الحسن کے قائم کردہ ادارہ یادگار غالب، کراچی سے شائع (دسمبر 2011) ہو گئی ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر معین الدین عقیل ہیں۔

ابتدا میں اپنے شاگرد ڈاکٹر معین الدین عقیل کی فرمائش پر جسارت کے ادبی صفحے کے لیے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس خودنوشت کو قسط وار تقریبا ڈیڑھ سال تک لکھا تھا۔ ستمبر 1994 میں ڈاکٹر صدیقی انتقال کر گئے۔ خودنوشت کے اصل مسودے کی نقل ڈاکٹر معین کے پاس محفوظ تھی جسے انہوں نے شائع کروا کے ڈاکٹر صدیقی کی داستان حیات کو محفوظ کر دیا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی 15 جون 1916 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وکٹوریہ ہائی اسکول، آگرہ مشن اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں سے مکمل کی۔ بعد ازاں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1942 میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی مکمل کی۔

خودنوشت کے مقدمے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں کہ "ڈاکٹر ابواللیث

صدیقی زمانہ طالب علمی ہی سے مضامین و مقالات لکھنے لگے تھے جو جامعہ دہلی، علی گڑھ میگزین علی گڑھ، ہمایوں لاہور، معارف اعظم گڑھ اور نگار لکھنو میں شائع ہوتے رہے۔ تنقید اور تحقیق دونوں ہی میں ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی یکساں تھی۔ بعد میں لسانیات اور خاص طور پر اردو لسانیات ان کا محبوب موضوع بن گیا۔ ان کے پی ایچ ڈی کے تحقیق مقالے لکھنو کا دبستان شاعری نے، جو شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا پہلا تحقیقی کام تھا، انہیں اسی زمانے میں شہرت سے ہمکنار کردیا تھا۔ یہ مقالہ بھارت "اور پاکستان میں کئی بار شائع ہوا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی اہم تصانیف کے نام یہ ہیں: مصحفی اور اس کا عہد, جرات، اس کا عہد اور شاعری, نظیر اکبر آبادی، اس کا عہد اور شاعری, تاریخ زبان وادب اردو, .بیسویں صدی کا اردو ادب

مضامین کے تین مجموعے غزل اور متغزلین، روایت اور تجربے اور ادب اور لسانیات ,کے عنوانات سے شائع ہوئے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل مزید لکھتے ہیں کہ " علی گڑھ سے متعلق کئی اہم اور غیر اہم شخصیات کی خودنوشت سوانح عمریاں ان تک منظر عام پر آچکی ہیں جن میں

علی گڑھ کا ماحول، وہاں کی زندگی اور شخصیات کا احوال ہمارے لیے پر کشش بھی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی رفت و بود ان میں کئی اعتبار سے زیادہ معلوماتی اور دلچسپ و مفید ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے بے ساختہ اسلوب کا بھی بڑا دخل ہے۔ ان کا حافظہ بڑا " قوی اور حاضر تھا اور حالات و واقعات کی جزئیات تک انہیں خوب یاد تھیں۔

رفت و بود کی فہرست ابواب کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں کہ عنوانات کی جاذبیت، ابواب کے متن کے پر کشش ہونے کی بجا طور پر غماز ہے:

قبیلہ کشتگاں، دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے، تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں، یاد ہیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں، دیوار بار منت مزدور سے ہے خم، ہنوز ایک پر تو نقش خیال یار باقی ہے، کاشانہ ہستی کہ برانداختنی ہے، نے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار، بعض اکابر، لاہور کا پہلا سفر، چند تلخ حقیقتیں، ذکر کچھ شام اودھ کا، جیسے استاد ویسے شاگرد، علی گڑھ کے رجسٹرار اور ڈائننگ ہال، علی گڑھ ایک ادارہ ایک روایت، مشرقی تمدن کے کچھ نمونے، لاہور کے گنج ہائے گراں مایہ، کراچی یونیورسٹی: تازہ بستی۔

علی گڑھ کے آفتاب ہوسٹل میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ہم عصروں میں اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، فضل الرحمٰن انصاری شامل تھے۔

اسی زمانے میں ان پر اپنی تعلیمی قابلیت کے سبب، علی گڑھ کے اکابرین کی خصوصی عنایت رہی۔ ان اکابرین میں سے نواب سر راس مسعود اور پروفیسر محمد حبیب کا ذکر خاص رفت و بود میں شامل ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان محفلوں کو اور ان نابغہ روزگار شخصیات کو کراچی آکر یاد کرتے رہے۔ فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی ان میں سرفہرست تھے۔ وہ ان شعرا کی تصاویر دیکھ کر اور ان کے کلام کو پڑھ کر گزرے زمانے کو یاد کرتے تھے، اس ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

کان ان آوازوں کو سننے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں، ہیرے تلاش کرتا ہوں تو پتھر" ملتے ہیں، گوہر ڈھونڈتا ہوں تو مردہ مچھلیوں کے ڈھانچے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی دہلی میں مقیم تھے کہ انجمن ترقی اردو کا دفتر دکن سے منتقل ہو کر دہلی آگیا۔ اس زمانے کے احوال میں انھوں نے اپنے ایک ہم جماعت دوست معین الدین دردائی کا یاس انگیز واقعہ بیان کیا ہے، دردائی صاحب انجمن کے دریا گنج والے دفتر کے ایک کمرے میں کام کیا کرتے تھے اور اسی عمارت میں رہتے تھے۔ کام کے اوقات اتنے تھے کہ دردائی صاحب کسی اور کام کے کیا بلکہ بات کرنے کے قابل بھی نہ رہتے تھے۔ ایک شام ایسی سخت طلبی ہوئی کہ دردائی صاحب رو پڑے۔ کام کرتے کرتے ان کے گھٹنوں میں تکلیف شروع ہو گئی یہاں تک کہ

وہ بالکل معذور ہو گئے، انجمن نے انہیں چند ماہ کی چھٹی دے کر رخصت کر دیا اور انہوں نے زندگی کے باقی چالس برس اس طرح گزارے کہ نہ کھڑے ہو سکتے تھے، نہ چل سکتے تھے، نہ لیٹتے سوتے وقت ٹانگیں سیدھی کر سکتے تھے، بعد ازاں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے دوست کو کراچی بلوالیا تھا۔ معین الدین دردائی کا انتقال ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے روز ہوا۔ مرتے وقت بھی ان کی ٹانگیں سیدھی نہ ہو سکی تھیں، قبر اور مردہ گاڑی کے لیے خاص انتظام کروانا پڑا!

جب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے دوست کو دفن کرکے واپس آرہے تھے تو انہیں وہ وقت یاد آرہا تھا جب ان کے دوست کا خاندان بہار میں زمینداروں کا گھرانہ تھا اور ایک مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسٹیشن سے معین الدین دردائی کے ساتھ ان کے گھر پالکی میں گئے تھے اور واپسی پر ہاتھی پر سوار ہو کر آئے تھے۔

!رہے نام اللہ کا

رفت و بود میں جوش ملیح آبادی کا احوال موجود ہے جن سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی پہلی ملاقات علی گڑھ میں دوران مشاعرہ ہوئی تھی جہاں جوش اپنے خاص

شغل کے بعد اس عالم میں تشریف لائے کہ بقول ڈاکٹر صدیقی، 'جو عین غروب آفتاب کے وقت اپنا پورا رنگ لا چکا تھا'۔ جوش نے شعر پڑھا:

شیخ صاحب اور خدا کو نہ جانیں
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

جوش کا یہ لب و لہجہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ ایک صاحب اسٹیج پر تشریف لائے، یہ ظفر احمد صدیقی تھے اور اپنی گرجدار آواز میں کہا کہ جناب صدر اس طرح کا کلام یہاں برداشت نہیں کیا جاسکتا، جوش صاحب پڑھنا بند کریں'
"

اس بات پر مشاعرے میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔

پاکستان بنا اور جوش صاحب کراچی چلے آئے، یہاں ایک موقع پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ان سے ایک مرتبہ پھر واسطہ پڑا، اس بار اردو کی ترقی کی خاطر بنائے جانے والے بورڈ کی تشکیل کا معاملہ و موقع تھا جس میں جوش کا عہدہ وزارت تعلیم کے بورڈ کے ادبی مشیر کا تھا۔ یہ بقول ڈاکٹر صدیقی، ہرن پر گھاس لادنے والی بات تھی۔ جوش اور بورڈ، دونوں کے معاملات بگڑتے چلے گئے اور نوبت جوش کو بورڈ سے نکالنے تک جا پہنچی۔
ایک روز وزارت تعلیم کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو علاحدہ بلا کر رازداری سے کہا:

دیکھئے نا! یہ جوش صاحب کا میدان نہیں ہے، اس ڈھب کے وہ آدمی نہیں، بورڈ کی "
" گرانٹ محدود ہے، آپ ان کو سبکدوش کیوں نہیں کردیتے
:ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو بڑا غصہ آیا لیکن انہوں نے ہنس کر جواب دیا
جناب! آپ یہ بندوق میرے یا بورڈ کے کسی ممبر کے کندھے پر رکھ کر ہی کیوں "
چلانا چاہتے ہیں، رہا یہ سوال کہ جوش کی پرورش ہورہی ہے اور یہ روپے کا زیاں ہے تو
جناب پرورش تو اور بہت سے لوگوں کی ہو رہی ہے اور ان میں سے بیشتر کا ادبی قد
"جوش سے بہت چھوٹا ہے۔ یہ کام آپ کم از کم مجھ سے نہیں کروا سکتے۔
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جامعہ کراچی کی تازہ بستی آباد کرنے والوں کے سرخیل تھے،
وائس چانسلر بشیر احمد ہاشمی کی نگرانی میں کیمپس کی تعمیر کا کام شروع ہوا، ہاشمی صاحب ہی
کیمپس کے پہلے مکین تھے اور ان کے اصرار پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اساتذہ میں پہلے
شخص تھے جنہوں نے اس ویرانے میں آنے کی ہمت کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صدیقی
:بیان کرتے ہیں
اس وقت تک رہائشی مکان پورے طور پر نہیں بنے تھے، بجلی نہیں تھی، فلش نہیں تھا، "
،پانی کے نلکے نہیں تھے، سڑکیں نہیں تھیں، دکانیں نہیں تھیں

ڈاکٹر اور اسپتال نہیں تھے اور کیمپس سے نیو ٹاؤن پولیس اسٹیشن تک، جو ان ایک آباد اور پر رونق علاقہ ہے، ایک ویرانہ تھا جس سے اندھیرے اجالے گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کیمپس کی ایک ایک اینٹ ہم دونوں کے سامنے لگی، سڑکیں بنیں اور زندگی کی بہت سی آسائشیں مل گئیں لیکن تازہ بستیاں آباد کرنا بڑے حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔ اور ہاں ہم دونوں (مصنف اور ڈاکٹر عباد الرحمٰن خان) کیمپس کے پہلے مکین تھے۔ کیمپس میں آخری آرام گاہ کے قیام میں بھی پہل ڈاکٹر عباد الرحمٰن خان نے کی۔ "ایک دن پہلے تک اچھے خاصے تھے، دوسرے روز اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عمدہ کتابت، مصنف کی باوقار تصویر سے مزین سادہ مگر دلنشیں سرورق کی حامل 448 صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کی قیمت 450 مقرر کی گئی ہے۔ کتاب مندرجہ ذیل پتے سے براہ راست حاصل کی جا سکتی ہے:

ادارہ یادگار غالب و غالب لائبریری

پوسٹ بکس نمبر: 2268، ناظم آباد، کراچی-74600

فون نمبر: 3668698-021

کتابوں کا اتوار بازار۔25 دسمبر، 2011۔سرد ہوا، کتابیں اور عمران خان

ان دنوں سائبیریا کی کٹیلی زمستانی ہواؤں نے براستہ کوئٹہ، کراچی کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ مگر صاحب، شاعر تو یہ بھی کہتا ہے:

چل اے ہوائے زمستاں، چل اور زور سے چل

تو سرد مہری احباب سے زیادہ نہیں

علی الصبح گھر سے نکلتے ہی مزاج پوچھا اور خوب پوچھا۔ کراچی کی نہ گرمی اپنی، نہ سردی، مستعار لیے ہوئے دونوں موسموں کا انحصار بھی بیرونی 'حملہ آوروں' پر ہی ہے۔

مسافر چلا اپنی منزل کی جانب اور رستے میں مزار قائد پر گہما گہمی سی دیکھ کر یاد آیا کہ آج تو صحافی ہارون رشید کے "کپتان" کا جلسہ ہے۔ گزشتہ کل ہی سے موبائل فون پر پیغامات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ یہ موبائل فون پر پیغامات کا رواج بھی اثر رکھتا ہے، ، کہتے ہیں کہ ایک عرب ملک میں حال ہی آنے والے انقلاب میں ان کا بڑا عمل دخل ہے جب پارلیمنٹ کے باہر ایک پولیس

والی نے ایک سبزی فروش کو طمانچہ دے مارا, وہ غریب اپنی توہین.برداشت نہ کرتے ہوئے خود سوزی کر بیٹھا۔۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے نوجوانوں کے موبائل فونز پر ایک دوسرے کو بھیجے جانے والے پیغامات نے حکومتی بساط الٹ دی۔

کپتان کا معاملہ دوسرا ہے۔ کل موبائل فون پر پیغام آیا کہ اہلیان کراچی کو نوید ہو کہ اگر مفت کی مضبوط پلاسٹک کی کرسی درکار ہو تو 25 دسمبر کو عمران خان کے جلسے میں جایئے اور واپسی پر کرسی ہمراہ لیتے آیئے۔

چار سال کی بات ہے کہ حلقہ احباب میں عمران خان کی کامیابی کی بات چل نکلی، خاکسار نے ایک تاریخی فقرہ کہا (یہاں خاکسار کا اپنی ذاتی طور پر مرتب کردہ تاریخ کی جانب اشارہ ہے) کہ خاں صاحب صرف اور صرف ایک صورت میں ملک کی حالت بدلنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی کلوننگ کروالیں اور کم از کم 5 ہزار اپنے جیسے ایماندار اور نیک نیت عمران خان بنوالیں، بصورت دیگر ذرا مشکل ہی نظر آتا ہے!

کتابوں کے بازار میں کتابوں کا سمندر اور اس میں جال ڈال کر مطلوبہ گوہر نکالتے مشتاقان کتب، لیکن ان گوہر نایاب کی قیمت لینے والے بھی توگھاگ ہیں:

آدمی پہچان لیتے ہیں قیافہ دیکھ کر

آج ملنے والی پہلی کتاب نے اداس کردیا، جی ہاں، بات ہی کچھ ایسی ہے، عنوان دیکھ کر ذہن میں ایک جھپاکا سا ہوا:

اختر۔ تجھ سا اور کہاں سے لاؤں

مرتب: ابن انشاء

سن شاعت: 1958

یہ اختر کون ہیں؟ ایک جست لگا کر ذہن کئی برس پیچھے چلا گیا۔ ابن انشائ۔احوال و آثار کی طرف جو ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے اسے 1988 میں شائع کیا تھا۔ یاد آیا کہ اس مقالے میں ابن انشاء نے اپنے عزیز جواں مرگ دوست کا ذکر کیا تھا۔ صفحہ 173 تا 177 ، ڈاکٹر ریاض نے یہ احوال قلم بند کیا ہے۔

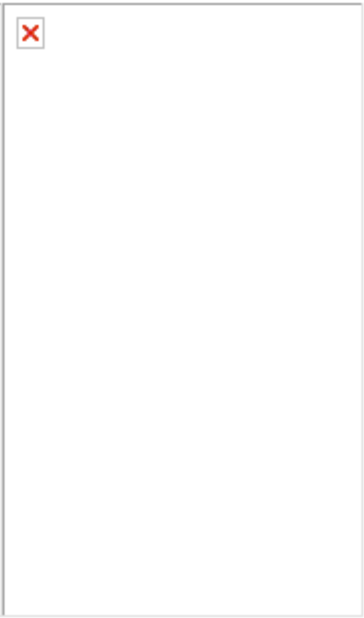
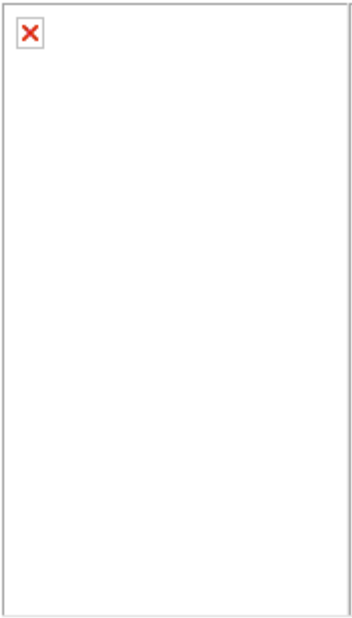

محمد اختر کراچی میں ابن انشاء کے جگری دوست بن گئے تھے، پیشے سے انگریزی زبان کے صحافی تھے، کھیلوں کے نامہ نگار۔ محمد اختر نے 1948 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا، ان کی گھریلوں ذمہ داریاں بھی ابن انشاءسے ملتی جلتی تھیں، حتی کہ ماں کی محبت میں بھی وہ ابن انشاء ہی کی طرح خوش قسمت تھے۔ والدہ، والد،پانچ بہنوں اور تین بھائیوں کا گھر، محمد اختر سب سے بڑے تھے۔ ان کی بڑی بہن بیان کرتی تھیں کہ "نہ جانے وہ کون سی صفات تھیں جن کی بنا پر والدہ کی بھائی (اختر) محبت عشق کے انتہائی درجے پر پہنچی ہوئی تھی، ان کے معمولی اور ادنی کاموں میں بھی وہ تاخیر نہ برتیں، اکثر جس دن بھائی جلدی گھر آجاتے، منہ ہاتھ دھو کر اماں کے پاس لیٹ جاتے اور پھر دنیا جہان کی باتیں کرتے رہتے۔ خاندان کے ایک ایک فرد کے متعلق باتیں کرتے!"۔۔

ابن انشاءکے ساتھ محمد اختر کے صبح و شام گزرنے لگے۔

کون جانتا تھا کہ انشا جی زندگی میں جو واحد کتاب (زیر موضوع) مرتب کریں وہ ان کے اپنے دوست کے متعلق ہو گی۔

پھر وہ گھڑی آ پہنچی جو اہل خانہ کے لیے قیامت کی گھڑی تھی، 20 نومبر 1958 کی ایک طوفانی صبح محمد اختر حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے، اس وقت ان کی عمر صرف 32 برس تھی۔ انشاء جی نے ان کا دلسوز مرثیہ لکھا اور متذکرہ کتاب میں مختلف اہل قلم سے ان پر مضامین لکھوائے جن یں فیض، طفیل جمالی، میجر ابن الحسن، فخر ماتری، مختار زمن، حمید اختر، میجر اسحاق جیسے نابغہ روزگار شامل ہیں۔ محمد اختر کی رحلت کے مہینوں بعد تک انشاء جی کو ان کے گھر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

اے دور نگر کے بنجارے، کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے
یہ بارش، کیچڑ، سرد ہوا اور راہ کھٹن انجانی ہے
آ محفل چپ چاپ بیٹھی ہے، آ محفل کا دل شاد کریں
وہ لوگ کہ تیرے عاشق ہیں، کے روز سے تجھ کو یاد کریں
اے دور نگر کے بنجارے، گر چھوڑ کے ایسے جانا تھا
کیوں چاہ کی راہ دکھائی تھی، کیوں پیار کا ہاتھ بڑھانا تھا

اور محمد اختر کی اماں
پی ایچ ڈی کا مقالہ اس بارے میں خاموش ہے لیکن کیا کہوں کہ زیر موضوع کتاب میں مشاہیر ادب کے علاوہ انشاء جی خدا جانے کیسے اس دکھی ماں سے بھی ایک مضمون لکھوانے میں کامیاب ہوگئے۔ عنوان دیکھ کر کلیجہ شق ہوا، "میرا لاڈلا" ۔۔۔۔۔ ماں نے جو لکھا سو لکھا، لیکن ابتدا ہی میں آخری چند سطریں پڑھ کر مضمون پڑھنے کا حوصلہ جاتا رہا:

" مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا بچہ مجھے آواز دے گا 'اماں'۔ ہر وقت مجھے اس کے قدموں کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔ ہر وقت یہ یقین رہتا ہے کہ میرا بچہ جلد سے جلد آجائے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بے موت رخصت ہوگیا۔ میرا بچہ اس وقت عالم بالا میں پہنچ چکا لیکن میں ہر سکینڈ اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہوں۔ ہر وقت وہی میرے ذہن میں بسا رہتا ہے۔ اب میرے لیے دنیا ایک دوزخ سے کم نہیں ہے۔ میرے دل کی تڑپ کا اندازہ شاید کوئی نہیں کرسکتا۔ اتنے بڑے جوان کو دے کر میرے لیے یہ زندگی اجیرن ہے۔ ہر وقت خدا سے یہ دعا ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس جلد سے جلد بلالے۔ ""

اللہ بس باقی ہوس!

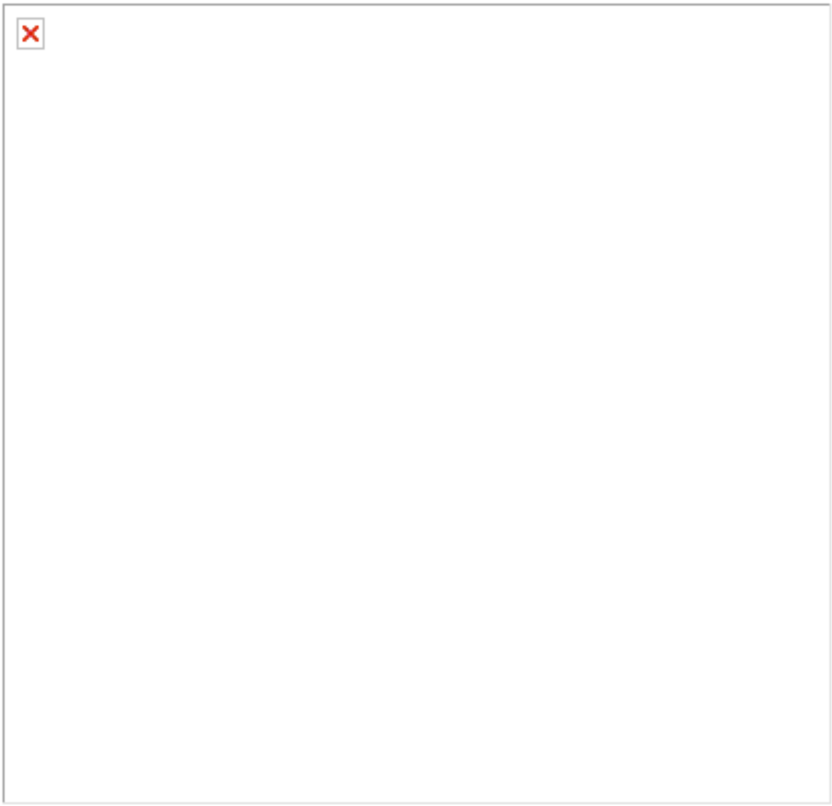

بقیہ کتابوں کا تعارف یہ ہے:

2-ادیبوں کے لطیفے
مرتبہ: کے ایل نارنگ ساقی
الحمد پبلیکیشنز، لاہور
سن اشاعت: 1993

3-اپنی کہانی
خودنوشت

راجندر پرساد

مترجم: گوپی ناتھ امن

صفحات: گیارہ سو

ساہیتہ اکیڈمی نئی دلی کی جانب سے شمع بک ڈپو نئی دہلی نے مئی 1961 میں شائع کی

اردو میں خودنوشت سوانح حیات-4

ڈاکٹر صبیحہ انور (اس مقالے پر صبیحہ انور کو لکھنو یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی)

فخر الدین میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

سن اشاعت: اگست 1982

صفحات: 400

ناشر: نامی پریس، لکھنو

یادش بخیر-5

آمنہ ابوالحسن

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

سن اشاعت: 1995

کہاں سے لاؤں انہیں

خاکہ نگاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ تحریر ہے جس میں خاکہ نگار کسی انسان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ شخصیت قاری کو ایک زندہ شکل میں نظر آئے اور خاکہ نگار نے اس انسان کی زندگی کا جس قدر مشاہدہ کیا ہو ، غیر جانبداری سے اس سے متعلقہ حالات و واقعات کو قاری کے مطالعہ میں لے آئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

" اردو ادب میں خاکہ مختصر افسانے کی طرح ایک نئی صنف ہے۔ اس سے پہلے ہمیں طویل سوانح عمریاں تو ملتی ہیں لیکن ان کی حیثیت عام طور پر ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔ غالب کے فورا بعد کے دور میں سوانح نگاری نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی اور حالی کی یادگار غالب، حیات سعدی، حیات جاوید، شبلی کی حیات ابو حنیفہ ، المامون اور الفاروق وغیرہ سامنے آئیں۔ یہ چیزیں مستقل تصانیف ہیں اور ان میں کسی ایک شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہر زاویہ نگاہ سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ ان میں تاریخی اہمیت زیادہ اور کردار نگاری کا عنصر کم ہے۔"

مختلف شخصیات پر مبنی خاکوں کی کتابیں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں

لیکن کیا ہر کتاب ڈاکٹر جالبی کے بیان کردہ معیار پر پورا اترتی ہے ؟
اس ضمن میں ممتاز رفیق تصویر خانہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

سعادت حسن منٹو نے اپنے خاکوں میں فرشتوں کا مونڈن کیا اور آج ہم خاکہ نگاروں " کے ہاتھوں خاکہ نگاری کا مونڈن ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ان دنوں شائع ہونے والے خاکوں کے مجموعوں میں ہمیں فرشتوں کا اجتماع نظر آتا ہے جس میں ہر فرد دھلا منجھا اور تقریباً ہر انسانی کم زوری سے مبرا دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاکہ نگاری بے حد مشکل صنف ہے جس کا تمام حسن سچائی، دیانت داری اور اس کے غیر جانبدارانہ اظہار میں ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کی مثال ایک ایسے فرد کی سی ہے جو اپنے ہاتھوں میں آئینہ لیے پھرتا ہے اور جو فرد اس آئینے میں تصویر ہوتا ہے اسے پوری ایمانداری سے بے کم و کاست کاغذ پر نقش کر دیتا ہے۔ "

سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اشرف صبوحی، مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر آفتاب احمد، قرۃ العین حیدر، نصر اللہ خان، مالک رام اور ڈاکٹر اسلم فرخی بلا شبہ خاکہ نگاروں کی فہرست کے قدآور نام ہیں۔

محمد طفیل، حمید اختر، انور ظہیر خان اور صبیح محسن خاکہ نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔
فلمی خاکوں میں رضا ہاشمی (لاہور)، انیس امروہوی (دہلی) نے دلچسپ خاکے تحریر کیے ہیں۔ دسمبر 2011 میں مدیر و ناشر جناب اجمل کمال نے اپنے سہ ماہی جریدے آج کے شمارہ نمبر 71 میں ہندوستان کے جاوید صدیقی کے تحریر کردہ گیارہ اہم فلمی شخصیات کے رنگا رنگ خاکے شائع کیے ہیں۔
ڈاکٹر بشیر سیفی نے چند اہم خاکہ نگاروں کے تحریر کردہ خاکوں کو مختلف خانوں میں بانٹا ہے۔ ان کے مطابق تعارفی خاکوں میں چراغ حسن حسرت اور رئیس احمد جعفری، مدحیہ خاکوں میں رشید احمد صدیقی، نفسیاتی خاکوں میں ممتاز مفتی اور یک رخی خاکوں میں دوزخی از عصمت چغتائی اور جوش ملیح آبادی از شاہد احمد دہلوی کے نام بہ آسانی لیے جا سکتے ہیں۔
چند روز قبل (دسمبر 2011) خاکوں کی ایک ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف کہنے کو تو ایک نامور محقق، مدرس و فارسی داں ہیں لیکن یہ کتاب لکھ کر انہوں نے وصف خاکہ نگاری کے تمام اہم تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ یہ ذکر ہے حافظ محمود شیرانی کے پوتے اور اختر شیرانی کے صاحبزادے پروفیسر مظہر محمود شیرانی اور ان کی کتاب 'کہاں سے لاؤں انہیں' کا۔

پروفیسر مظہر شیرانی 9 اکتوبر 1935 کو راجپوتانہ کی ریاست جودھ پور میں کے گاؤں شیرانی آباد میں پیدا ہوئے۔ دربار ہائی اسکول ٹونک اور میونسپل ہائی اسکول لاڑکانہ سندھ) سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں نقل مکانی کر کے پنجاب چلے آئے۔) شیخوپورہ سے میٹرک اور لاہور سے ایف اے، بی اے اور اس کے بعد تاریخ میں ایم اے کیا۔ فارسی زبان سے قلبی لگاؤ کی بنا پر اس میں ایم اے کیا اور پھر اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی شعبے کی نذر کر دیں۔ مظہر شیرانی نے 1963 میں شیخوپورہ میں رہائش اختیار کی اور تاحال وہ اسی شہر میں مقیم ہیں۔ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ سن اسی کی دہائی میں اپنے دادا حافظ محمود شیرانی پر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ 1995 میں گورنمنٹ کالج شیخوپورہ سے ریٹائر ہوئے لیکن 2003 میں 51 جلدوں پر مشتمل فارسی لغت کو مرتب کرنے کا وہ جناتی کام شروع کیا جو انہیں ایک مرتبہ پھر گورنمنٹ کالج لاہور لے آیا۔ مظہر محمود شیرانی کے علمی و تحقیقی مضامین پاکستان کے نامور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ 2006 میں 'بے نشانوں کا نشاں' کے عنوان سے خاکوں کی پہلی کتاب شائع ہوئی جس میں عام لوگوں کے خاکے ہیں، بالکل ویسے جیسا کہ بابائے اردو نے نام دیو مالی کا خاکہ لکھ کر اسے امر کر دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا کندن اور اشرف صبوحی دہلوی کا مٹھو بھٹیارا ایسی ہی چند مزید مثالیں ہیں۔

کہاں سے لاؤں انہیں میں کل بارہ خاکے ہیں۔ 'شعلہ مستعجل' کے عنوان سے کتاب کا پہلا خاکہ مصنف نے اپنے والد اختر شیرانی مرحوم پر لکھا ہے۔ دیگر خاکوں میں احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، مولانا سید محمد یعقوب حسنی، پروفیسر حمید احمد خان، سید وزیر الحسن عابدی، حکیم نیر واسطی، اکرام احسن خان، ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، رشید حسن خان اور پروفیسر وحید قریشی کے خاکے شامل ہیں۔ ان تمام خاکوں کے عنوانات ایسے دلچسپ ہیں کہ قاری انہیں پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نباض الملک، صاحب اکرام، بن ٹھن کے کہاں چلے؟، نظیر خویش نہ بگذاشتند و بگذ شتند، کون گلی گیو خان، سانجھ بھئی چودیس وغیرہ۔

کتاب کا ابتدائی خاکہ نہ صرف اہم ہے بلکہ شاعر رومان کی زندگی کی تہہ در تہہ پرتوں کو عیاں کرتا ہے۔ اس سے قبل اختر شیرانی ہمیں منٹو کے خاکے میں ایک رند بلا نوش نظر آئے تھے۔ لیکن 'شعلہ مستعجل' میں مظہر شیرانی نے جہاں اپنے والد کی شفیق شخصیت کو دیانتداری سے نمایاں کیا ہے وہاں ان کی بادہ نوشی اور اس کے اثرات کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ مذکورہ خاکے کا طرز بیاں ملاحظہ ہو:

"درمیانہ قد، وجیہ چہرہ، کسرتی جسم پر کھلے پائنچوں کا پاجامہ، قمیض اور

شیروانی، پاؤں میں گرگابی یا پمپ شو، یہ تھے ہمارے والد اختر شیرانی جنہیں ہم پنجابی محاورے کے مطابق بھاء جی کہا کرتے تھے۔ وہ ہم بہن بھائیوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی مجھے مارا یا جھڑکا ہو۔ کھانے پینے کا انہیں شوق نہیں تھا، ان کی ضروریات شراب کے علاوہ سگریٹ اور پان تک محدود تھیں۔

۔۔۔ان ایام میں خندہ روئی اور خوش مزاجی ان پر غالب رہتی تھی۔ ہم بچوں سے ہنسی مذاق کرتے اور پھلجھڑیاں سی چھوڑتے رہتے۔ایک روز سہ پہر کی چائے میں ذرا تاخیر ہوئی۔ انہوں نے یاد دلایا۔ ہماری والدہ نے کہا پانی رکھا ہوا ہے، جوش نہیں آیا۔ بولے جوش کی کیا ضرورت ہے، جب اختر موجود ہے۔ماں نے ایک بار بیٹے (اختر شیرانی) کے لیے کرتا سلوایااور پہناتے وقت بڑے چاؤ سے اپنی طلائی گھنڈیاں جن میں تہری زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، لگا دیں۔ وہ باہر نکلے۔ کسی ضرورت مند نے سوال "کیا، انہوں نے زنجیریں نوچ کر اس کو بخش دیں۔

اختر شیرانی کی بادہ نوشی ان کے گھرانے کے لیے اور بالخصوص ان کے والد حافظ محمود شیرانی کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ اس علت کو چھڑانے کی غرض سے ان کے اہل خانہ طرح طرح کے ٹوٹکے آزماتے رہتے تھے۔ایک مرتبہ کسی نے بھنگ کی تجویز پیش کی، اگلے روز دستر خوان پر بھنگ ملی برفی موجود تھی جسے اختر

شیرانی نے آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ مظہر شیرانی لکھتے ہیں : " ایک روز کسی بقراط نے شیر کا جھوٹا گوشت پکا کر کھلانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس عمل سے شراب ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتی ہے۔ جے پور کے چڑیا گھر سے رابطہ کرکے شیر کا پس خوردہ منگوایا گیا اور بڑے اہتمام سے اختر صاحب کے آگے رکھا گیا۔ انہوں نے کھایا بھی لیکن نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فش۔ اور شراب چھوڑی تو کس وقت! جب مرض الموت میں مبتلا ہو کر میو اسپتال میں داخل ہوئے۔ حالت سقیم ہوئی تو ڈاکٹروں نے صلاح کرکے کوشش کی کہ انہیں دو گھونٹ بطور دوا پلائے جائیں، لیکن جب آب طربناک کا جام منہ کے نزدیک لے جایا گیا تو اس کی بو سونگھتے ہی ہونٹ بھینچ لیے اور منہ کی طرف اشارہ کرکے انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دی۔ مطلب تھا کہ مے آلودہ دہن لے کر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونا مناسب نہیں "

مظہر شیرانی نے متذکرہ خاکے میں بحوالہ قمر تسکین ایک حیرت انگیز بات لکھی ہے۔ 1942 کی بات ہے، اختر شیرانی عرب ہوٹل میں احباب کے ساتھ محفل جمائے ہوئے تھے کہ ایک سانولے رنگ کا نوجوان اندر داخل ہوا اور اختر مرحوم کو سلام کر کے اور ایک کاغذ ان کی جانب بڑھا کر ادب سے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اختر صاحب نے جیب سے قلم نکالا اور اصلاح شروع کردی۔ اختر کو نوجوان کی غزل میں ایک شعر سخت ناپسند تھا جسے حذف کرکے انہوں نے اس کی جگہ ایک اور

شعر لکھا اور پھر اس شعر کو احباب کے سامنے پڑھا:

اے دوست ہم نے ترک تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

قمر تسکین لکھتے ہیں کہ اختر کے اس نوجوان شاگرد کا نام ناصر کاظمی تھا اور متذکرہ شعر ناصر کاظمی کی غزل میں استاد کا عطیہ تھا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ شعر اس غزل کی جان قرار پایا۔

حکیم نیر واسطی کا خاکہ نباض الملک بھی ماضی کی یادوں اور متفرق واقعات کا مرقع ہے۔ اختر شیرانی کے حکیم نیر واسطی کے ساتھ مراسم انتہائی بے تکلفانہ نوعیت کے تھے۔ مظہر شیرانی لکھتے ہیں کہ " والد کا مزاج گھڑی ماشہ گھڑی تولہ۔جب لاڈ میں ہوتے تو حکیم صاحب کو قبلہ کہہ کر مخاطب کرتے اور جب ترنگ میں بگڑ بیٹھتے تو مجمع میں بے نقط سنا دیتے۔ مگر واہ رے حکیم صاحب مجال ہو کہ کبھی چتون پر بل آیا ہو۔ ہنس ہنس کر "فرماتے مولانا! یہ سب گالیاں پرانی ہو گئی ہیں، کوئی نئی گالی دیجیے۔

حکیم نیر واسطی کی طبیعت میں بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ایک روز مظہر شیرانی اپنے ایک دوست کے بھائی کو لے کر حکیم صاحب کے پاس پہنچے۔ نوجوان

لڑکا تھا، تبخیر معدہ کا مریض، بیماری بڑھتی چلی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کہ جنون کی کیفیت میں دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کرتے پکڑا گیا۔ حکیم صاحب نے نوجوان کی نبض پکڑی اور بولے میں جو پوچھتا جاؤں اس کا جواب دیتے جانا۔ پیٹ سے گیس اٹھتی ہے ؟ یہ گیس دل کو چڑھتی ہے؟ کھانا ہضم نہیں ہوتا؟ گھبراہٹ، پریشانی، خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے ؟

مریض ہر سوال کے جواب میں جی ہاں، جی ہاں کرتا جاتا تھا۔ آخری سوال کے جواب میں اس نے بڑے خشوع و خضوع سے اثبات میں جواب دیا۔

حکیم صاحب نے نبض چھوڑی اور اور ایک قہقہ لگا کر کہا تو پھر کب ارادہ ہے ؟

نظیر خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند، ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب (حیدرآباد، سندھ) کا خاکہ ہے۔ مظہر شیرانی نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کی کتاب فضل کبیر میں درج کئی مکاشفات بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں کہ: ۔۔’’ایک مرتبہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی مجھ سیاہ کار پر شفقت ہوئی۔ فرمایا کہ مجھے مسلمان قوم سے شرم آتی ہے کہ " میری قوم نے ان کو بہت دھوکے دیے ہیں۔

۔۔" ایک مرتبہ حضرت شہباز قلندر کی خدمت میں پروفیسر علی نواز جتوئی کے ساتھ ریل میں سہیون پہنچا، وہاں سے تانگے میں بیٹھ کر ہم لوگ مزار شریف کی طرف جانے لگے تو حضرت شہباز قلندر خود ہی تشریف لے آئے۔ فرمایا: تم کہاں جارہے ہو ؟ میں تو بدعات کی وجہ سے وہاں نہیں رہتا۔

۔۔" بالاکوٹ میں موٹر اسٹینڈ کے قریب ہی حضرت سید احمد شہید کا مزار ہے۔ وہاں عجیب کیفیت ہوئی۔ مزار کے قریب پھسل کر گر پڑا اور بے تاب ہوگیا۔ پھر سکون ہوا تو حضرت سید احمد شہید نے فرمایا میں اسی جگہ شہید ہوا تھا اور میرا گھوڑا بھی یہیں کھڑا ہوا تھا، شاہ اسمٰعیل لڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور آگے جاکر شہید ہوئے، تمہارے "ڈاکٹر غلام مصطفیٰ) بعض اعزاہ بھی میرے ساتھ تھے۔)

۔۔اپریل 1968 میں معروف دانشور علامہ آئی آئی قاضی نے دریائے سندھ میں کود کر خودکشی کرلی تھی، اس موقع پر ایک بزرگ نے کہا کہ ان کی نماز جنازہ پڑھانا جائز نہیں ہے لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے علامہ صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ بیان کرتے ہیں کہ یہ واقعہ تیرہ اپریل کا ہے، نماز جنازہ اور تدفین سے فارغ ہو کر میں گھر آیا اور سوگیا۔ رات کو تین

بجے علامہ صاحب تشریف لائے۔ مجھے جگایا اور فرمایا تم نے ابھی تک تہجد کی نماز نہیں پڑھی۔ میں نے وضو کیا اور نماز شروع کی، علامہ صاحب میرے مصلے کے قریب بیٹھے رہے، پھر فرمایا مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔

مظہر شیرانی لکھتے ہیں کہ :

"ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان قبلہ کی نظر صحیح معنوں میں کیمیا اثر تھی۔ ان کے تصرف کا ایک واقعہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے حوالے سے یہاں درج کرتا ہوں۔ 1988 میں جب ڈاکٹر صاحب کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے نشان سپاس پیش کیا جانا تھا، ان دنوں انجمن کے صدر نور الحسن جعفری تھے۔ وہ حکومت پاکستان کے معتمد مالیات کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے اور 'صاحب' آدمی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں جلسے کی اجازت تو دے دی لیکن خود اس میں شرکت سے معذرت کرلی۔ بہر حال انجمن کے دوسرے کارپرداران کے اصرار پر نور الحسن جعفری جلسے کی صدارت پر آمادہ ہوگئے۔ مختلف تقاریر کے بعد آخر میں جعفری صاحب صدارتی کلمات کہنے کے لیے مائیک پر آئے تو بجائے کچھ کہنے کے زار و قطار رونے لگے ۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولے حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب، مجھے معاف کردیجیے۔ میں آپ کے مقامات ظاہری اور مراتب باطنی سے بالکل بے خبر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اٹھ کر انہیں سینے سے لگایا اور تسلی دی تب کہیں جا کر ان کو قرار آیا۔"

کہاں سے لاؤں انہیں' ایک ایسی کتاب کہلانے جانے کی حقدار ہے جس کے مصنف '
نے خاکہ نگاری کے بھاری پتھر کو محض چوم کر نہیں رکھ دیا ہے بلکہ تمام شخصیات کی
یادوں کو دلنشیں و مربوط انداز سے سمیٹا ہے اور ان سے متعلق ہر اس بات کا ذکر کیا
ہے جس سے ان شخصیات کے مصنف سے تعلقات نکھر کر سامنے آتے ہیں۔
خوبصورت سرورق سے مزین اس کتاب کو القا پبلشر، لاہور نے شائع کیا ہے۔ صفحات
اور قیمت 590 ہے 285

:ناشر کا پتہ وفون نمبر یہ ہے
مین بلیوارڈ، گلبرگ 2، لاہور 54660، K 12
فون نمبر: + 92-42-35757877
ای میل پتہ: info.iqbalpublications@reading.com.pk

شام و سحر کے درمیاں۔ایک سول سرونٹ کی سرگزشت

شام و سحر کے درمیاں, پاکستان کی سول سروس سے وابستہ رہے رئیس عباس زیدی کی خودنوشت ہے جو حال ہی میں لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ ان کا آبائی تعلق جھنگ سے ہے۔ رئیس زیدی کو یونائیٹڈ بینک کے لیے آغا حسن عابدی کے رفقاء کار نے منتخب کیا، وہ جلد ہی وہاں سے استعفی دے کر جھنگ کالج میں پڑھانے لگے، بعد ازاں سول سروس کا امتحان پاس کرکے ڈی ایم جی گروپ میں شمولیت اختیار کی، اسسٹنٹ کمشنر اور پھر ڈپٹی کمشنر رہے۔

اس سے قبل سول سروس کے جن نمائندوں نے اپنی خودنوشت تحریر کی ہیں ان میں سرفہرست قدرت اللہ شہاب ہیں ان کے علاوہ لیاقت علی عاصم (ڈپٹی کمشنر کی ڈائری) اور مہر جیون خان (جیون دھارا۔ دو ضخیم حصوں میں) اپنی داستان حیات قلم بند کرچکے ہیں۔ سول سروس سے تعلق رکھنے والے ایک اور صاحب ہیں، خاصے مشہور اور ایک منجھے ہوئے لکھاری, یہ شوکت علی شاہ ہیں جن کے سفرنامے اپنی مثال آپ ہیں۔

سول سروس سے وابستہ رہے لوگ اپنی خودنوشت خال خال ہی تحریر کرتے ہیں، اس کی وجہ سیدھی سی ہے، کتاب وہ شخص لکھے گا جس کا دامن صاف ہو ، جو ایماندار رہا، غیر جانبدار رہا، انصاف پسند رہا بصورت دیگر تو معاملات عیاں کرنے سے مشکلات میں اضافہ متوقع ہے۔

رئیس زیدی پنجاب یونورسٹی میں پڑھتے تھے، گرمیوں کی ایک دوپہر ایک ریچھ والے کا گزر ہوا۔ رئیس کے ساتھی چوہدری صاحب نے ریچھ والے کو آواز دی:

اوئے! ہن تک کنے پیسے کمائے نے ؟

ریچھ والے نے کچھ پیسے بتائے۔ چودھری صاحب نے وہ قوی الجثہ ریچھ بمعہ چھڑی اس سے لے لیا۔ اب کیفیت یہ تھی یہ دونوں حضرات ریچھ کو لے کر ہاسٹل کے ہر

کمرے میں جاتے اور ریچھ کو کرسی کرسی پر بٹھا کر کمرے کے رہائشی طالب علم سے کہتے کہ تمہارا مہمان آیا ہے اس کی خدمت کرو۔ پیسٹریاں، شیزان کی بوتل یا پھر پانچ روپے نقد۔ کمرے سو سے اوپر تھے، کچھ خالی بھی تھے، ہوتے ہوتے اڑتالیس روپے اور کچھ پیسے اکھٹے ہوئے۔ یہ پیسے اور ریچھ، ریچھ والے کے حوالے کیے۔ وہ انہیں دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ سستا زمانہ تھا، یہ رقم اس وقت اچھی خاصی ہوتی تھی۔

سول سروس کے امتحان کا نتیجہ آچکا تھا، رئیس زیدی منتخب ہوگئے اور سندھ میں تعینات کیے گئے۔

ضلع نواب شاہ۔۔۔ وڈیروں کی ریاست۔۔

وڈیرا کیا ہوتا ہے، یہ رئیس زیدی کو ایک روز معلوم ہوا۔ سکرنڈ کی نہر کے کنارے کنارے گشت کرتے ایک ہاری پر نظر پڑی جس کے چہرے پر دو خون آلود سوراخ تھے۔ رئیس کے ساتھ بیٹھے اے ایس پی نے پوچھا کہ کیا ہوا، وہ بتانے پر راضی نہ تھا، مشکل سے بتایا کہ کسی معمولی سے بات پر ناراض ہو کر وڈیرے نے اس کی مونچھیں اکھڑوا دیں۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کے دن تھے، سندھ میں شورش عروج پر تھی، رئیس زیدی نے دوران ملازمت کبھی جابرانہ حکم نہیں مانا۔ جلوس بپھرا ہوا تھا، اوپر سے حکم آیا کہ گولی چلاؤ، رئیس زیدی نے حکم عدولی کی اور تبادلے کے احکامات صبح سویرے ہی آ گئے۔ حکام بالا کے دلوں سے اتر گئے لیکن اہل علاقہ کے دلوں میں گھر کیا۔ رخصت ہو رہے تھے تو دو ڈھائی سو کا مجمع تھا، لوگ ہاتھ چوم رہے تھے کہ انہیں حقیقیت کا علم ہو چکا تھا۔

"سائیں ہمیں پتہ ہے کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے"

:اسی دوران ایک بکریاں چرانے والا ایک بوڑھا شخص وہاں آ نکلا، کہنے لگا

"سائیں ! اگر ہمارا ایک بھی جرنیل سندھی ہوتا تو ہمارے بھٹو سائیں کو پھانسی نہ لگتی "

ایم آر ڈی کے دوران سندھ میں صرف دو پنجابی افسر زیر عتاب آئے اور دونوں نے سندھیوں پر گولی چلانے سے انکار کیا تھا۔ ایک تو رئیس زیدی تھے اور دوسرے

قاضی ایوب جن پر الزام تھا کہ جب تعلقہ قنبر علی خان کی ٹیلی فون ایکسچینج جل رہی تھی تو انھوں نے ہجوم پر فائرنگ کا حکم کیوں نہیں دیا۔ اس استفسار کے جواب میں قاضی بھول پن سے جواب دیتے تھے:

"ٹیلی فون ایکسچینج تو پھر لگ جائے گی۔"

نواب شاہ کے بعد رئیس زیدی اسسٹنٹ کمشنر ٹھری میر واہ تعینات ہوئے، آفس سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس خیر پور نے استقبال کیا۔ نام سن کر ڈی سی رو پڑا۔ رئیس زیدی سے کہنے لگا کہ آپ سے پہلے بھی ایک زیدی صاحب یہاں آئے تھے

تو بھائی اس میں رونے کی کیا بات ہے"؟ رئیس نے پوچھا"

اس نے بتایا کہ ایم اے انگریزی کر کے اسے کہیں نوکری نہ ملی تو ڈی سی آفس میں کلرک ہوگیا تھا۔ اچھی زبان لکھنے کی وجہ سے مصطفیٰ زیدی (شاعر) اسے ہی ڈکٹیشن دیا کرتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ کچھ غلطیاں ہوگئیں، مصطفیٰ زیدی نے پہلے تو ڈانٹا پھر حسب عادت بلا کر پوچھا:

"آج غلطیاں کیوں کیں؟ خیریت تو ہے؟"

اس نے کہا: " سر! بہن کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے مگر جہیز کے لیے پیسے نہیں ہیں "

مصطفی زیدی مرحوم نے فورا مختیار کار کو بلایا اور کہا:

"اسے پچاس ہزار روپے دے دو"

یہ بات 1962 کی ہے۔

ہائے کیوں خاک کی مانند بجھے بیٹھے ہو

شعلہ رو شعلہ فشاں بداماں زیدی

سندھ کے عوام سید پرست، رئیس زیدی کا واسطہ پڑا ڈاکوؤں سے۔ ہوا یوں کہ ایک ہندو بنیا اغوا ہوگیا۔ وفاقی وزارت داخلہ سے فون آنے لگے کہ اس مسئلے کو جلد سلجھایا جائے۔ یہ کارنامہ ڈاکو جمعہ خشک کے گروہ کا تھا۔ ایک واسطہ دار وڈیرے کے توسط سے سردار سے ملاقات طے ہوئی۔ چاروں طرف ڈاکو تھے، اتنے میں جمعہ خشک آیا، کافی منت سماجت کے بعد تاوان کی رقم میں کمی پر آمادہ ہوگیا۔

تمام معاملات طے ہو گئے لیکن جمعہ خشک تھا کہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ رئیس زیدی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے:

"سائیں آپ اولاد علی ہیں، میرے لیے دعا کریں "

اور رئیس زیدی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا.

اندرون سندھ سے رئیس زیدی کا پہلے کراچی اور پھر پنجاب تبادلہ ہوا۔ منزل تھی گوجرنوالہ۔ ایک صاحب تھے بائی وکیل خاں نامی، رئیس کی ان سے دوستی ہو گئی۔ ایک روز لاہور سے واپسی پر بائی وکیل خاں کی بیٹھک میں رک گئے، وہاں ان کی راجپوت برادری اکٹھی تھی۔ رئیس مجمع سے کہنے لگے کہ آپ راجپوتوں نے ہم سادات کو پناہ دی، زمینیں دیں، آپ لوگ بہادر ہیں، وچن دینے کے بعد مرمٹنے کو تیار۔ اس کے بعد رئیس زیدی نے راجپوتوں کے تاریخ بیان کرنا شروع کر دی۔

اس بیٹھک میں کسی گاؤں سے آئے ہوئے ایک بزرگ رانگڑ بیٹھے تھے۔ مہندی لگے ہوئے لمبے لمبے بال، ہاتھ میں بانس کی ڈنگوری، اپنی پاٹ دار آواز میں گویا ہوئے:

یاہ چھوکرا ٹھیک کہہ رہا۔ ہم ایسے تھوڑی تھے۔ یاہ بے غیرت تو ہم مسلمان ہو کر "
"ہو گئے۔

رئیس زیدی سیکریٹری اوقاف مذہبی و اقلیتی امور بنائے گئے۔ چودھری پرویز الٰہی کے عملے کی طرف سے حکم ملا کہ پچھلے وزیر کے حکم پر جتنے لوگوں کو ملازمت دی گئی تھی، ان تمام کو فارغ کردیا جائے۔ رئیس زیدی پرویز الٰہی کے پاس گئے اور کہا:

سر! جب کسی غریب کو ملازمت مل جاتی ہے تو وہ شہر میں مکان کرائے پر لے لیتا "
ہے، شادی کرلیتا ہے، باپ کی آنکھوں کا آپریشن کروالیتا ہے، اپنے خرچے بڑھا لیتا ہے،
""ان لوگوں کو بے روزگار نہ کریں، ان کی دعائیں لیں۔

پرویز الٰہی نے رئیس زیدی کو گلے سے لگا لیا:

"او شاہ جی، جذباتی کیوں ہوندے او، نہ کڈھو انہاں نو "

ان گیارہ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ ان کی نوکریاں کس طرح اور کیسے بچ

گئیں۔

رئیس زیدی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی، جدوجہد، افسری لیکن ٹمارگمٹ فقط دو باتیں ہونی چاہیں۔ عزت اور محبت۔

سول سروس سے وابستہ رہے افراد کی بیان کردہ داستانوں کے درمیان، زیر تبصرہ خودنوشت "شام و سحر کے درمیاں" ایک مہکتے پھول کی حیثیت سے یاد رکھی جائے گی۔

ابن انشاء -شاعر ترا، انشاء ترا

11 جنوری 1978 انشاء جی کی تاریخ وفات ہے، گزشتہ کل گزرے اس دن کو پاکستان کے چند ٹی وی چینلز نے یاد رکھا اور خبر نشر کی لیکن کسی نے انشاء جی کی قبر کی تصویر نہ دکھائی، وجہ اس کی یہ ہے کہ انشاء جی کی قبر پر کتبہ نہیں ہے۔
کچھ عرصہ قبل شام مغرب کے وقت مشفق خواجہ صاحب کی لائبریری کا قصد تھا اور وہاں حاضری سے قبل خیال آیا کہ انشاء جی کو سلام کرلیا جائے۔ دو برس پیشتر آج ٹی وی کے ایک رپورٹر جن کو ہم جناب ابن صفی کی قبر پر لے گئے تھے، قریب سے گزرتے وقت ہاتھ کے اشارے سے کہا تھا
"یہ انشاء جی کی قبر ہے"

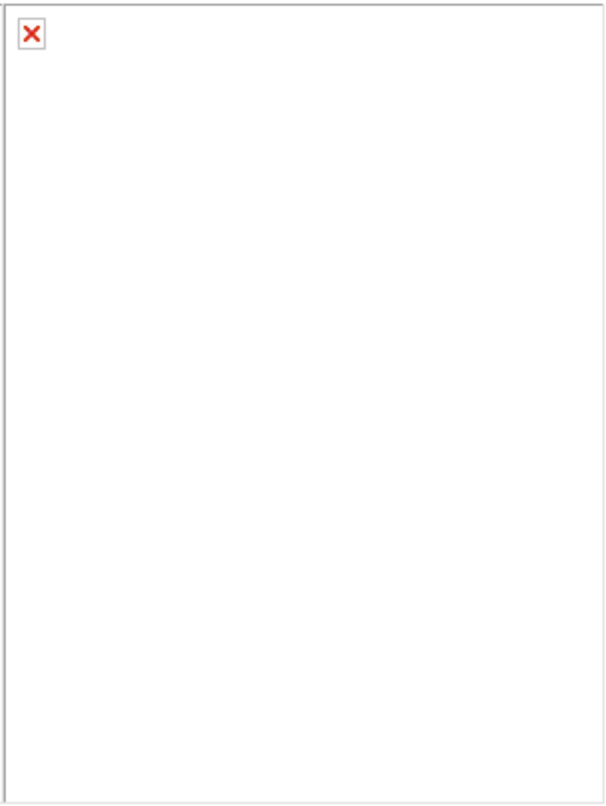

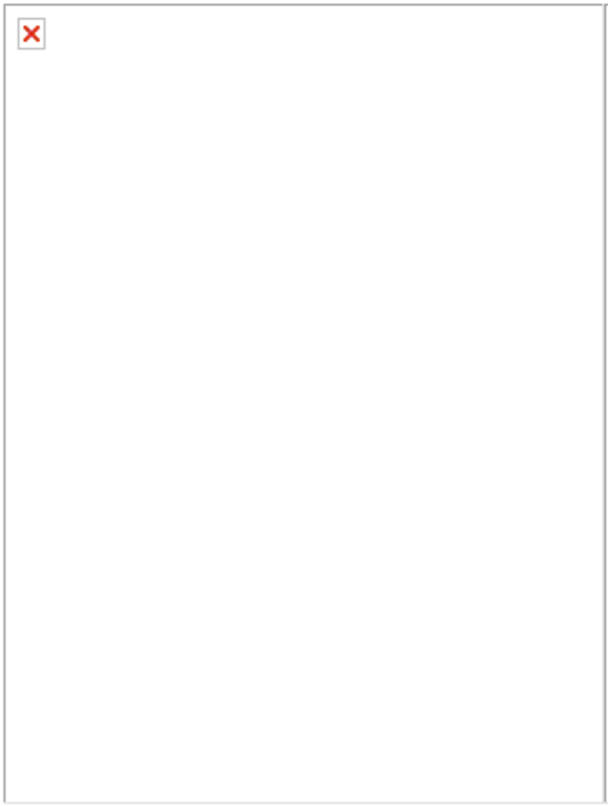

جس طرف وہ ہاتھ کا اشارہ کرتا تھا وہ قبرستان کا داخلی رستہ تھا، گاڑی چشم زدن میں اس کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ اس روز نہ صرف انشاء جی کی بے نام و نشان قبر ملی بلکہ وہاں اطمینان سے فاتحہ پڑھنے کا موقع بھی نصیب ہوا۔

سلمان علوی نے انشاء جی کے اس کلام (انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو) کے جواب میں قتیل کی غزل 'یہ کس نے کہا تم کوچ کرو' گا کر حق ادا کردیا ہے

یہ کس نے کہا تم کوچ کرو، باتیں نہ بناؤ انشا جی
یہ شہر تمہارا اپنا ہے، اسے چھوڑ نہ جاؤ انشا جی

جتنے بھی یہاں کے باسی ہیں، سب کے سب تم سے پیار کریں
کیا اِن سے بھی منہہ پھیروگے، یہ ظلم نہ ڈھاؤ انشا جی

کیا سوچ کے تم نے سینچی تھی، یہ کیسر کیاری چاہت کی
تم جن کو ہنسانے آئے تھے، اُن کو نہ رلاؤ انشا جی

تم لاکھ سیاحت کے ہو دھنی، اِک بات ہماری بھی مانو
کوئی جاکے جہاں سے آتا نہیں، اُس دیس نہ جاؤ انشا جی
بکھراتے ہو سونا حرفوں کا، تم چاندی جیسے کاغذ پر
پھر اِن میں اپنے زخموں کا، مت زہر ملاؤ انشا جی
اِک رات تو کیا وہ حشر تلک، رکھے گی کھُلا دروازے کو
کب لوٹ کے تم گھر آؤ گے، سجنی کو بتاؤ انشا جی
نہیں صرف "قتیلؔ" کی بات یہاں، کہیں "ساحرؔ" ہے کہیں "عالیؔ" ہے
تم اپنے پرانے یاروں سے، دامن نہ چھڑاؤ انشا جی

کراچی کے دوڑتے بھاگتے بے رحم ٹریفک سے بے نیاز، لب سڑک ہمارا پسندیدہ شاعر محو استراحت ہے۔ ایک پختہ احاطے میں خاندان کی پانچ قبریں--- کتبہ نہ ہونے کی وجہ سے عام لوگ بے خبر - ہاں مگر ایک پھول بیچنے والا باخبر نکلا

اللہ تعالٰی جنت میں درجات بلند فرمائے

تو باوفا، تو مہرباں، ہم اور تجھ سے بدگماں؟
ہم نے تو پوچھا تھا ذرا، یہ وصف کیوں ٹھہرا ترا
ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیر راہگزر
رستہ کبھی روکا ترا، دامن کبھی تھاما ترا
ہاں ہاں تیری صورت حسیں لیکن تو اتنا بھی نہیں
اک شخص کے اشعار سے شہرہ ہوا کیا کیا ترا

پی آئی اے کی جس فلائٹ سے انشاء جی کا تابوت آیا تھا اس کے پائلٹ نے استاد امانت علی کی آواز میں 'انشاء جی اٹھو' لگادی تھی مسافر سنتے رہے اور روتے

رہے تھے۔ استاد کی گائی اس غزل کو بغیر آنسو بہائے نہیں سنا جاسکتا۔

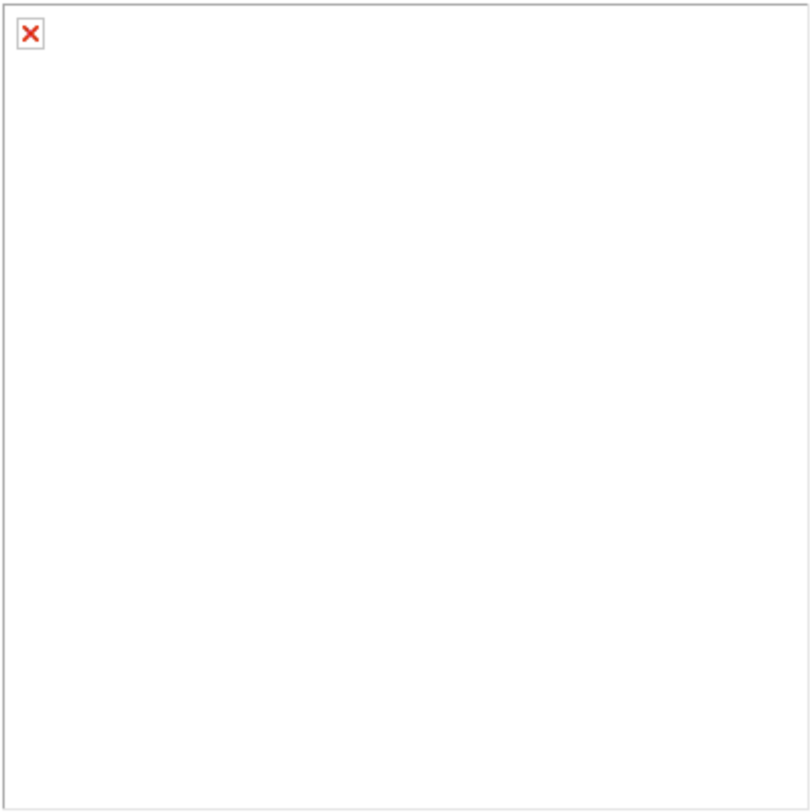

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں پساریں پاؤں
نیند سی نیند ہمیں اب نہ جگانا لوگو
ایک ہی شب ہے طویل، اتنی طویل، اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو

گلوکار فیصل لطیف نے انشاء جی کا کلام 'سب مایا ہے' خوب گایا ہے، احباب اسے یوٹیوب پر سن سکتے ہیں:

ہاجرہ مسرور - کریدتے 'کیوں' ہو اب راکھ؟

17 جنوری 2012 - ہاجرہ مسرور کی 82 ویں سالگرہ کا دن

اتوار کا دن اور 15 جنوری، 2012 کی تاریخ، جناب معراج جامی کی معیت میں دو گھنٹے اس گھر میں گزارنے کا موقع ملا جہاں اردو کی ایک رجحان ساز افسانہ نگار ہاجرہ مسرور مقیم ہیں، جامعہ دہلی سے پروفیسر عمیر منظر نے اطلاع فراہم کی کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کے فکر و فن پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ان کے فن پارے تو مل گئے البتہ ان کی شخصیت اور سوانح کا گوشہ نامکمل ہے۔ صبا خانم دہلی کی رہنے والی ہیں یہی کام کر رہی ہیں۔ امید ہے آپ کے تعاون سے یہ کام مکمل ہو جائے گا۔"
اکادمی ادبیات نے سو کے لگ بھگ ادباء و شعراء کے بارے میں کتابیں شائع کی ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر ان میں ہاجرہ مسرور شامل نہیں ہیں لہٰذا سوانحی حالات کو حصول کی خاطر رابطہ لازمی ٹھہرا تھا۔ پروفیسر عمیر کی اس امید کو یقین میں بدلنے کی غرض سے ہاجرہ مسرور کا پتہ بدقت ڈھونڈ، وہاں کا قصد کیا۔ میرے کرم فرما جناب عقیل عباس جعفری کی آنکھیں چہار اطراف نگراں رہتی ہیں،

آپ نے منجانب منزل راہنمائی 'آسان لفظوں' میں کردی اور وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ ہماری میزبان ہاجرہ مسرور کی صاحبزادی نوید احمد طاہر تھیں.

ہم دو گھنٹے میں ہاجرہ مسرور کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پائے!

ہاجرہ مسرور نہیں چاہتیں کہ لوگ انہیں موجودہ حال میں دیکھیں۔ بیاسی برس کی ہو گئی ہیں، بیماری انسان کے مزاج پر بھی تو خوفناک طریقے سے حملہ آور ہوتی ہے۔ ابھی چند روز قبل ہی ہاجرہ مسرور اسپتال سے واپس آئی ہیں۔

ہاجرہ مسرور-حالیہ تصویر

کچھ عرصہ قبل کشور ناہید نے اپنے کالم میں لکھا تھا:
" ادا جعفری، زندگی کی اس منزل پر ہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں کہ کب دن ہوتا ہے اور کب رات ہوتی ہے۔ یہ عجب طرح کی تنہائی اور بے خودی ہے جس نے بیگم نصرت بھٹو (اب مرحومہ) کو بھی جکڑ رکھا ہے کہ دنیا سے ماؤف بھی ہیں مگر موجود بھی ہیں۔ ہاجرہ مسرور تو ذہنی طور پر بھی، تنہائی لیٹے بیٹھی ہیں نہ کسی سے ملتی ہیں، نہ کسی کو اپنا دکھ سناتی ہیں بالکل مہاتما بدھ والی تنہائی کے ریگزار میں چل رہی ہیں"۔

ہاجرہ مسرور کی صاحبزادی نے ہمیں بتایا کہ قریب آٹھ برس قبل کشور ناہید ٹی وی کیمرہ لیے آئی تھیں، ہاجرہ مسرور انٹرویو دینے سے انکار کردیں گی، اس کی انہیں امید نہ تھی، مایوس لوٹ گئیں۔

"کیمرہ کو ایک طرف رکھتا ہوں، کیا ہم ہاجرہ مسرور کو دیکھ سکتے ہیں" ؟ میرا سوال تھا
"یہ بھی ممکن نہیں ہے" ان کی بیٹی کی جانب سے جواب ملا

ایک لمحے کو تو قیامت گزر گئی، بھلا دیکھنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے ؟ پر

تاب لائے ہی بنی۔ ہاجرہ مسرور کی صاحبزادی نوید احمد طاہر سے ملاقات کے اختتام پر اس انکار کی وجہ بھی سمجھ میں آچکی تھی۔

خیر صاحب, گفتگو شروع کی، تمہید باندھی، لفظوں کی بساط جمائی تو کچھ برف بھی پگھلی، خاتون کو یہ باور کرایا کہ اس ملاقات کا کوئی تجارتی پہلو نہیں ہے، ہم تو ہزاروں میل دور بیٹھے کسی انسان کی غرض پوری کرنے کی نیت سے آئے ہیں، چلیے اردو کے نام پر نہیں، انسانیت کے نام پر مدد کیجیے، ہماری نہ سہی، ہمارے ممدوح کی سہی۔ اس کوشش کا نتیجہ قدرے مایوس کن رہا لیکن خالی ہاتھ نہیں لوٹا، سوانحی معلومات اور چند یادگار تصاویر تو مل ہی گئیں۔

ایک تقریب میں شاہد احمد دہلوی اظہار خیال کررہے، ہاجرہ مسرور براجماں ہیں ----------ہاجرہ مسرور

ہاجرہ مسرور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنس کے ذریعے معاشرے میں پلنے والی برائیوں کو بیان کیا۔ ان کے ہاں دو حوالے ہیں ایک جنسی اور دوسرا پیٹ کی بھوک ، اُن کے ہاں کئی جگہ ایسے مواقع آتے ہیں جہاں ان کا تصادم شروع ہوجاتا ہے۔ اور ان کے ہاں ایک خاص قسم کا امتزاجی رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ "کتے " قابلِ ذکر ہے۔ ہاجرہ سے عورت کے حوالے سے اس معاشرے کو دیکھاہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ معاشرے میں سماجی ، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی وجہ سے عورت گھٹن کا شکار ہے۔ وہ جو چاہتی ہے وہ ویسا نہیں کر سکتی ایک معاشرتی جبر اُن پر مسلط ہے اُن کے ہاں بہت سے افسانے ایسے ہیں جو جنسی استحصال پر انحصار کرتے ہیں۔ افسانہ "خرمن " اُن کے شہرہ آفاق افسانوں میں سے ایک ہے۔

ہاجرہ مسرور کی تاریخ پیدائش بمطابق شناختی کارڈ، 17 جنوری 1930 ہے، دبستانوں کا دبستان جلد اول میں احمد حسین صدیقی نے 1929 لکھا ہے اور مختلف مضامین میں یہی سن پیدائش مستعمل ہوا۔ آبائی تعلق لکھنؤ سے ہے، ان کے والد ڈاکٹر تہور احمد خان برٹش آرمی میں ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر تہور نے زیادہ عمر نہیں پائی، عید کی ایک سرد صبح غسل کر اجلا لباس زیب تن کیے گھر سے نکلے

اور مسجد کا رخ کیا، ٹھنڈ ایسی لگی کہ نمونیا کا مرض جان لے کر ٹلا۔ ڈاکٹر تہور کے انتقال کے وقت ان کی چھ بیٹیاں اور ایک کم عمر بیٹا تھا۔ ہاجرہ مسرور کی والدہ باہمت خاتون تھیں، تمام بچوں کو رکھ رکھاؤ سے پالا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کو اوائل عمر ہی سے ادب سے لگاؤ تھا۔ افسانے شائع ہونا شروع ہوئے تو شہرت نے گھر کا رستہ دیکھا۔ ہاجرہ مسرور نوعمری میں ساحر لدھیانوی کی محبت میں گرفتار ہوئیں۔ اس ضمن میں رفعت سروش مرحوم لکھتے ہیں:

"1946 میں لکھنؤ سے خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور (دونوں بہنیں) بھی آئیں، کچھ دن بمبئی رہیں۔ ان دونوں کو احمد ندیم قاسمی سے بہنوں کی سی قربت تھی۔ ہاجرہ مسرور ساحر لدھیانوی کی ناپختہ محبت کا زخم کھا کر عازم لاہور ہوئیں اور کچھ دن بعد اس دور کے رسائل میں خط چھپتے تھے، ہجو بہن (یعنی ہاجرہ مسرور) اور ندو بھیا (یعنی احمد ندیم قاسمی)۔ احمد ندیم قاسمی نے ان دونوں بہنوں کو بہت سہارا دیا۔ خدیجہ مستور کی تو شادی کرادی اپنے ایک بھانجے ظہیر بابر سے اور ہاجرہ مسرور کی شادی اس کے بعد ہوئی مہوال کے احمد علی سے جو ''ڈان'' کے ایڈیٹر تھے۔"

ہاجرہ مسرور کے شوہر
احمد علی خان دونوں بیٹیوں
کے ہمراہ

پاکستان بن گیا اور اس خاندان نے لاہور کا رخ کیا۔ ہاجرہ مسرور سن ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں کراچی منتقل ہوئی تھیں۔ ان کے بہن بھائیوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

عائشہ جمال - بڑی بہن تھیں
خدیجہ مستور - مشہور افسانہ نگار، احمد ندیم قاسمی کے بھانجے ظہیر بابر سے بیاہی تھیں
ہاجرہ مسرور - مقیم کراچی
طاہرہ عابدی - بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے صحافی، شاعر حسن عابدی کی اہلیہ

شاہدہ خیری - حبیب وہاب الخیری کی اہلیہ

توصیف احمد خان - بھائی - صحافی، حریت کے کالم نگار

خالد احمد - سوتیلے بھائی - شاعر و کالم نگار - لاہور میں مقیم ہیں

خالد احمد اور ہاجرہ مسرور کے علاوہ چھوڑ کر تمام بہنوں اور بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔

دائیں جانب: ہاجرہ مسرور اپنے اہل خانہ کے ہمراہ

امریکہ میں مقیم صحافی و ادیب اکمل علیمی لکھتے ہیں:
"آزادی کے بعد ہندوستان سے جن اہل قلم نے ہجرت کی ان میں سے کچھ سیدھے ندیم صاحب کے پاس آئے اور ان کی امداد سے لاہور اور نوزائیدہ پاکستان کے دوسرے

حصوں میں آباد ہوئے۔ ان میں ایک خاندان عائشہ جمال، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور ان کی دو اور بہنوں اور دو بھائیوں پر مشتمل تھا جو نسبت روڈ پر ندیم صاحب کے گھر پر مہمان رہا۔ پھر رفتہ رفتہ ندیم صاحب نے جواں سال لڑکیوں کے رشتے تلاش کئے۔ عائشہ ابھرتے ہوئے صنعت کار رحمٰن سے، خدیجہ، ندیم صاحب کے بھانجے ظہیر بابر سے، ہاجرہ پاکستان ٹائمز کے مدیر معاون احمد علی خان سے، تیسری بہن ہفت روزہ لیل و نہار کے حسن عابدی اور چوتھی نوجوان وکیل وہاب الاخیری سے بیاہی گئیں اور اپنے "اپنے گھروں میں آباد و شاد ہوئیں۔

ہاجرہ مسرور کے شوہر احمد علی خان ابتدا میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ 1973 میں معاصر ڈان کے ایڈیٹر بنے اور اس عہدے پر پورے اٹھائیس برس یعنی 2000 تک فائز رہے۔ احمد علی خان کا انتقال 27 مارچ 2007 کو ہوا۔ ان کی ادھوری خودنوشت ان کی بیٹی نوید احمد طاہر شائع کروانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہاجرہ مسرور کی اولاد میں دو بیٹیاں ہیں، نوید احمد طاہر (راقم کی میزبان) اور نوشین احمد۔ نوشین احمد کینیڈا میں مقیم ہیں۔

:ہاجرہ مسرور کے افسانوں پر مشتمل کتابوں کے نام یہ ہیں

چاند کے دوسری طرف: آٹھ افسانے

تیسری منزل: پندرہ افسانے

اندھیرے اجالے: سات افسانے

چوری چھپے: سات افسانے

ہائے اللہ: گیارہ افسانے

چرکے: تیرہ افسانے

ان تمام افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور کے ادارے مقبول اکیڈمی سے 1991 میں "سب افسانے میرے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ افسانوں کے علاوہ ہاجرہ مسرور نے ڈرامے بھی تحریر کیے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے ہاجرہ مسرور کی بچوں کے لیے تحریر کردہ کہانیاں شائع کیں۔

ہاجرہ مسرور 1965 میں بننے والی پاکستانی فلم آخری اسٹیشن کی کہانی نویس بھی ہیں۔
آخری اسٹیشن سرور بارہ بنکوی نے بنائی تھی۔

ہاجرہ مسرور

ہاجرہ مسرور اپنے شوہر احمد علی خان کے انتقال (2007) کے بعد عملاً" گوشہ نشین ہوگئی ہیں۔ دو برس قبل تک وہ شہر کراچی میں ہونے والی ادبی تقریبات میں کبھی کبھار شرکت کرلیا کرتی تھیں لیکن اب یہ سلسلہ بھی موقوف ہوچکا ہے۔ ہاجرہ مسرور کے قریبی دوستوں میں فرزانہ رضوی (بی سی سی آئی بینک والے آغا حسن عابدی کی بہن)، نثار عزیز بٹ (پاکستان کے سابق وزیر خانہ سرتاج عزیز کی بہن)، حبیب اللہ شہاب (قدرت اللہ شہاب کے بھائی) اور ان کی اہلیہ زبیدہ شہاب شامل ہیں۔ زبیدہ شہاب اکتوبر 2005 کے زلزلے کے دوران اسلام آباد کے مارگلہ ٹاوز کے سانحے میں جاں بحق ہوگئی تھیں۔ اپنی اس سہیلی کے انتقال پر ہاجرہ مسرور بہت عرصے تک بیحد رنجیدہ رہیں۔

ہاجرہ مسرور اپنے دن پورے کررہی ہیں، رخسار جاناں پر نہ تو رنگ باقی رہا ہے اور نہ ہی دیوار گلستاں پر دھوپ باقی رہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کی صحت بحال رہے۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے

ہاجرہ مسرور سے ملاقات نہ ہو سکی، ہم ان کو دیکھنے سے بھی قاصر رہے، لیکن بالفرض ایسا ہو جاتا تو شاید وہ یہی کہتیں:

اس وقت کہاں سے آ گئے ہو تم
اس وقت میں اپنے روبرو ہوں

کتابوں کا اتوار بازار۔ 29 جنوری 2012۔ کچھ احوال بازار کا

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
لیکن صاحب، اس کا ہر اتوار صدر کراچی کی ایک گلی میں برسنا ہی غنیمت ہے کہ طلبگاران کتب کی کچھ اشک شوئی تو اس طرح ہو ہی جاتی ہے۔
کتابوں کے اتوار بازار میں آج حسب معمول ملاقات ہوئی اپنے دوست امین ہاشم سے۔ یہ 1987 سے اس بازار میں آ رہے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو، کیسے بھی حالات کیوں نہ رہے ہوں، امین کا آنا طے ہے:

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

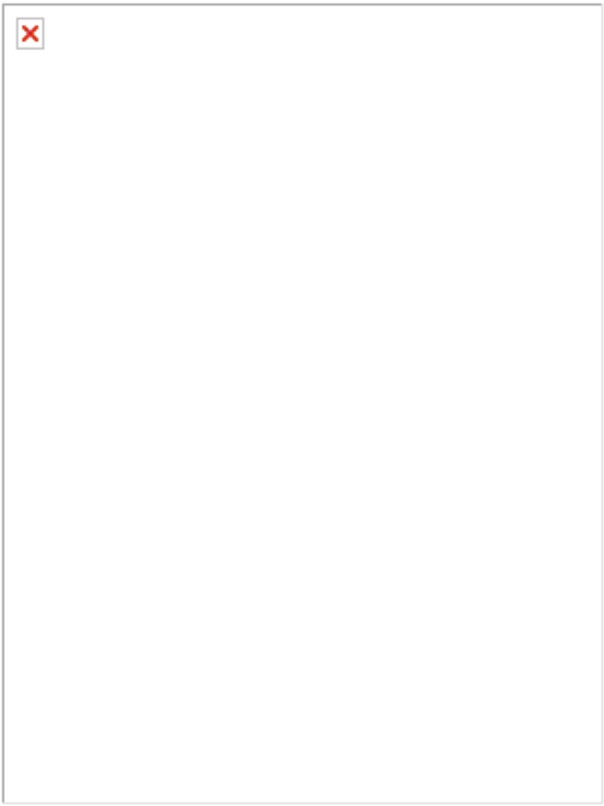

ہم ایک جانب کھڑے ہوگئے۔ بات چل نکلی اتوار بازار کی تو کئی نئی باتیں سننے کو ملیں، معلومات میں اضافہ ہوا۔ کراچی صدر کے علاقے ریگل چوک سے متصل ایک گلی میں یہ بازار لگتا ہے لیکن کب سے؟ اس کا جواب امین ہاشم نے دیا:

"کوئی آٹھ دس برس ہوئے ہیں، اس سے قبل یہ مرکزی سڑک پر ہی لگا کرتا تھا اور غالبا" سن پچاس کی دہائی کے اواخر سے اس کی شروعات ہوئی تھی۔"

'مرکزی سڑک سے گلی میں اٹھ آنے کی کیا وجہ ہوئی، یوں اٹھے آج اس گلی سے ہم والی بات تو نہ ہوئی ہوگی کہ سڑک سے گلی میں آئے تھے' میرا سوال تھا

امین بتانے لگے:
" بازار سڑک پر سجا کرتا تھا اور وہ علاقہ پریڈی تھانے کی حدود میں آتا ہے، ایک روز بااثر دکانداروں نے تھانے دار کو ساتھ ملایا اور عذر پیش کیا کہ ان

"کا کاروبار متاثر ہوتا ہے

' اتوار کے روز بھی' ؟
" جی زبردست کا ٹھینگا سر پر" امین بولے "
' پھر کیا ہوا' ؟
"پھر یہ ہوا کہ ایک سڑک سے اٹھ کر یہاں گلی میں آنے سے یہ ہوا کہ تھانے کی حدود بدل گئی، یہ گلی کنٹونمنٹ کی حدود میں آتی ہے اور پھر یہاں کے دکانداروں نے کوئی اعتراض نہ کیا تو یہ یہاں جم گئے"

'میں (راقم) نے پولیس کو بھی آتے دیکھا ہے، یہ کیا معاملہ ہے'؟ میرا سوال

تھا

امین بتانے لگے: " اس کی بھی سن لیجیے، پولیس یہاں سے بھتہ لیتی ہے اور بعض اوقات تو دو علیحدہ علیحدہ پولیس موبائلز بھتہ لینے پہنچ جاتی ہیں۔ ایک بندہ ہے یہاں (انھوں نے ایک آشنا چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) یہ اس کا کام ہے، پیسے جمع کرتا ہے اور تھانے والوں کو پیش کرتا ہے۔ ایک مرتبہ تو یہ بھی پھنس گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک تھانے کو پیسے دے کر ہٹا تو دوسرے تھانے کے ایس ایچ او نے اسے طلب کرلیا اور الزام لگایا کہ تم صدر کے دکانداروں سے بھتہ جمع کرتے ہو۔ اس غریب نے پریشان ہو کر کہا کہ حضور وہ جمع کرکے آپ لوگوں ہی کو تو پہنچاتا ہوں۔ یہ کہنا غضب ہوگیا، تھانے دار نے "ایف آئی آر درج کرنے کی دھمکی دی، بڑی مشکل سے بیس ہزار دے کر جان چھڑائی۔

سن 1987 سے یہاں باقاعدگی سے آنے والوں میں اب کوئی چہرہ نظر آتا ہے؟ میں نے امین ہاشم سے سوال کیا

امین کہنے لگے "ایک تو جامعہ کراچی کے ڈاکٹر ظفر اقبال ہیں، پھر پروفیسر سحر انصاری ہیں جو اب کبھی کبھی آتے ہیں، ایک صاحب تھے قمر سہارنپوری، وہ بلا ناغہ آتے تھے لیکن ان دنوں بہت بیمار رہنے لگے ہیں۔

کتب فروشوں میں ایک ایسی شخصیت ہے جس کے ذکر کے بغیر اس بازار کا تذکرہ نامکمل سمجھا جائے گا، ان کا نام ماسٹر اقبال تھا، وضع قطع باکل مرزا غالب جیسی، وہی کھڑی ٹوپی، پاجامہ اور کبھی کبھی شیروانی بھی زیب تن کرتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب انہوں نے صدر کے کریم سینٹر میں کتابوں کی دکان بھی کھولی تھی جو چلی نہیں، اور گھاٹے میں بند کرنی پڑی، ماسٹر اقبال گاہک کے حساب (گاہک کی ظاہری وضع دیکھ کر) سے کتاب کی قیمت لگاتے تھے۔ ماسٹر اقبال زمانہ ہوا انتقال کرچکے ہیں"

سن اسی کی دہائی میں امین ہاشم کی تنخواہ 2000 روپے تھی، ایک روز انہیں

خطبات عالیہ تین جلدوں میں نظر آئی، 600 روپے کی رقم 2000 کمانے والے کے لیے خطیر تھی، امین ان دنوں سائیکل پر آیا کرتے تھے، قیمت سن کر ان کے ہوش اڑ گئے، خاموشی سے واپس جانے لگے تو ماسٹر اقبال نے ان کی سائیکل کا پچھلا حصہ تھام کر روک لیا اور کہا کہ لے جایئے یہ کتابیں، آ جائیں گے پیسے بھی۔

اور اب؟

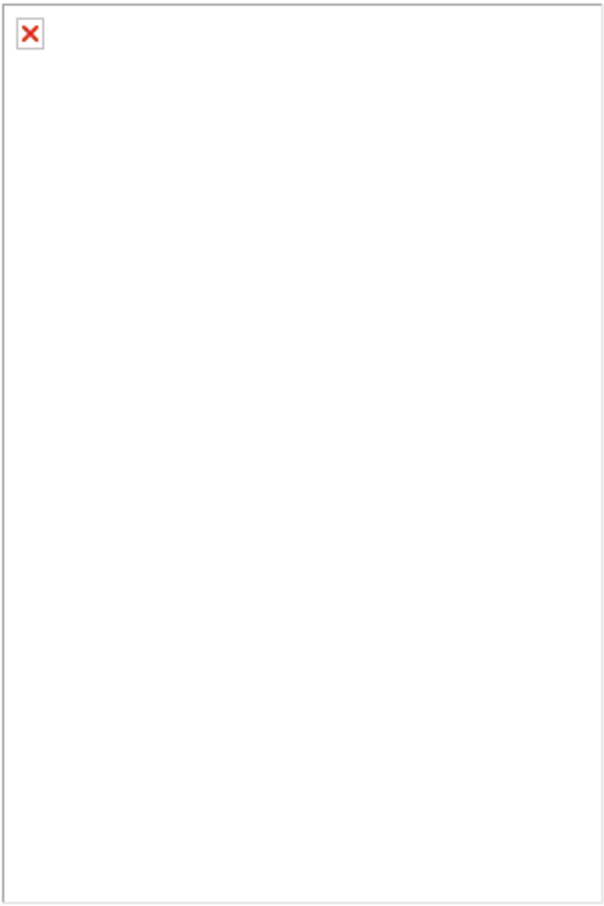

اب تو یہ حال ہے کہ پرانے کتب فروش چل بسے، ان کی اولاد میں کچھ باقی رہ گئے ہیں بقول امین ہاشم جن کی آنکھوں میں ابھی بھی کچھ شرم باقی ہے۔ باقی

یہ حال ہے کہ بھاؤ تاؤ کرنے والے گاہکوں کی لاف گزاف سے بازار کے سب سے بااثر کتب فروش کو اکثر تاؤ آجایا کرتا ہے اور وہ کھڑے گھاٹ گاہک کی بے عزتی بھی کرتے دیکھا گیا ہے۔ اسی کتب فروش کے پاس راقم نے آج صبح ایک تھیلا دیکھا جس پر گاڑھی سیاہی والے قلم سے لفظ "ڈاکٹر" لکھا تھا۔ ایک صاحب نے کتب فروش سے اس تھیلے کو کھولنے کی درخواست کی جو اس نے نخوت سے رد کردی۔

یہ عقدہ بھی امین ہاشم نے کھولا، معلوم ہوا کہ ایک ڈاکٹر صاحب ہیں جو تین ماہ سے کتابوں کے بازار میں آرہے ہیں:

وہ آیا، اس نے دیکھا اور دوسروں کا بیڑہ غرق کردیا

ڈاکٹر صاحب کتاب کی منہ مانگی قیمت ادا کرتے ہیں، کتب فروش نے ان کو تاک لیا ہے، وہ سو روپے کی کتاب کے تین سو روپے طلب کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب قبلہ فراغ دلی سے ادائیگی کردیتے ہیں، ہوتے ہوتے یہ نوبت آن پہنچی ہے کہ کتابوں کا کم از کم ایک بورا تو ایسا ہوتا ہے کہ جو ڈاکٹر صاحب کی آمد پر ہی کھلتا ہے، وہ اپنی پسند کی کتابیں چھانٹتے ہیں، پھر باری کے انتظار میں کھڑے دوسرے مسکین عشاق، بچوں سے بچا کھچا فیض پاتے ہیں۔

' اور اگر ڈاکٹر نہ آئیں تو؟'

تو پورا نہیں کھلتا اور اسے کتب فروش واپس لے جاتا ہے، بھیا! وہ تو ایسے ہیں کہ ایک " مرتبہ برملا کہتے سنے گئے کہ میرے پاس پیسہ ہے اور میں اس کی مدد سے کچھ بھی خرید سکتا ہوں" امین نے انکشاف کیا۔

شاید یہ بھی ہے کہ اب ڈاکٹر صاحب کے جوش جنوں میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ شاید ان کے مریض کچھ ہشیار ہوگئے ہوں گے، لیکن دوسرے گاہکوں کو جو نقصان پہنچنا تھا، وہ تو پہنچا۔

ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

آج ہمارے محترم دوست عادل حسن بھی بازار میں جلوہ افروز تھے۔ 10 فروری کو ان کے نانا جناب قیسی رامپوری کی برسی آرہی ہے۔ احباب سے وہ پہلے ہی درخواست کرچکے ہیں کہ کسی کے پاس ان کے نانا سے متعلق اگر کوئی تحریر ہو تو اسے اس روز بزم قلم پر شامل کریں۔ ذیل میں درج فہرست کتب میں شامل 'اردو کتابوں کی ڈائرکٹری' بھی بھائی عادل نے کمال محبت سے ہمیں خرید کر پیش کی۔

:کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے

چہرے
خاکوں کا مجموعہ
شورش کاشمیری
ناشر: مکتبہ ماحول لاہور

سن اشاعت: 1965
صفحات: 272

کچھ یادیں
یاداشتیں
محمد مظہر بقا
ناشر: بقا پرنٹر اینڈ پبلشر کراچی
سن اشاعت: 1996
صفحات: 166

لاہور کا جو ذکر کیا
آپ بیتی

گوپال متل

ناشر: مکتبہ اردو ادب، لاہور

سن اشاعت: 1985

صفحات: 128

راہی اور راہ نما

خاکوں کا مجموعہ

سید الطاف علی بریلوی

ناشر: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی

سن اشاعت: 1964

صفحات: 265

تخلیقی ادب

مدیر مشفق خواجہ

شمارہ نمبر 2

سن اشاعت: 1980

صفحات: 568

اردو کتابوں کی ڈائرکٹری

سالنامہ کتاب لاہور

اکتوبر۔نومبر 1968

نگران: ابن انشائ۔،مدیر: سید قاسم محمود۔ نائب مدیر: صفدر ادیب

صفحات: 1104

ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ایک شام

جنوری کی ایک خنک شام ،جو رفتہ رفتہ رات میں تبدیل ہوتی رہی، کچھ شاعروں اور چند ادیبوں کے درمیان گزری جن کے میزبان سید معراج جامی تھے۔ گھر سے چلتے وقت ایک دوست آگئے جو حسن اتفاق سے اس روز بھی آدھمکے تھے جس روز جامی صاحب ہی کے گھر کا قصد تھا، اس مرتبہ یہ سچ مچ بگڑ گئے:

'یار آپ پچھلی مرتبہ بھی جلدی میں تھے، کوئی ادبی نشست تھی، آج بھی وہیں جارہے ہیں'

'اس مرتبہ کوی سمپلن ہے، مطلب مشاعرہ ہے' میں نے گڑگڑا کر کہا

' میں بھی چلوں' ؟انہوں نے اشتیاق سے پوچھا

' اہل زبان ہونا شرط ہے' میں نے کہا' ویسے یار ! تمہاری زبان کیا ہے ؟

جواب میں دوست نے اپنی پان سے رنگی زبان باہر نکال دی، یہ اشارہ تھا کہ میں جاسکتا ہوں۔

منزل پر پہنچا تو مہمانوں کی آمد آمد تھی، غلبہ شعرا کرام کا تھا۔

خدا نہ کرے کہ' معاملہ اپنے خرچ پر آئے اور اپنی ذمہ داری پر کلام سنا کر چلے گئے' والا ہو، میں سوچ رہا تھا۔ فدوی کو مشاعروں میں شرکت کا تجربہ جو

نہیں ہے۔ دوران نشست ایک موقع پر تو ہوا بھی وہی جس کا ڈر تھا، ایسا کڑا وقت آیا کہ جناب امیر السلام ہاشمی نے، جو میرے بہت قریب بیٹھے تھے، کڑک کر کہا "بھئی! آپ چپ کیوں ہیں، داد دیجیے نا"۔ اوسان خطا ہو چلے تھے کہ ایک کونے سے کسی خاتون کی ڈھارس بندھاتی آواز آئی " وہ لکھ رہے ہیں"۔

نشست گاہ کتابوں سے بھری الماریوں کی موجودگی کی وجہ سے قدرے چھوٹی لیکن دلوں میں بہت گنجائش تھی۔ ابتدا میں معاملہ خاتون و حضرات کا تھا جو بعد ازاں خواتین و حضرات پر جا ٹھہرا۔ جامعہ کراچی سے ڈاکٹر مہہ جبین زیدی تھیں، ان کے ساتھ خدیجہ زبیر احمد براجماں تھیں جو نصیر الدین ہاشمی کی صاحبزادی ہیں۔ یہ نصیر الدین ہاشمی وہی ہیں جنہوں نے دکن میں اردو ، دکنی کلچر اور یورپ میں دکنی مخطوطات جیسی مشہور کتابیں تحریر کی ہیں۔ان کے ساتھ دلشاد

انجم تشریف رکھتی تھیں جنہیں اخبار جہاں کا پہلا کالم خالہ بی کی ڈائری کے عنوان سے لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ شجاع الدین غوری صاحب نثر نگار ہیں، ان کے ہمراہ شاعر، نثر نگار و ادبی تجزیہ نگار جناب عشرت رومانی تشریف فرما تھے ۔ عشرت رومانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ 2005 میں شائع ہوئی ان کی ضخیم کتاب مقصدی شاعری۔ ایک جائزہ' ادب میں اہم مقام رکھتی ہے ۔ عشرت رومانی کے برابر میں بیٹھے امیر السلام ہاشمی صاحب مزاحیہ شاعری میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، شاعری کی چار کتابیں شائع ہوچکی ہیں جبکہ ایک کلیات بھی مرتب کی جارہی ہے۔ان کے برابر میں آتش زیر پا اور خان کی ڈائری کے مصنف اصغر خان چپُ چاپ ایک گوشے میں بیٹھے تھے، یہ ایک گوشہ نشین شخص تھے جنہیں احمد ہمیش نے دریافت کیا اور دنیائے ادب میں متعارف کرایا۔اصغر خان کے ہمراہ عزیز احسن تشریف رکھتے تھے، آپ نعتیہ شاعری کرتے ہیں اور فن نعت گوئی میں تنقید کے موضوع پر نعت رنگ نامی مجلے میں کئی اہم مضامین تحریر کرچکے ہیں۔شاہینہ فلک صدیقی کہ ذرا تاخیر سے آئیں، ایک شاعرہ ہیں جن کا پہلا شعری مجموعہ تتلی کی پہلی بارش حال ہی میں بزم تخلیق ادب نے شائع کیا ہے۔

نشست کا آغاز عزیز احسن کی نعت سے ہوا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تڑپ تو رکھتا ہوں زاد سفر نہیں رکھتا

کرم حضور کہ میں بال و پر نہیں رکھتا

میں عرض حال کے قابل کہاں مرے آقا

سوائے عجز بیاں، اور کوئی ہنر نہیں رکھتا

ستم زدہ ہوں، نگاہ کرم کا طالب ہوں

میں بے اماں ہوں، کہیں کوئی گھر نہیں رکھتا

:اس کے بعد صاحب صدر جناب معراج جامی نے اپنی تازہ تخلیق پیش کی

داد میں کچھ کمی نہ ہو جائے

رائیگاں زندگی نہ ہو جائے

حادثہ واقعی نہ ہو جائے

دشمنی دوستی نہ ہو جائے

ذکر محفل میں اس کا ٹھیک نہیں

گفتگو شاعری نہ ہو جائے

آپ برہم ہیں بے سبب مجھ پر

آپ سے برہمی نہ ہو جائے

زندگی جیسی ہے گوارا ہے

اس سے بڑھ کر بری نہ ہو جائے

یاد میری نکالیے دل سے
یہ مرض دائمی نہ ہوجائے
میرے اتنے قریب مت بیٹھو
کوئی آفت کھڑی نہ ہوجائے
آگہی اک عذاب ہے جامی
خلق کو آگہی نہ ہوجائے

جامی صاحب کے بعد شاہینہ فلک صدیقی نے اپنی غزل پیش کی:
تیرا ثبات سلامت دل جنوں پیشہ
نہ کر مجھے تو ملامت دل جنوں پیشہ

سفر میں ہوں میں ترے ساتھ ایک مدت سے
ہے اور کتنی مسافت دل جنوں پیشہ
فضا میں پھیلتا جاتا ہے نفرتوں کا غبار
جہاد مہر و محبت دل جنوں پیشہ
کسی کے سامنے کیوں چپ سادھ لی تو نے
کہاں گئی تری وحشت دل جنوں پیشہ
بہار نے تو تجھے اپنا کام سونپ دیا
اب آگے تیری طریقت دل جنوں پیشہ
!داد و تحسین کے ڈونگرے برستے رہے
شمع محفل' اصغر خان صاحب کے پاس پہنچی، خان صاحب سے تقریب کے درمیانی وقفے '
:میں گفتگو رہی تھی، ان کا ایک شعر دیکھیے
تم ہو ابھی حیات، یہ سن کر خوشی ہوئی
ماتم کو میرے ایک اعزادار بچ گیا
:خان صاحب گویا ہوئے
تقدیر سے رشتہ کبھی تحریر سے رشتہ
تخریب سے رشتہ ہو کہ تعمیر سے رشتہ

میں تجھ کو بھلا پاؤں گا یہ بھول تھی میری
قائم ہے برابر تیری تقدیر سے رشتہ
افکار کا قیدی کبھی احساس کا مجرم
کافی ہے پرانا میرا زنجیر سے رشتہ
حاضرین کی فرمائش پر اصغر خان نے ایک اور غزل سنائی:
تہمتوں کا سلسلہ اچھا نہیں
یہ سلوک ناروا اچھا نہیں
سر جھکانے میں بڑا آرام ہے
سرکشی کا راستہ اچھا نہیں
گاہے گاہے رنجشوں کو راہ دو
پیار اتنا بے بہا اچھا نہیں
اجنبی آخر کو پھر ہے اجنبی
اجنبی سے واسطہ اچھا نہیں
تم نہیں واقف ابھی انجام سے
دل لگی کا راستہ اچھا نہیں
کیا کہیں گے لوگ بستی کے
تم رہو ہم سے جدا اچھا نہیں
مان لو اب تو تم کسی کو خدا

یہ تغافل بخدا اچھا نہیں

اصغر خان صاحب کے بعد عشرت رومانی اور خدیجہ زبیر احمد نے اپنی نظمیں سنائیں۔

شاعر ی کے دور کے آخری شاعر جناب امیر السلام ہاشمی تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

آئیں ہنس بول کے غم اپنے کم تو کریں
مسکراہٹ غم دوراں کو فراہم تو کریں

خیر مقدم کریں ہر غم کا خوشی سے بڑھ کر
زیست کرنے کے لیے کاوش پیہم تو کریں

٪

گر یہ معیار ظرافت ہے تو کچھ دن میں امیر
مسخرہ مسند فن پر کوئی بیٹھا ہوگا
اور ہم سا کسی چوپال میں برگد کے تلے
اپنی تخلیق پہ سر پیٹ کے روتا ہوگا

٪

حال کیا میں سناؤں بیوی کا
درد جوڑوں میں اس کے رہتا ہے
درد میرا ہے اس کہانی میں
وہ جو بے درد تھی جوانی میں

٪

مولوی مفتی فقیہہ شہر قاضی اور پیر
لوگ پھنس کے رہ گئے ہیں کتنی دستاروں کے بیچ

٪

! حاضرین زار و قطار ہنستے رہے
وہ خم گردن ، وہ دست ناز وہ ان کا سلام

کیا ادائے دلبری ہے تین تلواروں کے بیچ

حسن میں کیا رہ گیا ہے آج میک اپ کے بغیر

کچھ بھیانک سرخیاں جیسے ہوں اخباروں کے بیچ

٭

شاعری کے دور کے بعد نثر کا دور شروع ہوا چاہتا ہی تھا کہ راقم نے صاحب صدر سے اجازت طلب کی، جامی صاحب باہر تک چھوڑنے آئے اور گلہ کرتے رہے کہ تم خاصہ تناول کیے بغیر ہی جا رہے ہو، معلوم ہوا کہ شرکاء کی ضیافت کے واسطے 'پائے' پکوائے گئے ہیں، موسم سرد تھا اور پیشکش تھی کہ دل لبھا رہی تھی ، اس محرومی پر دل سے ایک آہ نکل کر آسمان تک اثر لانے کو گئی،کچھ سنبھالا لیا، متزلزل ہوتے ارادے کو مستحکم کیا اور جامی صاحب سے اجازت طلب کی۔ نثری نشست کا احوال جامی صاحب کی زبانی سنیے:

معاف کرنا راشد، تمہارے بغیر پائے کھا کر جانے کی وجہ سے بعد از مشاعرہ میرے " سر میں شدید درد ہوگیا ، اس وجہ سے مشاعرے کے بعد کی کاروائی تم کو ارسال نہیں کر سکا۔ اب سنو کہ صدر محفل امیر الاسلام ہاشمی کے جانے کے بعد نثر نگاروں میں سب سے پہلے شجاع الدین غوری صاحب نے اپنا مزاحیہ مضمون کلیات اقبال پڑھا۔ اس کے بعد دلشاد انجم نے یوم اقبال پر اپنا طنزیہ کالم

پڑھ کر سنایا۔ پھر انور احمد علوی نے اقبال ساغر صدیقی پر اپنا خاکہ پڑھا اور آخر میں خدیجہ زبیر احمد نے اپنا افسانہ چھوٹی سی بے وفائی حاضرین کی خدمت میں پیش کیا۔ تقریبا نو بجے اس محفل کا اختتام ہوا۔ پائے کے ساتھ حیدرآبادی مرچوں کا سالن بھی تھا اور مٹر پلاؤ بھی۔ میٹھے میں لوکی کا حلوہ تھا۔ کھانے کی باتیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں بغیر کھائے جانے کا افسوس بھی ہو اور تمہارے منہ میں پانی بھی بھر آئے۔ اور ہاں ! سب لوگوں کے جانے کے بعد صرف میرے سر میں ہی درد نہیں ہوا بلکہ آسمان بھی بہت رویا کہ ایسی اچھی تقریب اتنی جلدی ختم ہو گئی۔"

مزاح کے کارخانے میں دخل

ان دنوں کتابیں اس کثیر تعداد میں شائع ہو رہی ہیں کہ ادھر کچھ عرصے سے دیکھتے ہی دیکھتے بازار میں کاغذ کا بھاؤ بڑھ گیا ہے۔ قارئین کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کیا خریدیں اور کیا چھوڑیں۔ شاعری، تنقید، تاریخ، سفرنامہ غرض یہ کہ ایک سیلاب بلا ہے جو کتابوں کی شکل میں گھروں میں داخل ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں معروف ادیبہ سائرہ غلام نبی اپنی ایک تازہ تحریر میں لکھتی ہیں:

"ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کتابوں کی اشاعت میں بے پناہ تیزی آئی ہے۔ لکھنے والا اعتبار کی سند حاصل کیے بغیر صاحب کتاب باآسانی بن رہا ہے۔ یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ کیا یہ محض جدید دور کا کوئی نیا فیشن ہے یا اس سے کوئی ذاتی قسم کا مفاد وابستہ ہے۔ نظریاتی تحاریک سے جڑے بغیر، content کی گہرائی میں اترے بغیر، سنجیدگی سے علم کا انہماک کیے بنا تخلیقی وفور سے سرشار ہوئے بغیر لفظوں کا ڈھیر لگایا جا رہا ہے۔ چمکتے دمکتے درآمد شدہ کورے اوراق کو فرسودہ اور بے معنی خیالات سے سیاہ ترکیا جا رہا ہے۔ یہ دو نمبر شاعر اور ادیب مارکیٹ میں کھلے عام دستیاب ہیں اور بہت تیزی سے اصل مال کے دام کو کھوٹا کر رہے ہیں۔ ہماری تشویش آج سے زیادہ آئندہ کے لیے ہے کہ آج کے مسترد

شدہ ادیب و شاعر کل کے بچے کھچے قاری کی دسترس میں ہوں۔ انہیں اوچھے ہتھکنڈے آتے ہیں جن میں فلیپ لکھنے والے نقاد ان کے مددگار ہیں۔ ایسے ادب کو ادب بننے سے کیسے روکا جائے؟ بے پناہ کتابوں کی اشاعت پر پابندی کیسے لگائی جائے؟ "

سائرہ غلام نبی کی تشویش اپنی جگہ لیکن ہم سمجھتے تھے کہ ایک صنف ادب ضرور ایسی باقی بچی ہے جس میں طبع آزمائی ہر کس و ناکس کی بات نہیں لیکن اب وہ بھی لکھنے والوں کی زد پر آ گئی ہے، یہاں بات ہو رہی ہے مزاح نگاری کی۔ دوسرے لفظوں میں اس کارخانے میں بھی تواتر کے ساتھ دخل اندازی کرنے والوں میں اضافہ دیکھا گیا ہے۔

مزاح کے کارخانے میں دخل کی ترکیب پر مبنی واقعے کے راوی خامہ بگوش ہیں، لکھتے ہیں:

ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی خودنوشت 'شاخ ہری اور پیلے پھول' میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ وہ اکثر جوش صاحب کے گھر جایا کرتی تھیں۔ بیگم جوش کو ان کا آنا پسند نہیں تھا۔ ایک روز بیگم صاحبہ کا پیمانہ صبر چھلک گیااور انہوں نے ڈاکٹر عالیہ امام سے کہا: " مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں جو دوسروں کے کارخانے میں دخل دیں "

افسوس کہ بیگم جوش کا انتقال ہو چکا ہے۔ اگر ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب 'شاعر

انقلاب۔۔۔ نظریاتی و تنقیدی مطالعہ' ان کی زندگی میں شائع ہوئی ہوتی تو وہ اسے دیکھ کر یہ ضرور کہتیں:

(اچھا تو اب آپ تنقید کے کارخانے میں بھی دخل دینے لگیں۔" (خامہ بگوش "

اس خامہ بگوشی کی یاد ہمیں حال ہی میں شائع ہوئی ایک ایسی کتاب کو پڑھنے کے بعد آئی جسے ہم یاداشتوں کا مجموعہ سمجھ کر خرید لائے تھے لیکن کتاب کے ایک ہی نشست میں مطالعے کے پُرخطر فیصلے کے بعد یہ علم ہوا کہ فاضل مصنف نے مزاح کے کارخانے میں دخل دینے کی کوشش کی ہے۔۔ کتاب کا عنوان ہے 'لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ'، اس کے مصنف ایک ریٹائرڈ بینکار جناب ایس ایچ جعفری ہیں۔ پس ورق، مصنف کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر ہے جو کتاب کے عنوان کی مناسبت سے مختلف ہے۔ آپ نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا، کتاب کے دیباچے میں یہ واضح کردیا کہ ' یہ سوانح عمری نہیں ہے، بس ایک عام سے آدمی کے اوپر سے گزرنے والے کچھ واقعات ہیں جو ذہنی گرفت میں آگئے"۔ مصنف نے کتاب کے مطالعے کے بعد اس کے قاری کی ذہنی گرفت کی کیفیت میں ہونے والی تبدیلیوں کا حال جاننے کے لیے اپنا ای میل پتہ بھی درج کیا ہے۔ مصنف نے دیباچے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے مزاح کا معیار اس قدر بلند کردیا ہے کہ بڑے بڑے مزاح نگار ان کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراف کرنے کے باوجود بھی انہوں نے لکھ رہا'

ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' کو بشکل عنوان کتاب، ایک جنوں کی کیفیت میں لکھا اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ جنوں کی یہ کیفیت ان کے قاری پر بھی طاری ہو جائے خاص کر اپنے پیسوں کو ضائع ہوتا دیکھ کر۔کتاب عالم جنوں میں لکھی گئی ہے اور قاری بھی دوران مطالعہ یہی کیفیت طاری ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری طرف مصنف نے ابتدا ہی میں یہ لکھ کر قاری کے دکھوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے کہ 'مذکورہ کتاب کی جملہ آمدنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسو سی ایشن کراچی کے لیے وقف ہے۔'

۔دیکھنے والی بات یہ ہے کہ علی گڑھ ایسو سی ایشن کے انتظامی و معاشی معاملات پر زیر موضوع کتاب کی فروخت سے حاصل ہوئی آمدنی کی آمیزش کے کیا اثرات مرتب ہوں گے ؟

کتاب کے دیباچے میں جعفری صاحب نے یہ راز بھی فاش کردیا ہے کہ آخران کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال کیونکر آیا۔ لکھتے ہیں کہ " میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میرا ایک مضمون پڑھ کر میرے چند دوستوں نے پہلے تو مشورہ دیا کہ میں مزید لکھوں، اس کے بعد بھی اصرار کرتے رہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان کے اس عمل سے مقصود میری ٹانگ کھینچنا رہا ہو لیکن میں نے بڑی سنجیدگی سے ان کے مشورے پر عمل کیا ہے۔ "

جعفری صاحب نے اپنی کتاب کا انتساب اپنے ہم وطنوں کے نام یہ لکھ کر کیا ہے " جو اگر چاہیں تو نظم و ضبط کو اپنا شعار بنا کر ترقی یافتہ اقوام عالم کی صف میں اپنی ممتاز حیثیت کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ "

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ریٹائرڈ بینکار کے دوست کس قماش کے ہیں جنہوں نے ان کو یہ کتاب لکھنے کا مشورہ دیا اور اس پر مستزاد مصنف ان کی باتوں میں کیونکر آئے۔ اس صورت حال میں وہ محاورہ بھی مصنف کے پیش نظر ہونا چاہیے تھا کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ رہا سوال ٹانگ کھینچنے کا، تو کتاب میں ایک جگہ انہوں نے اپنا وزن بھی پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے درج

کیا ہے جو 140 پاؤنڈ ہے۔ اتنے وزن کے حامل کسی شخص کی ٹانگ کھینچنا ذرا

مشکل بات نظر آتی ہے۔ کتاب کے انتساب میں مصنف اپنے ہم وطنوں کو نظم و ضبط کو اپنا شعار بنانے کی تلقین کرتے ہیں لیکن انہیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ان کی اس کتاب کا قاری اسے خریدنے کے بعد نظم اور پڑھنے کے بعد اپنا ضبط کیونکر برقرار رکھ سکتا ہے؟

لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' کے مصنف نے اس کتاب کا آغاز ہی ایک تنازعے کے' ساتھ کیا ہے، یہ ہماری ناقص سمجھ کا قصور بھی ہو سکتا ہے کہ شاید مصنف نے کتاب کی ابتدا ہی مزاح سے کرنے کی کوشش کی ہو، بہرکیف انہوں نے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہے ' 'تاریخ پیدائش: متنازعہ"۔ یہ بجائے خود ایک متنازعہ بات ہے۔ وہ تمام عمر بینک میں ایک متنازعہ تاریخ پیدائش کے حامل ریکارڈ کے ساتھ کیسے نوکری کرتے

رہے؟ تاریخ پیدائش کے بعد لکھتے ہیں 'تاریخ وفات: ہنوز نامعلوم'۔ خدا ان کو لمبی عمر دے لیکن ان کی اس کتاب کے مطالعے کے بعد مصنف کے بجائے اس کے قاری کی تاریخ وفات کا تعین ہونا آسان نظر آ رہا ہے۔ فہرست مضامین کا آغاز ہی مزاحیہ انداز میں کیا گیا ہے، باب نمبر دو کا عنوان 'میں کیوں پیدا ہوا' رکھا گیا ہے۔ مذکورہ باب میں مصنف اپنی پیدائش کا سبب تلاش کرتے نظر آتے ہیں، بقول ان کے، 'میں گزشتہ پانچ دہائیوں سے اس سوال کا جواب تلاش کر رہا ہوں لیکن تاحال مجھے کوئی تسلی بخش جواز نزول نہیں مل سکا ہے۔، دنیا کی بے انتہا ترقی کے باوجود آج بھی قدرت کے کئی راز ہائے

سربستہ سے پردہ نہیں ہٹ سکا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میرا حادثہ پیدائش بھی ان میں سے ایک ہے'۔

ایس ایچ جعفری صاحب نے یہ بات لکھ کر کم از کم ہمیں تو حیران و پریشان کر دیا ہے، اس سے پہلے ہمارے علم میں قدرت کے دس مصدقہ راز ہائے سربستہ مثلاً برمودا ٹرینگل، جیک دی رپر وغیرہ، جیسے پیچیدہ و لاینحل معمے ہی تھے، اب یہ علم ہوا کہ جناب مصنف کا حادثہ پیدائش بھی ان میں سے ایک ہے۔

لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' کا آغاز مصنف کے سوانحی حالات سے ہوتا ہے اور' اس سے یہ امید بندھ جاتی ہے کہ یہ سلسلہ آخر تک یونہی چلے گا اور پڑھنے والوں کو ایک بینکار کے حالات زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا لیکن الہ آباد میں گزرے اپنے بچپن کے واقعات کو بیان کرتے کرتے یکایک مصنف لندن میں بینک کی نوکری کا احوال بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ قاری ان کو کسی قسم کا الزام نہیں دے سکتا کہ کتاب کا عنوان اس کے پیش نظر رہتا ہے۔

ایس ایچ جعفری صاحب کی بذلہ سنجی کے کئی یادگار نمونے کتاب میں جا بجا

بکھرے ہیں بلکہ کئی جگہ تو قاری کو ان کی جانب سے بے دھیانی برتنے کی صورت میں ٹھوکر لگنے کا احتمال بھی رہتا ہے۔ لندن میں قیام کے دوران مصنف نے اپنے دوست ملک صاحب کو لاجواب کر دیا تھا۔ ہوا یہ کہ ملک صاحب نے اپنے گھر میں غسل خانہ بنوایا اور ہر ملاقاتی کو جوش و خروش سے دکھانا شروع کیا، مصنف بھی پہنچے اور غسل خانے کا ٹب دیکھ کر ملک صاحب سے کہا:

جناب اسٹیم کہاں سے آئے گی؟

ملک صاحب نے پوچھا اسٹیم کیسی، یہ تو نارمل باتھ ٹب ہے

مصنف نے جواب دیا: ملک صاحب! اس ٹب میں یا تو آپ آئیں گے یا پانی، دونوں تو بیک وقت نہیں سما سکتے

اس اچھوتی، بے مثال و لاجواب بذلہ سنجی پر مبنی جواب کے بعد مصنف لکھتے ہیں: ملک صاحب نے مجھے دھکا دے کر باہر نکال دیا اور میری بیوی سے کہنے لگے کہ آپ کے شوہر بہت بے ہودہ ہیں۔

ہمیں مصنف کے کہے گئے جملے میں بے ہودگی کی تو کوئی رمق نظر آئی البتہ ملک صاحب کا مصنف کو دھکے دے کر باہر نکال دینا بجائے خود ایک بے ہودگی پر مبنی واقعہ نظر آتا ہے۔

جعفری صاحب ایک کیفے میں چمچوں کا معائنہ کر رہے تھے، یہی ملک صاحب وہاں

موجود تھے ، انہوں نے جعفری صاحب سے کہا ’کسی خاص چیچے کی تلاش ہے ؟ جعفری صاحب نے جواب دیا’ معاف کیجیے ! میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا‘۔ جعفری صاحب لکھتے ہیں کہ ملک صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے، بعد میں خفگی کا اظہار کیا۔ جعفری صاحب نے اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد اگلے ہی صفحے پر اپنی ہی بات کی تردید یہ کہہ کر کردی کہ " ملک صاحب میں اور خوبیوں کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ نہ صرف دوسروں کی بات کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے اوپر چپکائے ہوئے مذاق بھی مزے لے لے کر دوسروں کو سناتے۔"

یہ عین ممکن ہے کہ کیفے میں مصنف کے بے مثال جملے کے جواب میں ملک صاحب کی خفگی کو بھی مصنف نے ان کی ایک خوبی سمجھا ہو۔

جن لوگوں کو اسٹیج پر مزاحیہ ڈرامے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو، وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ ان ڈراموں کا آغاز اچھے انداز سے ہوتا ہے، لیکن مزاح کا معیاری تسلسل برقرار رکھنا خالہ جی کا گھر نہیں، درمیان میں ’بھرتی کی کامیڈی‘ کی مدد سے اسے طول دیا جاتا ہے،جہاں ناظرین کی اکتاہٹ کو محسوس کیا، وہاں ایک صحت مند قسم کی رقاصہ کو میدان میں اتارا جاتا ہے کہ ناظرین جمے بیٹھے رہیں۔ لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ‘ میں بھی یہی انداز اپنایا گیا ہے۔ مصنف اپنے قارئین کی خوشی کی خاطر ایسے واقعات کو بیان کرنے

سے بھی گریز نہیں کرتے جہاں ' عاشقی میں عزت سادات 'کے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ جملے بازی کے شوق میں اپنے دوست کی بیگمات کو بھی نہیں بخشتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہ جملے پڑھ کر شاید اس کتاب کے کاتب کو بھی ہنسی نہ آئی ہو، قاری تو دور کی بات ہے۔ ہاں ، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کتاب کی کتابت بھی مصنف نے خود ہی کی ہو، اس صورت میں ہمیں اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ مصنف اپنے ایک دوست کے گھر کھانے پر مدعو تھے، گپ شپ کا سلسلہ چل رہا تھا، فون کی گھنٹی بجی اور خاتون فون سننے گئیں، واپس پر مصنف اور وہاں بیٹھے ایک دوسرے دوست کے سامنے گلہ کرنے لگیں کہ ان کی خریدی ہوئی نئ استری خراب ہو گئ، وہ کل اسے واپس کرنے جائیں گی، پیسے تو دکاندار دے گا نہیں البتہ جو ملے گا لے آئیں گی۔

بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی" خاتون نے اپنی بات کے آخر میں کہا "

اس بات پر ہمارے ممدوح رواں ہوگئے: " کسی کی بھی لنگوٹی کو ہتھیانے کی کوشش ، خواہ وہ بھوت ہی کیوں نہ ہو، انتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے، خصوصا ایک خاتون کے لیے، شریف بہو بیٹیوں کو اس قسم کے محاورے استعمال کرنے سے بھی گریز کرنا چاہیے "

ساتھ بیٹھے دوست نے مصنف کو ٹوکا: " بولے چلے جا رہے ہو، یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ "وہ تمہیں کچا کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی ہیں

مصنف نے جواب دیا ' یہ دوسری غلط حرکت ہوگی، کیونکہ نا محرم کو اس طرح دیکھنا بہت ہی نامناسب بات ہے'

میں حرام چیزیں نہیں کھاتی" خاتون نے تنک کر کہا "

میں خود کو حلال کروانے پر راضی ہوں" ۔ مصنف نے جواب دیا "

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شریف بہو بیٹیوں 'کے گھر پر بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کرنا کہاں تک درست ہے ؟ نیز یہ کہ اس دوران خاتون کے شوہر کہاں تھے ؟ ہمارے معاشرے میں عموما دوست کی بیوی کو بھابی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور یہ رشتہ ایک قابل اعتماد اور پرخلوص رشتہ سمجھا جاتا ہے۔ مصنف کی خود کو اپنے ہی دوست کی بیوی پر حلال کروانے کی برملا خواہش کا کیا نتیجہ نکلا، کتاب میں اس کا کوئی بیان نہیں ملتا۔

ایک دوسرے واقعے میں، جس کو مصنف نے ایک علاحدہ صفحے پر پانچ جملوں میں

چھیڑ چھاڑ کے عنوان کے ساتھ اہتمام سے لکھا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ "شادی کی تقریب میں ایک پرانے دوست کی بیگم نظر
آئیں، ان کے پاس جاکر میں نے مذاقاً کچھ کہا، وہ بولیں چھیڑ چھاڑ کی عادت نہیں گئی ، کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کریں۔ میں بولا عمر ہی کا تو لحاظ ہے ورنہ ادھر (قریب بیٹھی لڑکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) نہ
"جاتا۔ وہ بہت محظوظ ہوئیں۔
مشتاق احمد یوسفی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ بارش کے بعد بیر بہوٹیاں اور بہو بیٹیاں، دونوں باہر نکل آتی ہیں۔ گمان ہے کہ جعفری صاحب کے بیان کردہ ان واقعات میں موجود فرضی (بظاہر) خواتین اسی قبیل کی رہی ہوں گی۔ استاد لاغر مرادآبادی نے یہ واقعہ سن کر فہمائشی انداز میں ارشاد فرمایا، میاں ، جیسی روح ویسے فرشتے، تم کیوں
!ہلکان ہوتے ہو
ایک اور جگہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دن ترنگ میں آکر ایک ہمجولی کو بیٹی کہہ دیا۔ وہ اٹھلا کر بولیں اب میں اتنی کم عمر نہیں ہوں۔"۔
مصنف کی طبیعت میں رنگین مزاجی کا عنصر اوائل عمری ہی سے رہا۔ عشق کے باب میں ایک جگہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں ' میں نے بے شمار عشق کیے، میرے عشق

عمر، مذہب، قومیت کی پابندیوں سے آزاد رہے۔ میرے عشق کی مدت چند منٹ، چند گھنٹوں، دنوں ہفتوں اور مہینوں تک محدود رہی۔' ۔نصف سے زیادہ کتاب میں اسی قسم کے روح پرور واقعات لکھ لینے کے بعد مصنف کو خیال آیا کہ موت کو بھی یاد کرلیا جائے لیکن اس بیان میں بھی انہوں نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چشم تصور میں اپنے انتقال اور اس کے بعد اہل خانہ پر اس کے اثرات کو دیکھا اور اس میں قاری کو بھی زبردستی شریک کرلیا۔ مصنف کو یونہی خیال آیا کہ ان کے مرنے کا دعوت نامہ اگر ہوتا تو کچھ اس قسم کا ہوتا:

میرا انتقال

بتاریخ۔۔۔۔۔۔،بروز۔۔۔۔۔

ہونا قرار پایا ہے۔پروگرام حسب ذیل ہے

روانگی جلوس: ایک بجے دوپہر

نماز: ڈیڑھ بجے دوپہر بمقام سلطان مسجد

تدفین: ڈھائی بجے

طعام: تین بجے

درج بالا پروگرام کی آخری پیشکش سب سے زیادہ پرکشش ہے اور گمان غالب ہے کہ شرکاء اسی میں سب سے زیادہ دلچسپی لیں گے ماسوائے 'لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' کے قارئین کو چھوڑ کرکے وہ توکتاب کے مطالعے کے بعد حلق تک 'پر

ہو چکے ہوں گے۔

ذہنی پراگندی کی اس تشویشناک حالت کو مصنف نے ایک جگہ خود ان الفاظ میں بیان کردیا ہے، ہماری نظر میں تو یہ ان کا اعترافی بیان سمجھا جانا چاہیے :

راتوں کو سوتے سوتے نہ جانے کیوں آنکھ کھلتی ہے تو فیض کے قطعے 'رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی' کا ورد ہو رہا ہوتا ہے۔ پریشانی اس بات کی ہے کہ یہ 'تری' کون ہیں جن کی کھوئی ہوئی یاد نہیں آ پا رہی، آخر یہ چکر کیا ہے ؟ کہیں سٹھیانے کے اثرات تو نہیں ؟

آیئے اب کتاب میں موجود مصنف کے زرخیز قلم سے نکلے یک سطری جواہر پاروں پر بھی ایک نظر ڈال لیں جن کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی :

۔ خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا لیکن میں نے لاتعداد گنجوں کے ناخن دیکھے ہیں بلکہ اپنا سَر کھجاتے ہوئے پایا۔

جب ہر طرح کی آزادی ہے تو سوال یہ ہے کہ ڈکیتی کی آزادی کیوں نہ ہو۔

میں نے آج تک کسی کتے، بلی، گدھے، گھوڑے کو گنجا نہیں پایا۔

لیکن یہ آپ کے پلے (اس لفظ کے پ پر زبر دے کر پڑھیں، زبر نیچے گر کر زیر ہوگیا تو مفہوم بدل جائے گا) نہیں پڑے گا۔

میں تشدد کے ہمیشہ خلاف تھا، فٹ بال نسبتاً امن پسند کھیل لگا سو اسے اپنا لیا۔

میں اپنی شادی کا کارڈ دینے گیا تو ہونے والی سالی کے سامنے ایک (اجنبی) بچہ آیا اور ابو کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

۔میں پیدائشی بزرگ واقع ہوا ہوں، یعنی میں جب اس سیارے پر جسے لوگ دنیا بھی کہتے ہیں، وارد ہوا تو یہاں پر پہلے ہی سے بہت سے لوگ موجود تھے جن کا میں رشتہ میں ماموں یا چچا تھا۔

بڑھاپا بھی ایک حقیقت ہے جس سے ہر شخص کسی نہ کسی مرحلے پر دوچار ہونا پڑتا ہے بشرطیکہ وہ اس مرحلے پر پہنچنے سے پہلے گزر نہ گیا ہو۔

مجھے دوسروں کی تمام بیویاں پسند نہیں آتیں، صرف وہ بیویاں پسند آتی ہیں جو واقعی پسندیدہ ہوں۔

اسٹیفن لیکاک نے مزاح کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے: " یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔"

ہمیں تو 'لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' کے مصنف جناب ایس ایچ جعفری کے صنف نازک میں حد درجے بڑھے ہوئے لگاؤ اور اس کے جا بجا اور جا بیجا اظہار کو مد نظر رکھتے ہوئے اسٹیفن لیکاک کی درج بالا مزاح کی تعریف کو کچھ اس

طرح بیان کرنا مناسب لگ رہا ہے :

یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس 'مردانہ' شعور کا نام ہے جس کا معاندانہ (قاری کے لیے) اظہار ہو جائے۔

ہمارے قارئین یقینناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم تو جناب ایس ایچ جعفری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں تو ایسے تمام احباب کی خدمت میں عرض ہے کہ پہلے وہ زیر موضوع کتاب اپنی حق حلال کی کمائی سے خریدیں اور اس کے مطالعے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچیں۔ یہ مضمون ہم جناب مصنف کو بھی ارسال کریں گے، ظاہر ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد ان کی رائے ہمارے حق میں بہتر تو نہ ہو گی البتہ اگر وہ ہماری کچھ اشک شوئی چاہتے ہیں تو ان سے درخواست ہے کہ پہلے وہ اردو بازار کراچی کے کتب فروشوں کے پاس موجود اس کتاب کے تمام نسخوں کو واپس منگوائیں، اب تک کے فروخت شدہ نسخوں کی آمدنی علی گڑھ ایسوسی ایشن کے بجائے کسی خیراتی ادارے کے حوالے کریں، نئے سرے سے اپنی خود نوشت آپ بیتی لکھیں اور اس کا نام زیر موضوع کتاب کے عنوان میں رد و بدل کے ساتھ استعمال کیے گئے غالب کے اصل شعر کے دوسرے مصرعے پر رکھیں۔

زیر نظر مضمون کا اختتام بھی خامہ بگوش ہی کے ایک اقتباس سے کرنا مناسب نظر آ رہا ہے :

ہمارے ننانوے فیصد ادیب اپنے حسن عمل کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔ جب کوئی پڑھتا نہیں تو کتابوں کے فروخت ہونے کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔ بس شرمندگی کی دولت ہاتھ لگتی ہے اور یہی دولت بیدار کتاب لکھنے والے کا خالص منافع ہوتی ہے۔"

کتابوں کا اتوار بازار-5 فروری 2012

گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا رہ جائے گا

آج بروز اتوار 5 فروری 2012، میں علی الصبح چھ بجے بھاپ اڑاتی کافی کا پیالہ ہاتھ میں تھامے ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا، خیال آیا کہ اتوار بازار روانگی سے قبل کچھ حالات کا جائزہ لیا جائے کہ بارہ ربیع الاول کی وجہ سے کتب فروشوں کی آمد مشکل نظر آرہی تھی۔ لیکن صاحب سب کے سب نہ سہی، چار عدد تو آئے۔

ٹی وی چینل پر قرضوں میں جکڑی ہوئی قوم پر گیس، پیٹرول اور ڈالر کے نرخوں میں حالیہ اضافے پر بات کی جارہی تھی۔ ہم تو یوں بھی منتظر ہیں کہ دیکھیے پیٹرول، ڈالر اور ٹنڈ لکر میں سے کون سب سے پہلے 100 کا ہندسہ عبور کرتا ہے؟

بڑھتے بڑھتے حد سے اپنی بڑھ چلا دست ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا رہ جائے گا

ٹی وی بند کیا اور سوچا کہ ای میل اور فیس بک کا جائزہ لیا جائے

فیس بک پر تو عابدہ رحمانی صاحبہ نے ایک دلچسپ مضمون بھی بزم پر شامل کیا ہے۔
موبائل فون کے آنے کے بعد تو احباب اب چوبیں گھنٹے اس کی پہنچ میں رہتے ہیں۔
نوبت بہ ایں رسید کہ ایک صاحب کی بیگم کا انتقال ہوا، اداس بیٹھے تھے، آنسو جاری تھے،
ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان کو چپ کرانے کے بعد از راہ ہمدردی دریافت کیا:
" تجھے کچھ چاہیے ؟ "
لیپ ٹاپ لا دے" ان صاحب نے کہا "
لیپ ٹاپ، وہ کیوں ؟" دوست نے حیرت سے پوچھا "
"فیس بک پر اسٹیٹس تو سنگل کر دوں "
ایک کرم فرما کا ارسال کردہ پیغام پڑھ کر رہی سہی کسر پوری ہوئی. خبر سکرین پر جگمگا رہی تھی:
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے صدر شعبہ اردو کی پی ایچ ڈی کی ڈگری جعلی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر شفیق عجمی صاحب نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا، موضوع تھا

"علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین
دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کے ایم فل کے مقالے کا موضوع بھی من و عن یہی تھا۔ خبر میں لکھا تھا کہ:
"کوئی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ برصغیر کی معروف درسگاہ کا صدر ایک ہی مقالے پر دو مختلف یونیورسٹیوں سے دو الگ ڈگریاں بھی حاصل کرسکتا ہے۔ ایم فل کے مقالے کو پی ایچ ڈی کے مقالے میں شامل کر دیا، تحقیق بھی وہی رہی اور تحقیقی نتائج بھی ایم فل والے ہی رہے۔"
کالج کے ایک پرانے طالب علم نے یہ راز فاش کیا اور ساتھ ہی اس کے ثبوت بھی انٹرنیٹ (فیس بک وغیرہ) پر جاری کر دیے۔
ضروریات زندگی میں ہوش ربا اضافہ کرتے حکمران اب اتنے برے نہیں لگ رہے تھے!

اتوار بازار کی گلی میں ہوا سرد تھی، محض چار کتب فروشوں کی موجودگی دیکھ کر قریب تھا کہ خالی ہاتھ لوٹ جاتا کہ ایک جانب سے آواز آئی:
"چھوٹے! یہ دو بورے اردو کے ہیں، ان کو ابھی مت کھولیو"

یہ وہ کتب فروش ہے جو ارزاں نرخوں پر کتابیں فروخت کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں گاہک اور دکاندار، دونوں کے لیے یہ ایک

Win-Win Situation

ہوتی ہے۔ ہمارے دوست امین ہاشم نے کچھ بحث کے بعد اسے بورے کھولنے پر قائل کر ہی لیا۔ کتب فروش کا 'چھوٹا' استاد کی جانب سے اجازت ملنے پر ہاتھ میں ایک چاقو تھامے لپک کر سڑک کی دوسری جانب ہماری طرف پہنچا۔ ہمارا یہ چھوٹا اپنے استاد کا بیٹا ہی تو ہے، عمر آٹھ نو برس رہی ہوگی، بازار میں اور بھی ایسے ہیں جو اپنے چھوٹے بچوں بلکہ بعض تو پانچ پانچ سال کے بچوں کو اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ یہ بچے بھی اپنے والد کے ہمراہ تمام دن یہاں گزارتے ہیں، گلی کے کونے پر کھڑے چنے والے سے چنوں کا سالن اور نان لے کر کھاتے ہیں، جس روز والد کا کاروبار زیادہ چمکے، اس روز چنے اور چاولوں کی عیاشی طے ہے! یہ چنے والا بھی خوب ہے، ہاتھ میں ذائقہ ہے، خاکسار اکثر اس کے پکوان سے لطف اندوز ہوتا ہے، چنے والے کے ہاتھ کا ذائقہ اور اس کے چہرے کا رنگ، دونوں اس وقت پھیکے پڑ جاتے ہیں جب پولیس والے ادھر آنکلتے ہیں، ان سے پیسوں کا تقاضہ کرنا تو عبث ہے، خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

بلاآخر بورے کھل ہی گئے۔

دس کتابیں ہاتھ لگیں اور محض چار سو روپوں کے عوض، بازار کے سب سے شاطر کتب فروش کے پاس ان کی قیمت کم از کم ایک ہزار ہوتی۔ ہمارا یہ شاطر کتب فروش ایسا معاملہ فہم کاروباری شخص ہے کہ صبح صبح دیگر کتب فروشوں سے بھی ان کی کتابیں رعایتی نرخوں پر خریدتا ہے اور کچھ ہی دیر میں اپنے اسٹال پر دوگنی قیمت کے ساتھ فروخت کرتا ہے۔

امین ہاشم ایک ایک کرکے کتابوں کو اٹھاتے جاتے، پہلا حق ان کا بنا، بعد میں میری اور معراج جامی صاحب کی باری آئی۔ میری تحریک پر امین ہاشم نے اس بازار سے متعلق اپنی یادوں کو لکھ کر مجھے سونپنے کا وعدہ کیا ہے۔

:کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے

حدیث دلبراں

خاکوں اور یادداشتوں کا مرکب۔ بہار یار جنگ، مولانا مودودی، محمد عمر مہاجر، ماہر القادری، فضل گلبرگوی، راز مرادآبادی، مسٹر دہلوی۔ سید صبیح محسن وغیرہ کے تذکرے شامل ہیں

مصنف: مسعود جاوید

ناشر: نکمت پرنٹر، کراچی

سن اشاعت: 1993

صفحات: 210

مسعود جاوید 11 جولائی 1925 کو بلدہ (دکن کے اطراف کا ایک گاؤں) میں پیدا ہوئے۔ ہجرات کے بعد کراچی کو مسکن بنایا۔ ڈپٹی کنٹرولر ریڈیو پاکستان کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

مائی باپ

علی گڑھ کی یاداشتیں

مصنف: محمد ذاکر علی خان

ناشر: سرسید یونیورسٹی پریس، کراچی

سن اشاعت: 2002

صفحات: 316

مرد آہن

پاکستان اسٹیل مل کے سربراہ حق نواز اختر کی آپ بیتی

مرتبہ: عبادت اللہ خان

ناشر" دانیال اکیڈمی، کراچی

سن اشاعت: 2006

صفحات: 335

وعلیکم السلام

مزاحیہ شاعری۔غزلیات اور دیگر منظومات

مرتبہ: امیر السلام ہاشمی

ناشر: بزم نشور شعبہ تصنیف وتالیف کراچی

سن اشاعت: 1994

صفحات: 160

کہہ گیا ہوں ہنسی میں کیا کیا کچھ

مجھ کو سمجھے خدا کرے کوئی

وہ آئیں گھر میں ہمارے
خاکوں کا مجوعہ
کتاب میں ندیم قاسمی، پروفیسر عزیز احمد، فیض، پروفیسر ممتاز حسین، علی سردار جعفری،
رئیس امروہوی، صہبا لکھنوی، حمایت علی شاعر کے خاکے شامل ہیں!
مصنف: عبدالقوی ضیاء علیگ
ناشر: بزم تخلیق ادب کراچی
سن اشاعت: 1997
صفحات: 224

انجم اعظمی-حیات اور ادبی خدمات
مرتبہ: ڈاکٹر مشرف احمد
ناشر: کراچی رائٹرز ایسوسی ایشن، کراچی
سن اشاعت: 1997
صفحات: 338

گوشے اور جالے

احمد صغیر صدیقی کی متفرق تحریریں

ناشر: کتابیات پبلیکیشنز کراچی

سن اشاعت: 2002

صفحات: 160

حکیم احمد شجاع اور ان کا فن

مصنف: ڈاکٹر اے بی اشرف

ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی

سن اشاعت: 1987

صفحات: 296

پھولوں کے گیت

بچوں کے لیے اختر شیرانی کی نظمیں

مرتبہ: ڈاکٹر یونس حسنی

ناشر: ندیم بک ہاؤس۔ لاہور

سن اشاعت: 1993

سوانح حیات۔ مولانا اللہ بخش سومرو

مرتبہ: پروفیسر میر محمد مقبول سومرو

مصنف نے کراچی سے شائع کروائی

سن اشاعت: 2009

صفحات: 167

سہ ماہی تجدید نو-لاہور

مدیر: عذرا اصغر اور شبہ طراز

آغا سہیل نمبر

اپریل تا جون 2009

صفحات: 272

زیست کراچی اور نیا ورق ممبئی کے دو شمارے

آغا جانی کشمیری اور ان کی خودنوشت سحر ہونے تک

آغا جانی کشمیری، نواب کشمیری کے چچازاد بھائی، وہی نواب کشمیری جن کا خاکہ سعادت حسن منٹو نے لکھا ہے، جنھوں نے فلم یہودی کی لڑکی میں ایک کردار کے لیے اپنے سارے دانت نکلوا دیے تھے۔

آغا جانی کشمیری 16 اکتوبر 1908 میں لکھنو میں پیدا ہوئے اور ایک طویل عمر اور بھرپور زندگی گزار کر 27 مارچ 1998 میں کینیڈا میں وفات پا گئے، تدفین ٹورنٹو، کینیڈا میں ہوئی۔ آغا صاحب کا اصل نام سید واجد حسین رضوی تھا اور وہ ممبئ کی فلمی دنیا میں آغا جانی کشمیری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ فلمی دنیا میں ان کی خدمات بحیثیت اداکار، شاعر اور مکالمہ نویس ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ آغا صاحب نے کئ فلموں کی کہانیاں لکھیں اور بہت سی فلموں کے مکالمے و منظر نامے تحریر کیے، ان کی مشہور فلموں میں انمول گھڑی، ضدی، نجمہ، ہمایوں، تقدیر، مالکن، عورت، امر، چوری چوری، جنگلی وغیرہ شامل ہیں۔

آغا جانی کشمیری نے ساٹھ کی دہائی میں اپنی زندگی کی یادوں کو سمیٹتے ہوئے

اپنی خودنوشت ’سحر ہونے تک‘ کے عنوان سے تحریر کی۔ خودنوشت کو لکھے جانے کے دوران منور آغا مجنوں لکھنوی اور پروفیسر احتشام حسین ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے 1964 میں شائع ہوئی۔ آغا صاحب نے ’سحر ہونے تک‘ کی ابتدا میں یہ واضح کردیا تھا کہ: ”میں یہ کتاب نوبہار قافلوں کے لیے لکھ رہا ہوں، صرف اس لیے کہ وہ زندگی کی ان ٹھوکروں سے بچ سکیں جو میں نے اس رہگزر میں کھائی ہیں۔“

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ فلمی دنیا کی رنگینیوں کے درمیان ایک بھرپور زندگی گزارنے والے آغا صاحب کی خودنوشت ' سحر ہونے تک ' کے مطالعے کے بعد نوبہار قافلے بصد شوق وہ ٹھوکریں کھانا چاہیں گے جن سے ان کو بچانے کی غرض سے آغا

صاحب نے یہ کتاب تحریر کی تھی۔ یہ بھی ایک حقیقیت ہے کہ آغا جانی کشمیری نے اپنی خودنوشت میں بلاکم وکاست اپنی داستان حیات اپنے قاری کے سامنے بیان کی ہے اور جو ڈاکٹر سید عبداللہ کی بیان کردہ آپ بیتی کی اس تعریف پر پورااتری ہے کہ : " آپ بیتی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلف اور سادہ احوال زندگی پر مشتمل ہو۔"

اس ضمن میں پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ " آپ بیتی، جگ بیتی بھی ہوتی ہے کیونکہ ایک فرداپنے خاندان، ماحول، علمی اداروں، تحریکوں، شخصیات، تہذیبی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے دوچار ہوتا ہے، ان سے بہت کچھ لیتا ہے اور شاید تھوڑا بہت انہیں دیتا بھی ہے"۔

سحر ہونے تک' کے مصنف نے اپنے دور کی تاریخ، تمدن ، معاشرت اور عادات و' اطوار کو اس طور بیان کیا ہے کہ کتاب میں ایک الگ ہی طرح کا رنگ نمایاں ہوگیا ہے۔

یہاں آغا جانی کشمیری کی 'سحر ہونے تک' سے چند دلچسپ اقتباسات پیش خدمت ہیں :

ایک تھے مولانا سبط حسن مرحوم۔ بے پناہ شاعر، بے پناہ انشاء پرداز، بے پناہ مقرر۔۔ ان کا طرز بیاں، معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت و بلاغت کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ نظمیں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی کہیں۔ موسیقی پر ایک کتاب لکھی جو ان کے لڑکے سالک لکھنوی کے پاس ہے۔ ان کی مجالس میں شعیوں کے علاوہ دوسری قوم کے حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔ طرز ادا خدا نے وہ بخشی تھی کہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع، محرم کی مجلس میں کہرام مچا ہوا ہے، سب بے تحاشا رو رہے ہیں۔ کچھ سنائی نہیں دیتا اور یہ صرف ہاتھ کے اشاروں سے سب کچھ سمجھا رہے ہیں اور سب کچھ ہر ایک کی سمجھ میں آرہا ہے۔ سحر بیانی کا یہ عالم کہ ایک مجلس میں بارش ہونے لگی، ایک جملہ انہوں نے کہا

کاش یہ پانی کربلا میں برس جاتا

سنتے ہی ہر آنکھ بادل کی طرح برسنے لگی۔

کسی ایک آدمی کو پانی سے بچنے کے لیے اٹھتے نہیں دیکھا۔ میں تو چھت کے نیچے محفوظ بیٹھا تھا۔ ان کی سحر بیانی کی انتہا میں نے کانگریس کی ایک میٹنگ میں دیکھی تھی۔ مولانا کو بخار تھا، ایک سو تین ایک سو چار ڈگری۔ نہ جانے کس طرح لوگ ان کو پکڑ لائے۔ کم از کم دو لاکھ آدمیوں کا امین الدولہ پارک میں

مجمع تھا۔ ملک کے نمایاں لوگ گاندھی جی، نہرو، حسرت موہانی، سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد موجود تھے۔ غلامی پر بولنا تھا۔ ہر شخص کو پچیس منٹ دیے گئے تھے۔ اور جب یہ بے پناہ شخصیت کا مالک ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر کے بعد ڈنڈا ٹیک کر کھڑا ہوا ہے تو ہو پچیس منٹ کے بعد دو لاکھ کا مجمع تالیں بجاتا تھا، گاندھی جی اور دوسرے لیڈر منت کرتے تھے اور یہ پھر بولتا تھا۔ سوا گھنٹے یہ شخص بولتا رہا، پھر بھی کیا ہندو کیا مسلمان کسی ایک کا دل نہیں بھرا تھا۔ اگر یہ سیاست کی دنیا میں آ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔

ایک تھے اس زمانے کے شاید سب سے زیادہ بوڑھے جن کی عمر سو سے اوپر ہو گی۔ ان کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ ایک روز بازار میں میرے والد صاحب کو مل گئے، انہوں نے کچھ روپے ان کی نذر کیے اور گھر کھانا کھلانے بھی لے گئے۔ میں نے کٹے ہوئے ہاتھوں کی وجہ پوچھی تو میرے والد صاحب نے ان کے سامنے بتایا کہ یہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے نہ جانے کتنے محتاجوں کو امیر بنا دیا۔ کسی بھی بگڑے ہوئے اور تباہ شدہ نواب کو پکڑا اور کہا کہ اگر لاکھ دلوادوں تو پچاس ہزار دوگے ؟، اس نے کہا جی ہاں۔ ان کے نام کا وصیت نامہ نواب مرحوم کے ہاتھ کی تحریر میں تیار کیا۔ خاندانی شجرہ تیار کیا اور مسل تیار کی اس زمانے کے مرحوم کاتب کی تحریر میں۔ ان کاغذات کو جہاں جہاں سے چاہا دیمک سے

چٹوا دیا۔ خاص خاص جگہ پر اپنے تیار کیے ہوئے رنگ سے دھبے ڈالے اور کچھ دن بعد ان ٹوٹے ہوئے نواب صاحب سے کچہری میں مقدمہ دائر کروادیا۔ اس عجیب و غریب آدمی کا ہر کاغذ ولایت تک بھیجا گیا۔ کوئی شناخت نہ کر سکا اور فیصلہ ہمیشہ انہی کے حق میں ہوتا تھا کہ یہ کاغذات سو سال پرانے ہیں اور یہ تحریر انہی نواب نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔

اسی طرح کا ایک وصیت نامہ ایک نواب صاحب کی تحریر میں تیار کرنا تھا۔ ان مرحوم نواب کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ اس شخص نے کڑکڑاتے جاڑے میں ٹھنڈے پانی سے نہا کر وہ وصیت نامہ تحریر کیا اور اس طرح رعشہ کی کیفیت تحریر میں پیدا کی۔ نہ جانے کتنے نوابوں کو دولت دلوادی اور خود بھی کمائی۔ آخر کار پکڑے گئے اور انگریز گورنمنٹ نے ان کے دونوں ہاتھ کٹوا دیے۔ یہ واقعہ لکھنو میں بھی اسی طرح مشہور ہے۔

وہ سامنے ہے نواب آصف الدولہ کا امام باڑہ۔ اتنا بڑا امام باڑہ ساری دنیا میں دکھائی نہیں دے گا۔ یہ ہزاروں اوپر بنے ہوئے ایک ہی قسم کے در ہیں۔ زمین کے اوپر بھی اور زمین کے نیچے بھی۔ یہ بھول بھلیاں کے نام سے مشہور ہیں، بہت سے انگریز اس میں پھنس کر جان دے چکے ہیں۔ ہر دروازہ ایک ہی قسم کا۔ جہاں ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے اور گھوم کر دیکھا تو تو پیچا سوں

ویسے ہی دروازے دکھائی دیں گے۔ جانتے ہیں یہ امام باڑہ کیونکر بنا۔ رات کو بنایا جاتا تھا، صرف رات کو۔ جب لکھنو میں قحط پڑا، نواب آصف الدولہ نے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ کیسے کیسے شریف اور رئیس، کیسے کیسے اونچے خاندان والے، سب ہی رات کی تاریکی میں بنایا کرتے تھے۔ روشنی جلانے کا حکم نہ تھا۔ کوئی کسی کو پہچان نہ سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ پہچاننے کی کوشش بھی نہ کرتا تھا۔ سب ہی ایک دوسرے سے منہ چھپاتے تھے، اس طرح کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے والوں کے بچے بھی پل گئے۔ جبھی تو اس وقت کے ہندو مسلمان اپنی اپنی دکانیں صبح یہ کہہ کر کھولتے تھے:

جس کو نہ دیں مولا، اس کو دیں آصف الدولہ۔

ایک تھے لکھنو میں میر مچھلی۔ نو دس سال کی عمر میں میں نے خود دیکھا ہے کہ آلتی پالتی جمائے پانی پر اس طرح بیٹھے ہیں جیسے کوئی فرش پر بیٹھے۔ ایک زانو پر حقہ رکھا ہے اور پی رہے ہیں۔ آدھے گھنٹے تک میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ صرف پیروں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کی جنبش سے پانی پر قائم رہتے تھے۔ کیا مجال جو ذرا بھی ہل جائیں۔ حسین آباد کے تالاب میں پیراکی کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ شہریوں کے علاوہ بڑے بڑے انگریز افسر بھی اکثر یہ منظر دیکھنے آیا کرتے تھے۔

ایک تھے سجاد علی خاں، بنوٹیے۔ لکڑی کے سب سے بڑے استاد۔ سینکڑوں آدمیوں کے مجمع سے لکڑی گھماتے نکل جایا کرتے تھے۔ ان کا ایک منظر مین نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نواڑ کی چارپائی کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ دیا گیا۔ اس زمانے کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر اور بہت سے حکام وہاں موجود تھے۔ کیونکر اور کس طرح ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن بیس منٹ تک اس بنوٹیے نے پلنگ پر لیٹ کر ایک چھوٹی سی لکڑی چاروں طرف تیزی سے گھمانا شروع کی۔ اتنی تیزی سے کہ لکڑی کا ایک جال سا پلنگ کے چاروں طرف بن گیا۔ جدھر سے کبوتر نکالنا چاہے ادھر سجاد علی خاں کی لکڑی موجود۔ کبوتر پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ چارپائی کے باہر کسی طرف سے نہیں نکل سکا۔ دو منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ ان کی لکڑی رکی اور کبوتر اڑ گیا۔

ایک صاحب اور یاد آ گئے۔ مقبرے کے سید مصطفیٰ عرف مچھو بھائی۔ میں والد کی انگلی پکڑے ہوئے بازار سے گزار رہا تھا۔ دن کے دو بجے کے قریب کہ مچھو بھائی دکھائی دیے۔ اسی وقت کابلی والا بھی اپنا خوانچہ سر پر رکھے وہاں سے گزر رہا تھا۔ والد نے خوانچہ اتروایا اور مچھو بھائی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

کھاتے ہو؟

کہنے لگے: واللہ ابھی کھانا کھا کر آ رہا ہوں

والد نے کہا: دو روپے دوں گا

کہنے لگے: بہت کم ہیں

والد نے رقم دوگنی کر دی۔

کہنے لگے: پانچ دے دیجیے گا۔

فیصلہ ہوگیا۔

اس دبلے پتلے ڈیڑھ پسلی کے آدمی نے پکے چار سیر کابلی مٹر کھائے۔ پکے چار سیر آلو کھائے۔ والد نے کہا: اور یہ کھٹائی کی چٹنی؟

جو ایک ہنڈیا میں لبالب بھری تھی اور نہ جانے کتنی لال مرچیں اور پیاز نمک، ان سب کی بھی شرط تھی۔

کہنے لگے؛ بہت خوب، آٹھ آنے اور ہوں گے۔

وہ بھی پی گئے اور کھا گئے۔

والد کی زیادتی تھی، ان کو پانچ گھنٹے گھر پر روکا کہ شاید مر جائے۔ مگر واہ! شام کو چائے پی اور فرمانے لگے: کچھ مٹھائی کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ کیونکہ مٹھائی والے کی .برابر آواز آ رہی تھی۔ والد نے کہا: ضرور کھاؤ شاید اسی بہانے مر جاؤ۔

باہر آ کر سیر بھر برفی کھائی۔ کھا کر والد کی طرف دیکھا۔ والد نے کہا: بس اب رحم کرو، یہ لو اپنے ساڑھے پانچ روپے اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

روپے لے کر مسکراتے ہوئے سلام کر کے چلے، مگر جاتے جاتے والد پر جملہ چپکا گئے کہ شکریہ، جب پھر کبھی کھجلی ہو تو یاد کر لیجیے گا ناچیز کو۔

ایک تھے میر بنیاد حسین جو سیتاپور کے رہنے والے تھے۔ فلم انڈسٹری کے ڈاکٹر صفدر آہ کے دادا۔ میرا بچپن، ان کی ضعیفی۔ بڑے سے بڑا پہلوان خواہ گاما ہو یا امام بخش، ہندو ہو یا مسلمان، جب بھی کشتی لڑنے لکھنو آتا تو پہلے ان کے پیر چھوتا تھا۔ یہ بیحد سفید رنگ کے ایک پتلی کے آدمی تھے۔ کرتا اور پائجامہ پہنا کرتے تھے۔ یہ لکڑی کے بھی :بہترین استاد تھے۔ ایک واقعہ چشم دید بیان کر دوں

جاڑے کا زمانہ، ایک کمرے میں میں، میرے والد مرحوم اور میر بنیاد حسین، حلوہ سوہن کھا رہے تھے۔ بالائی والی کشمیری چائے کا انتظام تھا۔ اتنے میں

پانچ آدمی ہاتھوں میں لکڑیاں لیے آ گئے اور آتے ہی استاد کو برا بھلا کہنے لگے۔ کچھ پچھلی دشمنی تھی۔ اس زمانے میں موٹا پیسہ بھی چلا کرتا تھا۔ استاد نے میرے سامنے ایک موٹا پیسہ رومال میں جلدی سے باندھا اور انگنائی میں نکل آئے اور ان پانچوں آدمیوں پر حملہ کردیا۔ رومال بجلی کی رفتار سے ہوا میں گھوم رہا تھا، لکڑیوں سے بچنے کے لیے استاد بجلی سے زیادہ تیز گھوم رہے تھے۔ جس کے موٹا پیسہ پڑا، وہ گرا۔ استاد کے صرف دو لکڑیاں پڑیں اور دس منٹ کے اندر یہ پانچوں نوجوان بے ہوش پڑے تھے اور میر بنیاد حسین بڑے اطمینان سے ان بے ہوش آدمیوں کی رگیں میرے والد کو دکھا کر لیکچر دے رہے تھے کہ دیکھو، اگر یہاں ہلکی سی چوٹ پڑے تو آدمی صرف بے ہوش ہوجاتا ہے اور اس جگہ ذرا ہٹ کر پڑ جائے تو مر جاتا ہے۔ دس منٹ میں کیا کر گیا وہ موٹا پیسہ اور یہ سو برس کا بوڑھا، جو مجھے آج تک جادو سا معلوم ہوتا ہے۔

ایک تھے امراؤ صاحب، بالکل پاگل تھے۔ چوسر کھیلتے تھے اور ناممکن پانسوں کا نام لے کر وہی پھینک دیا کرتے تھے۔ انہی کی بتائی ہوئی ایک ترکیب نے اس زمانے میں ایک بڑی بازی جیت لی تھی۔

سائمن کمیشن لکھنو آیا۔ قیصر باغ میں بہت بڑی دعوت، پولیس کا سخت پہرہ، کیونکہ کئی مقامات ہر سائمن واپس جاؤکے نعروں سے ہندوستانی اس کا استقبال

کر چکے تھے۔ لکھنو میں انگریز حکام نے پورا انتظام کیا تھا کہ کوئی ان کے قریب نہ پہنچ سکے۔ امراؤ صاحب نے ترکیب بتائی کہ آج کل ہوا قیصر باغ کی طرف کی ہے۔ بڑے بڑے کنکووں پر 'سائمن گو بیک' لکھو اور اس طرح پیچ لڑاؤ کہ کنکوے کٹ کٹ کر ٹھیک اس پارٹی میں گریں۔ یقین مانیے۔ پارٹی ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے افسر موجود تھے۔ پولیس اور ملٹری کا پہرہ دور دور تک تھا اور پارٹی میں سینکڑوں کنکوے کٹ کٹ کر گر رہے تھے جن پر لکھا ہوا تھا 'سائمن گو بیک'

آزادی کی یہ جنگ کچھ لوگوں کی نہیں بلکہ دیش کے بیالیس کروڑ لوگوں کی جیتی ہوئی تھی جس میں اس پاگل نے بھی حصہ لیا ہے۔

آیئے گومتی کی ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے رفاہ عام اور گولہ گنج کے محلوں کی سیر کرلیں۔ تانگہ مل نہیں رہا، اکالے لیں۔ یہ دوپلی ٹوپی اب تک یہاں پہنی جاتی ہے ؟ ہماری اور آپ کی طرح موٹی انگریزی ہیٹ نہیں پہنتے۔ ارے یہ دوپلی ٹوپی تو اکے والے کی، تیز ہوا سے اڑی جاتی ہے۔ ہر دفعہ ہاتھ سے روکتا ہے۔ کہیں سچ مچ ہوا سے اڑ نہ جائے۔ آپ سے کیا، آپ خاموش رہیے، نہیں تو یہ اکے والا ایسا جملہ چپکا دے گا کہ جنم جنم یاد رہے گا۔ یہ لکھنو ہے، اجی چھوڑیے

تو شوق فرمایئے، دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔

بھیا اکے والے ! ایسی ٹوپی کیوں پہنتے ہو جو تیز ہوا سے اڑ جائے ؟

حضور! یہ غیرت دار ٹوپی ہے، ہوا کے اشارے سے اڑ جاتی ہے، آپ کی بے غیرت موٹی ہیٹ تھوڑی ہے کہ سو جوتے مارو پھر بھی وہیں کی وہیں جمی رہتی ہے۔ ابے کمہار کے لونڈے، ذرا بچ کے، ابے ہٹ کے چل نہیں تو چپاتی بن جائے گا۔

سن لیا جواب آپ نے؟ منع کیا تھا کہ یہ لکھنو ہے۔ سمجھ بوجھ کے جملے باری فرمایئے گا۔

ایک بہت موٹے آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے اکا رکوایا۔ کیونکہ اکے میں دو آدمی تھے اور حکومت کی طرف سے تین آدمیوں کے بیٹھنے کی اجازت ہے۔ ذرا ہم کو بھی امین آباد چھوڑ دینا۔ بہت موٹے آدمی نے اکے والے سے کہا۔

اکے والے نے معصوم بن کر جواب دیا: صرف تین آدمیوں کو بٹھانے کی اجازت ہے، چار کو نہیں

موٹے صاحب ہنس کر کہنے لگے: دو بیٹھے ہیں، تیسرا میں ہوں، یہ چار کہاں سے ہو گئے؟ بھنگ پیے ہے کیا؟

اکے والے نے تیور بدل کر کہا: غلط فہمی میں نہ پڑیے گا، آج ہی کسی لکڑی کی ٹھیکی پر اپنا وزن کرا لیجیے، ڈھائی گدھوں کے برابر نکلے گا آپ کا وزن حضور۔

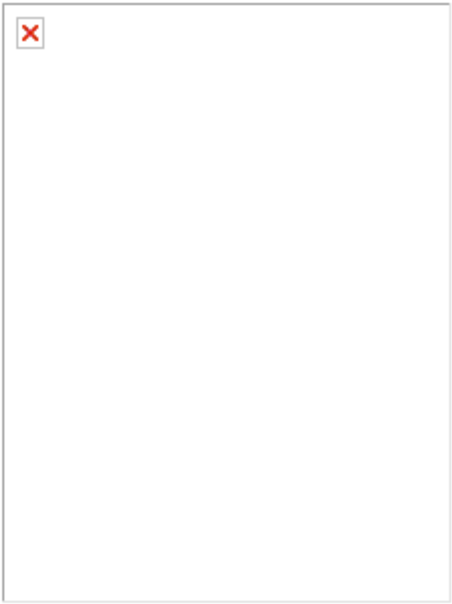

لیجیے یہ آگئی بیرسٹر آنند نرائن ملا کی کوٹھی۔ روز مشاعرے ہوتے ہیں یہاں۔ ایک مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا تھا۔ منظور صاحب کو مشہور استاد صفی لکھنوی کے بیٹھے ہیں اور شعیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر، ان کا ایک شعر کانوں میں گونجا کرتا ہے:

دیوانہ ہے اور وسعت دنیائے تخیل
وہ بھی نظر آتا ہے جو موجود نہیں ہے

بے مثل شاعر حضرت آرزو لکھنوی کے ایک مطلع نے ہنگامہ مچا دیا تھا مشاعرے میں، فرماتے ہیں:

نقش قدم اس کا کہ مرا خط جبیں ہے
اب ایک ہیں دونوں پہچان نہیں ہے
کیا خوب تھا ایک اور شعر:

خلوت کدہ دل کا بھرم جائے گا اے شوق
آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

اس سے قبل کہ کلکتہ چھوڑیں، آیئے آپ کو ایک عظیم شخصیت آغا حشر سے ملوا دیں جو ہندوستانی تھیٹر کا بے تاج بادشاہ مشہور ہے۔ آدمی بیحد دلچسپ، اندھا دھند گالیاں بکنے والے اور بڑی خوبصورت گالیاں۔ ان کو جوئے سے سخت نفرت تھی۔ کلکتہ سے کہیں کمپنی باہر جانے والی تھی اور بڑے بڑے ایکٹر مانگ پتہ کھیل رہے تھے۔ ایک نے ایک روپے کا بادشاہ مانگا تھا۔ دوسرا تاش کی گڈی ہاتھ میں ہے، ایک پتہ اس کے طرف کھلا رکھتا تھا، اور ایک اپنی طرف۔ ہر پتے پر وہ کہتا تھا 'بادشاہ اندر' اور دوسرا کہتا تھا 'بادشاہ باہر'۔ اور لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ اندر سے آغا صاحب آ گئے۔ موٹی سی گالی 'سے کر چیخے: اس بادشاہ کی تو۔۔۔۔ جو ایک روپے میں اندر چلا آئے اور ایک روپے میں باہر چلا جائے۔
سب اٹھ کر بھاگے۔
ایک بار کسی نے کہہ دیا کہ حشر صاحب صرف اردو جانتے ہیں، ہندی اور سنسکرت نہیں۔ غصہ آگیا اور بھیشم پرتگیا کے نام سے ایسا نایاب ڈرامہ لکھا کہ بس۔
یہ ایک ایسا ڈرامہ نویس تھا جس کا مثل ڈرامے کی دنیا آج تک نہ پیدا کر سکی۔

اگر اسے ہم ہندوستان کا شیکسپیئر کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ شراب کے خلاف ایک ڈرامہ لکھا
۔ دو سال کلکتے میں چلتا رہا۔ یہ اثر ہوا کہ سینکڑوں شراب پینے والوں نے واقعی توبہ
کر لی۔
ایک دن خود پیئے جھومتے جا رہے تھے ۔کچھ لوگ قریب آئے ۔بولے، حضور قسم لے
لیجیے ہم نے محض آپ کی بدولت شراب چھوڑی اور آپ خود پیئے ہوئے ہیں
ہنس کر بولے۔ایک رائٹر اگر نہ پیئے تو اس کو شراب کی اچھائی.برائی کا پتہ کیسے چلے ؟

ممبئی کی اس بلڈنگ میں جہاں ہم اور کمال امروہوی مقیم تھے ایک بار شادی ہوئی۔ قسم
قسم کے کھانے پکے۔ ہم لوگوں کو نہیں بلایا گیا۔ ہم نے ایک قریب کی دکان سے ،جہاں
سینگ کے کنگھے بنتے تھے، بہت سا.برادا خریدا اور حجام کی دکان سے بہت سے بال
سمیٹے۔ ٹھیک اسی وقت جب سارے مہمان کھانا کھانے بیٹھے ہم نے آگ پر.برادا چھڑکا
اور مٹھی بھر بال ڈال دیے۔ پوری بلڈنگ کی سانس گھٹنے لگی۔ کیسا کھانا ؟ تمام مہمان
ابکائیاں لیتے اور قے کرتے بھاگے۔
میزبان اور ان کے ایک عزیز ہمارے پاس آئے۔ ہاتھ جوڑنے لگے، ہم نے کہا: واہ
واہ یہ کیا بات ہوئی، ہم نے اگر یہ دوا نہیں بنائی تو ہمارا پندرہ روپیہ مٹی میں مل جائے
گا۔ ہم نہیں مانتے اور کیوں مانیں جب آپ لوگوں کو اتنی شرم

نہیں ہے کہ ہم پڑوسیوں کو کھانے کی دعوت ہی دے دیتے۔
ان لوگوں نے پندرہ روپے تو اسی وقت جیب سے نکال کر ہمیں دے دیے اور نیچے جا کر ہمیں بہت سی بریانی، سالن، روٹیاں اور مٹھائی بھیجی۔ یہ واقعہ آج بھی کمال صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو مزے لے لے کر دوہرایا جاتا ہے اور ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا ہے۔

ایک دن جوش صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ میں اور کچھ ادیب پیروں کے پاس بیٹھے تھے۔
:الفاظ پر قدرت رکھنے والے جوش نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا
وقت بھی کیا کمینی چیز ہے۔ ذرا دیر تو قائم رہے۔ اس وقت جیسے تم لوگ محبت سے" میرے پیروں کے پاس بیٹھے ہو، اسی طرح یہاں بمبئی میں کبھی کبھی آرزو صاحب مرحوم (آرزو لکھنوی) کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا اور آرزو رکھتا تھا کہ کوئی نئی "بات، کوئی آبدار موتی اس سمندر کی زبان سے نکلے تو میں اپنے دامن میں چھپا لوں۔

عجیب ظلم کی بات ہے کہ میں اپنے ایک دشمن نما بے مثل دوست کو بھولے جا رہا ہوں جس کا نام بابو راو پٹیل ہے۔ فلم انڈیا میگزین کا اڈیٹر۔ یہ آدمی عجیب و غریب آدمی ہے۔ یہ کیا ہے، یہ خود نہیں جانتا۔ یہ بھٹکا ہوا دماغ بے مثل و بے نظیر انگریزی لکھتا ہے۔ اس کے لکھنے میں آگ ہی آگ ہے۔ یہ نہ معلوم کس حرکت

پر، شاید بچپن میں کسی سے بگڑ چکا ہے جس کا بدلہ غصے میں آ کر ہر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سے لینا چاہتا ہے۔ اس کے صحبت میں بیٹھ کر آپ محسوس کریں گے کہ آپ ابھی زندہ ہیں، مرے نہیں۔

سخت ترین ہندو مسلم کشمکش کا زمانہ۔ پاکستان بن چکا تھا۔ اس کا باورچی مسلمان اور کٹر قسم کا۔ میں نے ایک دن پوچھا' بیٹا یہ کہیں زہر نہ دے دے کھانے میں، پورا گھرانہ میٹھی نیند سو جائے گا۔

بابو راؤ کہنے لگا: تو مسلمان ہے، یہ بھی نہیں جانتا کہ مسلمان سامنے سے آ کر لڑتا ہے، چوری چھپے نہیں۔

ایک زمانے میں جب ہم مڈل ایسٹ سے سخت مفلس ہو کر پلٹے ہیں تو ہر دوست کو پرکھ کر دیکھ لیا۔ نہ ہندو دوست کام آیا، نہ مسلمان۔ ہم ایک دن لائن میں کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ بابو راؤ اپنے بڑے موٹر پر گزرا۔ مجھے دیکھ کر موٹر روکی۔ پہلا جملہ یہ تھا:

ٹیکسی کیوں نہیں لی تو نے ؟

میں نے کہا: تیرا اجارہ ہے، نہیں لی۔

کہنے لگا: مفلس ہو رہا ہے آج کل ؟

میں نے جل کر کہا: تجھ سے کیا کمینے

اور اس نے گھسیٹ کر موٹر میں بٹھا لیا اور آہستہ آہستہ ہمیں کھلوا ہی لیا اور ہم کھلے۔ کچھ انکم ٹیکس اور کچھ گھر کے خرچ کے لیے چند ہزار کی ضرورت تھی اور سخت ضرورت۔

کہنے لگا: کل دن کے کھانے پر آ جائے گا روپیہ۔ روتا کیوں ہے، میاں بھائی بن۔

میں نے کہا: ابے بہت دیکھے ہیں تیرے ایسے۔ جب کٹر قسم کے مسلمان دوست کام نہ آئے تو ہندو کیا کام آئے گا؟

صاحب دوسرے دن کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ گھنٹی بجی اور اس کا ڈرائیور ہزاروں روپے کا چیک دے گیا۔ اور اس کمبخت کافر نے کبھی پلٹ کر روپوں کا تقاضہ ہی نہیں کیا۔ جب بھی فراہم ہوا، میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے دیا، پھر بھی کچھ ضرور باقی رہ گئے ہوں گے۔

آغا جانی کشمیری فلم جوانی کا نشہ میں

خواجہ احمد عباس کی بیوی مجی، کیسے کہوں کہ مرگئی۔ بیحد پڑھی لکھی، دھان پان، ہمیشہ کی بیمار، مگر اک شگفتہ کلی، جو ایک تبسم کے لیے نہیں کھلی تھی بلکہ جس نے تبسم کو اپنی زندگی بنا لیا تھا اور زبان کی گل فشانی ؟ توبہ توبہ۔ ہزار محبوب ایک طرف اور اس کی کوثر میں دھلی ہوئی پاکیزہ او ر ستھری زبان ایک طرف۔ ایک دن میں نے چھیڑنے کو پوچھا ۔آخر آپ نے کیا سمجھ کر خواجہ احمد عباس سے شادی کی ؟ایک ایسی معصوم مسکراہٹ کے بعد جواب ملا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔ کہنے لگیں صرف ایک وجہ سے، کیونکہ باچھو، جو خواجہ صاحب کا پیار کا نام ہے، گنجے ہیں اس لیے میں نے ترس کھا کر شادی کرلی۔ میں نے مسکرا کر کہا: میں باچھو سے زیادہ گنجا ہوں، مجھ پر کیوں ترس نہ آیا حضور کو ؟ کہنے لگیں: آپ گنجے ضرور ہیں مگر کشمیری خطرناک گنجے ہیں، یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہتی کہ بدذات بھی ہیں۔

فارسی کے اس شعر کی طرف اشارہ تھا جس کا دوسر امصرع ہے کہ:

اول افغان، دوم کنبوہ، سوم بدذات کشمیری

میں نے کہا آپ نے آکر کہہ ہی دیا

مسکرا کر بولیں: بہت سوچنے کے بعد ہمت کی ہے بدذات کہنے کی۔ سوچتی تھی آپ کے منہ پر نہ کہوں۔ آپ کہیں خوشامد نہ سمجھیں اور کہیں آپ کا دماغ نہ خراب ہو جائے۔

دیر تک میں اس جملے پر ہنستا رہا۔ آج یہ چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو یہی جملہ یاد کر کے رو رہا ہوں۔

زیارتوں پر جاتے وقت پانی کے جہاز میں ایک بوڑھے جن کی عمر قریب نوے سال کی ہوگی، سرخ و سفید رنگ کے، جہاز میں گھسے۔ میں عرب سمجھا۔ مگر فوراً ہی ان کے ان کے چہرے کے نقوش ان کے ہندوستانی ہونے کی چغلیاں کھانے لگے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ غصے سے کہنے لگے: میرے دوست کو کھا لیا، کیا اب مجھے کھانے کا ارادہ ہے؟۔ میں مسکرا دیا، پاگل سمجھ کر۔ کہنے لگے: وہ کافر مر گیا اور مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ گیا۔ میں نے پوچھا: کون؟۔ کہنے لگے وہی الہ آباد والا کشمیری، نوابی گئی لیکن میں نے وطن نہیں چھوڑا، بیوی بچے مرے لیکن وطن نہیں چھوڑا مگر جب سے یہ بے وفا کافر مر گیا ایک ہندوستان میں اپنا نہیں دکھائی دیتا۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکالی اور میں چونک پڑا۔ یہ ان کی اور موتی لال نہرو کی تصویر تھی۔ فوراً میرا دماغ ہندوستان، لکھنو اور الہ آباد ہوتا ہوا کلکتے پہنچا۔ اب کلکتے کے

مٹیا برج میں جا کر ٹک گیا۔ بڑا سا مشاعرہ۔ استاد علامہ آرزو، قیامت کے شاعر رضا علی وحشت، مائل لکھنوی، سبھی موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا سرخ و سفید رنگ کا آدمی، گیروے کپڑے پہنے اس مشاعرے میں آیا جو جان عالم واجد علی شاہ کے مزار پر بیٹھا کرتا تھا اور یہ مطلع پڑھ کر مشاعرہ لوٹ کر چلا گیا :

کچھ اس طرح کا موافق مرا زمانہ تھا
یہ برق گرتی تھی، یہ میرا آشیانہ تھا

میں نے جھومتے ہوئے جہاز کے کھمبے کا سہارا لیتے ہوئے یہ شعر ان کی طرف دیکھ کر گنگنایا۔ بیک وقت وہ مجھ سے چمٹ گئے، اور 'تم تو مجھے جانتے ہو' کہہ کر دیر تک روتے رہے۔ اور میں بھی روتا رہا۔ پھر گھوم کر ہم دونوں نے سمندر کی طرف دیکھا جو جو نہ جانے کتنے انقلاب اپنے سینے میں چھپائے ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ہم کربلا پہنچے اور صحیح معنوں میں امام حسین کے روضے پر وہ بے کسی برستے ہوئے دیکھی جس کا جواب شاید ہی کوئی تاریخ دے سکے۔ مجھ سا گنہگار گھنٹوں روضے کو دیکھتا رہتا۔ یہ عدم تشدد کا سچا علمبردار۔ بارہ سو سال قبل کئی لاکھ کے مقابل میں صرف بہتر کو لے کر لڑا۔ تین دن کی بھوک پیاس میں کئی

لاکھ سے جنگ کرکے وہ اسلام جو رسول نے پھیلایا تھا اسے تباہ ہونے سے بچا لیا۔ یہی تو خواجہ معین الدین چشتی فرما گئے ہیں :

شاہ است حسین و بادشاہ است حسین

دین است حسین و دین پناہ است حسین

سر داد نہ داد دست در دست یزید

حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

عجیب بات یہ ہے کہ یہ کم بخت شعیہ سنی کی بحث صرف ہندوستان میں ہے اور مسلم ممالک میں بالکل نہیں ہے۔ اس بات پر مجھے خواجہ حسن نظامی یاد آ گئے جن کی قریب قریب ہر تحریر میں نے پڑھی ہے۔ مجھے ان کا رنگ بے تحاشا پسند ہے۔ ایک کانفرنس ہوئی احمد آباد میں۔ شعیہ اور سنی مولوی ایک ہی پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ نہ جانے کیونکر میں بد قسمتی کا مارا، کسی ضرورت سے احمد آباد گیا اور خواجہ صاحب کا نام سن کر وہاں پہنچ گیا۔ جب میں پہنچا ہوں تو یہ کانفرنس شروع ہو چکی تھی۔ شاید کسی سنی مولوی نے حضرت علی کو چوتھا خلیفہ کہہ دیا تھا اور ایک شعیہ مولوی اس پر بگڑ گئے تھے ۔اور قریب قریب یہ کانفرنس درہم برہم ہونے والی تھی کہ خواجہ حسن نظامی کھڑے ہو گئے۔ کیا تقریر کی اس جادو گر نے، آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس نے چیخ کر کہا: آپ سب حضرات سے صرف میرا ایمان سچا ہے اور صحیح معنوں میں میں صرف میں مسلمان ہوں۔ مت توہین کیجیے

علی ایسی شخصیت کی کہ وہ پہلے خلیفہ تھے یا چوتھے۔ اگر ان کو خلافت نہ بھی ملتی اور خلیفہ نہ بھی ہوتے تب بھی رسول کے بعد دنیائے اسلام کی دوسری اہم ترین شخصیت علی ہی کی ہوتی۔ خلافت نے علی کا مرتبہ نہیں بڑھایا بلکہ علی نے خلافت کا مرتبہ بڑھا دیا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سب شعیہ سنی مل کر تالیاں بجا رہے تھے۔

بچپن میں حسن حسین عام بچوں کی طرح پرورش پاتے تھے۔ کبھی کبھی گھر میں فاقہ بھی ہو جاتا تھا۔ لباس بھی وہی جو عام عربوں کا ہوا کرتا تھا۔ علی، رسول کی بیٹی کے شوہر، کام کرتے تھے تو کھاتے تھے۔ خلفاء راشدین کی بھی یہی شان تھی۔ اور صرف یہ رہا ہے سچا اسلامی ہی نہیں بلکہ سچا انسانی دور۔

کراچی لٹریچر فیسٹیول اور اس میں ہوئے ابن صفی پر مذاکرے کا احوال

کراچی لٹریچر فیسٹیول ہفتہ اور اتوار 2012 کے روز اپنی تمام تر رونقیں بکھیرنے کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ جمعے کی رات ڈاکٹر آصف فرخی کی دعوت پر فیسٹیول کے شرکاء کے اعزاز میں منعقدہ عشائیے میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔ مشاہیر ادب کے ساتھ ساتھ ٹی وی اور فلم سے وابستہ کئی چہرے بھی نظر آئے جن میں زیبا بختیار، راحت کاظمی اور ساحرہ کاظمی شامل تھے۔ دہلی سے تشریف لائے ڈاکٹر خالد جاوید سے ملاقات کروا کر ڈاکٹر آصف فرخی نے ہم پر گویا ایک احسان کیا، دو گھنٹے خالد صاحب اور میں، اپنے پسندیدہ موضوع یعنی ابن صفی پر بات کرتے رہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، برٹش کونسل اور ڈاکٹر آصف فرخی کی کوششوں سے اس رنگا رنگ میلے کا انعقاد گزشتہ تین برس سے جاری ہے۔ اس مرتبہ کل 136 مہمانوں کو دنیا بھر سے مدعو کیا گیا تھا۔ دو روز تک جاری رہنے والے اس فیسٹیول میں مذاکرے، مباحثے، کتابوں کی نمائش و رونمائی، موسیقی کا اہتمام کیا گیا جبکہ پہلے روز شام کے وقت مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ ادبی میلے میں برطانیہ، امریکہ، فرانس، جرمنی، انڈیا اور پاکستان سے ادیب، دانشور اور شعراء نے شرکت کی۔ کتابوں پر گفتگو ہوئی، لکھنے اور پڑھنے والوں کے درمیان

ربط بھی پیدا ہوا۔ میلے کے دوران ادبی و عصر حاضر کے موضوعات پر تھیٹر بھی پیش کیا گیا۔

عشائیے کے دوران برطانیہ سے آئی بے نظیر بھٹو کی ہم جماعت وکٹوریہ شوفیلڈ کو اخباری نمائندوں نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ اس ادبی میلے میں شرکت اور مقامی لوگوں سے مل کر پاکستان اور یہاں کے باشندوں کے متعلق وہ منفی تاثر ختم ہوگیا جو عالمی سطح پر موجود ہے۔ میرے نزدیک یہ صرف روایتی پروپیگنڈا ہے۔ پاکستانی کھلے ذہن کے مالک اور فراخ دل ہیں۔ مطالعہ کے شوقین ہیں، ملنسار اور خوش اخلاق ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر آئندہ پھر انہیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی تو وہ پاکستان آنے سے بالکل نہیں

"ہچکچائیں گی

آرٹس کونسل کے سربراہ احمد شاہ نے یہ عندیہ دیا کہ آئندہ برس کراچی لٹریچر فیسٹیول کے انعقاد میں آرٹس کونسل کا تعاون بھی شامل ہوگا۔

فیسٹیول میں اس مرتبہ انگریزی لکھنے والے ادیبوں میں وکرم سیٹھ، شوبھاڈے، بینا شاہ، اناتول لیوین، ایم ایچ نقوی، عائشہ جلال، منیزہ نقوی، احمد رشید، کاملہ شمسی، محسن حامد وغیرہ نے شرکت کی۔جب کہ اردو کے ادیبوں میں انتظار حسین، عارفہ سیدہ زہرہ، عطیہ داؤد زہرہ نگاہ، کشور ناہید، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، افتخار عارف، فاطمہ حسن، پروفیسر سحر انصاری و دیگر شامل تھے۔

ادبی میلے کے پہلے روز شام پانچ بجے جناب ابن صفی پر ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا ۔ ابن صفی برصغیر پاک و ہند کے سری ادب کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقادوں اور ادب کے علمبرداروں نے انہیں 'ادب عالیہ ' میں کبھی شمار نہیں کیا لیکن اب یہ برف پگھل رہی ہے اور ادب میں ان کو ان کا جائز مقام دینے کی باتیں کی جارہی ہیں۔
اس ضمن میں ابن صفی اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں:

مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں۔ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریق کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میرے احباب کا اعلیٰ و ارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے۔افسانوی ادب خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی شطرنج سے

نہیں بہل سکتا۔ اسی طرح ہماری سوسائٹی کے ایک بہتیرے حصّے کے لئے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے۔ تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لئے کیوں لکھوں؟ میں اسی انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔ بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ لیکن 1947 میں جو کچھ ہوا اُس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آ گئے اور چیخنا شروع کر دیا۔ "یہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ بہت برا ہوا۔" لیکن ہوا کیوں؟ تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمہارے گیت دیوانگی کے اِس طوفان کو کیوں نہ روک سکے۔

میں سوچتا سوچتا رہا۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہو گا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام سیکھے۔ اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اِسی لئے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لئے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے۔ اور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے کے لئے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔"

مذاکرے کے شرکاءمیں جامعہ ملیہ دہلی کے ڈاکٹر خالد جاوید، فرزند ابن صفی جناب احمد صفی، جناب شکیل عادل زادہ اور ڈاکٹر شیر شاہ سید شامل تھے جبکہ صدارت کے فرائض ادیب و مترجم بلال تنویر نے سرانجام دیے۔ جناب احمد صفی نے حاضرین کو بتایا کہ : "ایک سوال ہمیشہ سے ذہن میں اٹھتا ہے کہ پلپ فکشن یا مقبول عوامی ادب تو معاشرے کے ایک خاص طبقے ہی میں پڑھا جاتا ہے اور اسی میں ختم ہو جاتا ہے۔ اہل علم و فراست اس پر توجہ نہیں دیتے تو پھر کیا ابن صفی کے ادب کو پلپ فکشن کہا جا سکتا ہے؟ ان کے پڑھنے والوں مین رکشہ ٹیکسی

والے سے لے کر علما، ادیب، دانشور اور شعرا سب ہی شامل ہیں۔ جب ابو (ابن صفی) گھر سے نکلتے تھے تو نکڑ پر بیٹھا پان والا بھی ان سے ان کے نئے آنے والے ناول کے بارے میں سوال کرتا تھا۔ ان کے پڑھنے والوں کا اسپیکٹرم بہت وسیع ہے۔ تو ایسے ادب کو کوئی اور نام دینا پڑے گا۔ ممتاز محقق خرم علی شفیق ایسے ادب کو جسے معاشرے کے ہر طبقے میں پذیرائی حاصل ہو جمہوری ادب قرار دیتے ہیں اور ابن صفی کو سر سید، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے سلسلے کی کڑی قرار دیتے ہیں"

فزیشن و سرجن ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک جانے پہچانے افسانہ نگار بھی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ 'پاکستان نیشنل فورم آن وومین ہیلتھ' کے صدر کے عہدے پر بھی فائز ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ: " میں 2005 کے زلزلے کے بعد رفاہ عامہ کے کام کے لیے شمالی علاقاجات میں گیا تھا۔ مانسہرہ میں ہمارا پڑاؤ تھا۔ مقامی لوگوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، ہم آپ کو قریب واقع ایک چھوٹے سے شہر بفہ میں لے چلتے ہیں، یہ شہر ترکوں کا آباد کیا ہوا ہے اور مانسہرہ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ شہر میں داخل ہوتے وقت میری نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا کہ یہاں ابن صفی کے ناول کرایے پر ملتے ہیں، یہ سٹی ہال کی لائبریری کی جانب سے آویزاں کیا گیا تھا جہاں ابن صفی کے ناول کثیر تعداد میں دستیاب تھے۔ ہم جب تک وہاں رہے، فرصت کے اوقات میں

لائبریری سے ناول لے کر پڑھتے رہے۔

مجھ سے بڑے دو بھائی تھے جو ابن صفی کے ناول چھپ چھپ کر پڑھا کرتے تھے اس لیے کہ والدہ صاحبہ کی طرف سے ناول پڑھنے پر پابندی تھی۔ یہ پابندی اس وقت ختم ہو گئی جب ہماری والدہ نے خود ایک مرتبہ ابن صفی کا ناول پڑھا اور ہمیں انہیں پڑھنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ میں نے ناظم شہر کراچی سے کئی مرتبہ کہا کہ کسی سڑک یا فلائی اوور کا نام ضرور ابن صفی کے نام پر رکھا جانا چاہیے۔ آپ اتنے بڑے بڑے فلائی اوور اور پل بنا رہے ہیں کچھ پیسہ اس شہر میں لائبریریاں بنانے پر خرچ کریں۔ لائبریریاں بنایئے اور اس میں ابن صفی کی کتابیں بھر دیجیئے۔ مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا کیونکہ پل بنانا بہت آسان ہے، لائبریری بنانا بہت مشکل۔ میں جب کبھی بھی کسی دورے پر جاتا ہوں، ابن صفی کے ناولز ضرور میرے ساتھ ہوتے ہیں۔"

جناب شکیل عادل زادہ ایک نامور ادیب ہیں، سب رنگ ڈائجسٹ کے مدیر کی حیثیت سے ان کی شہرت مسلمہ ہے۔ اردو زبان پر گرفت ہے اور اس کی تمام نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں۔شکیل عادہ زادہ نے دوران گفتگو ابن صفی سے متعلق ایک واقعہ سنایا:" سن ستر کے اواخر کی بات ہے۔ میں اس وقت ایک رسالہ نکالا کرتا تھا جس کی اشاعت بڑھانے کی خاطر یہ سوچا کہ کیوں نہ ابن صفی سے کچھ لکھوایا جائے۔ ابن صفی بہت مشکل سے راضی ہوئے اور رسالے کے لیے ایک سلسلے وار کہانی اب تک تھی کہاں کا آغاز کیا لیکن ایک قسط کے بعد بوجوہ لکھنا بند کردیا۔ جواباً میں نے الف لیلہ کے خاص نمبر کے لیے ابن صفی کے خلاف ایک مضمون لکھ کر مدیر کو روانہ کردیا۔ مضمون تو نہ چھپا لیکن چند روز بعد ابن صفی اپنی صاحبزادی کی شادی کا دعوت نامہ دینے کی غرض سے میرے گھر آئے اور کہا مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن شادی میں ضرور آنا۔ یہ ان کی بڑائی تھی اور میں اس بات سے بہت متاثر ہوا۔"

شکیل عادل زادہ نے مزید کہا کہ" مجھے یاد ہے کہ جس روز ابن صفی کا نیا ناول شائع ہوتا تھا، اس روز صدر کے علاقے ریگل میں صبح ہی سے شور بپا ہوجاتا

کرتا تھا اور ہمیں شام کو پتہ چلتا تھا کہ چودہ ہزار کاپیاں آئیں اور ختم بھی ہو گئیں۔ ابن صفی ایک یکتا و نادر روزگار شخصیت تھے، ان کی تحریر میں روانی، شوخی اور شگفتگی تھی۔ پاکستان میں ادب کے ناخداؤں نے کم تر اور برتر ادب کی درجہ بندی کی ہوئی ہے اور جاسوسی ناول نگاری کو یہ لوگ ادب میں شمار نہیں کرتے یا پھر کم تر ادب میں شمار کرتے ہیں جبکہ یورپ میں یہ صورتحال نہیں ہے۔ کوئی ادب، اعلیٰ ادب نہیں ہوتا بلکہ اس کی پیشکش اسے اعلیٰ بناتی ہے۔"

جامعہ ملیہ دہلی کے استاد ڈاکٹر خالد جاوید اس مذاکرے میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر خالد ہندوستان میں اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ناول 'موت کی کتاب' شائع ہوا ہے جس نے تیزی سے مقبولیت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر خالد نے ابن صفی پر ' ابن صفی ۔ چند معروضات' کے عنوان سے 2006 میں ایک اہم مضمون تحریر کیا تھا جس کی اشاعت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ابن صفی کے فن اور شخصیت پر تحقیقی کام کی باضابطہ شروعات ہوئی۔

تقریب سے ایک روز قبل دوران عشائیہ ڈاکٹر خالد نے راقم الحروف کو بتایا کہ انہوں نے پانچ برس کی عمر سے ابن صفی کو 'سننا' شروع کیا تھا، ان کے والد انہیں رات کے وقت ابن صفی کے ناول پڑھ کر سنایا کرتے تھے جو بقول ان کے رفتہ رفتہ ان کے خون میں شامل ہوتے چلے گئے۔

مذاکرے میں ڈاکٹر خالد جاوید نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:" جب تک کسی تحریر میں ادبی چاشنی نہ ہو ، وہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ عموما روایتی لکھنے والے کو اپنے قاری کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا اور وہ ایک 'پروڈکٹ' کی شکل میں اپنی تخلیقات کا ڈھیر لگاتا چلا جاتا ہے جبکہ سنجیدہ لکھنے والا اپنے قاری کی پسند و نا پسند کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہے۔ ابن صفی کو اس بات کا مکمل ادراک تھا۔ ہم دیکھ رہے ہیں اب ابن صفی کی تحریروں کا ایک نیا جنم ہورہا ہے۔ ہندوستان میں عارف مارہروی،مسعود جاوید، انجم عرشی، جمیل انجم، اظہار اثر اور اکرم الہ آبادی نے ابن صفی کے اسلوب کی نقل کی لیکن آج ان لوگوں کی تحریروں سے کوئی واقف نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عمران کا

کردار ایسا تھا جس نے ابن صفی کو لازوال بنا دیا۔ عمران کے کردار میں حماقت کا فلسفہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے، اگر ہم غور کریں تو ملا نصیر الدین کے کی ہر داستان کا آغاز بھی کسی حماقت ہی سے ہوتا ہے، اسی طرح 1509 میں In Praise oF Folly نامی کتاب میں ایک ولندیزی فلسفی ڈیزیڈیریس اراسمس نے حماقت کے فلسفے کو بیان کیا ہے،۔ عمران کے کردار کی حماقت کا موازنہ باآسانی کامیو کی Absurdity ، کافکا کی Redundancy اور سارتر کی Nothingness سے کیا جاسکتا ہے۔ ان مثالوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حماقت کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب جامعہ ملیہ دہلی میں کوئی طالب علم ابن صفی پر تحقیق کام کرنے کی خواہش ظاہر کرتا تھا تو اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی، اس سلسلے میں میں (خالد جاوید) نے 'بورڈ آف اسٹڈیز' میں خاصی بحث و مباحثے کے بعد ابن صفی پر تحقیقی کام شروع کرانے کی منظوری حاصل کی اور اب جامعہ ملیہ میں میری زیر نگرانی ایک ایم فل اور ایک پی ایچ ڈی کے مقالے پر کام ہورہا ہے۔ یہ اطلاع بھی آپ کے لیے اہم ہوگی کہ بات اب جامعہ ملیہ تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دیگر جامعات میں بھی ابن صفی پر تحقیق کام کا آغاز ہوچکا ہے۔ دہلی یونیورسٹی اور حیدرآباد دکن میں اس پر کام کیا جارہا ہے۔
ہندوستان میں بھی 'ادب عالیہ' کے مارے ایسے ادیب موجود ہیں جو ابن صفی کو تسلیم نہیں کرتے، اس ضمن میں راجندر یادو کی مثال پیش کروں گا جنہوں نے ایک انٹرویو میں کہا

تھا کہ بڑا ادب وہ ہے جسے لوگ بار بار پڑھیں، اس پر انٹرویو کرنے والے نے کہا کہ بار بار تو ہم ابن صفی کو پڑھتے ہیں، جواب میں راجندر یادو بولے کہ ہم ان کا ایک ہی ناول بار بار نہیں پڑھ سکتے۔"

مذاکرے کے اختتام پر حاضرین نے احمد صفی سے مختلف سوالات کیے۔ خاتون حنا جاوید نے ابن صفی کی شاعری اور اس کی عدم دستیابی کے بارے دریافت کیا، احمد صفی نے جواب میں کہا کہ ابن صفی کا پہلا شعری مجموعہ گزشتہ برس شائع ہونا تھا لیکن ان کی احمد صفی کی) کراچی سے لاہور منتقلی کی وجہ سے یہ کام تاخیر کا شکار ہوگیا اور اب ان کی) پوری کوشش ہے کہ یہ مجموعہ جلد از جلد شائع ہو جائے۔ ایک اور سوال کے جواب میں احمد صفی نے کہا کہ ابن صفی کی بنائی فلم دھماکہ کا کوئی پرنٹ انہیں تاحال نہیں مل سکا ہے، یہ فلم بازار میں دستیاب کہیں نہیں ہے، اس سلسلے میں احمد صفی نے راقم الحروف اور جناب محمد حنیف (نگراں کار ابن صفی ڈاٹ انفو) کا ذکر کیا کہ یہ لوگ فلم دھماکہ کے حصول کی خاطر کوششیں کر رہے ہیں۔

راقم الحروف نے 'ابن صفی۔ایک نئے انداز میں 'کے عنوان سے منعقد ہوئے اس مذاکرے میں ڈاکٹر خالد جاوید کی گفتگو کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی محفوظ کی جسے تین حصوں میں مندرجہ ذیل لنکس پر دیکھا جاسکتا ہے:

ڈاکٹر خالد جاوید کا ابن صفی کے فن و شخصیت پر اظہار خیال۔حصہ اول
http://www.youtube.com/watch?v=S_Obh792O8o&feature=youtu.be

ڈاکٹر خالد جاوید کا ابن صفی کے فن و شخصیت پر اظہار خیال۔حصہ دوم
http://www.youtube.com/watch?v=19lVEnsU5x8&feature=youtu.be

ڈاکٹر خالد جاوید کا ابن صفی کے فن و شخصیت پر اظہار خیال۔حصہ سوم
http://www.youtube.com/watch?v=Luo7WIl8tjo&feature=youtu.be

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی اہم ہوگا کہ جناب انتظار حسین نے ہندوستان میں ایک سیمینار میں ابن صفی سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا اور ان کی اس بات پر خاصی لے دے بھی ہوئی تھی بالخصوص گوپی چند نارنگ نے ، جو ابن صفی کے مداح ہیں، اس پر اپنے سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ راقم نے کراچی لٹریچر فیسٹیول میں اس بارے میں انتظار صاحب سے خصوصی گفتگو کی۔ جناب انتظار حسین اس ضمن میں ایک بیان ریکارڈ کروانے پر رضا مند ہوگئے جس میں انہوں نے ابن صفی کی عظمت کو تسلیم کیا اور اس بات کا عندیہ بھی دیا کہ وہ اب ابن صفی کو پڑھیں گے۔مذکورہ ویڈیو مندرجہ ذیل لنک پر جاکر دیکھی جاسکتی ہے:

http://www.youtube.com/watch?v=U3PhejNblMc&feature=youtu.be

کراچی لٹریچر فیسٹیول کا اختتام ہوا۔ منتظمین کی ہوا کا رخ بدلنے کی، کتاب سے محبت کی، باہمی تعلقات کو مضبوط تر بنانے کی، وطن عزیز کا دلآویز اور معتدل چہرہ بیرونی دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی، کوششوں کو ہر سطح پر سراہا گیا۔ منتظمین کی محنت وصول ہوئی۔ لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے، اگلے برس ایک نئے ولولے کے ساتھ اسی جگہ ملاقات کے وعدے کے ساتھ:

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

روشندان۔ جاوید صدیقی کے بے مثال خاکے

اجمل کمال کی زیر ادارت شائع ہونے والا کراچی کا ادبی مجلّہ آج ستمبر 2011 میں شائع ہوا، یہ آج کا اٹھسرواں شمارہ تھا جس میں ممبئ کی فلمی دنیا کے معروف کہانی کار و مکالمہ نویس جاوید صدیقی کے تحریر کردہ شخصی خاکے شامل کیے گئے ہیں۔ خاکے کیا ہیں، دل کو پارہ پارہ کردینے والی تحریریں ہیں۔ بقول عنایت اختر یہ خاکے انفرادیت ، لہجے کے بانکپن، اور درد مندی کی مثال ہیں۔ انہیں پڑھ کر کہیں آپ کی آنکھ نم ہوجائے گی، کہیں دل بھر آئے گا، کہیں سکتہ طاری ہوجائے گااور کہیں آپ سن ہو کر رہ جائیں گے۔ جاوید صدیقی بنیادی طور پر ایک مشاق مکالمہ و کہانی نویس ہیں ، روشندان میں انہوں نے اپنی اس صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا ہے اور خاکوں میں موجود شخصیات اور ان سے متعلق یادوں کو تمام ترجزیات کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شخصیات ہمیں اپنے اطراف میں چلتی پھرتی ، سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں، ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ان کے دکھوں میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں ۔ انسان بلاشبہ عظیم ہے لیکن خدا کی یہ عظیم تخلیق بعض اوقات اپنی کم مائیگی پر کس طرح بے دست وپا ہو کر رہ جاتی ہے، اس کا اندازہ روشندان کے کئی خاکوں کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ روشندان میں شامل چند خاکے ممبئ کے جریدے نیا ورق میں شائع ہوچکے ہیں۔

کل دس خاکوں پر مشتمل کتاب روشندان 20 نومبر 2011 کو دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ سہ ماہی آج میں شائع کیے گئے خاکوں کی تعداد گیارہ ہے۔ روشندان کو اجمل کمال جلد ہی سٹی پریس کراچی سے کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کتاب کو نئی کتاب پبلشرز۔ جامعہ نگر نئی دہلی نے شائع کیا، سرورق ایم ایف حسین کا تخلیق کردہ ہے، قیمت 250 روپے جبکہ ناشر کا پتہ و رابطہ نمبر یہ ہے:

Z-326/3, Okhla Main Road, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Phone: 65416661 - Mobile: 09313883054

ممبئی میں پچاس سے زائد فلموں کی کہانیاں لکھنے والے جاوید صدیقی نے اپنے فنی سفر کا آغاز ستیہ جیت رے کی شہرہ آفاق فلم شطرنج کے کھلاڑی کے مکالمہ نویس کی حیثیت سے 1977 میں کیا تھا۔ مذکورہ فلم کے مکالمے جاوید صدیقی نے شمع زیدی کے ساتھ مل کر تحریر کیے تھے۔ وہ محض سترہ برس کی عمر میں ممبئی آئے تھے۔ آج وہ ایک شہرت یافتہ شخص کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جاوید صدیقی روشندان میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں: خدا جانے فرشتوں کے دل میں کیا آئی کہ مجھے رامپور کے ایک ایسے خاندان میں تقسیم کردیا جہاں پڑھنے لکھنے کا رواج کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس خاندان نے علی برادران کے علاوہ اور بہت سے نامی لوگوں کو جنم دیا جن میں ایک مشہور پینٹر شاکر علی بھی ہیں۔ اسی خاندان میں حافظ احمد علی خان شوق بھی تھے جو رضا لائبریری کے پہلے لائبریرین تھے (جب یہ شاہی کتب خانہ کہلاتا تھا) اور وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے انگریزی کے طرز پر لائبریری کیٹلاگ بنوایا تھا۔"

نوے سے زیادہ فلمیں بنانے اور دولت اور شہرت سمیٹنے کے بعد ایک روز تنہا بیٹھے غم جاناں کا حساب کرتے جاوید صدیقی کو خیال آیا کہ زندگی کے سفر میں وہ بہت دور نکل آئے ہیں اور کیوں نہ ان لوگوں کی جلتی بجھتی یادوں کو صفحہ قرطاس پر یکجا کیا جائے جن کی یادیں آج بھی ان کے ذہن میں بمثل چراغ روشن ہیں۔ جاوید صدیقی کے بقول یہ خاکے نہیں ہیں بلکہ زندگی کے اندھیروں میں

کھلنے والے وہ روزن ہیں جن کی روشنی نہ ملتی تو ان کا دم گھٹ جاتا۔

یہ ان لوگوں کے قصے ہیں جو جا چکے ہیں مگر وہ جس جگہ تھے وہاں اب تک روشنی ہے " اور جب تک آنکھوں میں دیکھنے کی سکت ہے، باقی رہے گی۔ ان میں اکثر وہ ہیں جنہیں دنیا نہیں جانتی مگر دنیا کی آنکھیں تو ہمیشہ سے کمزور ہیں، اسے وہی دکھائی دیتے ہیں جن کے سروں پر اجالے ہوتے ہیں۔ وقت کے ملگجے اندھیرے میں چپ چاپ گزر جانے والوں کو وہ کیا دیکھے، کیا جانے؟ مگر میں ان کے ساتھ چلا ہوں، میں نے انہیں دیکھا بھی ہے، جانا بھی ہے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں ہی میں سہی مگر ان کا تعارف کرا دوں۔"

روشندان میں ایسا ہی ایک تعارف جاوید صدیقی نے اپنے گرو یعنی اسرار علوی کا کرایا ہے :

"18 نومبر 2009 کی رات کو دس بجے انور کا فون آیا: "ابا چلے گئے جاوید صاحب...! میں اسی وقت ان کے گھر پہنچا مگر کمرے کے اندر نہیں گیا۔ بلکہ باہر ہی بیٹھ گیا۔ میری ایک بری یا اچھی عادت یہ ہے کہ میں مرنے والوں کا چہرہ نہیں دیکھتا۔ تاکہ وہ جب بھی تصور میں آئیں زندگی کے ساتھ آئیں۔ اسرار صاحب کے سٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے میں انھیں یاد کرتا رہا اور میری نظریں گرو دت کی تصویر پہ رک گئیں جو ایک سائڈ ٹیبل پہ رکھی ہوئی تھیں۔ کتنی مماثلت تھی

اسرار علوی اور گرودت کی زندگی میں۔ دونوں نے اپنا عروج دیکھا اور زوال بھی۔ دونوں کو اپنی ذاتی زندگی میں کبھی سکون نہیں مل سکا۔ دونوں زندگی کے ریگستان میں چھاؤں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے تو ہار کر بیٹھ گئے۔ ایک نے اپنی ہار دسمبر 1964 میں قبول کی تھی اور دوسرے نے نومبر 2009 میں۔ میں بہت دیر تک ان ہارے ہوئے بہادروں کے بارے میں سوچتا رہا مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس سے ہارے تھے، وقت سے یا خود سے۔

(گرو جی)

روشندان میں شامل چند خاکوں کے عنوانات اور شخصیات کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

ایک بنجارہ۔ نیاز حیدر

حجیانی ۔ایک بزرگ رشتہ دار

موگرے کی بالیوں والی ۔ سلطانہ جعفری

گرو جی ۔ اسرار علوی

ہارے ہوئے لشکر کا سپاہی۔ مولانا زاہد شوکت علی

ایک تھے بھائی ۔ مصنف کے بہنوئی

مما اور بجیا۔ مصنف کے بزرگ

اپنے کامریڈ حبیب - حبیب تنویر

نیاز حیدر کے خاکے میں جاوید صدیقی نے ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے، انہی کی زبانی سنئیے:

بابا کا ایک مزے دار قصہ ہری بھائی (سنجیو کمار) نے مجھے سنایا تھا۔

جب تک وشوامتر عادل بمبئی میں رہے ہر سال اپٹا کی "دعوت شیراز" ان کے گھر پر ہوتی رہی۔ ہر نیا اور پرانا اپٹا والا اپنا کھانا اور اپنی شراب لے کر آتا تھا اور اس محفل میں شریک ہوتا تھا۔ ساری شراب اور سارے کھانے ایک بڑی سی میز پر چن دیے جاتے، جس کا جو جی چاہتا کھالیتا اور جو پسند آتا وہ پی لیتا۔ یہ ایک عجیب وغریب محفل ہوتی تھی جس میں گانا بجانا ناچنا، لطیفے، ڈرامے سبھی کچھ ہوتا تھا۔ اور بہت کم ایسے اپٹا والے تھے جو اس میں شریک نہ ہوتے ہوں۔ ایسی ہی ایک "دعوت شیراز" میں ہری بھائی نیاز بابا سے ٹکرا گئے۔ اور جب پارٹی ختم ہوئی تو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ ہری بھائی دیر سے سوتے تھے اور دیر سے جاگتے تھے، اس لیے وہاں بھی صبح تک محفل جمی رہی۔ پتہ نہیں کس وقت ہری بھائی اٹھ کے سونے کے لیے چلے گئے اور بابا وہیں قالین پہ دراز ہو گئے۔

دوسرے دن دوپہر میں ہری بھائی سوکر اٹھے اور حسب معمول تیار ہونے کے لیے اپنے باتھ روم میں گئے۔ مگر جب انھوں نے پہننے کے لیے اپنے کپڑے اٹھانے چاہے تو حیران ہوگئے، کیوں کہ وہاں بابا کا میلا کرتا پاجامہ رکھا ہوا تھا اور ہری بھائی کا سلک کا کرتا اور لنگی غائب تھے۔

ہری بھائی نے نوکر سے پوچھا تو تصدیق ہوگئی کہ وہ مہمان جو رات کو آئے تھے صبح سویرے نہا دھوکر سلک کا لنگی کرتا پہن کے رخصت ہوچکے ہیں۔
کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی ہے۔
اس کہانی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کچھ دو مہینے بعد ایک دن اچانک نیاز بابا ہری بھائی کے گھر جادھمکے اور چھوٹتے ہی پوچھا: ”ارے یار ہری! پچھلی دفعہ جب ہم آئے تھے تو اپنا ایک جوڑ کپڑا چھوڑ گئے تھے وہ کہاں ہے؟“

ہری بھائی نے کہا: "آپ کے کپڑے تو میں نے دھلواکے رکھ لیے ہیں مگر آپ جو میرا لنگی کرتا پہن کے چلے گئے تھے وہ کہاں ہے؟"

بابا نے بڑی معصومیت سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، سر کھجایا اور بولے: "ہمیں کیا معلوم تمھارا لنگی کرتا کہاں ہے؟ ہم کوئی ایک جگہ کپڑے تھوڑی بدلتے ہیں؟"

ہری بھائی جب بھی یہ قصہ سناتے تھے بابا کا جملہ یاد کرکے بے تحاشہ ہنسنے لگتے تھے۔

نیاز حیدر کی پہلو دار شخصیت کو عیاں کرتے ہوئے جاوید صدیقی ایک جگہ یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:

جوہو کولی واڑہ اور اس کے آس پاس بہت سی چھوٹی موٹی گلیاں ہیں بابا ایسی ایک گلی میں گھس گئے۔ دور دور تک اندھیرا تھا، دو چار بلب جل رہے تھے مگر وہ روشنی دینے کے بجائے تنہائی اور سناٹے کے احساس کو بڑھا رہے تھے۔ بابا تھوڑی دور چلتے پھر رک جاتے، گھروں کو غور سے دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اچانک وہ رک گئے، سامنے ایک کمپاؤنڈ تھا جس کے اندر دس بارہ گھر دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی گھر ایک منزل سے زیادہ نہیں تھا اور بیچ میں چھوٹا سا میدان پڑا ہوا تھا جس میں ایک کنواں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بابا نے کہا

یہی ہے اور گیٹ کے اندر گھس گئے۔ میں بھی پیچھے پیچھے تھا مگر ڈر رہا تھا کہ آج یہ حضرت ضرور پٹوائینگے۔ بابا کمپاؤنڈ کے بیچ میں کھڑے ہوگئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ کسی گھر میں روشنی نہیں تھی۔ بابا نے زور سے آواز لگائی: "لارنس..." کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میرا خوف اور بڑھنے لگا۔ کولیوں کی بستی ہے وہ لوگ ویسے ہی سر پھرے ہوتے ہیں آج تو پٹائی یقینی ہے۔

بابا زور زور سے پکار رہے تھے: "لارنس... لارنس!..." اچانک ایک جھوپڑے نما گھر میں روشنی جلی، دروازہ کھلا اور ایک لمبا چوڑا بڑی سی توند والا آدمی باہر آیا، جس نے ایک گندا سا نیکر اور ایک دھاری دار بنیان پہن رکھا تھا۔

جیسے ہی اس نے بابا کو دیکھا ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی: "ارے بابا! کدھر ہے تم؟ کتنا ٹائم کے بعد آیا ہے؟" یہ کہتے کہتے اس نے بابا کو دبوچ لیا اور پھر زور زور سے گوانی زبان میں چیخنے لگا۔ اس نے بابا کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف کھینچنے لگا: "آؤ آؤ اندر بیٹھو... چلو چلو" پھر وہ میری طرف مڑا: "آپ بھی آؤ ساب! آجاؤ آجاؤ اپنا ہی گھر ہے۔" ہم تینوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں دو تین میزیں تھیں، کچھ کرسیاں اور ایک صوفہ۔ اندر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ بابا پوچھ رہے تھے: "کیسا ہے تو لارنس؟... ماں کیسی ہے؟... بچہ لوگ کیسا ہے؟"

اتنی دیر میں اندر کا پردہ کھلا اور بہت سے چہرے دکھائی دینے لگے۔ ایک بوڑھی عورت ایک میلی سی میکسی پہنے باہر آئی اور بابا کے پیروں پر جھک گئی۔ بابا نے اس کی خیر خیریت پوچھی، بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو لارنس نے پوچھا:

"کیا پیئنگے بابا؟"

وہسکی..." بابا نے کہا"

لارنس اندر گیا اور وہسکی کی ایک بوتل ٹیبل پہ لاکے رکھ دی۔ اس کے ساتھ دو گلاس تھے، کچھ چنے کچھ نمک سوڈے اور پانی کی بوتلیں۔ بابا نے پیگ بنایا، لارنس الہ دین کے جن کی طرح ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہوگیا: "اور کیا کھانے کا ہے بابا؟... ماں مچھّی بناتی، اور کچھ چھیئے تو بولو... کومڑی (مرغی) کھانے کا موڈ ہے؟" بابا نے مجھ سے "پوچھا: "بولو بولو بھئی کیا کھاؤ گے ؟

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بابا کی اتنی آؤ بھگت کیوں ہو رہی ہے۔ اگر ایسا بھی ہوتا کہ وہ لارنس کے مستقل گراہکوں میں سے ایک ہوتے تو بھی رات کے دو بجے ایسی خاطر تو کہیں نہیں ہوتی۔ یہاں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے بابا اپنی سسرال میں آ گئے ہوں۔

تھوڑی دیر میں تلی ہوئی مچھلی بھی آ گئی، ابلے ہوئے انڈے بھی اور پاؤ بھی۔ بہر حال مجھ سے برداشت نہیں ہوا، کھانا کھاتے ہوئے میں نے بابا سے پوچھا: "بابا اب اس راز پر سے پردہ اٹھاہی دیجئے کہ اس لارنس اور اس کی ماں سے آپ

"کا کیا رشتہ ہے؟

کہانی یہ سامنے آئی کہ برسوں پہلے جب بابا اپنی ہر شام لارنس کے اڈے پر گزارا کرتے تھے تو ایک دن جب لارنس کہیں باہر گیا ہوا تھا اس کی ماں کے پیٹ میں درد اٹھا تھا، درد اتنا شدید تھا کہ وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ اس وقت بابا اسے اپنے ساتھ لے کر اسپتال پہنچے، پتہ لگا کہ اپینڈکس پھٹ گیا ہے، کیس بہت Serious تھا آپریشن اسی وقت ہونا تھا ورنہ موت یقینی تھی۔ بابا نے ڈاکٹر سے کہا آپ آپریشن کی تیاری کیجیے اور نہ جانے کہاں سے اور کن دوستوں سے پیسے جمع کر کے لائے، بڑھیا کا آپریشن کرایا اور جب لارنس اسپتال پہنچا تو اسے خوش خبری ملی کہ اس کی ماں موت کے دروازے پہ دستک دے کے واپس آ چکی ہے۔ .....Thanks to Niyaz Baba

اس کہانی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ لارنس اور اس کی ماں کے بار بار خوشامد کرنے کے باوجود بابا نے وہ پیسے کبھی واپس نہیں لیے جو انھوں نے اسپتال میں بھرے تھے۔

صبح تین بجے کے قریب جب میں بابا کو لے کر باہر نکل رہا تھا تو میں نے پلٹ کر دیکھا تھا، لارنس کی ماں اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی اور لارنس اپنے ہاتھ جوڑے سر جھکائے اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی چرچ میں کھڑا ہو۔ "

کہتے ہیں کہ خاکہ وہ تحریر ہے جس میں خاکہ نگار کسی انسان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ شخصیت قاری کو ایک زندہ شکل میں نظر آئے اور خاکہ نگار نے اس انسان کی زندگی کا جس قدر مشاہدہ کیا ہو، غیر جانب داری سے اس سے متعلقہ حالات و واقعات کو قاری کے مطالعہ میں لے آئے۔ 'ممااور بجیا' نامی خاکے سے یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے :

' نام زیتون رکھا گیا۔زیتون کی شاخ صلح وامن کا نشان ہوتی ہے مگر زیتون۔۔سنا ہے کہ بچپن میں بھی تتیا مرچ تھیں۔ سیدھی تو ہو نہیں سکتی تھیں مگر دو ہاتھ اور ایک پیر کے سہارے لنگڑی بلی کی طرح اچھل اچھل کر ہر جگہ پہنچ جاتی تھیں۔ ہر کھیل میں حصہ لینا چاہتی تھیں اور جب ان کی مجبوری کی وجہ سے نہ کھیلایا جاتا تو زبان سے زہر کی ایسی بارش ہوتی کہ جو سنتا اس کے کان میں چھالے پڑ جاتے۔'

حجیانی نامی خاکے سے یہ انتخاب ملاحظہ ہو کہ زبان و بیان کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ مصنف کی تحریر میں کردار نگاری کے تقاضے بھی بہ احسن طریق نبھائے گئے ہیں :

"حجیانی بہت ننھی منی سی تھیں۔ سر پر کھچڑی بال، گہرے سانولے چہرے پر بہت سی جھریاں، بہت چھوٹی چھوٹی مگر چمکتی ہوئی آنکھیں۔ چھوٹی سی ناک جس میں

چاندی کی بڑی سی لونگ جو دور سے مسے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ کان اوپر سے نیچے تک چھدے ہوئے تھے جن میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بالیوں میں لال ہرے اور سفید موتی جھولتے رہتے تھے اور ان کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ کان کا اوپری حصہ دوہرا ہوگیا تھا۔ کان کا یہ زیور بالی پتے کہلاتا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ بالی پتے جب سے ان کے کانوں تک پہنچے تھے نہ کبھی اترے تھے اور نہ کبھی صاف ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی دو دو چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں جو ہر وقت دھلتے رہنے کے باوجود کالی ہی رہتی تھیں۔ ہاتھوں کی نسیں ابھر آئی تھیں اور ناخن تو دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ پیر میں موٹے چمڑے کی جوتی پہنتی تھیں جس کا پچھلا حصہ ایڑی کے نیچے دبا رہتا تھا۔ سیدھی کاٹ کا چست پاجامہ جس کا نچلا حصہ جس میں چوڑیاں پڑتی تھیں ہمیشہ کسی دوسرے کپڑے اور دوسرے رنگ کا ہوتا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا کرتا جو کرتی سے ذرا سا ہی لمبا ہوتا تھا۔ سر پر تین گز کا دوپٹہ جو زیادہ تر کسی موٹے کپڑے کا ہوتا تھا اور جس پر رنگین گوٹ لگی ہوتی تھی تاکہ اوڑھنی کے کام بھی آسکے۔"

خاکہ نگاری کی ایک سیدھی سادی تعریف یہ ہے کہ جب ہم کسی کا خاکہ پڑھیں تو اس کی شخصیت سے متعارف ہوتے چلے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے آگاہی بھی حاصل ہوجائے۔ جاوید صدیقی کی کتاب روشندان میں یوں تو اس وصف کا جابجا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے لیکن 'ہارے ہوئے لشکر کا

سیاہی' میں جاوید صدیقی اس وصف کو بام عروج تک پہنچا گئے ہیں۔مذکورہ خاکہ مولانا زاہد شوکت علی کا ہے جو ہندوستان میں خلافت کے آخری نام لیوا تھے اور علی برادران کے وارث بھی۔ مولانا زاہد اسلام مولانا شوکت علی کے بڑے بیٹے تھے ۔یہ وہ زمانہ تھا جب جاوید صدیقی نئے نئے رام پور سے بمبئی (اب ممبئی) وارد ہوئے تھے اور خلافت ہاؤس میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ مولانا زاہد ان کے دور کے رشتہ دار تھے۔ خلافت ہاؤس تحریک خلافت کا مرکز تھا اور روزنامہ خلافت کا دفتر بھی یہیں واقع تھا۔

جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بولیں اماں محمد علی کی

:جاوید صدیقی نے مولانا زاہد کا حلیہ کچھ یوں بیان کیا ہے

جامہ زیب آدمی تھے۔ لنگی کرتا بھی پہنے ہوتے تھے تو برے نہیں لگتے تھے۔ مگر جب" کہیں باہر جاتے تو دھج دیکھنے کی ہوتی۔ سر پر لکھنوی دوپلی ٹوپی، سفید شیروانی جس میں سے جیبی گھڑی کی سنہری زنجیر جھانکتی رہتی تھی، پنڈلیوں پر منڈھا ہوا آڑا پاجامہ، پیروں میں سفید موزے اور سفید رنگ کی سلیم شاہی۔ خود گورے نہیں تھے مگر سفید کپڑے اور سفید داڑھی ان کی شخصیت کو ایسا وقار دیتے تھے کہ اجنبی بھی مرعوب ہو جایا "کرتے تھے۔

مولانا زاہد روزنامہ خلافت کا انتظام دیکھا کرتے تھے۔ اخبار کا کام شام چار

بجے کے قریب شروع ہوتا تھا اور رات کے ایک بجے تک جاری رہتا تھا۔ دفتر میں اخبار کے ایڈیٹر سید نور الحسن کے علاوہ دو تین مترجم تھے جو انگریزی سے اردو میں خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ جاوید صدیقی کے سپرد بھی یہی کام کیا گیا تھا۔ مولانا زاہد ایک مجلسی انسان تھے۔ ان کے چٹکلوں سے دوسروں کا جی لگا رہتا تھا، ساتھ ہی ساتھ ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ جاوید صدیقی لکھتے ہیں:

"شام ہوتی۔ چھڑکاؤ کیا جاتا۔ پیڑوں کو پانی ڈالا جاتا۔ لکڑی کے بڑے بڑے بینچ جن پر سفید رنگ کیا ہوا تھا دھوئے جاتے اور میزیں لگا دی جاتیں۔ جب گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو موگرے اور رات کی رانی کی مہک میں شامل ہو کے چاروں طرف پھیل جاتی تو زاہد صاحب نیچے اترتے۔ ایک نظر کاتبوں اور ایڈیٹوریل اسٹاف پر ڈالتے ہوئے باہر نکل جاتے۔ پہلے ایک تنقیدی جائزہ لیتے۔ اگر کوئی چیز قرینے سے نہ ہوتی تو نوکروں کی شامت آجاتی: "لالہ، مالی، میاں جان... حرام زادو! بینچ اب تک گیلی ہے۔ سکھائی کیوں نہیں؟... صاف کر گنوار۔ جلدی ہاتھ چلا۔ سور کے بچے کوئی کام ٹھیک سے نہیں کر سکتے!..."

جب سارا کام مرضی کے مطابق ہو جاتا تو جامن کے پیڑ کے سائے میں بچھی ہوئی بینچ پر براجمان ہو جاتے۔ اسی بینچ پر بیٹھے بیٹھے مغرب کے تین فرض ادا کرتے۔

اور ان کی انگلیاں ۳۳ دانوں والی چھوٹی سی تسبیح پر پھسلنے لگتیں۔ تب تک پانچ پانچ سو واٹ کے دو بلب جلادیے جاتے، سارا صحن جگمگا اٹھتا۔ ان کے احباب، پرانے خلافتی اور ملنے جلنے والے جمع ہونا شروع ہوجاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری بینچیں بھر جاتیں۔ بالکل ایسا لگتا جیسے کوئی جلسہ یا نشست ہورہی ہو اور زاہد صاحب اس کی صدارت کر رہے ہوں۔"

مولانا کا مزاج بھی ہوا کے جھونکے پر سوار رہتا تھا، پل میں تولا اور پل میں ماشہ۔ ڈانٹتے بھی اس انداز میں تھے کہ سامنے والا بے مزہ نہ ہوتا تھا۔ جاوید صدیقی بھی ابتدا ہی میں زیر عتاب آگئے، لکھتے ہیں:

" بمبئی آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ عید آگئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی زاہد صاحب کھڑکی میں آکھڑے ہوئے اور خلافت ہاؤس کے تمام رہنے والوں کو نام بنام پکارنا شروع کردیا:

لالہ، ابے لالہ حرامزادے کہاں مرگیا۔ ابھی تک نہا رہا ہے کیا؟"

ماموں، او ماموں (ارشاد علی صاحب) ارے باہر نکلو بھائی۔ کب تک بیوی کا پلو پکڑے بیٹھے رہوگے۔

عالم صاحب! ...اے شاہ محمد جاکے دیکھ عباسی صاحب تیار ہوئے کہ نہیں۔ اور یہ جاوید کہاں ہے۔ اب تک سو رہا ہے کیا، اٹھاؤ نالائق کو۔ عید کی نماز بھی

"! ... نہیں پڑھے گا کیا

ایک ایک کرکے سبھی جمع ہو گئے اور تھوڑی دیر میں باب عمر سے نمازیوں کا ایک چھوٹا سا جلوس نکلا جس کی قیادت زاہد صاحب کر رہے تھے اور جس کا رخ بائیکلہ مسجد کی طرف تھا۔ انھوں نے پلٹ کر اپنے ساتھ آنے والوں کو دیکھا۔ سب پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کوئی اصیل مرغا اپنے پیچھے آنے والی مرغیوں کو دیکھتا ہے۔ اور مجھ سے پوچھا: سب چیزیں لے لیں ؟" ... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ نماز کے لیے کس چیز کی" ضرورت ہو سکتی ہے۔ اچانک خیال آیا کہ میں ننگے سر ہوں۔ یہ ٹوپی کو پوچھ رہے ہیں جو میرے کرتے کی جیب میں تھی۔ میں نے ٹوپی ٹٹولی اور کہا: "جی"۔

جب ہمارا قافلہ مسجد پہنچا تو باہر کا فٹ پاتھ بھی نمازیوں سے بھر چکا تھا۔ اور دیر سے آنے والے سڑک پر صف بندی کر رہے تھے۔ زاہد صاحب نے کہا:

"! بچھاؤ بچھاؤ۔ ادھر ہی بچھادو"

کیا بچھادوں ؟" میں نے پوچھا۔"

چٹائی اور کیا؟" وہ گرجے۔"

چٹائی ؟... وہ تو میں لایا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ اور لالہ جسے ہر بات معلوم ہوتی تھی نماز پڑھنے کے لیے آزاد میدان چلا گیا تھا۔

زاہد صاحب نے دانت پیس کر مجھے دیکھا اور پھر باوضو مغلظات کا ایسا ریلا آیا

کہ الامان۔ میں آنسو پونچھتا ہوا بھاگا اور جب چٹائی لے کر پلٹا تو نماز ختم ہو چکی تھی اور خطبہ شروع ہو چکا تھا۔

اچھی عادت یہ تھی کہ کسی بات کو نہ دل میں رکھتے تھے نہ دماغ میں۔ نماز کے بعد جب گلے لگایا تو شاید انھیں یاد بھی نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے رلا چکے ہیں"۔

مولانا زاہد کو کاتبوں سے تو اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ذرا دیکھیے تو کہ جاوید صدیقی ایک جگہ روزنامہ خلافت کے کاتبوں کی بنی درگت کو کس انداز میں بیان کر رہے ہیں، یہ موقع اس وقت آتا جب ہر ہفتے کاتبوں کی کارگزاری سامنے آتی تھی:

اس لطیف لنگڑے کی تو دوسری بھی توڑ دینی چاہیے۔ دیکھو یہ، دیکھو یہ کتابت ہے؟..." معلوم ہوتا ہے چیونٹی کی دم میں سیاہی لگاکے کاغذ پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اس رونق حیدر آبادی سے تو کتابت ہی نہیں کرانی چاہیے، مسطر بنوایا کرو۔ حرامزادہ خبر کو قبر کہتا ہے، لاحول ولا قوۃ...۔اور یہ اختر... ایک سطر میں سات لفظ ہوتے ہیں۔ مردود پانچ غلط لکھتا ہے۔ اور اس خبیث سنبل کو تو ایک پیسہ مت دینا۔ حکیم صاحب کے اشتہار میں لکھا تھا عورتوں کے لیے زنانہ کا معقول انتظام ہے۔ بدمعاش نے لکھا، عورتوں کے لیے زنا کا معقول انتظام ہے۔ جان

بوجھ کے کیا ہے ×××× نے۔ اشتہار بند ہوگیا نا۔ اب پیسے اس کا باپ دے گا۔ سب

"... ہیں۔ سب کے سب۔ خدا ان کی بھوک بڑھائے اور کھانے کو کم دے ××××

مگر جب اختر حسین کاتب کی بیوی لمبی بیماری کے بعد گزر گئی تو اس کے پاس اسپتال کا بل ادا کرنے کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ زاہد صاحب کو پتہ چلا تو خود اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹروں کو بہت برا بھلا کہا اور بل ادا کرکے لاش اختر حسین کے حوالے کی۔ کفن دفن کے لیے کچھ نقد بھی دیا اور بولے، اس پیسے کے بارے میں عالم (منیجر) کو مت بتانا۔ ورنہ وہ

" تمہارے حساب میں سے کاٹ لے گا۔

مولانا ایک روز فلم دیکھنے پہنچ گئے۔ ہوا یوں کہ ایک روز ناشتے کی میز پر جاوید صدیقی نے مولانا کے سامنے گرودت اور وحیدہ رحمٰن کی فلم 'چودھویں کا چاند' کی وہ تعریف کی کہ مولانا بے چین ہوگئے، اخبار کھول کر وحیدہ رحمٰن کو بہت غور سے دیکھا اور جاوید صدیقی سے پوچھا: "کون سے تھیٹر میں لگ رہی ہے"؟ تھیٹر کا معلوم ہونے پر مولانا دو چار نہیں بلکہ پورے بائیس لوگوں کو لے کے وہاں پہنچ گئے۔

مولانا فلم دیکھ کر واپس ہوئے اور اگلی صبح جاوید صدیقی ان کا ردعمل جاننے کے لیے ناشتے کی میز پر وقت سے ذرا پہلے ہی پہنچ گئے لیکن وہاں تو عالم ہی

:کچھ اور تھا۔ جاوید صدیقی لکھتے ہیں
زاہد صاحب ڈائننگ ٹیبل پر آ چکے تھے اور اخبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ میں نے پوچھا، پکچر کیسی لگی آپ کو؟... انھوں نے اخبار جھٹکے سے نیچے رکھا اور گرج کر بولے: "اس سے زیادہ ذلیل فلم تو میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہ کوئی فلم ہے۔"
میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا: "آپ کون سی فلم دیکھ کے آئے ہیں؟"
ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں: "کون سی فلم؟... کون سی فلم بتائی تھی تم نے؟"

"...جی میں نے تو چودھویں کا چاند"
جی وہی... چودھویں کا چاند... ذلیل فلم، بیہودہ گھٹیا فلم... وہ سالی کوئی فلم ہے۔"
روتے روتے بری حالت ہو گئی۔ رات بھر نیند بھی نہیں آئی۔ تم سالے پیدا ہوئے تو جائیدادیں ضبط ہو گئیں، بڑے ہوئے تو باپ کو کھا گئے۔ تم ایسی رونے دھونے کی فلمیں دیکھا کرو۔ کیونکہ تمھاری اپنی زندگی ایک ٹریجڈی ہے سالی۔ مگر مجھے رونے کا کوئی شوق نہیں۔ میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا، ساری زندگی عیش و آرام سے کٹی۔ باقی بھی اسی طرح کٹ جائے گی۔ میری زندگی میں آنسوؤں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوبارہ اگر ایسی حرکت کی تو سیدھا

رامپور بھجوادوں گا۔ جاؤ منہ کالا کرو... لاحول ولا قوۃ۔ رات کا کھانا خراب ہوا، صبح کا ناشتہ بھی خراب ہوگیا۔"

ایک روز تو مولانا سچ مچ جاوید صدیقی سے ناراض ہوگئے، اتنے کہ جاوید صدیقی نے وہ گھر ہی چھوڑ دیا۔ ہوا یہ کہ ہندوستان میں سعودی عرب کے سلطان ابن سعود آنے والے تھے ،اخبارات میں خبریں شائع ہورہی تھیں، ضمیمے نکل رہے تھے، جاوید صدیقی نے قلم اٹھایا اور مولانا محمد علی کی ایک لازوال تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ مولانا نے زندگی بھر اس غیر اسلامی تصور کی مخالفت کی جس میں باپ کے بعد بیٹا تخت نشین ہوتا ہے اور خود کو شہنشاہ، بادشاہ یا سلطان کہہ کر اسلامی جمہوری نظام کا مذاق اڑاتا ہے جیسا کہ سعودی عرب میں

اڑایا جا رہا ہے۔ اگلی صبح جاوید صدیقی کی آنکھ زبردست قسم کے شور سے کھلی، مولانا کف اڑا رہے تھے، روزنامہ خلافت ان کے ہاتھ میں تھا، تمام بدن غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ جاوید صدیقی کو دیکھتے ہی دہاڑ کر بولے: "تم سالے، کمینے، جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ نکل جاؤ۔ ابھی۔ اسی وقت منہ کالا کرو۔ ورنہ پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

دراصل خلافت اخبار، خلافت ہاؤس اور خود زاہد صاحب اس امداد پر زندہ تھے جو سعودی عرب سے آتی تھی۔

جاوید صدیقی کو خلافت ہاؤس چھوڑے تین برس گزر گئے، ایک روز انہیں معلوم ہوا کہ مولانا کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں داخل ہیں، ان سے نہ رہا گیا، لپک کر اسپتال پہنچے، بڑے پیار سے مولانا کے سر پر ہاتھ پھیرا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ جاوید صدیقی لکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا تو مسکرائے، ان کے سوکھے ہونٹ کھلے اور مدھم آواز سنائی دی:

"اتنے دن تک مجھے دیکھنے بھی نہیں آیا؟... اپنے بڑوں سے اس طرح ناراض ہوتے ہیں کیا؟"

کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ میرا باندھ بھی ٹوٹ گیا۔ جب رونے سے دل ہلکا ہوا تو میں نے پوچھا: "ڈاکٹر کیا

"کہتا ہے؟

"مسکرائے اور بولے: "ابھی نہیں مروں گا۔

میں نے ان کا ماتھا چوما اور کہا: "میں مرنے بھی نہیں دوں گا۔' ('ہارے ہوئے لشکر کا سپاہی')

لیکن ایک روز مولانا زاہد شوکت علی سچ مچ مرگئے، جاوید صدیقی انہیں مرنے سے نہیں بچاسکے۔ اس دن وہ بالکل اکیلے تھے جب ان پر دل کا آخری دورہ پڑا۔ درد اٹھا تو نماز پڑھ رہے تھے۔ سجدے میں سر رکھا اور وہیں ختم ہوگئے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

جاوید صدیقی نے اپنے بہنوئی کا خاکہ بھی خوب لکھا ہے۔ جاوید صدیقی کے والد ان کی اوائل عمری میں جیل چلے گئے تھے۔ گھر میں مفلسی نے ڈیرے ڈال دیے۔ گیارہ مہینے بعد ان کے والد جیل سے واپس تو آ گئے لیکن ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور کچھ ہی مہینے بعد ایک دن جب فجر کی اذان ہو رہی تھی، انھوں نے آنکھیں کھول کر جاوید صدیقی کو دیکھا اور پھر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ ان کے والد کے انتقال کے بعد سب لوگ انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے اور جاوید صدیقی کو اس روش سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ بقول ان کے، 'ہر نظر ترس کھاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور ہر ہونٹ افسوس کرتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ جب

بھی کوئی بزرگ سر پر ہاتھ پھیرتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ بول رہا ہو: "ہائے، "اب اس معصوم کا کیا ہوگا؟

ایسے حالات میں صرف ایک گھر ایسا تھا جہاں بے مطلب افسوس اور بے معنی ہمدردی کی برسات نہیں ہوتی تھی۔ یہ گھر ان کی قمر باجی اور بہنوئی کا تھا جو شہر سے بہت دور واقع تھا۔ جاوید صدیقی کا دل جب بہت گھبراتا تو دو آنے پر سائکل کرایے پر لیتے اور وہاں پہنچ جاتے تھے۔ان کے بہنوئی 'رضا شوگر فیکٹری رام پور' میں ملازم تھے۔ فیکٹری کی کالونی میں چوتھا کوارٹر ان کی باجی کا تھا۔ باجی کے گھر میں داخل ہوتے ہی جاوید صدیقی کی نظر سب سے پہلے صحن میں بندھی گائے پر پڑتی تھی، انہیں وہ گائے کبھی پسند نہیں آئی تھی، وہ ہمیشہ یہ سوچتے تھے کہ ایک تو اتنے چھوٹے سے گھر کے اندر اتنا بڑا جانور اور وہ بھی ایسا جو دن بھر کھانے اور گندگی کرنے کے سوا کچھ نہ کرے۔ جاوید صدیقی کو اپنی باجی سے بڑی محبت تھی اور وہ بھی ان کا بہت خیال کرتی تھیں، وہ جب بھی وہاں پہنچتے تھے ، ان کی باجی انہیں دیکھ کر کھل اٹھتی تھیں ، ان کا سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں ہوتا تھا اور چائے بھی کیسی ؟ بقول جاوید صدیقی، " گھر کی گائے کا خالص دودھ جسے رامپور والے "تھن تلے" کا دودھ کہتے ہیں یعنی وہ دودھ جس میں پانی کی ایک بوند بھی نہ ملی ہو۔ اس میں چائے کی پتی ڈالی جاتی اور اس قدر ابالا جاتا کہ دودھ کا رنگ گرمی میں تپتی ہوئی کسی حسینہ کے گالوں جیسا ہو جاتا۔ کبھی کبھی اس میں الائچی بھی ڈال دی

جاتی تاکہ ذائقے میں خوشبو بھی شامل ہو جائے۔ ہم دونوں چائے کے بڑے بڑے مگ بھر کے آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور گپیں مارتے۔انھوں نے جاوید صدیقی سے وہ ذلیل سوال کبھی نہیں کیا کہ اب کیا ہوگا اور تم کیا کروگے ؟ ...”

لیکن ان کے بہنوئی اپنی بیگم جیسے نہیں تھے، وہ حاجی شجاعت علی یا داڑھی والے شجاعت کہلاتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ جاوید صدیقی بہت بد تمیز اور نہایت گستاخ ہیں اور دادی کے بیجا لاڈ پیار نے انہیں خراب کردیا ہے۔جب بھی جاوید صدیقی سے ان کا سامنا ہوتا تھا، وہ اپنی ٹوپی اور شیروانی اتارتے اتارتے پوچھ ہی لیتے: "ہاں بھائی، تو کیا سوچا تم نے ؟ کیا کرنے کا ارادہ ہے آگے ؟ ...”

جواب میں کہنے کے لیے جاوید صدیقی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا۔ بقول ان کے " مجھے خود ہی نہیں معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے بلکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ ایک ایسے یتیم بچے کے پاس، جس کے باپ کا کفن دفن بھی کچھ رشتے داروں کی مہربانی سے ہوا ہو، اس کے پاس Options ہی کہاں ہوتے ہیں۔ ”

ایک وقت ایسا آیا کہ جب جاوید صدیقی کے تمام رشتہ دار ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اتنا پریشان ہوگئے کہ انھوں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ تب ایک حیرت

انگیز واقعہ ہوا۔ بمبئی سے ان کے رشتے دار مولانا زاہد شوکت علی کا خط آیا، انہوں نے لکھا کہ جاوید صدیقی کو بمبئی بھیج دیا جائے۔ جاوید صدیقی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، آیئے انہی کے الفاظ میں پڑھتے ہیں:

اگر امریکی حکومت کسی ہندوستانی کو نیویارک میں رہنے کی دعوت دے اور ساتھ" میں گرین کارڈ بھی بھیج دے تو جو خوشی ہوگی ویسا ہی کچھ میرا حال بھی ہوا۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ چھپّر پھٹا کیسے۔ کیونکہ زاہد شوکت علی صاحب اپنے خاندان والوں کو ذرا کم ہی منہ لگاتے تھے۔ اور پھر دوریاں بھی اتنی تھیں کہ تصور ہانپنے لگتا تھا۔ باقی سب لوگ تو خوش ہوئے مگر میری نیندیں حرام ہوگئیں۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا بمبئی کی وہ تمام تصویریں جو کتابوں اور رسالوں میں دیکھی تھیں، سامنے آکھڑی ہوتیں۔ گیٹ وے آف انڈیا دکھائی دیتا، جوہو کا سمندر دکھائی دیتا، سڑکوں پہ دوڑتی ہوئی دومنزلہ بسیں دکھائی دیتیں۔ عالم یہ تھا کہ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ تمام یاروں دوستوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے خوشخبری سنائی اور ان کی آنکھوں میں رشک دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ مگر یہ خوشی کچھ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔

ایک دن جب میں اپنی دادی کے ساتھ بیٹھ کر اس سامان کی فہرست بنا رہا تھا جو اپنے ساتھ بمبئی لے جانا چاہتا تھا تو وہ اچانک پھٹ پڑیں: "ارے رہنے دے یہ

"سب کچھ، بمبئی جانا اتنا آسان نہیں ہے۔

"کیوں نہیں ہے؟" میں تلملا گیا۔ "زاہد چچا نے خود بلایا ہے۔"

اس کے بلانے سے کیا ہوتا ہے، کوئی بھیجنے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ ڈیڑھ دو سو کا خرچہ "ہے، کون دے گا؟

مجھے بالکل ایسا لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں گھونسا مار دیا ہو اور مجھے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔

ڈیڑھ دو سو کا خرچہ؟" یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

وہ سوال جو کہیں منہ چھپا کے بیٹھ گیا تھا پھر اچانک اچھل کر باہر آگیا۔

اب کیا ہوگا؟"

جاوید صدیقی ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی باجی کے گھر پہنچے، باجی نے ان کی آنکھوں کی سرخی اور پلکوں کی نمی بھی دیکھی مگر کچھ بولیں نہیں۔ چپ چاپ چائے کی چسکیاں لیتی رہیں۔ اور اس گائے کو دیکھتی رہیں جو کونے میں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھی اور دم سے مکھیاں اڑاتی جا رہی تھی۔

:جاوید صدیقی لکھتے ہیں

شام ہو رہی تھی، بھائی کے آنے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ میں جانے کے لیے اٹھا تو باجی" نے روک لیا: "ذرا دیر ٹھہر جاؤ، میاں جی آتے ہی ہوں گے مل کے جانا۔ "مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کیونکہ باجی کو معلوم تھا، میں بھائی کا سامنا

کرنے سے گھبراتا ہوں اور وہ بھی مجھے دیکھ کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے بہانہ بنایا اور جانے لگا۔ مگر بھائی ایک دم سے اندر آ گئے۔ انھوں نے سلام دعا کرتے کرتے اپنی شیروانی اور ٹوپی اتاری، اور نل کے سامنے وضو کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ پاؤں دھوتے دھوتے اچانک میری طرف مڑے اور پوچھا: "کیا ہوا تمھارے بمبئی جانے کا؟"

"جی وہ..."۔ میں اس کے آگے نہیں بول سکا۔ باجی نے کم سے کم لفظوں میں بتایا کہ: "جانا تو طے ہے، مگر ابھی تک کرایے کا بھی انتظام نہیں ہوا ہے۔ دو چار جوڑے کپڑے اور ایک آدھ اچھا جوتا بھی چاہیے ہوگا۔ بھائی نے ایک لمبی سی "ہوں" کی اور بولے: "میں نے رام دین سے کہہ دیا ہے، وہ اجوان لے کر آئے گا، گائے کو کھلا دینا۔ دو دن سے چارہ چھوڑ رہی ہے، شاید پیٹ خراب ہے۔" اور مصلیٰ بچھا کے نماز کی نیت باندھ لی۔ مجھے معلوم تھا وہ کچھ نہیں کہیں گے اور نہ کچھ کریں گے۔ انھیں مجھ سے زیادہ اپنی گائے کی پرواہ ہے جس کا پیٹ خراب ہے۔ کسی کی زندگی خراب ہو رہی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں چپکے سے باہر نکلا، سائیکل اٹھائی اور اس کچی سڑک پر ہولیا جو میرے گھر کی طرف جاتی تھی۔ "

کئی روز تک جاوید صدیقی کو یوں لگا جیسے بمبئی ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے اوپر گر رہی ہے۔ وہ ساری تصویریں جو آنکھوں میں تیرتی تھیں اب ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ انھوں نے کتابوں میں دل لگایا مگر نہیں لگا۔ کچھ

لکھنے کی کوشش کی مگر لفظوں نے ہڑتال کردی۔ ان کے ایک جاننے والے کنور صاحب نے انہیں پچاس روپے دیے لیکن ضرورت تو پورے ڈیڑھ سو کی تھی۔انہیں خیال آیا کہ اپنے والد کی الماری کھول کر دیکھی جائے کہ کچھ چھوڑ کر گئے ہیں یا نہیں۔ لیکن وہاں ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی کے کرتے پاجاموں کے سوا دھرا ہی کیا تھا۔ وہ بھی دو تین ہی کی دو پتلونیں مل گئیں جن کے بقل زنگShark Skin تھے۔ ایک کونے میں سے کھاکے کپڑے سے چپک گئے تھے۔

مایوسی کے عالم میں ان کو اپنے پھوپھا کا خیال آیا۔ سخت گرمی کے دن تھے، ایک روز انہوں نے سائکل کرایے پر لی اور منزلیں مارتے ہوئے پھوپھا کے گھر جا پہنچے۔ جب اندر داخل ہوئے تو ان کا یہ حال تھا کہ ہاتھوں میں چین کا گریس لگا ہوا تھا، پاجامے کے پائنچے بھی کالے ہوگئے تھے، سر کے بال مٹی اور پسینے سے الجھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ تمام زندگی ان کی پھوپھی نے سوائے حقارت کے انہیں اور کچھ نہیں دیا تھا۔ مدعا جاننے کے بعد تو ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ شام کو پھوپھا آئے تو جاوید صدیقی ان سے بنا کچھ کہے روانہ ہونے لگے۔ بیان کرتے ہیں:

پھوپھی نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا: "دیکھو بیٹا، ہمارے باپ دادا بھی کوئی جائیداد چھوڑ کر تو مرے نہیں تھے۔ تمہارے باپو کیسے ہیں تم اچھی طرح

جانتے ہو۔ ایک پیسہ رشوت نہیں لیتے۔ جو کچھ ہے بس ان کی تنخواہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کنور صاحب نے پچاس روپے بھجوادیے ہیں۔ تم سچ سچ بتاؤ تمھیں کتنے پیسے کی ضرورت ہے۔ جھوٹ مت بولنا۔"

میں نے اپنے گریس لگے پاجامے کو دیکھا جو چین میں آتے آتے کئی جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا: "پھوپھو میرے پاس کپڑے نہیں ہیں"۔ ان کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ انھیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

پھوپھی نے پانچ پانچ کے کچھ نوٹ میرے ہاتھ پہ رکھ دیئے: "یہ لو، سنبھال کر لے جانا۔"

ڈپٹی گنج سے نکلتے نکلتے جب پہلی بار چین اتری تو میں نے جیب سے نکال کر گنے، پانچ پانچ کے چار نوٹ تھے۔ بیس روپے کی خطیر رقم جو میری پھوپھی نے مجھے اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے لیے دی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ لوٹ کر جاؤں اور روپے واپس کردوں یا چپ چاپ رکھ لوں۔ سوچتے سوچتے کوسی کے پل پہ آ گیا جس کے بعد ریلوے لائن ہے۔ بہت سی بسیں گاڑیاں اور ٹرک رکے ہوئے تھے۔ دو چار سائیکلیں بھی تھیں۔ مجھے بہت سے بھکاریوں نے گھیر لیا اور میں انھیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ میری حالت ان سے زیادہ خراب ہے۔ اچانک میری نظر پانچ چھ برس کے ایک بچے پہ پڑی جو کیلے والے سے ایک کیلے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ میں نے اسے پاس بلایا اور پانچ پانچ کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ میں اس بچے کے چہرے کا Expression کبھی نہیں بھول سکتا۔ بہت دیر تک تو ایسا لگا جیسے وہ Freeze ہوگیا ہے۔ پھر اچانک مڑ کر تیزی سے بھاگا اور نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ میں جب شہر پہنچا تو رات ہو چکی تھی مگر متھرا حلوائی کی دکان جاگ رہی تھی۔ میں نے دو گلاس ڈبل ملائی والا گرم دودھ پیا۔ ایک دونا ربڑی کھائی اور جب میں اس کی دکان سے اٹھا تو دل بڑا ہلکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پھوپھو سے اپنا انتقام لے چکا ہوں۔ بیس روپے ختم ہو چکے تھے۔"

جاوید صدیقی گھر واپس پہنچے۔ دو چار دن بعد انھوں نے شہر کے بکنگ آفس سے بمبئی کا ٹکٹ خرید لیا۔ ریزرویشن کے ساتھ بتیس روپے پچاس پیسے کا ٹکٹ تھا۔ تقریباً اڑتیس گھنٹے کا سفر تھا۔ پچاس روپوں میں سے ساڑھے سترہ روپے پھر بھی باقی تھے، انھوں نے سوچا کہ دیکھ بھال کر خرچ کیا جائے تو رستہ تو کٹ ہی جائے گا باقی اللہ مالک ہے لیکن پہننے کے لیے کپڑے تو پھر بھی نہیں تھے۔ پرانے سوٹ کیس کے اندر ان کے والد کی دو پرانی پتلونوں اور مزید دو پرانے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اچانک ان کے بہنوئی آ گئے۔ جاوید صدیقی لکھتے ہیں:

بہنوئی کہنے لگے "چلو بازار چلتے ہیں" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے بازار کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر بھبا (جاوید صدیقی کی قمرباجی) جو چپ چاپ سن رہی تھیں اور چھالیہ کاٹتی جارہی تھیں، اچانک بولیں: "بھائی کے ساتھ جاتا کیوں نہیں، جا۔ لوٹتے ہوئے میرے لیے پان بھی لیتا آئیو۔"

بھائی نے چوک سے کچھ قمیصوں پاجاموں کا کپڑا دلایا، باٹا کا ایک جوڑ سینڈل اور گھر میں پہننے کے لیے ہوائی چپل خریدے گئے۔ کچھ اور ضروری چیزیں جیسے بنیان، رومال، ٹوتھ پیسٹ، برش وغیرہ... ہاں ایک بڑی سی چار خانے والی چادر بھی تھی اور ایک ربر کا تکیہ جس میں منہ سے پھونک بھر کے پھلایا جاسکتا تھا۔

شوکت باجی نے راتوں رات پاجامے سی دیئے، حبیبہ آپا قمیص سینے کی Expert تھیں، انھوں نے کاٹے بھی خود اور سیئے بھی خود۔ اور ایسی فٹنگ دی کہ کوئی درزی بھی کیا دے گا۔ میرا سوٹ کیس بھرچکا تھا اور اس میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اماں نے اس میں ایک پھٹا ہوا کپڑا بھی رکھ دیا تھا۔ اور میرے پوچھنے پر بتایا تھا: ارے بچے، جوتے صاف کرے گا تو کیا رومال سے کرے گا؟"۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر دل بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ آدمی جس نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا، سیدھے منہ بات نہیں کی اچانک بدل کیسے

گیا۔ یہ ہمدردی کہاں سے آ گئی۔ بھائی کی مہربانیوں کے پیچھے ضرور کوئی اور ہے، مگر کون ہو سکتا ہے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

بہرحال جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں اور میں سب سے رخصت ہو لیا تو باجی اور بھائی سے ملنے کے لیے رضا شوگر فیکٹری پہنچا۔ اندر گھسا تو گھر کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ وہ گائے جو ہمیشہ دروازے کے سامنے دم ہلاتی ہوئی ملتی تھی غائب تھی۔ اس کا کوئی سامان بھی نہیں تھا اور صحن کو دھو کر صاف کیا جا چکا تھا۔

گائے کہاں چلی گئی؟" میں نے باجی سے پوچھا۔"

بک گئی" انھوں نے جواب دیا۔"

"کب؟"

"کئی دن ہو گئے"

مجھے یہ سمجھنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا کہ گائے کیوں بیچی گئی۔ تب تک بھائی کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا:

"آپ نے گائے بیچ دی؟"

ارے بھائی گائے کا کیا ہے، پھر آ جائے گی۔ تمہارا جانا زیادہ ضروری ہے۔ جاؤ، اللہ" "تمھیں کامیاب کرے۔

میں ان سے لپٹ گیا اور وہ آنسو جو ابو کی موت پر بھی نہیں گرے تھے اچانک بہہ نکلے۔ تبھی مجھے باجی کی آواز سنائی دی:

"بازار کا دودھ ہے، مگر اچھا ہے۔ چائے پیوگے؟"

میں نے باجی کی طرف دیکھا۔ ان کا سانولا چہرہ کھلا ہوا تھا اور مسکراہٹ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

جب کبھی یہ آدھی صدی پرانا قصہ یاد آتا ہے، تو سوچتا ہوں کہ ہم لوگ دوسروں کے بارے میں اپنی رائے بنانے میں کتنی جلدی کرتے ہیں اور پھر اس پہ قائم بھی رہتے ہیں۔ ذرا نہیں سوچتے کہ یہ رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔" (ایک تھے بھائی

یہ ہو نہیں سکتا کہ جاوید صدیقی ان خاکوں کو لکھتے وقت روئے نہ ہوں، کم تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کا مصنف خود بھی روئے اور اپنے قاری کو بھی رلائے، ایسی تحریریں کبھی نہیں مرتیں۔ شنید ہے کہ وہ روشندان کا دوسرا حصہ تحریر کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اسے جلد از جلد مکمل کریں گے اور یوں پاک و ہند کے قارئین کو ایک اور عمدہ کتاب کا تحفہ میسر آئے گا۔

شاہ محی الحق فاروقی۔کیا دوانے نے موت پائی ہے

31دسمبر 2011 کا سورج جاتے جاتے ادیب، مترجم و کالم نگار شاہ محی الحق فاروقی کو اپنے ہمراہ لے کر غروب ہوا۔ فاروقی صاحب حکومت پاکستان کے ریٹائرڈ جوائنٹ سیکریٹری تھے اور کراچی کی ایک دور افتادہ بستی میں گزشتہ کئی برس سے مقیم تھے۔
راقم کی فاروقی صاحب سے پہلی ملاقات گزشتہ برس ہوئی تھی۔انہوں نے 1998 میں ' بلبلیں نواب کی ' کے عنوان سے ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا، یہ ہندوستان کی سول سروس سے وابستہ رہے موسی رضا کی یاداشتوں کا مجموعہ ہے۔ ملاقات کا سبب متذکرہ کتاب تھا۔ 82 برس کی عمر میں بھی فاروقی صاحب کی بذلہ سنجی قائم تھی۔ میں ایک صاحب کے ساتھ گیا تھا، میز پر مشروبات و فواکہات دھرے تھے۔ فاروقی صاحب نے دھیرے سے ہم سے کہا: لیجیے، تکلف نہ کریں
ان صاحب نے رسمی جملے کا سہارا لیا: " ارے صاحب ! تکلف کیسا ! اپنا ہی گھر ہے"
اور فاروقی صاحب بیساختہ بولے: " خیر صاحب ! گھر تو میرا ہے"
ہمارے قہقہوں میں فاروقی صاحب نے ہمارا ساتھ دیا تھا!

شاہ محی الحق فاروقی کی تصانیف میں بلبلیں نواب کی ، بیدار دل لوگ (خاکوں کا مجموعہ)، کھٹے میٹھے انار (کالمز کا مجوعہ) اور ان دیکھی گہرائیاں (ہارون ابن علی کی انگریزی خودنوشت کا ترجمہ) ، 'ایک جج ہنس بھی سکتا ہے شاید (جسٹس ایم آر کیانی کی کتاب ترجمہ)،رہنمائے تربیت، تفہیم کراچی، سانحہ مشرقہ پاکستان، تصوری کا دوسر رخ، شمالی امریکہ کے مسلمان شامل ہیں۔ فاروقی صاحب نے اپنی خودنوشت سپرد تحریر کے بعد گزشتہ کئی برس سے اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی، وہ اس کی اشاعت کے متمنی تھے ۔ ان کے انتقال کے تیسرے روز راقم معروف ادیب ،شاعرو ناشر سید معراج جامی کو ان کے صاحبزادے کے پاس مذکورہ خودنوشت کی اشاعت کے سلسلے میں بات چیت کے لیے لے گیا اور ایک مختصر سی نشست کے بعد فاروقی صاحب کے صاحبزادے نے کتاب کی اشاعت کی منظوری دے دی۔ مذکورہ خودنوشت تیزی سے اشاعت کے مراحل طے کررہی ہے۔ کاش کہ یہ خودنوشت فاروقی صاحب کی زندگی میں شائع ہوجاتی۔ فاروقی صاحب نے اپنی خودنوشت کا نام

گزشت۔اِس دلچسپ نام کی Sir بھی کچھ الگ ہی رکھا تھا۔ کلرک سے کلرک تک۔ایک وجہِ تسمیہ ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ جب انھوں نے ملازمت کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر شخص کہہ SIR کہا کرتے تھے اور جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ہر شخص ان کو SIR کو رہا تھا۔

شاہ محی الحق فاروقی کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید مشیر الحق، کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، ایک روز وہ گورنر جگ موہن سے مل کر واپس آرہے تھے کہ رستے میں اغوا کرلیے گئے اور پھر 10 اپریل 1990 کے دن ان کی لاش ملی۔یہ وقت کراچی میں مقیم شاہ محی الحق فاروقی پر بہت کڑا گزرا تھا، انہیں باوجود کوشش کے ہندوستان کا ویزا نہ مل سکا اور وہ اپنے بھائی کی تدفین میں شریک نہ ہوسکے۔

مترجم: شاہ محی الحق فاروقی

شاہ محی الحق فاروقی 15 جون 1932کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے قصبہ بحری آباد ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ شبلی کالج اعظم گڑھ سے 1947میں میٹرک کیا۔ اسی سال اکتوبر میں پاکستان آگئے۔ سندھ مسلم کالج کراچی سے بی اے اور اسلامیہ لا کالج سے ایل ایل بی کیا اور پھر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ شاہ محی الحق فاروقی نے اپنی ملازمت کا آغاز بطور ایک جونیئر کلرک کیا اورآخر میں فنانس ڈائریکٹر کے منصب سے سبکدوش ہوئے۔ شاہ محی الحق فاروقی نے وفاقی پبلک سروس کمیشن سے لوئر ڈویژن کلرک (LDC) کا امتحان پاس کیا۔ 1951 میں وفاقی وزارتِ قانون میں تعیناتی ہوگئی۔1959میں اسسٹنٹ سے ترقی پاکر وفاقی سیکریٹریٹ کے اوّلین سیکشن آفیسرز میں منتخب ہوئے۔ پھر اپنی خداداد صلاحیتوں کی مدد سے ترقی کرتے ہوئے کیبنٹ ڈویژن کے جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر 15 جون 1992 کو کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن کے ڈائریکٹر فنانس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

فاروقی صاحب کے ایک قریبی عزیزاحمد حاطب کی بیان کردہ تفصیلات کے مطابق "شاہ محی الحق فاروقی نے اپنے ادبی سفرکا آغاز مدیر ماہنامہ "ساقی" شاہد

احمد دہلوی، مدیر ماہنامہ "نقش" شمس زبیری، مدیر پندرہ روزہ "نمک دان" مجید لاہوری اور سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ کراچی ڈاکٹر اسلم فرخی وغیرہ کی معیت میں کیا تھا۔ یہی لوگ ان کے ادبی ہم سفر اور ان کے ادبی ارتقا کے شاہدین میں سے تھے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سابق ناظم مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن ان کے معترفوں میں سے تھے، محب عارفی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور ڈاکٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر محمد الغزالی ان کے نیازمندوں میں سے۔ 1962 میں جب وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے پہلے سیکریٹری مقرر ہو کر لاہور گئے تو وہاں ان کی ملاقات مولانا کوثر نیازی سے ہو گئی۔ مولانا کی فرمائش پر ان کے ہفت روزہ "شہاب" میں ابن منیر کے قلمی نام سے تازہ خبروں پر طنزیہ تبصرے لکھتے رہے۔ 1964 میں ان کی تقرری اسلام آباد میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی میں ہو گئی۔ فاروقی صاحب نے ادارے کے تحقیقی جریدے "فکر و نظر" میں بہت سے طبع زاد مضامین لکھے اور انگریزی سے کئی ترجمے بھی کیے۔ ان کے طبع زاد مضامین میں "وقف علی الاولاد" اور "اہانتِ انبیائؑ" کے موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین کو بڑی پذیرائی ملی۔ فاروقی صاحب ایک بلند پایہ مزاح نگار اور انتہائی مقبول کالم نگار تھے۔ روزنامہ "امت" کراچی میں ایک طویل مدت سے "کھٹے میٹھے انار" کے مستقل عنوان سے پر لطف اور پر مزاح کالم نگاری کر رہے تھے۔
انھوں نے مزاح میں بھی متعدد تراجم کیے جن میں امریکی مزاح نگار مارک ٹوئن کے مزاح پارے بھی شامل ہیں۔

کم "مزاح نگار" ایسے ہوتے ہیں جو "مجلسی مزاح گو" بھی ہوں۔ فاروقی صاحب اپنی تحریروں کی طرح اپنی مجلسی گفتگو سے بھی محفل کو کشتِ زعفران بنا کر رکھ دیتے تھے۔ اصل میں وہ تھے ہی مجلسی آدمی۔ ان کے کالموں میں بھی مجلسی گفتگو ہی کے چٹخارے ملتے تھے۔ وہی قصے، وہی کہانیاں، وہی لطیفے اور وہی حاضر جوابیاں۔

مترجم: شاہ محی الحق فاروقی

فاروقی صاحب بڑے حاضر جواب آدمی تھے۔ پاکستان قومی اتحاد نے جب 1978ءمیں ضیاءالحق کی کابینہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو محموداعظم فاروقی صاحب

وزیرِ اطلاعات و نشریات مقرر کیے گئے۔ شاہ محی الحق فاروقی کی دینداری اور دیانت داری کے سبب، محمود اعظم فاروقی صاحب نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ان کے سیکریٹری کے طور پر کام کریں۔ محی الحق فاروقی صاحب نے انکار کیا تو محمود اعظم فاروقی صاحب نے کہا: "آپ جیسے دیانت دار لوگ بھی انکار کریں گے تو افرادِ کار کہاں سے آئیں گی؟ آخر آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟" محی الحق فاروقی صاحب پہلے تو کچھ دیر عذر سوچتے رہے پھر بولے: "آپ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی"۔ محمود اعظم فاروقی صاحب نے قدرے تلخ لہجے میں پوچھا: "کیا مشکل ہو جائے گی؟" محی الحق فاروقی صاحب نے جواب دیا: "جب آپ فون اٹھا کر کہیں گے کہ میں فاروقی بول رہا ہوں تو ہر شخص ہر مرتبہ یہ پوچھے گا کہ کون سے فاروقی؟ مسٹر فاروقی یا منسٹر فاروقی؟"

شاہ محی الحق فاروقی کے برادرِ نسبتی احمد حاطب صدیقی مزید بیان کرتے ہیں کہ فاروقی صاحب کیبنٹ ڈویژن کے جوائنٹ سیکریٹری تھے کہ 1990ء میں یکایک ان کا تبادلہ ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے ڈائریکٹر فنانس کے عہدے پر کر دیا گیا۔ یہ بے نظیر بھٹو کا پہلا دورِ اقتدار تھا۔ وزیرِ اعظم کی ایک قریب ترین شخصیت نے ان سے بالواسطہ طور پر ایک ایسا کام کروانا چاہا جو غیر قانونی اور ناجائز تھا۔ فاروقی صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ سزا کے طور پر وہ افسرِ بکارِ خاص (OSD) بنا کر ایک گوشے میں بٹھا دیے گئے۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ یہ

عاجز کالم نگار ان سے ملاقات کے لیے ایک روز کراچی سے اسلام آباد پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ان کی تعیناتی سیکریٹریٹ نمبر دو میں ہے۔ وہاں پہنچ کر ان کا کمرہ پوچھنا شروع کیا۔ فاروقی صاحب دفتر میں بھی شیروانی اور چوڑی مہری کا علی گڑھ کٹ پاجامہ پہن کر جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے دفتر میں ''S. M. H. Farooqi'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے، جب کہ ان کا یہ ملاقاتی ہر شخص سے 'شاہ محی الحق فاروقی' کو پوچھتا پھر رہا تھا۔ بالآخر ایک صاحب نے تفتیشِ مزید کی خاطر شکل، صورت اور حلیہ پوچھا تو لفظوں میں ان کا سراپا کھینچ دیا۔ وہ لہک کر بولا: "اچھاآآآ.... وہ پاجامے والے سیکریٹری؟" تب یاد آیا کہ ان کی نمایاں شناخت تو ان کا لباس ہی ہے۔ خوش ہو کر کہا: "جی ہاں.... وہی وہی"۔ یوں ہم ان کے کمرے میں پہنچائے گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ان کو یہی قصہ سنایا اور ان سے کہا کہ: "صاحب! یہاں تو آپ پاجامے والے سیکریٹری کے طور پر پہچانے جاتے ہیں"۔ کہنے لگے: "ہاں میاں.... اب یہاں بس ایک میں ہی تو پاجامے والا رہ گیا ہوں...."

شہر کراچی سے ایک محبت کرنے والا شخص اٹھ گیا، فاروقی صاحب کا ہر چاہنے والا ان کی جدائی کے کرب کو اپنے دل میں محسوس کر رہا ہے:

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

مستنصر حسین تارڑ کا تازہ ترین انٹرویو

چند روز قبل (فروری 2012) ایک انگریزی اخبار میں تارڑ صاحب کا انٹرویو شائع ہوا ہے، اسے ہمارے کرم فرما جناب عارف وقار نے لیا ہے۔ مذکورہ انٹرویو کا عنوان ہے:

At home with the wanderer

ہماری انگریزی ان اساتذہ کی اردو جیسی ہے جو گزشتہ 35 برس سے ماسکو یونیورسٹی میں تارڑ صاحب کی تحریریں بطور نصاب طالب علموں کو پڑھا رہے ہیں، لہٰذا ہم نے انٹرویو کے عنوان کا ترجمہ "ایک خانہ بدوش کے گھر میں" کے عنوان سے کیا ہے۔

انٹرویو پڑھ کر کئی دلچسپ باتوں کا علم ہوا مثلاً:

A few days later, the young Tarrar was shocked to see a press statement issued by the prime minister of Pakistan saying that Soviet Union was Pakistan's mortal enemy; and that the boys who had been to Moscow were traitors and would be arrested at the Karachi airport on their return and immediately dispatched to Mianwali jail

یہ ذکر تارڑ صاحب کے 1957 میں ماسکو کے پہلے سفر سے واپسی کا ہے، ان دنوں

تارڑ صاحب کی عمر 18 برس تھی۔ وہ تو میانوالی جیل جانے سے بچ گئے لیکن شنید ہے کہ میانوالی جیل میں ایسے کئی قیدی موجود ہیں جنھوں نے تارڑ صاحب کے ناولز پڑھ رکھے ہیں۔ چند ایک تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے تارڑ صاحب کا سفر نامہ 'نکلے تیری تلاش میں' پڑھ کر دساور کا رخ کیا، وہاں دھر لیے گئے اور شکریے کے ساتھ واپس کیے گئے۔

انٹرویو میں تارڑ صاحب مزید بیان کرتے ہیں

After about half a century, in 2007, I got an invitation from The Moscow State University to deliver a series of lectures about the influence of Russian Classics on Pakistani literature. On that occasion, I was bestowed the Gold Medal for Outstanding Literary Contributions.“

خفیہ ذرائع سے ہمیں یہ علم ہوا کہ تارڑ صاحب نے ماسکو یونیورسٹی میں "روسی فن پاروں کے پاکستانی ادب پر اثرات" کے ضمن میں اپنی ہی تحریریں پیش کیں، سند کے طور پر انہوں نے روس کے پس منظر میں لکھی اپنی تخلیقات کو پیش کیا جن میں ان کا ناول جپسی، ماسکو کی سفید راتیں وغیرہ شامل ہیں۔ روسی فن پاروں کے پاکستانی ادب پر جتنے اثرات تارڑ صاحب کی تحریروں میں نظر آتے ہیں، شاید ہی کوئی دوسری مثال مل سکے۔ تارڑ صاحب کا جلد شائع ہونے والا

ناول بھی ماسکو ہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

ماسکو یونیورسٹی کی Professor Galina Dushenko کے لیے پاکستان یا تو فیض کی شاعری ہے یا پھر مستنصر کا ناول۔ان کے الفاظ میں:

"For us, Pakistan is Faiz's poetry and Tarrar's novels

فیض کی شاعری تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، البتہ خاتون پروفیسر کے بیان کے دوسرے حصے کو پڑھ کر ماسکو اور اسلام آباد کے خراب تعلقات کا سبب اب ذرا واضح طور پر سمجھ میں آیا ہے۔ گزشتہ 35 برس میں تو ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب یہ حالات خطرناک حد تک خراب ہو گئے تھے، خبریں گرم تھیں کہ روس کی جانب سے حملہ اب ہوا کہ تب ہوا۔ یہ بات بھی قابل تشویش ہے کہ خاتون پروفیسر کے لیے پاکستان، تارڑ صاحب کا ناول ہی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، یہاں ایک مطلب تو سیدھا سیدھا یہ نکلتا ہے کہ شاید خاتون کا اشارہ یہاں تارڑ صاحب کے ناول راکھ کے عنوان کی جانب ہے کہ وطن عزیز میں گزشتہ چند برسوں سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر خیال "راکھ" اور 'خس و خاشاک' ہی کی جانب جاتا ہے۔ ماسکو یونیورسٹی میں 35 برس سے تارڑ صاحب کی چند تحریریں نصاب میں شامل ہیں۔ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام عموماً سارا سال ہی ہوتے رہتے ہیں اور ان کے عوض پی ایچ ڈی کی سند بھی جاری کی جاتی ہے،

ہمیں امید ہے کہ یہ تارڑ

صاحب کی تحریروں پر بھی پی ایچ ڈی کی جائے گی یا ہو سکتا ہے کہ اب تک کی جاچکی ہو۔

:خامہ بگوش نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ

مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں جن کاموں پر سزا ہو سکتی ہے، انہی کاموں پر بعض" پسماندہ ایشیائی ممالک میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔ تارڑ صاحب کے معاملے میں مندرجہ بالا بیان کو الٹ کر (مہذب ممالک سے ایشیائی ممالک کے الٹ پھیر کے ساتھ) پڑھا جائے تو مفہوم واضح ہوتا نظر آتا ہے۔

یہ مقام شکر ہے کہ تارڑ صاحب کی تحریریں ماسکو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کی گئیں، ہم انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ان کی محنت ضائع نہیں ہوئی ورنہ اس قسم کی کوششوں میں ہم نے خود ادیب کو ضائع ہوتے دیکھا ہے۔ (خامہ بگوش (سے معذرت کے ساتھ

: انٹرویو میں ایک ٹکڑا یہ بھی نظر سے گزرا

Dr Christina Oesterheld, from the Institute of Modern South Asian Languages and Literatures, Heidelberg University, Germany, is an expert

in modern Urdu Literature. She specialises in the fiction of Quratulain Hyder, but she has declared my novel Raakh to be the most representative piece of fiction of the whole subcontinent."

ڈاکٹر اوسٹرہیلڈ سے جناب ابن صفی کے تعلق سے ہمارا رابطہ بھی رہا ہے، کیا خوب خاتون ہیں۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ ایک غیر ملک سے تعلق رکھنے والی نے ہمارے ادیب کے مقام کا تعین کیا ہے، یہ کام تو ہمارے نقادوں کو کرنا چاہیے۔ ایک نقاد سے ہماری اس سلسلے میں بات ہوئی تھی، کہنے لگے کہ راکھ کو پڑھنے کے بعد ان کے ہاتھ میں سوائے راکھ کے، اور کچھ نہ آیا لہذا انہوں نے اس پر تبصرہ لکھنے کا خیال ترک کردیا۔ ہم اس شر پسندانہ رائے سے ہرگز ہرگز اتفاق نہیں کرتے ! لیکن حال ہی میں ہمیں ناقدین کے تارڑ صاحب کے بارے میں اس معاندانہ رویے کی ایک اہم وجہ معلوم ہوئی ہے۔ دونوں طرف ہے "آگ" برابر لگی ہوئے کے مصداق تارڑ صاحب بھی نقادوں سے سخت بیزار ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تارڑ صاحب کا ایک حالیہ بیان لاہور کے الحمراء کے جنوری 2012 کے سالنامے میں شائع ہوا ہے۔ مدیر الحراء کی ہمت کو داد ہے کہ ان کا خط شائع کردیا۔ اپنے خط میں فرماتے ہیں:

" درانی نامہ اور محمد کاظم کی آپ بیتی 'دن جو علی گڑھ میں گزرے' ایسی

تخلیقات ہیں جو الحمراء میں مسلسل شائع ہونے والی زہر ناک اور گھٹیا تحریروں کی کڑواہٹ بھلا دیتی ہیں جن میں کسی ایک ادبی شخصیت پر نہایت پلید وار کیے جاتے ہیں۔ آپ کی خواہش اور فرمائش سر آنکھوں پر۔ میں اپنے تازہ ناول کے کچھ حصے آپ کی نذر کرتا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ محفل احباب میں ہمہ وقت موجود پر تعصب اور مدرسی نقاد اس ناول پر اپنی عالمانہ رائے دینے سے اجتناب کریں، خاموشی اختیار کریں۔" (مستنصر حسین تارڑ)

ہم نے الحمراء کے چند گزشتہ شماروں کا بندوبست کرنے کی کوشش کی ہے، ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ محفل احباب میں ایسے کون سے "پر تعصب اور مدرسی نقاد' ہیں جنہیں سوائے الحمراء کی محفل احباب میں موجود رہنے کے، اور کوئی کام ہی نہیں۔

استاد لاغر مراد آبادی نے مذکورہ خط پڑھنے کے بعد فرمایا کہ "اس عزیز نے اب تک جتنے ناولز لکھے ہیں ان پر ان کے اپنے الفاظ میں 'خاموشی اختیار کرلینا' ہی بہتر ہے۔ لیکن تمام لوگ ایک جیسا نہیں سوچتے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان مرحوم نے دو برس قبل تارڑ صاحب کے بارے میں اپنی ایک عقیدت بھری تحریر میں لکھا تھا کہ

تارڑ نے یہی کارنامہ کر دکھایا ہے کہ معمولی کو غیر معمولی بنا دیا ہے اور عام باحیا" خواتین کے کرداروں کو پہاڑوں، صحراؤں اور جنگلوں کی بستیوں میں افسانوی کردار "بخش کر زندہ و امر کر دیا ہے۔

اعوان صاحب کے اس بیان کے پہلے حصے سے ہمیں مکمل اتفاق ہے کہ تارڑ صاحب کی تحریروں کے ہم بھی مداح ہیں لیکن تارڑ صاحب کے سفر ناموں و ناولوں بالخصوص نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی اور جپسی میں "عام باحیا خواتین" تو ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ بلکہ ایک آبی ذخیرے کے کنارے غسل کرتی جن خواتین کا تفصیلی بیان ' اندلس میں اجنبی 'میں ملتا ہے، ان میں تو حیا بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اگر حسن اتفاق سے تارڑ صاحب کو ڈاکٹر نازلا سعد، پاسکل، مارگریتا اور مرسیڈس جیسی باحیا خواتین دوران سفر مل بھی جاتی تھیں تو وہ بھی ملاقات کے بعد اپنی حیا اور تارڑ صاحب، دونوں کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔تارڑ صاحب کے سفر اندلس کے دوران ان کی ملاقات ڈاکٹر نازلا سعد سے ہوئی تھی، مختصر وقت ہی میں ان کے اس نیک بی بی سے تعلقات اس نہج پر پہنچ گئے کہ وقت رخصت، دونوں قرطبہ کی ایک بند گلی میں پہنچ گئے تھے اور جہاں بقول تارڑ صاحب، ' اسے چھونے کے لیے مجھے خلیل جبران کی ضرورت نہ تھی'۔ تارڑ صاحب تو ڈاکٹر نازلا کو چھوڑ کر کب کے پاکستان واپس آ گئے لیکن مذکورہ سفر نامے کا قاری اب تک اس بند گلی ہی میں بھٹک رہا ہے۔

ایک زمانے میں تارڑ صاحب کے سفرناموں کی مقبولیت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ راوی کے بیان کے مطابق لاہور کے یعقوب ناسک لندن علاج کی غرض سے گئے، وہ ٹیوب میں سفر کررہے تھے، ان کے برابر میں ایک انگریزی خاتون محوخواب تھیں، سوتے سوتے ان کا سر یعقوب صاحب کے کندھے سے آ لگا۔ انہوں نے خاتون کو جگاتے ہوئے کہا" بی بی اٹھو! میں یقوب ناسک ہوں، مستنصر حسین تارڑ نہیں"۔

ظہور اعوان صاحب عقیدت میں اس قدر بڑھ گئے اور یہ لکھنے سے بھی نہیں چوکے کہ میں کسی زمانے میں مستنصر حسین تارڑ سے کہا کرتا تھا کہ تارڑ صاحب آپ کمرے" "سے غسل خانے تک جائیں تو اتنے عرصے کا بھی سفرنامہ لکھ دیں گے۔

اس جملے سے یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ تعریف ہے یا کچھ اور۔ اعوان صاحب نے یہ غور نہیں کیا ان کی رائے پر عمل کے نتیجے میں تارڑ صاحب کے قاری کو ایک محتاط اندازے کے مطابق سال میں ان کے 1095 سفرنامے پڑھنے کو ملیں گے۔ تارڑ صاحب کے ناشر کو چھوڑ کر ان کے قارئین کو اس کا کتنا مالی نقصان ہوگا، اعوان صاحب نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔

تارڑ صاحب کے سفرناموں نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی اور ناول فاختہ

پر معروف ادیب محمد خالد اختر کے تند و تیز مضامین بھی خاصے کی چیز ہیں۔ ان مضامین میں ستائش بھی ہے اور تنقید بھی، محمد خالد اختر کے منفرد اسلوب نے ان مضامین کو کتابوں پر کیے گئے تبصروں میں ایک الگ مقام دیا ہے۔

انٹرویو کے آخر میں تارڑ صاحب سے ایک دلچسپ سوال کیا گیا:

Wearing so many feathers in his cap — a travel writer, a novelist, a playwright, a columnist, a television presenter and an actor — how would he like to be remembered, say, 50 years from now, I ask. He looks directly into my eyes for the first time during the conversation and puts me a counter question, rather wryly, "Fifty years from now, or fifty years from the day I'm buried under tons of soil in my family graveyard?"

تارڑ صاحب نے جواب دیا:

"All these feathers in my cap will be blown away by the dust-storm of time. The travel writer, the novelist, the media person will vanish in the fog of future. If, however, the impossible happens and some crackpot discovers me in the future, I would like to be remembered as a person who devoted his whole

life sweating at his study table, as a travel writer and a novelist. Presumptions are pretensions but two of my novels, Bahaao and Khaso Khashaak Zamanay may survive

crackpot کے معنی خبطی، سنکی، نیم باؤلا، مقتدرہ قومی زبان کی پانچ کلو وزنی لغت میں پاگل درج ہیں۔ یہاں یہ بات تعجب خیز ہے کہ تارڑ صاحب اپنے کام کو کسی 'کریک پوٹ' ہی سے کیوں دریافت کروانا چاہتے ہیں۔ وطن عزیز میں آج بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو مذکورہ لفظ کی تعریف پر پورا اترتے ہیں لیکن روز بروز بڑھتے معاشی و معاشرتی مسائل کے پیش نظر اس بات کا قومی امکان ہے کہ پچاس برس کے بعد ایسے افراد کی تعداد میں ہوشربا اضافہ ہوچکا ہوگا لہٰذا اگلے پچاس برس بعد بھی یہ کام کئی ایسے لوگ بخوشی کرنے پر تیار ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پچاس برس بعد ہمارے ممدوح کو دریافت کرنے والے نے ان کے ناولز پڑھ رکھے ہوں، اس صورت میں یہ تلاش بیحد سہل ہوجائے گی۔

چند برس قبل وائس آف رشیا کی اناؤنسر ایرینا ماکسی مینکو نے تارڑ صاحب کا انٹرویو کیا تھا جو مذکورہ ریڈیو سے 27 جون 2007 کو نشر ہوا تھا، انٹرویو میں تارڑ صاحب نے نکلے تری تلاش "Professor Galina Dushenko انکشاف کیا کہ ماسکو یونیورسٹی کی میں" کو بائبل کی طرح پڑھتی ہیں۔ واضح رہے کہ تارڑ

صاحب نے زیر تبصرہ انٹرویو میں اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے۔

روسی بحیثیت قوم خدا پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی کوئی مذہبی کتاب ہے، لہذا پروفیسر صاحبہ نے "نکلے تری تلاش میں" کو ہی ایک مذہبی کتاب کا درجہ دے دیا۔

خاتون چونکہ تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور اب تک ہزاروں لاکھوں طالب علموں میں علم بانٹ چکی ہیں، لہذا اس بات سے یہ خدشہ بھی لاحق ہوتا نظر آتا ہے کہ اگر آنے والے وقت میں خاتون پروفیسر کے پیروکار بھی انہی کے نقش قدم پر چل پڑے تو اس بات کا قومی امکان ہے کہ پچاس برس کے بعد "نکلے تری تلاش میں" روس کی مذہبی کتاب قرار پا سکتی ہے۔ یہ ہر گھر میں طاق پر رکھی ملے گی، لوگ اس کے ابواب کے تعویذ بنایا کر گلے میں پہنا کریں گے، فال نکالنے والے اس سے فال نکالا کریں گے۔ اور کم و بیش یہ وہی وقت ہوگا جب وطن عزیز میں کوئی "کریک پاٹ" تارڑ صاحب کو دریافت کر رہا ہوگا۔

تارڑ صاحب کے انٹرویو میں ایک جگہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کو لکھتے ہوئے 45 برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔

ادھر ہمارے قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ اب تک ہم نے تارڑ صاحب کی تحریروں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کیوں محفوظ کر رکھی ہے سو اس بارے عرض ہے کہ ہم

اوائل عمری ہی سے ان کے بڑے مداح رہے ہیں، نکلے تری تلاش میں،شانہ بدوش،، اندلس میں اجنبی، جپسی ، پیار کا پہلا شہر ، ہنزہ داستان، کے ٹو کہانی تو ہم نے گھول کر پیے ہوئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کے بعد کے سفرناموں اور ناولوں نے کھلنے سے انکار کردیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں ہمیں اپنے محبوب مصنف جناب ابن صفی کا تحریر کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے جسے درج کرنے میں ہمیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی:

ایک بار کا ذکر ہے کہ انگریزی کے مشہور مصنف ایڈگر ویلس نے اپنے مداحوں کے ایک مجمع میں بڑے خلوص سے کہا۔ " پچاس ناول لکھنے کے بعد ہی مجھے ناول لکھنے کا سلیقہ ہوا ہے۔

چھوٹتے ہی ایک صاحبزادی نے فرمایا" کاش ایسا نہ ہوا ہوتا! اب تو آپ بور کرنے لگے ہیں"۔ شروع شروع کی کتابوں کا کیا کہنا۔ کاش آپ ماضی میں چھلانگ لگا سکیں۔

نیشنل بک فاونڈیشن کی ایک تقریب۔25 فروری 2012

بروز ہفتہ 25 فروری 2012 ، کراچی ایئرپورٹ کے اندرونی حصے تک پہنچنے سے قبل سید معراج جامی صاحب اور راقم کو کئی حفاظتی مراحل سے گزرنا پڑا، ہم دونوں کے داخلی اجازت نامے سیکورٹی اہلکاروں کے پاس موجود تھے ، خوب تسلی کے بعد اندر جانے کی اجازت ملی لیکن اندر داخلے کے بعد بھی ہم پر شک کیا جاتا رہا، دو جگہوں پر جسمانی تلاشی کے بعد مطلوبہ منزل تک پہنچے ۔ یہ اندورن ملک پرواز کا ہال تھا جہاں رئیس فاطمہ صاحبہ اور ان کے میاں قاضی اختر (قاضی احمد میاں کے فرزند) بھی تشریف رکھتے تھے۔

ہماری موجودگی کی سبب نیشنل بک فاونڈیشن کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب تھی۔ فاونڈیشن کو ایک روز خیال آیا کہ کراچی کے ہوائی اڈے پر کیوں نہ کتابوں کی ایک دکان کھولی جائے جہاں سفر سے گھر واپسی پر اترے مسافر پہلے یہ کتابیں خریدیں اور پھر اپنی اپنی منزل کا قصد کریں۔ اسی طرح وہ مسافر جو گھر سے دور جارہے ہوں، پہلے یہاں کتابیں کا معائنہ کریں اور پھر اگلی منزل کے بارے میں سوچیں۔ یہ اہتمام انفرادی حیثیت میں کرنا مشکل نظر آرہا تھا سو اس سلسلے میں مدد لی گئی چند دیگر اداروں کی ، اور کتابوں کی دکان پر یہ بھاری

: بھر کم الفاظ جگمگا اٹھے

Travellers Book Club & Book Shop

National Book Foundation/Civil Aviation Authority

Joint Venture Between The Cabinet Division &

Ministry Of Defence

ایک روز قبل جناب عقیل عباس جعفری کا پیغام آیا کہ پروفیسر رئیس فاطمہ نے، جو کہ تقریب مذکورہ کے انعقاد کے سلسلے میں 'بک ایمبسیڈر' کے عہدے پر فائز کی گئی تھیں، ان سے رابطہ کیا اور کہا کہ شہر کراچی میں پائے جانے والے چند کتاب دوست اشخاص کے نام دیے جائیں ، سو یہ تھی ہماری وہاں موجودگی کی وجہ ۔

عقیل صاحب نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس تقریب میں پاکستان کے وزیر دفاع مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کریں گے۔۔اب ہم لوگ وہاں دو گھنٹے سے انتظار میں بیٹھے تھے اور عقیل صاحب کا دور دور تک پتہ نہ تھا، خیر اس کی ایک وجہ تھی جو آگے بیان کروں گا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینیجنگ ڈائرکٹر جناب مظہر الاسلام نے میرا اور جامی صاحب کا استقبال کیا تھا، خاکسار نے اپنا نام بتایا تو کہنے لگے ، جی، میں آپ کو جانتا ہوں۔یا مظہر العجائب ! یہ ہمیں کیسے جانتے ہیں ؟ شکر ہوا کہ جلد ہی جامی صاحب نے "تشویش دور کردی" تم کو بی بی سی والا راشد اشرف سمجھ رہے ہوں گے

مظہر الاسلام اسلام آباد سے آئے تھے اور سخت پریشانی کے عالم میں ، جو ایسے موقعوں پر اس شخص کا مقدر ہوتا ہے جس کے کاندھوں پر اس قسم کی تقریبات کے انعقاد کی ذمہ داری ہوتی ہے، ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے ۔ کسی نے مجھے بتایا کہ مظہر صاحب وقت کے بہت پابند ہیں اور مذکورہ تقریب کے جلد شروع ہونے کے انتظار میں یہ وقت ان پر بھاری گزر رہا ہے۔انہیں دیکھ کر مجھے ان کی کتاب کا عنوان 'گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی' یاد آرہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ ان سے حال ہی میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جانب سے شائع کی گئی زیڈ اے بخاری کی 'سرگزشت' کے بارے میں بات کروں جس پر پطرس بخاری کی تصویر شائع کردی گئی ہے، 1966 اور 1995 کے بعد شائع ہونے والا سرگزشت کا یہ تیسرا

نسخہ ہے، پھر سوچا کہ اس موقع پر ان کی پریشانی کو مزید ہوا دینا مناسب نہ ہوگا۔ یہ ذکر رئیس فاطمہ اور قاضی اختر سے خوب رہا، قاضی صاحب تو اس قدر حیران ہوئے کہ اپنی نشست سے اٹھ کر بطور خاص سرگزشت کو دیکھنے گئے جسے منتظمین نے ایک نمایاں جگہ سجا رکھا تھا۔ بعد ازاں مظہر صاحب سے گفتگو میں اس موضوع پر بات ہوئی، معلوم ہوا کہ وہ اس بارے میں مکمل آگاہی رکھتے ہیں اور جلد ہی اس کے تدارک کے لیے مناسب قدم اٹھانے والے ہیں۔ جناب مظہر الاسلام کا کیا ہوا ایک معرکے کا کام ابھی تک ذہنوں میں تازہ ہے جس میں انہوں نے پہلی مرتبہ صحافیوں کی بجائے ادیبوں، شاعروں فنکاروں کی ملاقاتیں وزیراعظم سے کروائی تھیں۔ مذکورہ ملاقات میں مشاہیر ادب نے اعلیٰ ترین حکومتی شخصیت کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ کہنے والے اسے ایک منفرد واقعہ قرار دیتے ہیں۔ ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے مظہر الاسلام صاحب کے دیگر کارناموں میں ریلوے اسٹیشنز پر کتابوں کے اسٹالز کا قیام، مختلف شہروں میں سفراء کتب (بک ایمبیسڈرز) کی تقرری، ریل گاڑیوں میں کتابوں کی فراہمی کے علاوہ جیل میں کتب بینی کے فروغ کی کوششوں جیسے اہم کام شامل ہیں۔ اکثر ان کے مخالفین ان پر الزامات لگاتے رہتے ہیں، کچھ معاملے عدالتوں تک بھی پہنچے ہیں لیکن کیا ہم ایک معروف ادیب سے کسی بھی قسم کی بددیانتی کی توقع کر سکتے ہیں، یہ بات سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ کئی سمجھوتے بھی کرنے پڑتے ہیں بالخصوص اس وقت جب آپ کسی سرکاری ادارے

کے ساتھ منسلک ہو جائیں لیکن اگر یہ سب کسی نیک مقصد بالخصوص کتاب کی محبت میں کرنا گوارا کیا جائے تو ضمیر بہر حال مطمئین رہتا ہے۔

واضح رہے کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کا ادارہ 1972 میں پارلیمنٹ کی منظوری کے تحت قائم کیا گیا تھا. ادارے کے انتظامی امور کا ذمہ دار اس کا بورڈ آف گورنر زہے جبکہ وفاقی وزیر تعلیم اس بورڈ کا چیرمین ہے۔ پاکستان میں کتابوں کی اشاعت اور مطالعہ کتب کے فروغ کے لیے سرگرم عمل اس ادارے کا صدر دفتر اسلام آباد میں واقع ہے۔ اسکے علاوہ اس ادارہ کے صوبائی صدر دفاتر، علاقائی دفاتر اور کتب سیل پوائنٹس بھی کام کر رہے ہیں.یہ ادارہ مختلف موضوعات پرکتب شائع کرنے کے علاوہ بچوں کے ادب کے فروغ میں بھی کوشاں ہے.علاوہ ازیں

یہ ادارہ نابینا افراد کے لئے بھی بریل کتب شائع کرتا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے پاکستان میں کتب کے فروغ کے سلسلہ میں مختلف موضوعات پر بہت سی نصابی، علمی، ادبی و تحقیقی اور ترجمہ شدہ کتابیں شائع کی ہیں۔اس ادارہ کے زیر اہتمام ایک "کتاب رسالہ" بھی شائع کیا جاتا ہے جس میں مختلف کتب پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

غالب لائبریر ی کے نسیم صاحب،ادیب خرم سہیل ، شاعرنواز ندیم ہاشمی ، چند دیگر خواتین بھی حاضرین میں موجود تھے۔ خرم سہیل ان دنوں جناب رضا علی عابدی کی سوانح عمری تحریر کررہے ہیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن والوں کے جی میں کیا آئی کہ وہاں ٹی وی کی ایک طرحدار اداکارہ کو بھی مدعو کرلیا ، وہ نیک

بخت جب تک وہاں موجود رہی، اس کے پرس میں موجود آئینہ اس کے مد مقابل رہا، میک اپ ایسا کہ پھٹا پڑتا تھا، عمر سولہ سے چالیس کے درمیان، تقریب میں مدعو کی گئی تمام خواتین ایک طرف اور وہ عفیفہ ایک جانب چپ چاپ اکیلی ہی بیٹھی رہی۔ ہاں ایک موقع پر وہ بول پڑی تھی، وزیر دفاع سے ٹی والوں نے حالات حاضرہ پر سوالوں کا طومار باندھا تو اداکارہ سے نہ رہا گیا، دو قدم آگے آئی اور کہا کہ آپ لوگ یہاں سیاسی سوالات مت کیجیے۔ ایک نامہ نگار تیز نکلا، کہنے لگا بی بی، آپ پیچھے ہٹ جایئے، کتابوں کی تقریب کا احوال الگ پیش کیا جائے گا اور سیاسی گفتگو الگ۔ اداکارہ کو یہ عزت افزائی شاید پسند نہ آئی، طرحدار تھی، سو طرح دے کر تقریب کے اختتام سے قبل ہی غائب ہو گئی۔ سنا ہے کہ وہ 'سفیر کتاب' مقرر کی گئی تھی۔

جامی صاحب اور میں قاضی اختر جوناگڑھی سے محو گفتگو تھے۔ ہمارے لیے وقت پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اسی دوران ڈان نیوز چینل کا نمائندہ شرکاء سے ان کے تاثرات ریکارڈ کرتا ہماری جانب آنکلا، بزم میں جام مجھ تک بھی پہنچا، مائیک ہاتھ میں تھام کر میں رسمی گفتگو کرتا رہا۔

والٹیئر نے کہا تھا کہ " آپ کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ چند وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے"

یہاں معاملہ دوسرا ہے، ہم پر تو وحشی نسلوں ہی نے حکمرانی کی ہے اور یہ رفتہ رفتہ یہ وحشت عوام میں منتقل ہوتی چلی گئی۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن اس وحشت کو کم کرنے اور کتاب سے قاری کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ لوگ مرجاتے ہیں لیکن کتابیں نہیں مرتیں۔ یہ کہاوت ایک کونے میں چسپاں ایک ایسی تصویر کے نیچے لکھی دیکھی جس میں ایک شخص کتابوں کے انبار کو اٹھائے لڑکھڑاتا چلا جارہا ہے۔ سچ ہی تو ہے۔ کراچی کے پرانی کتابوں کے اتوار بازار میں ہر مرتبہ ایسی کتابیں نظر آتی ہیں جن کے مالکان انتقال کرچکے ہوتے ہیں، بعد ازاں یہ ذخیرہ کوڑیوں کے بھاؤ

بکتا ہے۔ اس سلسلے کی تازہ مثال اس وقت سامنے آئی جب لاہور کے پرانی کتابوں کے اتوار بازار میں چہل قدمی کرتے ہمارے ایک کرم فرما کو اظہر جاوید مرحوم کے ذخیرہ کتب کی دو کتابیں، مظہر محمود شیرانی کی 'بے نشانوں کا نشاں' اور گلزار کی 'چاند پکھراج کا' فٹ پاتھ پر فروخت کے لیے نظر آئیں۔ اظہر جاوید کا انتقال 14 فروری 2012 کو ہوا ہے، ان کی یہ کتابیں ان کے انتقال کے محض بارہ روز کے بعد ہی لاہور کے اتوار بازار میں فروخت کے لیے آ گئی تھیں۔

لیجیے وزیر دفاع تشریف لے آئے۔ تلاوت کا مرحلہ، پھر رسمی سی باتیں، میڈیا کے حالات حاضرہ پر سلگتے ہوئے سوالات، خدا خد کرکے معاملہ تما م ہوا۔ وزیر دفاع جانے سے قبل تقریب کے شرکاءکے پاس قلیل وقت کے لیے آئے اور ادھر ہم نے

ان سے ایک تصویر کھنچوانے کی درخواست کی کہ سند رہے اور 'بلاضرورت' کام آئے۔ شرکاء اب فواکہات پر ٹوٹ پڑے ہیں، ایسی تقریبات میں یہی ایک چیز ہے جس پر ٹوٹا جاسکتا ہے۔ جعفری صاحب کی پرواز کا وقت نزدیک تھا، وہ دہلی کے بین الاقوامی کتب میلے میں شرکت کی غرض سے جارہے ہیں، ان کی پلیٹ میں پیسٹریاں تھیں، میں ان سے کچھ پوچھتا ہوں، پیسٹری کی موجودگی میں ان کے لیے جواب دینا مشکل ہو رہا تھا، اچانک اسی اثناء میں ہال میں ایئرپورٹ اہلکار کی مشینی آواز گونجنے لگی: " مسٹر عقیل عباس جعفری سے درخواست ہے کہ فلائٹ نمبر فلاں فلاں محض ان ہی کے انتظار میں رکی ہوئی ہے،.براہ کرم جلد پہنچیں"

تقریب کے اختتام پر مچی ہڑبونگ کی وجہ سے ہم جناب مظہر الاسلام کو الوادع بھی نہ کہہ سکے !

کتابوں کا اتوار بازار (26 فروری، 2012)، بذلہ سنجان کراچی اور پائے

لوگ مرجاتے ہیں لیکن کتابیں نہیں مرتیں۔ یہ کہاوت حال ہی میں ایک ایسے پوسٹر کے نیچے لکھی دیکھی جس میں ایک شخص کتابوں کے انبار کو اٹھائے لڑکھڑاتا چلا جارہا ہے۔ سچ ہی تو ہے۔ اتوار بازار میں ہر مرتبہ ایسی کتابیں نظر آتی ہیں جن کے مالکان انتقال کرچکے ہوتے ہیں، بعد ازاں یہ ذخیرہ کوڑیوں کے بھاؤ بکتا ہے۔ 26 فروری 2012 کی صبح اتوار بازار میں کتابوں کے معائنے کے دوران لاہور سے عقیل عباس جعفری صاحب کا فون آگیا۔ وہ لاہور کے پرانی کتابوں کے اتوار بازار میں چہل قدمی کررہے تھے اور مظہر محمود شیرانی کی 'بے نشانوں کا نشاں' اور گلزار کی 'چاند پکھراج کا' کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے لیکن ایک بات بتا کر انہوں نے مجھے حیران کردیا۔ اظہر جاوید کا انتقال 14 فروری 2012 کو ہوا ہے، ان کی ذاتی دستخط شدہ کتابیں محض بارہ روز کے بعد اتوار بازار میں فروخت کے لیے آ گئی تھیں ۔ جعفری صاحب کو ملنے والی دونوں کتابیں مدیر تخلیق کی ملکیت تھیں جن پر ان کے دستخط بھی موجود ہیں۔

کراچی کے اتوار بازار میں ایک کرم فرما مسکراتے ہوئے ملے:

" ایک مرتبہ چکر لگا چکا ہوں، اب دوبارہ 'کانٹا' لے کر جارہا ہوں، دیکھئے

” کیا پھنستا ہے اس مرتبہ

کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے:

اور پھر بیاں اپنا

خاکے، مضامین

مصنف: اخلاق احمد دہلوی

صفحات: 167

ناشر: اردو مرکز لاہور

سن اشاعت: 1957

اور پھر بیاں اپنا

اخلاق صاحب نے یہ کتاب 1957 میں لکھی تھی، 1995 میں اس کا دوسرا حصہ 'پھر وہی بیاں اپنا' کے عنوان سے مکتبہ عالیہ سے شائع ہوا ۔ 'اور پھر بیاں اپنا' میں شامل مضامین، خاکوں اور تذکروں کے عنوانات یہ ہیں: میرا جی کااخلاق ، ردی کے بھاؤ، اناونسر، شاہد لطیف کی شادی، سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا، قصہ سوتے جاگتے کا، مصنف کی تلاش، عصمت (چغتائی)، ادب برائے عاقبت، مجازکے بعد کی رات، وہ ہنس کیوں رہے تھے۔

دہلی اور اس کے اطراف
ایک سفرنامہ ایک روزنامچہ
مصنف: مولانا حکیم سید عبدالغنی
ناشر: مجلس نشریات اسلام، کراچی
سن اشاعت: 1998

دہلی اور اس کے اطراف

وادی گنگا سے وادی مہران تک
خودنوشت
مصنف: محمد امجد علی حمیدی
ناشر: الحسن اکیڈمی کراچی
سن اشاعت: 2006 دسمبر

وادی گنگا سے وادی مہران تک

ایک مہم ایک فریب
ناول
ایچ اقبال
......

اتوار بازار سے رخ کیا جناب شجاع الدین غوری کی رہائش گاہ کا جہاں 'پایوں' کی دعوت میں انہوں نے معراج جامی صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ منزل پر پہنچنے سے قبل وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں ایک باقاعدہ ادبی نشست کا بھی اہتمام رہا ہوگا۔ فلیٹ کی بیٹھک میں کراچی کے بیس شعراءو ادباءفرشی نشست جمائے تشریف فرما تھے۔چند کرسیوں پر براجمان تھے۔ مشتاق احمد یوسفی کی آب گم یاد آگئی، ایک باب میں بشارت (گمان ہے کہ خود یوسفی صاحب) کے دوست خان صاحب بیمار ہوکر کراچی سے واپس پشاور چلے گئے تھے اور کچھ عرصے بعد انہوں نے بشارت صاحب کو خط لکھ کر کہا کہ اب آپ پشاور چلے آئیے، یہاں آپ کے اعزاز میں مشاعرے کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ کمرے میں کراچی کے سو اور پشاور کے پچاس شعراءکے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

پائے ، گرم نان، چاولوں کی کھیر اور اس کے بعد چائے ۔ اصولا تو اس 'پائے

کی دعوت کے بعد گھر کا رخ کرنا ہی مناسب تھا لیکن نشست کا باقاعدہ آغاز کیا گیا،'
حاضرین کی اکثریت اس بات سے ناواقف تھی کہ انہیں اپنی کوئی تخلیق بھی پیش کرنی ہے لہٰذا جو ہمراہ کچھ لائے تھے، مائیک انہی کے آگے گردش میں رہا۔

میں شرکاء میں موجود چند چہروں ہی سے آشنا تھا، جن میں علی حیدر ملک صاحب، معین کمالی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، اطہر ہاشمی، اور پروفیسر عزیز جبران انصاری شامل تھے۔ پروفیسر جبران سے ایک مرتبہ ابن صفی صاحب کے تعلق سے گفتگو رہی تھی، ملاقات کا شرف اس روز حاصل ہوا۔ پروفیسر صاحب نے گفتگو کے آغاز میں کہا کہ یہ نشست بزم میزان کے تحت منعقد کی جارہی ہے، انہوں نے علی حیدر ملک صاحب سے صدارت کی درخواست کی جبکہ مہمان خصوصی جناب اطہر ہاشمی اور مہمان اعزازی ڈاکٹر محمد محسن تھے۔

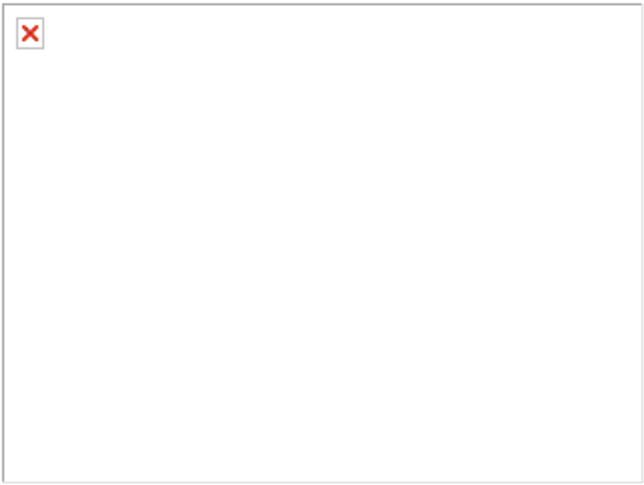

آگے کی طرف پروفیسر عزیز جبران انصاری۔ عقب میں دائیں جانب: ابوالفرح ہمایوں، معین کمالی

ابتدا میں معین کمالی صاحب نے بذلہ سنجان کراچی کے عنوان سے تازہ شائع ہوئی کتاب کے بارے میں اپنا مضمون پیش کیا۔ اس کے بعد وفا بریلوی نے اپنا کلام پیش کیا

رک سی گئی ہیں خوف سے اب سسکیاں تمام
ہیں برقرار آج بھی پابندیاں تمام
اک تم کہ انتقام فقط انتقام بس
اک ہم بھلائے بیٹھے ہیں اب تلخیاں تمام
آئینہ دل جو جوڑ کیا تھا گئے دنوں
پیوست ہیں بدن میں وہی کرچیاں تمام
پہلے بلا کے پاس کیا ہے سکت ہمیں
اور پھر ہم ہی میں بانٹ دیں بیساکھیاں تمام

مرزا عابد عباس:

جب لڑی اس کی نگاہوں سے نظر چوتھائی
دل میں دیکھا کیے ہم اس کا اثر چوتھائی
سر پہ پگڑی ہو تو بڑھ جاتی ہے سر کی عزت
کیوں کہ پگڑی کے بنا لگتا ہے سر چوتھائی
جب سے بازار میں آئی ہے دوا دو نمبر
رہ گیا یوں ہی دواوں میں اثر چوتھائی
کم لباسی کا جو فیشن ہے وہ مقبول ہے آج
ڈھانپا جاتا ہے بدن اپنا مگر چوتھائی
باپ کے مرتے ہی ہو جاتی ہے بس بندر بانٹ
حصے بخرے ہوا اور رہ گیا گھر چوتھائی
!کلام مذکورہ پر مرزا صاحب کو حاضرین کی داد بھی چوتھائی ہی ملی

سید معراج جامی اور ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی محو کلام ہیں

(صفدر علی خاں (مدیر انشاء

خدا کرے کہ سلامت ترا شباب نہ ہو
خدا کرے کہ ترے سر میں چونا پھر جائے
مزید یہ کہ میسر تجھے خضاب نہ ہو
خدا کرے کہ ترا کیبل کہیں سے کٹ جائے
تو اشتہاروں کے جلوؤں سے فیضیاب نہ ہو
خدا ترا کسی بوڑھے کو آشنا کردے
کہ جس کی بحر کی موجوں میں اضطراب نہ ہو

آخری مصرعے پر پچانوے فیصد عمر رسیدہ حاضرین کی داد و تحسین سے کمرہ گونج اٹھا

:سید معراج جامی

پڑھ لو دیوار کا لکھا ہوں میں
ابتدا ہوں کہ انتہا ہوں میں

پہروں یہ بات سوچتا ہوں میں
کتنی صدیوں سے چل رہا ہوں میں
کسی بچے کا خواب تابندہ ہوں میں
کسی لڑکی کا دیوتا ہوں میں
جس بلندی پہ تم کو جانا ہے
اس بلندی کا راستہ ہوں میں
چہرے جیسی کوئی کتاب نہیں
ایک مدت سے پڑھ رہا ہوں میں
لوگ تو چل دیے سو منزل
راہ میں تنہا رہ گیا ہوں میں
زیست کے سارے کرب سے گزرا
غم کی صورت سے آشنا ہوں میں
لوگ مبہوت ہو گئے ہیں کیوں
کس کا قصہ سنا رہا ہوں میں
گرچہ انسان ہوں مگر جامی
ذہن انساں سے ماورا ہوں میں
: قاضی حسیب احمد
کسی مسجد میں جب بھی جاتا ہوں

یاد سسرال کی بھی آتی ہے
اک شے ہے مشترک دونوں جگہ
میری جوتی چرائی جاتی ہے
بارے کچھ بیان بذلہ سنجان کراچی کا:
اس کتاب کے مولفین جناب شجاع الدین غوری اور پروفیسر عزیز جبران انصاری ہیں۔
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں کراچی سے تعلق رکھنے والے 83 شعراء اور ادباء کی
فکاہیہ تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کی قیمت 400 روپے ہے اور صفحات 272۔
بذلہ سنجان کراچی مندرجہ ذیل پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے:

Jibran Ishaat Ghar

102-Ayesha Manzil

Near Muqaddas Masjid, Urdu Bazar

Karachi

021-35461804

0345-3894586

عہد گم گشتہ۔استاد محبوب نرالے عالم

ابن صفی کا ایک لازوال کردار

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر

دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

ہمارے سامنے ایک خاتون اپنی اشکبار آنکھیں لیے بیٹھی تھی، اس کی والدہ اور بڑی بہن افسردہ بیٹھے تھے، ذکر مرحوم استاد محبوب نرالے عالم کا تھا، کمرے کی فضا بوجھل ہو چلی تھی، دکھ، حیرت، رنج و غم، کتنے ایسے جذبے تھے جو ہمیں پوری طرح گرفت میں لے چکے تھے۔یا خدا، کیا یہ اسی شہر نگاراں کا قصہ ہے کہ جہاں زیادہ تر نفع و نقصان کی بنیاد پر لوگوں سے تعلقات رکھے جاتے ہیں۔ہم سوچتے ہیں اس مضمون کی ابتدا کیسے اور کہاں سے کریں۔ خیال آیا کہ یہی مناسب رہے گا کہ واقعات کو بلا کم و کاست بیان کرتے چلیں کہ ابن صفی صاحب کے پڑھنے والوں کی ذہنی و فکری تربیت تو صفی صاحب اپنی تحریروں کے ذریعے سے آج تک خود کرتے ہیں۔بیس دسمبر 2009 کی صبح جب ہم محمد حنیف صاحب (ابن صفی ڈاٹ انفو) کی ارسال کی ہوئی لگ بھگ پانچ سال پرانی اخباری خبر پر درج کراچی کے علاقے اورنگی کے پتے کو اپنی والدہ کے ہمراہ اور ایک کرم فرما جناب امجد

اسلام کی رفاقت میں ڈھونڈنے نکلے تو کامیابی کا امکان صرف ایک فیصد تھا۔ اور نگی کی گلیوں میں بھٹکتے، لوگوں سے رہنمائی کے خواستگار، بلاآخر ہم اس جگہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے کہ جو اس خانماں.برباد انسان کا عرصہ دراز تک آخری ٹھکانہ کہلایا جسے سری ادب کے بے تاج بادشاہ جناب ابن صفی نے دنیا کے رو.برو استاد محبوب نرالے عالم کے نام سے روشناس کروایا۔ دروازے پر دھڑکتے دل کے ساتھ دستک دی تو ایک خاتون سامنے آئیں۔ یوں تو ہم منزل مراد پر پہنچ کر بھی ناکام لوٹ آتے کہ گھر کا مرد موجود نہ تھا لیکن ہماری والدہ کی موجودگی کی بنا پر گھر کے اندر رسائی ممکن ہو پائی اور یوں صفی صاحب کے حوالے سے ایک اور بند دروازہ ہم پر کھلا.برق رفتاری سے امتداد زمانہ کی نظر ہوتے ایک عہد کے مخفی گوشے آشکار ہوئے۔ بے نوا شاعر، ابن صفی صاحب کے قلم کی زبان میں "ادیف" (ادیب)، شریف النفس و درویش صفت انسان اور زمانے کی ناقدری کا شکار حرماں نصیب، استاد محبوب نرالے عالم کا پتہ ملا۔ آگے.بڑھنے سے قبل ایک ذرا یہاں ابن صفی صاحب ہی کے ناولز سے اس محبوب نرالے عالم کے کردار کا جائزہ لیں جسے صفی صاحب نے عمران سیریز میں امر کر دیا۔ واضح رہے کہ درج ذیل اقتباسات استاد کی ابن صفی صاحب سے دوران ملاقات کہی ہوئی وہ باتیں ہیں جنہیں صفی صاحب نے من و عن عمران سیریز میں استعمال کیا ہے۔ ان میں سے کئی باتوں کی تصدیق استاد کے مرتب کردہ اس ذاتی رجسٹر سے ہوئی جو استاد کے وسیع القلب اہل خانہ جنھوں نے استاد کو اپنے گھر میں محبت و)

عقیدت کے ساتھ رکھا) نے ہمیں عنایت کیا تھا۔ یہ اقتباسات عمران سیریز کے ان تمام ناولز سے اخذ کیے گئے ہیں جن میں استاد محبوب نرالے عالم جلوہ افروز ہوئے تھے۔

(1 ڈاکٹر دعاگو

یہ تھے استاد محبوب نرالے عالم۔ بے پناہ قسم کے شاعر۔شاعر کس پائے کے ہوں گے، یہ تو تخلص ہی سے ظاہر تھا۔ اتنا لمبا چوڑا تخلص شاید ہی کسی مائی کے لال کو نصیب ہوا ہو۔ استاد کا کہنا تھا کہ بڑا شاعر وہی ہے جس کے یہاں انفرادیت بے تحاشا پائی جاتی ہو، لہٰذا ان کا کہا ہوا شعر ہمیشہ بے وزن ہوتا تھا۔ بسر اوقات کے لیے پھیری لگا کر مسالے دار سوندھے چنے بیچتے تھے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جو بھی پکڑ پاتا،بری طرح جکڑ لیتا۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا کہ سننے سنانے کے چکر میں استاد ہفتوں دھندے سے دور رہتے۔ بڑے بڑے لوگوں سے یارانہ تھا، پھر عمران کیسے محروم رہتا۔

کوئی عمدہ سا شعر استاد' ۔ عمران انہیں کی میز پر جمتا ہوا بولا'

استاد نے منہ اوپر اٹھایا۔ تھوڑی دیر ناک بھوں پر زور دیتے رہے پھر جھوم کر بولے

'سنیے'

حسن کو آفتاب میں صنم ہوگیا ہے

عاشق کو ضرور بے خودی کا غم ہوگیا ہے

پھر بولے۔ 'پچھلی رات مجھ میں غالب کی روح حلول کر گئی تھی، سنو:

تم بھلا باز آؤگے غالب
راستے میں چڑھاؤگے غالب
کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ تو وزن دار ہے استاد'۔ عمران حیرت سے بولا'

"میں نے بتایا نا غالب کی روح حلول کر گئی تھی، پھر وزن کیسے نہ ہوتا '

استاد محبوب نرالے عالم-ایک انداز-(بشکریہ امتیاز فاران و اہل خانہ)

ڈاکٹر دعاگو (2)

" اور جی یہ لوگ میری اردو شاعری کی قدر کرتے ہیں لیکن میں اسے کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ میرا اصل رنگ دیکھنا ہو تو فارسا میں سنیے'

'فارسا'۔ ڈاکٹر دعاگو نے حیرت سے کہا

'یہ بھی مصیبت ہے'۔ عمران نے سر ہلا کر کہا۔ " استاد کی شاعری میں نر۔ مادہ ہو جاتا ہے اور مادہ – نر! اس لیے ان کی گرفت میں آتے ہی فارسی بھی فارسا ہوجاتی ہے۔ ہاں تو ہوجائے استاد فارسا میں کچھ'

استاد نے حسب عادت چھت کی طرف منہ اٹھا کر ناک بھوں پر زور دینا شروع کردیا۔ پھر بولے '، سنیے '

نظر خمی خمی، نظر گمی گمی، نظر سمی سمی

دھمک شک فزوں، فضا فسرونی، حیا لبم لبم

عشر خموشگی، خمو عشر فشاں، نمو زوم زوم

قلی و قل ونی، وقل، فنوقنی قنا قلم قلم

نظر خمی خمی، نظر گمی گمی، نظر سمی سمی

"بس بس" ڈاکٹر دعاگو ہاتھ اٹھا کر ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ " آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے"۔ اس نے عمران سے پوچھا۔

: قبل اس کے عمران کچھ کہتا، استاد نے اچھل کر ایک شعر عنایت کر دیا

پوچھو ہو رشتہ ہم سے فسردہ بہار دل

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے مزار کے

بس۔۔ بس " ڈاکٹر دعاگو ہاتھ اٹھا کر ناخوشگوار لہجے میں بولا: ' مسٹر عمران، آپ "

' میرا وقت برباد کر رہے ہیں

اوہ۔۔ جی ہاں۔۔ ہپ '' عمران تیزی سے اٹھا اور استاد کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف '

کھینچتا چلا گیا

بہت حرامی معلوم ہوتا ہے '۔ کمرے سے نکل کر استاد نے آہستہ سے کہا۔ '

(ڈاکٹر دعاگو (3

اچھا استاد '۔ عمران جیب سے پانچ کا ایک نوٹ کھینچتا ہوا بولا " یہ لیجیے اور ٹیکسی سے '

" واپس چلے جایئے

استاد نے دانت نکالے، تھوڑی دیر ہنستے رہے، پھر بولے :" اب آپ اس زادیٔ شکر کے

" پاس تشریف لے جائیں گے

" زادیٔ شکر' ؟ عمران حیرت سے بولا " میں نہیں سمجھا استاد '

' میں آپ کی محبوبہ پر بھی شاعری کروں گا '

استاد '' عمران ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا۔ ' ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، اگر آپ کا '

عربایا فارسا چل گیا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے گی'۔

(4 ڈاکٹر دعاگو

کارڈ پر نظر پڑتے ہی اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کارڈ پر تحریر تھا" امام الجاہلین، قتیل
"ادب، استاد محبوب نرالے عالم

بلاؤ' ۔ عمران کراہا'

'تشریف رکھیے'

لیکن استاد تشریف کہاں رکھتے، وہ تو کنکھیوں سے نرس کو دیکھے چلے جارہے تھے۔

'میں نے کہا استاد'

'جی۔ جی ہاں' استاد چونک کر بولے : 'آج میں ارتعاش سیمگاں کا مقیم مصلوب ہوں'

عمران نے اس طرح سر ہلایا جیسے پوری بات سمجھ میں آ گئی ہو۔

اکثر استاد پر بڑے بڑے نامانوس الفاظ بولنے کا دورہ پڑتا تھا۔ کبھی کبھی نئے الفاظ بھی ڈھالتے۔ اس قسم کے دورے عموما" اس وقت پڑتے جب آس پاس کوئی عورت بھی موجود ہو۔

نرس اٹھ کر چلی گئی اور استاد نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر جھک کر آہستہ سے 'بولے : 'یہ دوسری کب آئی

"آتی جاتی ہی رہتی ہیں' ۔ عمران لاپرواہی سے بولا" مگر آپ کیوں مغموم ہیں'

'نہیں جناب، یہ بے پردگی۔۔ یہ ٹڈے ٹڈیاں۔۔ میں عنقریب حج کرنے چلا جاؤں گا'
'ہوا کیا۔۔ کوئی خاص حادثہ '
جی ہاں، کل رینو میں میٹنی شو دیکھنے چلا گیا تھا۔ دیر ہو گئی تھی۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔'
ہائے کیا فلم ہے ڈاکٹر نو دیکھی ہے آپ نے۔ سالے، لونڈیا کو چوڑی دار پاجامہ پہنا دیتے ہیں'
چوڑی دار پاجامہ نہیں استاد، اسے جین کہتے ہیں' ۔عمران نے کہا'
(ڈاکٹر دعا گو 5
اتنے میں نرس واپس آئی اور استاد بولے " انسانی تہذیب کی مہذباتی اور مسکونی مناکحت بہت ضروری ہے۔ غالب، ذوق، داغ وغیرہ نے مشروباتی انفجاریت کی تقتیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن تجریدی ضابطے کی اشتراقیت مشروتی اعراب کی سند نہیں۔
واللہ آپ نے تو نثر ہی میں صنعت مستول الجہار پیدا کر دی استاد' ۔عمران نے خوش' ہو کر کہا۔
'میں غالب کو بھی للکار سکتا ہوں'
بیشک۔۔ بیشک۔۔ استاد ذرا چنا کٹر کٹ تو سنا دو'۔۔۔استاد نے بھونپو اٹھا کر منہ سے لگایا'
:اور شروع ہو گئے
پی۔ای۔سی۔ایچ کے حسین

میرے چنے سے نمکین

بولے بھائی خیر الدین

پاپڑ ایک آنے کے تین

چنا کٹرک

(ڈاکٹر دعاگو (6

استاد ابھی تک چنے بیچ رہے تھے، بمشکل سلسلہ تمام ہوا، عمران خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

"دفعتا" اس نے استاد سے کہا" آپ ایک عمدہ سا گرم سوٹ سلوا لیجیے

استاد نے دانت نکال دیے پھر کچھ سوچ کر گردن اکڑائی اور بولے 'پانچ سوٹ کیڑے کھا گئے، دو ابھی کھا رہے ہیں۔۔۔ میرے دادا جج تھے نکھلو کے

یہ نکھلو کہاں ہے جناب' ۔نرس نے پوچھا'

لکھنو والے پیار سے لکھنو کو کہتے ہیں' ۔عمران بولا'

میرے والد کرنل تھے' ۔استاد ان کی گفتگو پر توجہ دیے بغیر بولے ' عتیق بھائی سب جانتے ہیں'

'میں نے کہا تھا سوٹ سلوا لیجیے '

مجھے کتنا ادا کرنا پڑے گا' ۔؟۔۔استاد نے اکڑ کر پوچھا'

'فکر نہ کرو، اس رقم کے چنے چبوا دینا مجھے '

نہیں بھئی، پوچھنا میرا فرض تھا'۔ استاد نے کہا' ایک بار جمیل صاحب نے کہا تھا کہ تم' 'صرف بیالیس روپے جمع کرلو، میں تمہاری شادی کروادوں گا

استاد محبوب نرالے عالم-لباس فاخرہ میں-(بشکریہ امتیاز فاران و اہل خانہ)

زہریلی تصویر
استاد محبوب نرالے عالم جان کو آگئے تھے۔ عمران جیسا آدمی بھی ان کے مصافحوں سے بور ہو گیا تھا۔ جوزف جیسے آدمی کو بھی طوعا و کرہامصافحہ کرنا پڑتا۔ سلیمان البتہ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا، اکثر کہتا مجھے بھی شاعر بنادو۔ اور استاد گردن اکڑا کر کہتے:

میاں یہ ساہری ہے، سکھائی نہیں جاتی، ایک چیز ہوتی ہے تخیل صرف ادیفوں '
'ادیبوں) کو نصیب ہوتی ہے۔ ساہری نہ سیکھی جا سکتی ہے، اور نہ ہی سکھائی جا سکتی ہے)
آج بھی وہ اسی انداز سے آدھمکے تھے
'عمران استاد سے مخاطب رہا۔۔ 'گلبدنی کے بعد کیا کہا تھا استاد
فلبدنی۔۔ فارسا میں۔۔ جب سے جوش صاحب نے میری گلبدنی چرائی ہے، میں ایسی '
چیزیں فارسا میں کہنے لگا ہوں۔۔ مالم ہے جوش صاحب کا قصہ، بڑی زوردار جھڑپ
ہوئی تھی۔۔ لگے چیخنے چلانے۔۔ میں نے کہا جوش صاحب، میں ہاتھاپائی میں آپ سے
'نہیں جیت سکتا، علمی بحث کیجیے
صفدر پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا لیکن عمران کی سنجیدگی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔
'ہاں۔۔ ہاں'۔ عمران سر ہلا کر بولا 'اب شروع ہو جاؤ'
استاد نے کھنکار کر چھت کی طرف منہ اٹھایا اور ناک بھوں پر زور دینے لگے۔ پھر عمران
:سے بولے : ملاحجہ فرمایئے
وزرت زتاخ چر خم چر غار غازبوں
فریاد زنان مونگٹ پھلیم گوں گوں
گوں گوں چہ کٹار باندھم چوں چوں
فلبدنی۔۔۔۔ فلبدنی۔۔۔۔ فلبدنی

(پاگلوں کی انجمن (1

ہاتھ دیکھ لیجیے شاہ صاحب '۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا'

اس وقت نہیں دیکھ سکتا' استاد غرائے'

'کیوں جناب'

'میں اپنے ہاتھ مل رہا ہوں'

'آخر کیوں جناب'

'میں اپنے ہاتھوں سے جیوتش ودیا کی لکیر مٹا رہا ہوں'

'اس نے کیا قصور کیا ہے جناب'

'بس چلے جاؤ، اس ٹیم ہم صرف عورتوں کے ہاتھ دیکھتے ہیں'

گاہک نے غالبا" پشتو میں انہیں ایک گندی سی گالی دی اور چلا گیا

(پاگلوں کی انجمن (2

عمران نے استاد کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا: 'سنو اکثر لوگ تمہارے آئیڈیاز چرا لیا

'کرتے ہیں

جی بس کیا بتاؤں۔ استاد ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ 'نہ صرف وہ لوگ جو زندہ ہیں بلکہ'

'وہ بھی جو مر گئے

وہ کیسے استاد ؟

خواب میں آکر۔۔ مومن، غالب اکثر اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔۔ میرا شعر' تھا:

بے غیرت ناہید کی ہر تان ہے زمبک
شعلہ سا اپ اپ اپ جھپک

'اب آپ دیکھیے، ٹیلی وژن والوں سے معلوم ہوا کہ یہ غالب صاحب کا ہے! مومن کا ہے استاد'۔۔'

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اب یہی دیکھ لیجیے، میں نے بے غیرت ناہید کہا ہے، اور وہ فرماتے ہیں اس غیرت' 'ناہید۔۔۔ ہوئی نہ وہی خواب کی چوری والی بات

صبر کرو'۔ عمران ان کا شانہ تھپک کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور استاد میکانکی طور پر' آبدیدہ ہوگئے۔

(پاگلوں کی انجمن (3

استاد کی داڑھی برقرار رہی تھی لیکن زلفیں کٹوادی گئی تھیں۔۔ جس وقت وہ جاماوار کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے تو انہیں سکتہ ہوگیا۔

کیا میں چٹکی لوں استاد ؟۔ عمران نے ان کی حالت دیکھ کر پوچھا'

'جی'۔استاد چونک کر بولے 'اس وقت ذرا دل بھر آیا تھا'

خیریت۔ بھلا دل کیوں بھر آیا تھا' ؟'

یہ سالا کپڑا کیا چیز ہے۔ میرے والد حضور ہیرے جواہرات ٹنکی ہوئی شیروانی پہنتے' تھے۔۔ وقت۔۔ وقت کی بات ہے۔۔۔ ان کی اولاد اس طرح ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے '

خیر۔۔ خیر۔۔۔ دل چھوٹا نہ کرو۔۔۔ تمہارے والد حضور کی واپسی اگر میرے بس میں' 'ہوتی تو میں اس کے لیے بھی کوشش کرتا۔

استاد محبوب نرالے عالم-تاج پوشی کا ایک منظر-(بشکریہ امتیاز فاران و اہل خانہ)

آیئے اورنگی کے اس گھر کے چھوٹے سے کمرے میں واپس چلتے ہیں جہاں وہ لوگ استاد محبوب نرالے عالم کے ذکر سے آبدیدہ تھے۔ جی ہاں، یہ ہم جو تواتر کے ساتھ 'وہ لوگ' کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ متذکرہ گھر کے مکینوں کا استاد محبوب نرالے عالم سے قطعی کوئی خونی رشتہ نہ تھا اس کے باوجود بھی انہوں نے استاد کو قریب 15 برس اپنے پاس، اپنے گھر میں استاد کے انتقال تک رکھا۔ امتیاز فاران کی استاد سے پہلی ملاقات 1988 میں ہوئی، امتیاز فاران سن 1990 میں استاد کو اپنے ہمراہ لے آئے تھے اور تب سے اس خانماں برباد انسان کو ان فرشتہ صفت لوگوں نے اپنے دل میں جگہ دی۔ استاد ایک بزرگ کی حیثیت سے وہاں رہتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جب استاد کو فردوس کالونی ناظم آباد کا علاقہ چھوڑے ایک عرصہ بیت چلا تھا۔ وہ فردوس کالونی جہاں استاد کی ملاقات ابن صفی صاحب سے ہوئی تھی اور یہ ملاقات کروانے والے جناب انوار صدیقی (انکا، اقابلا وغیرہ کے مصنف) تھے جنہوں نے ہمیں ایک ملاقات میں یہ تفصیل بتائی تھی۔ استاد ان دنوں پھیری لگا کر چنے بیچا کرتے تھے اور ایک روز انوار صدیقی صاحب نے رات کے وقت استاد کو اشارے سے بلایا اور صفی صاحب سے ملوایا۔ چند روز بعد جب انوار صاحب، صفی صاحب سے ملنے گئے تو نے صفی صاحب نے ان سے گلہ کیا کہ یار یہ تم نے کس کو میرے پیچھے لگا دیا ہے، میں عدیم الفرصت آدمی ہوں اور یہ (استاد محبوب نرالے عالم) اکثر میرے پاس آکر گھنٹوں بیٹھا کرتے ہیں۔ انوار صاحب نے صفی صاحب کو استاد کو اپنے

ناولز کا کردار بنا کر پیش کرنے کی تجویز پیش کی جو صفی صاحب کو پسند آئی اور یوں اس سلسلے کا آغاز ہوا۔ استاد محبوب نرالے عالم گزر بسر کے واسطے ڈی سی آفس کے باہر بیٹھا کرتے تھے اور سائلین کے چھوٹے موٹے کام کردیا کرتے تھے۔ امتیاز فاران کے اہل خانہ ان سے کوئی بھی رقم لینا گناہ سمجھتے تھے۔

کمرے میں آبدیدہ بیٹھی خاتون، امتیاز فاران کی ہمشیرہ تھیں جن کو استاد اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور انھوں نے بھی اس حرماں نصیب شخص کی خدمت کا حق ادا کردیا تھا۔ ان کو استاد شفقت سے شہزادی کہا کرتے تھے اور ان کی زبان بھی ان کو استاد۔۔ استاد کہتے نہ تھکتی تھی۔ جتنی دیر ہم اس گھر میں ٹھہرے، ان لوگوں کی زبان سے محبوب نرالے عالم کے لیے، استاد کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ لوگ استاد کے اصل نام سے واقف ہی نہ تھے۔ خاتون قمر جہاں نے ہمیں بتایا کہ استاد کے انتقال کے بعد امتیاز فاران اور ان کی بہن شہزادی بہت بری طرح بیمار پڑ گئے تھے، قریب چھ ماہ وہ دونوں علیل رہے، اس دوران ان کا کھانا پینا چھوٹ گیا اور دونوں بہن بھائی سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔

ہمارے لیے خاص طور پر استاد کا مرتب کردہ ذاتی رجسٹر لایا گیا اور یہ دیکھ کر ہم لوگ دنگ رہ گئے کہ خاتون شہزادی نے استاد کے رجسٹر میں چسپاں ان کی

تصویر کو دونوں ہاتھوں سے احتراماً چھوا اور پھر وہ ہاتھ اپنی اشک آلود آنکھوں پر عقیدتاً لگا لیے ۔"استاد" شہزادی کی زبان سے آہستگی سے نکلا۔۔

یا اللہ۔۔۔۔ یہ منظر تو ہم نے اکثر اللہ والوں کے مزاروں پر ہی دیکھا تھا۔

استاد کی شہزادی جب اپنی مستقل بھیگتی آنکھوں کو مزید ہم سے نہ چھپا پائی تو اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ماحول ایک بار پھر سوگوار ہو گیا۔

استاد کے اہل خانہ (کہ بلاشبہ اب یہی لوگ ان کے اہل خانہ کہلائے جانے کے حقدار ہیں) سے یہ تمام گفتگو اس انتہائی مختصر سے کمرے میں ہوئی جس کا ایک ایک کونہ 15 برس استاد محبوب نرالے عالم کی رفاقت کا گواہ ہے۔ استاد ایک طویل القامت شخص تھے اور اس کمرے میں وہ اپنے پاؤں پھیلا کر لیٹ بھی نہ پاتے ہوں گے لیکن اہل خانہ کے دلوں کی وسعت تو دیکھیے کہ استاد کو کسی بھی صورت ان کی کم مائیگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اور استاد کی وضع داری بھی ملاحظہ ہو کہ بقول شہزادی کے کہ " ہم نے 15 برسوں میں استاد کی آنکھوں کی پتلی نہ دیکھی، وہ کبھی نظر اٹھا کر ہم سے بات نہ کرتے تھے"۔ خاتون شہزادی کی پردہ دار والدہ نے ہمیں بتایا کہ اتنے برسوں میں انہوں (والدہ نے) کبھی استاد کا چہرہ نہیں دیکھا اور نہ ہی استاد کبھی والدہ کے چہرے سے) آشنا ہوئے۔

گفتگو میں شریفانہ اب و لہجہ، حفظ مراتب نکتہ آفرینی اور رکھ رکھاؤ۔۔یہ سب استاد محبوب نرالے عالم کا شخصیت کا خاصہ تھے۔ بقول شہزادی، استاد اپنی گفتگو کے آغاز سے قبل ہمیشہ 'معاف کیجیے گا" ضرور کہتے تھے۔

استاد کے مرتب کردہ ذاتی رجسٹر کو امتیاز فاران کے اہل خانہ نے دے کر ہمیں اپنے احسان تلے زیر بار کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہم استاد کے انتقال کے بعد اس گھر تک پہنچنے والے پہلے فرد ہیں۔

آیئے متذکرہ رجسٹر کا جائزہ لیتے ہیں کہ جس کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر ہم نے استاد کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کیا:

سب سے پہلے رجسٹر میں استاد محبوب نرالے عالم کی (بقول ابن صفی صاحب) "گجل" کے ایک شعر پر نظر پڑی:

نگاہ یار سے مانگ کے لائے عمر ہزار پانچ دن
دو جستجو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

ارے صاحب یہ تو چار دن ہوئے لیکن پانچواں کہاں گیا ــــ ایک انٹرویو میں استاد نے اس سوال کے جواب میں کہا تھا کہ پانچواں دن تو میں خود ہوں جو زندہ ہوں۔

استاد محبوب نرالے عالم کیے ذاتی استعمال کی اشیاء (بشکریہ امتیاز فاران و اہل خانہ)

استاد مزید کہتے ہیں:
محبوب نرالے عالم کی بدنصیبی پر کرو ماتم میرے دوستوں
اس سرزمین پر رہنے کے لیے دو گز زمیں نہ ملی کوچہ یار میں

ایک مقام پر استاد کی ترقی پسندانہ نظم ملاحظہ کیجیے کہ یہی وہ شاہکار ہے جس سے متاثر ہو ابن صفی صاحب نے ان کی (صفی صاحب کے الفاظ میں) 'ساہری' کو اپنے ناولز کی زینت بنایا:

آج گھر سے بن من کے نکلی ہے نازنین
گل سفنی۔۔ گل سفنی۔۔ گل سفنی
نہ گرجتے ہیں۔ نہ برستے ہیں۔۔ یونہی چمکتے ہیں
گل برنی۔۔۔ گل برنی۔۔۔ گل برنی
آؤ ماتھے کی بندیا پہن کر رقص کرو
ہنس ہنس کر سربازار کہتے ہیں
گل ڈفنی۔۔ گل ڈفنی۔۔ گل ڈفنی
آج بھی دنیا میں چور رہتے ہیں
ہم نے بڑی مشکل سے چوری پکڑی ہے محبوب نرالے عالم
گل بخنی ـــ گل بخنی ـــ گل بخنی

استاد کی جوش ملیح آبادی سے نیاز مندی تھی اور ہمیں یقین ہے کہ جوش صاحب استاد کی مندرجہ بالا نظم کو سن کر اپنی 'گل بدنی' بھول گئے ہوں گے۔ ویسے بھی استاد محبوب نرالے عالم، جوش صاحب کی گل بدنی کی ٹکر پر '' فل بدنی' ایجاد

کر چکے تھے۔

اس مضمون میں اوپر ہم نے ابن صفی کی عمران سیریز سے چند دلچسپ اقتباسات درج کیے ہیں عمران سیریز کے ناول 'زہریلی تصویر' کا ایک مختصر اقتباس دوبارہ ملاحظہ کیجیے:

'عمران استاد سے مخاطب رہا۔۔ 'گلبدنی کے بعد کیا کہا تھا استاد

فلبدنی۔۔ فارسا میں۔۔ جب سے جوش صاحب نے میری گلبدنی چرائی ہے، میں ایسی' چیزیں فارسا میں کہنے لگا ہوں۔۔ مالم ہے جوش صاحب کا قصہ، بڑی زوردار جھڑپ ہوئی تھی۔۔ لگے چیخنے چلانے۔۔ میں نے کہا جوش صاحب، میں ہاتھاپائی میں آپ سے نہیں جیت سکتا، علمی بحث کیجیے'

منظر امکانی صاحب نے اپنے کالم (سن و تاریخ نامعلوم) میں استاد کے بارے میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن صفی صاحب نے زہریلی تصویر کا مندرجہ بالا ٹکڑا مکمل تصدیق کے بعد لکھا تھا۔ منظر امکانی لکھتے ہیں:

استاد کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی جگہ اور حالات میں نروس نہیں ہوتے۔ استاد محبوب" نرالے عالم جب پہلی بار جوش ملیح آبادی مرحوم سے ملنے گئے تو ان کی خاموش طبع دیکھ کر جوش صاحب یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ وہ اس صدی کی

عجیب و غریب چیز سے مخاطب ہیں۔۔ جب استاد گویا ہوئے تو جوش صاحب پر آشکار ہوا۔ اس آگاہی پر جوش صاحب شدید برہم ہوگئے اور وہ استاد کو بھگانے کھڑے ہوگئے۔۔ استاد محبوب نرالے عالم کچھ قدم دور جاکر بڑے یقین سے کہا: 'جوش صاحب، آپ ہاتھ پاؤں میں مجھ سے جیت سکتے ہیں مگر ادب میں مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔ استاد کے اس فقرے پر جوش صاحب کا غصہ ختم ہوگیا اور انہوں نے استاد کو ''بٹھا لیا اور پھر زندگی بھر استاد کی گفتگو برداشت کی۔

منظر امکانی سے چند مزید دلچسپ انکشافات سنیے کہ یہاں مقصد ان واقعات کو محفوظ کرنا ہے:

لکھتے ہیں کہ استاد نے ان پر انکشاف کیا تھا کہ ان کے (استاد کے) ایک لاکھ تیرہ ہزار شاگرد ہیں۔ مزید یہ کہ علامہ اقبال درحقیقت چار تھے اور ان میں وہ علامہ اقبال سب سے بڑے ہیں جنھوں نے شاعری کی۔ استاد نے ایک نئی صنف ادب "افسانی" بھی ایجاد کی تھی۔ استاد آج کل ایک تعمیراتی فرم میں ملازم ہیں، فرم کے دفتر میں انگریزی کا اخبار لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور اسے ہمیشہ الٹا پڑھتے ہیں۔۔ شعر کا پیمانہ استاد نے اس طرح بنایا ہے کہ دونوں مصرعے اسکیل رکھ کر ناپتے ہیں اور اگر معمولی بھی فرق ہوجائے تو شعر ناموزوں قرار پاتا ہے۔ ہر لمحہ جدت اختیار کرنا انہیں پسند ہے اسی لیے مکان کے باہر جو بورڈ لگایا اس پر 'بیت الخلا'' درج تھا۔ انہیں ملک کے باہر بھی شہرت ملی، معروف

امریکی جریدے ٹائم کے سرورق پر استاد کی تصویر شائع ہو چکی ہے، یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب استاد بنیادی جمہوریت کے انتخابات میں امیدوار تھے اور انھوں نے اپنے لیے ایک مخصوص لباس تیار کرایا تھا جس میں کئی فٹ لمبی ٹوپی تھی اور لبادے پر جلی حروف میں تحریر تھا کہ اس حلال خور کو ووٹ دیں۔ استاد جب باہر نکلتے تو ایک ہجوم ساتھ ہوتا، اس ہجوم اور اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ کر ٹائم کے نمائندے نے ان کی تصویر بنائی اور ان سے متعلق ٹائم میں مضمون لکھا۔ استاد کا تذکرہ لکھنے والوں میں مجید لاہوری، شوکت تھانوی، ابن انشائ، ابن صفی، ابراہیم جلیس، سلیم احمد اور جوش ملیح آبادی شامل ہیں"

-۔ استاد کے رجسٹر سے معلوم ہوا کہ ان پر کالم لکھنے والوں میں سجاد میر، ابو نثر اور نادم سیتا پوری بھی شامل ہیں۔ ابو نثر نے اپنے کالم (سن و تاریخ نامعلوم) میں لکھا ' استاد محبوب نرالے عالم ہمارے ہی نہیں پاکستان میں جاسوسی ادب کے پہلے اور آخری تاجدار ابن صفی مرحوم کے بھی محبوب تھے۔ مرحوم کی کہانیوں میں استاد کا ذکر ایک مستقل 'کردار کی حیثیت سے ملتا ہے۔ استاد کی وہ حیثیت ماشاءاللہ ابھی تک قائم و دائم ہے۔

-۔ نادم سیتا پوری نے استاد کو فخر پاکستان استاد محبوب نرالے عالم رجسٹرڈ (ان لمیٹڈ) کا خطاب دیا تھا۔

مشہور شاعر دلاور فگار نے استاد پر 3 جنوری سن انیس سو اٹھاسی کو ایک نظم لکھی، ۔

:اس کے دو بند ملاحظہ ہوں

قاتل کو کیا ملے گا نرالے کو مار کے
وہ خود ہی جا رہا ہے 'شب غم' گزار کے
سینہ ہے شاہزادہ کا خود ایک بلٹ پروف
درپے ہے اسکی جان کے یہ کون بیوقوف

۔۔ کراچی میں استاد کے ٹھکانے تواتر کے ساتھ بدلتے رہے اور اس بے آسرا شخص نے کئی علاقوں کی خاک چھانی جن میں 115 خالد آباد۔۔ فردوس کالونی، کوثر ٹاؤن ملیر اور گولیمار شامل ہیں۔

۔۔ استاد کی شاعری کی واحد کتاب 'دیوان تاریخ زمانہ' ہمیں ان کے اہل خانہ نے بطور تحفہ دی جس میں درج غزلوں سے کچھ منتخب کلام ابن صفی ڈاٹ انفو اور وادی اردو ڈاٹ کام پر شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ استاد کی ایک اور کتاب 'روٹی، کپڑا اور لامکان' کے چند منتخب دلچسپ حصے بھی مذکورہ ویب سائٹس پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

۔۔ تمام عمر استاد کا دعویٰ رہا کہ وہ مغلوں کی اولاد اور بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے ہیں اور استاد کے اس دعوے کی بنیاد پر ہی اخباری نامہ نگاروں اور کالم نگاروں کا لہجہ ان کے بارے میں ہمیشہ فکاہیہ رہا۔ لیکن یہ انکشاف بھی استاد کے چاہنے والوں کے لیے باعث حیرت ہوگا کہ روزنامہ نوائے وقت نے 8 جنوری سن 1984 کو ایک خبر شائع کی جس میں محقق اور گورنمنٹ اردو کالج کراچی کے شعبہ تاریخ اسلامی کے پروفیسر علی محمد شاہین نے اس بات کی تصدیق کی کہ استاد محبوب نرالے عالم، بہادر شاہ ظفر کے سلسلہ نسب سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہ شہزادے محبوب نرالے عالم ہی تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرے کے اصل وارث ہیں۔

۔۔ 17 جنوری سن انیس سو چوراسی کو ایک اخباری بیان کے ذریعے استاد نے یہ تاریخی انکشاف کیا کہ "سن 1857 میں دہلی کی جنگ آزادی کے دوران فرنگیوں نے تمام شہزادوں اور شاہزادیوں کو یا تو قتل کر دیا یا جنگلوں، پہاڑوں میں روپوشی کے دوران وہ سارے شہزادے اور شاہزادیاں لقمہ اجل بن گئے۔ شہزادہ محبوب نرالے عالم کو ان کے گھر کی ایک لونڈی اپنی بگھی میں باندھ کر فرنگیوں سے بچتی بچاتی لکھنو جا پہنچی لیکن جب لکھنو میں بھی فرنگیوں کا زور ہوا اور اس لونڈی کو دھڑکا ہوا کہ فرنگی اس نومولود شہزادے کو چھین کر

مارڈالیں گے تو اس نے ایک صندوق میں بند کرکے انہیں دریائے گومتی میں بہا دیا۔ یہ شہزادہ بلاآخر وضو کرتے ہوئے ایک بزرگ کو دریا میں بہتے صندوق سے مل گیا اور "انہوں نے اپنی روحانی عملیاتی کملی میں اس بچے کو لپیٹ کر سلادیا۔

--۔ جناب رئیس امروہوی اور ان کے بھائی سید محمد تقی کا دستخط شدہ سات جولائی سن 1986 کا ایک تصدیق نامہ یہاں موجود ہے کہ جس میں رئیس صاحب اور ان کے بھائی، استاد کے خانماں برباد ہونے کی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ استاد کو پلاٹ دیا جائے۔

--۔ وزیر اعظم پاکستان، محمد خان جونیجو کے نام استاد کی پلاٹ کے حصول کے واسطے لکھی گئی مورخہ بیس اگست سن 1986 کی درخواست اور وزیر اعظم سیکریٹریٹ میں وصول شدہ رسید موجود ہے۔

--۔ یہ انکشاف ہوا کہ استاد مختلف اخباروں میں کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے کالم کا مستقل عنوان 'ورنہ شکایت ہوگی' تھا اور وہ شہزادہ محبوب نرالے عالم کے نام سے مختلف موضوعات پر لکھا کرتے تھے۔ استاد عموما سماجی مسائل کو موضوع بناتے تھے مثلا: اورنگی ٹاؤن میں قلت آب، لیاقت آباد نمبر دس کی

چورنگی، کراچی کا بنگلہ بازار اور مچھلی، مچھیرے اور مگرمچھ۔ اس کے علاوہ ایک مضمون '
بیسویں صدی میں سائنسی علوم'' بھی ایک خاص کیفیت میں لکھا گیا ہے۔

:۔۔ استاد کے متفرق موضوعات پر مبنی ایک کالم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

چچی اماں کے مرنے پر بڑے جھگڑے بوا نکلے
بہت سے قبریں کھودیں لیکن ان سب میں چچا نکلے

۔۔ ایک خاندانی مہر دیکھی جا سکتی ہے جس پر درج ہے: یادگار پاک و ہند، خاندان مغلیہ
محبوب نرالے عالم، دہلی پایہ تخت اور لکھنو اودھ کی سرزمین، بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے،
اٹھارہ سو ستاون۔

۔۔ استاد محبوب نرالے عالم کا شجرہ چھپاں ہے جس کے مطابق استاد کے دادا نامی محمد شاہ
عالم، جج دہلی تھے (سن 1901 میں وفات پائی)، والد کا نام کرنل نادر درانی عالم (سن
میں وفات پائی) اور بعد ازاں، محبوب نرالے عالم۔1915

یہاں ہم آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتے چلیں کہ استاد نے اپنے والد اور دادا کا تذکرہ
ابن صفی صاحب سے یقیننا کیا ہوگا اور خاص کر ان کے والد کا نام ابن

صفی صاحب کے ذہن میں نقش تھے اسی لیے صفی صاحب نے عمران سیریز کے ناول
زہریلی تصویر میں استاد کے والد کا نام استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو زہریلی تصویر کا یہ
اقتباس:

'دفعتاً' ان کی طرف آنے والوں میں سے کسی نے گرج کر کہا' ہالٹ۔ ہو کمس دیئر
فرینڈز' عمران نے جواب دیا اور رک گیا۔'

'وہ تیر کی طرح قریب آئے۔۔ اور عمران نے بارعب لہجے میں پوچھا کیا بات ہے
'آپ لوگ اس وقت یہاں'

اونہہ۔۔ عمران ہاتھ ہلا کر بولا۔ 'کیا یہ کوئی ممنوعہ علاقہ ہے۔ ہم چہل قدمی کر رہے ہیں'
'

'آپ کون ہیں'
'کرنل نادر درانی آف سیکنڈ بٹالین'

اسی طرح صفی صاحب نے عمران سیریز کے ناول ڈاکٹر دعاگو میں استاد کے دادا کا ذکر کیا
ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر دعاگو کا یہ اقتباس:

استاد نے دانت نکال دیے پھر کچھ سوچ کر گردن اکڑائی اور بولے۔ 'پانچ سوٹ کیڑے
'کھا گئے، دو ابھی کھا رہے ہیں۔۔۔ میرے دادا جج تھے نکھلو کے
۔۔ دسمبر سن 1983 کے استاد کے ایک اخباری بیان سے معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ

کا نام شہزادی اختر جہاں بیگم تھا جن سے استاد کے سات بچے تھے جو سب کے سب انتقال کر گئے۔ اختر جہاں بیگم برصغیر کے ایک جج کی صاحبزادی تھیں۔

۔۔ رجسٹر میں موجود اخباری تراشوں کے مطالعے سے ہمارے ممدوح کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو عیاں ہوتا ہے۔۔۔ استاد بڑے تسلسل کے ساتھ اخباری بیان (بلکہ شاہی فرمان کہیں تو بہتر ہو گا کہ اکثر اخبار والے اسی طرح رپورٹ کیا کرتے تھے) جاری کیا کرتے تھے۔ کہیں وہ ایرانی حکومت سے تخت طاؤس کی حوالگی کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ہندوستانی حکومت کو بہادر شاہ ظفر کی جائداد میں حصے کے حصول کے لیے للکارتے ہیں۔۔۔ کہیں آپ سلطنت برطانیہ سے کوہ نور ہیرے کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں تو کہیں فرانسیسی شہزادی کو دورہ پاکستان کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ امریکی حکومت کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ اس نے عراق پر حملہ کرکے فاش غلطی کی ہے۔

۔۔ استاد کی زندگی کے آخری ماہ و سال میں رفتہ رفتہ ان اخباری بیانات پر ایک افسردگی کا رنگ غالب آتا دکھائی دیتا ہے اور ان کے پندرہ اگست سن 1998 کے اس بیان کے حزنیہ الفاظ کو پڑھ کر دل دکھ سے بھر آتا ہے جب وہ حکومت برطانیہ و پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ " آج ہم کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، حکومت ہمارے اجداد کی بے اندازہ دولت میں سے کم از کم اتنا

"تو دیں کہ میں اپنے زندگی بہتر انداز میں بسر کرنے کے قابل ہو سکوں
۔۔اسی طرح وہ ایک اور بیان میں ارباب اختیار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ: "ہمیں
"روٹی، کپڑا اور مکان دو۔۔ ورنہ اسلام آباد بلا کر گولی مار دو
۔۔ اور پھر آخری دنوں میں (مارچ سن 2003) ایک سیاسی عہدیدار وسیم رشید کی
سرکار سے یہ اخباری اپیل کہ شہزادہ استاد محبوب نرالے عالم کا، جو فالج کے حملے کے سبب
علیل ہیں، سرکاری خرچ پر علاج کرایا جائے۔

ابن صفی ڈاٹ انفو پر موجود استاد کے انٹرویو "اپنا ابن صفی والا استاد محبوب نرالے
عالم" سے استاد کے سن پیدائش سے آگاہی ہوتی ہے جو بقول استاد سن انیس سو چودہ
عیسوی ہے۔ استاد نے متذکرہ انٹرویو میں اپنی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام کچھ اس
طرح ہیں: مسائل عشق منزل، نرالا مذاق، بندر کی اولاد، یہ دنیا مرغ دل، دیوانے
تاریخ زمانہ، آنکھ دل کا مقدمہ، عرش کا مشاعرہ، بھارت کی تباہی، ایک پہاڑ کا آگ و
پانی اور روٹی کپڑا اور لامکان۔

راشد اشرف استاد محبوب نرالے عالم- کی بے نام قبر پر

بہادر شاہ ظفر کی برسی کا دن استاد کی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اس روز تمام اہل خانہ استاد کی دلجوئی کے لیے جمع ہوتے، اسی چھوٹے سے کمرے میں شہزادی کی والدہ کے ہاتھ کا بنا ہوا "کپڑے" کا تاج استاد کو پہنا کر ان کی تاج پوشی کرتے تھے۔ شہزادی کی والدہ استاد سے پوچھتی تھیں کہ 'بھائی،آج کے دن کے لیے کوئی فرمائش ؟ اور استاد اس خاص دن، قورمے اور زردے کی فرمائش کرتے تھے۔ تاج پوشی کے دن وہ اپنے اسلاف کے پرشکوہ ماضی اور اپنے حال کے بارے میں کیا سوچا کرتے ہوں گے، اس کا اندازہ لگانا دقت طلب نہیں۔

جولائی 4 سن 2005 کو یہ شہزادی ہی تھیں جو استاد کو طبیعت کی خرابی کی بنا پر اورنگی کے قطر اسپتال لے گئی تھیں، استاد بے حد کمزور ہو چکے تھے اور بقول خاتون شہزادی اور ان کی بہن قمر جہاں، زیادہ تر لیٹے رہنے پر ہی اصرار

کیا کرتے تھے۔ 4 جولائی کو استاد کو بلند فشار خون کی شکایت پر قطر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ استاد کسی سے بات نہ کرتے تھے، بس ڈاکٹروں سے یہی کہتے رہے کہ ہمیں جلدی سے ٹھیک کر دیں یہ بچیاں کب تک ہمارا خیال کریں گی۔۔۔ تین دن تک استاد اسپتال میں داخل رہے، اس دوران ان پر نقاہت کی وجہ سے زیادہ تر غنودگی کی کیفیت طاری رہی۔ انتقال سے ایک روز قبل ان کی اہل خانہ نے استاد سے کہا کہ استاد آپ ہمت نہ چھوڑیں۔۔ استاد جو غنودگی میں تھے، بولے " خان صاحب، ہمیں مجبور نہ کرو"۔۔۔ جولائی 6 سن 2005 کی صبح اسپتال سے فون آیا کہ استاد کی طبیعت خراب ہے، آپ لوگ چلے آیئے۔ خاتون شہزادی کے مطابق جب وہ لوگ اسپتال پہنچے تو وہ مجذوب صفت انسان کہ دنیا جس کو استاد محبوب نرالے عالم کے نام سے جانتی تھی، اس دار فانی کو لبیک کہہ چکا تھا۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون!

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طنیت را

اورنگی کے قبرستان میں جس طرح استاد محبوب نرالے عالم کی تدفین ہوئی وہ بذات خود ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔ روزنامہ عوام میں شائع ہوئی خبر کی تصدیق امتیاز فاران کے اہل خانہ نے بھی کی کہ مذکورہ قبرستان دس برس قبل ہر طرح کی تدفین کے لیے بند کیا جاچکا تھا لیکن استاد کو جو گوشہ ملا وہ کسی قبر کا حصہ نہیں بلکہ دیوار کے ساتھ واقع ایک گوشہ عافیت ہے۔ ہم نے یہ

دیکھا کہ استاد کی قبر پر نیم و کیکر کے درختوں نے ایک طمانیت بخش سایہ کیا ہوا ہے۔

محبوب نرالے عالم، دنیا کی نظروں میں آپ مفلس و تہی دامن تھے۔ اپنے اسلاف کی جائز دولت میں سے صرف اپنے گزارے لائق مشاہرے کے متمنی آپ تمام عمر در در ٹھوکر کھایا کیے۔۔۔ لوگ آپ کو سودائی خیال کرتے تھے۔۔ "آپ کے اسلاف جب زبان کھولتے تھے تو ایک عالم ان کی ہیبت سے تھرا جایا کرتا تھا"۔۔۔۔ ضرور ایسا ہوگا۔۔۔ لیکن آپ کی کہی ہوئی باتوں پر لوگ آپ کو دیوانہ قرار دیتے تھے۔۔

آپ کے آباؤاجداد تین وقت مرغ مسَلّم نوش کرتے اور ہیرے جواہرات ٹنکی" "شیروانیاں زیب تن کرتے تھے

یقیننا کرتے ہوں گے۔۔ لیکن آپ کو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ تھی، شاید ناظم آباد کی گلیوں میں چنے بیچتے وقت آپ شکم کی آگ بجھانے کے لیے مٹھی بھر چنے ہی پھانک لیا کرتے ہوں۔۔۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے اہل خانہ نے آپ کے ملگجے کپڑے، کسی آپ سے بھی زیادہ تہی دست انسان کو دے ڈالے۔۔۔۔۔

آپ کے اسلاف محلات میں رہا کرتے تھے۔

یقیناً رہتے ہوں گے۔۔۔ لیکن آپ تمام عمر سر چھپانے کے لیے ایک ٹھکانے کو ترسا کیے۔

آپ نے ملک پاکستان کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو اور کراچی کے ڈپٹی کمشنر کو ایک پلاٹ کے حصول کے لیے درخواست دی تھی لیکن آپ کی شنوائی نہ ہوئی۔

آپ کے اسلاف کی تاج پوشی کا منظر ہزاروں کی تعداد میں موجود رعایا دیکھا کرتی ہوگی، رنگ برنگے مختلف النوع قسم کے قیمتی پکوانوں سے ان کا دستر خوان سجا رہتا تھا۔۔

اس میں کوئی شک نہیں۔۔۔ لیکن آپ کی تاج پوشی سال میں صرف ایک دن ایک غریب عورت کے بنائے ہوئے کپڑے کے معمولی تاج سے سرانجام پاتی تھی اور معاشی حالات سے نبرد آزما وہ لوگ صرف اس دن آپ کے لیے قورمے اور زردے کا اہتمام کرتے تھے۔۔

آپ کے اسلاف میں کسی کے انتقال کے بعد اس کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا جاتا تھا، رعایا اس پر حاضری دیا کرتی تھی۔۔۔

تاریخ شاہد ہے، ضرور ایسا ہی ہوگا۔۔۔ لیکن آپ کی گمنام، ایک چھوٹے سے کتبے تک کو ترستی سادہ سی قبر کراچی کی ایک مضافاتی بستی کے قبرستان میں ہے جس سے سوائے مٹھی بھر افراد کے، اور کوئی واقف نہیں۔۔۔۔

آپ کے اسلاف میں سے کسی کے بیمار ہونے پر شاہی معالجین کا جھمگٹا مریض کو گھیر لیتا تھا اور اگر کوئی انتقال کر جاتا تو اس کے مرنے پر زبردست سوگ منایا جاتا تھا، شاہی دربار سے وابستہ شعرا اس کا نوحہ لکھتے تھے۔۔۔۔

یقیننا تاریخ اس کی گواہ ہے۔۔۔۔ لیکن جب آپ علیل ہوئے تو آپ کے اہل خانہ میں اتنی سکت نہ تھی کہ آپ کو کسی نجی اسپتال میں داخل کراتے، جب آپ کا دم نکلا تو آپ کے سرہانے کوئی موجود نہ تھا، شہر کراچی میں اس روز چلنے والی گرد آلود ہوا نے آپ کا ماتم کیا اور آپ کی قبر پر ایستادہ نیم و کیکر کے درختوں سے گرتے پتوں نے آپ کا نوحہ لکھا۔

دنیا کی نظروں میں آپ ناکام و نامراد کہلائے لیکن خان صاحب محبوب نرالے عالم، آپ ہرگز ہرگز ناکام و نامراد نہیں ہیں۔۔۔۔ درحقیقت آپ ایک عالی نفس انسان تھے جس کی زبان و ہاتھ سے زندگی بھر کسی کو نقصان نہ پہنچا۔۔۔ آپ تو بہت خوش قسمت تھے کہ عمر عزیز کے آخری 15 برس آپ نے ایسے مخلص لوگوں کے

درمیان بسر کیے کہ جنھوں نے آپ کا غم بھلانے میں آپ کی مدد کی، آپ کی خدمت میں دن رات ایک کردیے۔۔ آپ کی سات اولادیں اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن ذرا دیکھیے تو کہ آج آپ کی منہ بولی بیٹی شہزادی کے آنسو آپ کے لیے تھمتے ہی نہیں — خان صاحب محبوب نرالے عالم، بارے آپ کے اس مضمون کو لکھنے والا راشد اشرف ایک خوش گمان شخص ہے۔۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کی عاجزانہ درخواست پر، اس کے اس مضمون کے قارئین بارگاہ الہی میں ہاتھ اٹھا کر آپ کی مغفرت کے لیے دعا کررہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اتنی بڑی تعداد میں دعاؤں کی آمد پر فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ ہمارا یہ خانماں برباد بندہ نامی محبوب نرالے عالم، جو اپنی تمام زندگی میں ہمارے امتحان پر پورا اترا، اس کے درجات بلند کیے گئے اور اسے خلد بریں میں ابن صفی کے بے داغ سفید موتیوں کے بنے محل کے برابر میں ویسا ہی ایک محل عطا کیا جاتا ہے۔

لڑھکے ہوئے پتھر اور مخزنؔ

زیر نظر مضمون جناب مقصود الہی شیخ کے جریدے مخزن کے دسویں اور آخری شمارے میں اپریل 2010 میں شائع ہوا تھا

یہ بات ہے 1987 کی جب علی باقر نے ناقدین کرام کے رویے کے بارے میں کہا تھا:

"اردو ادب کے موجودہ حالات انتہائی تکلیف دہ ہیں۔ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے درمیان ناقدین کی ایک بہت بڑی فوج آ کر کھڑی ہو گئی ہے اور ان کی وجہ سے ہر طرف انتشار کا موسم ہے، لڑائی جھگڑے کا، موسم ہے، گروپ بندی کا موسم ہے۔ ناقد اصرار کرنے لگے ہیں کہ انہیں اور صرف انہیں ادب کی پہچان ہے، ادیب اور شاعر کی پہچان ہے اور چونکہ اکثر ناقد حضرات بارسوخ ہیں، وہ جس کو چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں ذلیل کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود ادب تخلیق نہیں کرتے ہیں لیکن ادب کی دنیا میں اپنی آواز بلند رکھتے ہیں تاکہ اس آواز کو وہ خود اور ان کے حواری سن سکیں۔"

آج جبکہ 2010 اپنی اختتامی سانسیں لے رہا ہے۔ علی باقر کی کہی ہوئی بات کو

تئیس برس بیت چلے ہیں اور آثار بتاتے ہیں کہ اگلے تئیس برس بعد بھی اس کلیے میں جان ہوگی۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علی باقر نے جن ناقدین اور ان کی تکلیف دہ روش کی جانب اشارہ کیا ہے، دیار فرنگ میں بسنے والے اردو افسانہ نگاروں و تخلیق کاروں نے ان کی کبھی پرواہ نہ کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مخزن میں ان کے 2001 سے تاحال تواتر کے ساتھ شائع ہونے والے تخلیقاتی ادب کو تازہ خون کی فراہمی کب کی منقطع ہوچکی ہوتی۔

بریڈ فورڈ، برطانیہ سے سالانہ بنیادوں پر نکلنے والے ادبی مجلے مخزن کے مرتب جناب مقصود الہی شیخ نے (جن کو پروفیسر قیصر نجفی نے اجنبی زمینوں پر آباد جینوئن قلمکار کا خطاب دیا تھا) راقم کے نام ایک پیغام دیار فرنگ میں مقیم نوآزمودہ اور کہنہ مشق لکھاریوں کے کام کے سمیٹے جانے کی ضرورت کے جواز میں جو کچھ لکھا، وہ بذات خود اس قدر خیال آفریں ہے کہ اس کے ذکر سے دامن بچا کر گزرنا نامناسب ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:
پچھلے دس سال میں برطانیہ کے اردو مجلے مخزن میں پیش کردہ ادب کی افادیت و ابدیت کی تعلی کا مطلب یہ ہے کہ سڑک سے لڑھکے ہوئے پتھر، جن کو اہل وطن

تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ انھوں نے دیارِ غیر میں اپنی زبان و ادب کی قندیل روشن رکھی بلکہ اس کی لو کو نئے در و دیوار کی اجنبیت و بے تحاشہ مصروف زندگی گزارتے ہوئے مزید ابھارا اور روشنی پھیلائی۔ اس پر مستزاد، مخزن کے ذریعے نئی تخلیقیت کی رو کو برصغیر کے جانے مانے تجزیہ نگاروں سے پرکھ اور تول کرا کے از خود آزمائش کرائی۔ اس طرح سخت اور سنگلاخ راہوں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان و ہندوستان کے درمیان ادبی پل بنا۔ آگے کیا ہوگا؟ یہ خدا جانے مگر برطانیہ (مغرب) کے اردو قلمکاروں نے اپنی فنی خامیوں یا خرابیوں (بالفرض) کے باوجود، اردو ادب میں بے باک بیانیہ اور نئے وژن کو آنے والے وقتوں میں مشعل بن کر ابدیت عطا کی۔"

اردو ادب کا سنجیدہ قاری اس بات کی گواہی دے گا کہ سڑک سے لڑھکے ہوئے یہ پتھر اردو ادب کی شاہراہ پر ایک نمایاں مقام پا چکے ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ پتھر ریفلکٹر کا کام بھی دے رہے ہیں جو اندھیرے میں شاہراہ پر سفر کرنے والوں کو بروقت اپنی چمک دکھا کر حادثے سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ درست سمت کا پتہ بھی دیتا ہے۔

امجد علی بھٹی کے بقول " جب انسان نے اپنے آپ کو فطرت سے الگ کر کے خود کو مرکزِ نگاہ بنایا اور اپنے قول و فعل کو جانچنے اور اپنے اردگرد پھیلی زندگی

سے خود کو شعوری طور پر ہم رشتہ کرنے کی خواہش کی تو اس کی سوچ کے عمل کو مہیز ملی اور یوں اس نے قوت متخیلہ کی مدد سے سورج، چاند، ستاروں، طوفانوں، آندھیوں کے متعلق کہانیاں تراش لیں۔"

زمانہ قدیم سے چلی یہ روایت ہمارے یہاں پہنچی ۔۔ بقول راجندر سنگھ بیدی " زندگی کی راہ گزر پر اب بھی ماضی کی طرح بے شمار کہانیاں موجود تھیں لیکن عام انسان ان کہانیوں کو بے خبری میں روندتے چلے جاتے ہیں اور انہیں کسی تاجدار کا سر غرور ہونے کے باعث خاک راہ میں پامال ہوتے رہنے کی خبر ہی نہیں ہوتی۔" ۔۔۔ لیکن منٹو، غلام عباس، کرشن چندر، شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی اور جوگندر پال جیسا کوئی افسانہ نگار ان کہانیوں کو دیکھتا ہے تو اسے حقیقی زندگی کی یوں تمثیل بنا دیتا ہے کہ اس کی تکنیک سے حسن اور اس کی ہیت سے صداقت آشکار ہوتی چلی جاتی ہے۔

تقسیم ہند سے لے کر موجودہ دور تک پہنچتے پہنچتے ان لڑھکے ہوئے پتھروں کے تحریر کردہ افسانے میں نئے رجحانات کا اضافہ، نئے موضوعات کی تلاش، علامتی افسانے کا آغاز، افسانے کی ہیت میں توڑ پھوڑ، انحراف کے مضمر اثرات کے ساتھ ساتھ جس قوی ترین رجحان سے راسطہ پڑتا ہے وہ ہے ہجرت کا کرب۔۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں کا خام مواد دیار فرنگ میں موجود اجتمائی زندگی کی

مشکلات، روز مرہ کے مسائل، مغرب میں انفرادی زندگی کے ناگزیر تجربات، معاشی، اقتصادی، استحصالی و خوش حالی کے حالات، محبت، نفرت اور عداوت و رواداری جیسے لاتعداد موضوعات سے نمو پاتا ہے۔

کے تبصرے (Dr. M.C.L Dodds) موضوع کی مناسبت سے یہاں ڈاکٹر مارٹن ڈاڈز کا حوالہ دینا یقیننا اہم ہوگا۔ ڈاکٹر مارٹن برطانیہ میں اردو کے استاد رہے ہیں۔ ان کی یہ رائے اس لحاظ بھی اہم ہے کہ اس بات کو جانا جائے کہ انگریزوں اور انگلستان کے بارے میں برطانوی اردو قلمکاروں کی تخلیقات پڑھ کر ایک انگریز اردودان کیا سوچتا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن لکھتے ہیں:

دیار فرنگ میں بسنے والوں کی اکثریت سن 1960 کی دہائی میں برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں منتقل ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ اب پہلی نسل کے ان ایشیائیوں بالخصوص پاکستانیوں کی دوسری اور تیسری پیڑی جوں جوں جوان ہو کر مقامی معاشرے میں گھلتی ملتی جارہی ہے، اس میں گھر کی حد تک اردو بول چال کا ماحول تو ہوسکتا ہے کہ ہو لیکن دوسری یا تیسری نسل کو اردو کے مطالعے کا شوق ہو، اس بارے میں یقیننا ابہام ہے۔

یہاں 2001 میں مخزن کے اجرا سے لے کر تادم تحریر، اس باوقار اردو جریدے میں

تواتر کے ساتھ لکھنے والے تارکین وطن (ابجدی ترتیب کے ساتھ) اور ان کے کام پر
ایک تحقیقی نظر ڈالی جائے تو کچھ اس قسم کی تفصیل سامنے آئے گی:

ادیب/شاعر کا نام.برطانیہ (مغرب) منتقلی کا سال مخزن میں شمولیت

(احمد فقیہ 1980۔ سویڈن مخزن۔ ۴ (شاعری

احمد صفی امریکہ (1987 سے 2002 تک قیام اور اس کے بعد کراچی منتقلی) مخزن۔۸

(مضامین: ابن صفی چند حقائق، ابن صفی، اسرار ناروی اور میرے ابو)

(مخزن۔۹ (افسانہ: شٹ ڈاؤن

(آدم چغتائی جون 1961۔برطانیہ مخزن۔ ۴ (شاعری

آصفہ نشاط امریکہ مخزن۔ ۴ (افسانے: صفحہ سات کالم چار، بون سائی، بھابھی کی

(لیبارٹری

آصف جیلانی 1965۔برطانیہ مخزن۔۹ (مضمون: اردو پہ مری آکے عجب وقت پڑا

(ہے

افتخار نسیم امریکہ مخزن۔ ۴ (افسانے: گلو، اپنی اپنی زندگی، شبری)، مخزن۔ ۴ (شاعری)

(مخزن۔۵ (شاعری،

(مخزن۔۶ (افسانہ: دلہن

(اکبر حیدرآبادی 1955۔برطانیہ مخزن۔ ۴ (شاعری

،(آغا محمد سعید 1965۔برطانیہ مخزن۔ ۴ (افسانے: میں لٹ گیا، رفو، کتا

(مخزن۔۴ (شاعری)، مخزن۔۵ (شاعری

مخزن۔۶ (افسانہ: مجو)، مخزن۔۶ (شاعری) ، مخزن۔۷ (شاعری ۔۔افسانہ: خواہش کی
(تکمیل

(باصر سلطان کاظمی 1990۔برطانیہ مخزن۔۴ (شاعری

(بانوارشد.برطانیہ مخزن۔۶ (افسانہ: ننھی مفکر)، مخزن۔۷ (افسانہ: ایک چیلنج

پروفیسر نذیر تبسم 29 جون 2003۔برطانیہ مخزن۔۸ (مضمون: ادب اور قومی
(شعور

(پرویز مظفر 1993۔برطانیہ مخزن۔۲ (شاعری

پروین لاشاری.برطانیہ مخزن۔۲ (افسانے: دو بول، منتر)، مخزن۔۴ (افسانے:
(احسان، بدبخت، خالی سیپ

ادیب/شاعر کا نام.برطانیہ (مغرب) منتقلی کا سال مخزن میں شمولیت

جیتندر بلو.برطانیہ مخزن۔۲ (افسانے: بچھڑتی دھوپ، مونگرل)، مخزن۔۳ (افسانے:
،(چھلاوہ، انجانا کھیل

،(مخزن۔۴ (افسانے: اعتراف، بازار، خداکارنگ)، مخزن۔۶ (افسانہ: ٹھکانا

(مخزن۔۷ (افسانہ: ماں بیٹی اور باپ

(جاوید دانش کینیڈا مخزن۔۴ (ڈرامہ: ٹانک) (عید کا کرب

جاوید اخترپاشا امریکہ مخزن۔۵ (افسانہ: جگنو)، مخزن۔۹ (افسانہ: آگ،برف اور

(راکھ

(جمشید مرزا۔برطانیہ مخزن۔(افسانے: زنجیر بنی رہنا، صبح کا خواب، رانی

(چمن لال چمن مئی 1974۔برطانیہ مخزن۔۲(شاعری

(حسن شکیل مظہری فروری 1973۔برطانیہ مخزن۔۲، ۳، ۴، ۶، ۷، ۹ (شاعری

(حسین مشیر علوی 1968۔برطانیہ مخزن۔۲(شاعری

حفیظ جوہر اکتوبر 1968۔برطانیہ (وفات: 31 مئی 2009، بریڈفورڈ) مخزن۔۲، ۶

(شاعری)

(حمیدہ معین رضوی اپریل 1986۔برطانیہ مخزن۔۲ (بڑے بھیا، کوئلہ بھئی نہ۔۔۔

خالد یوسف 1975۔برطانیہ (وفات: ۱۳ اکتوبر 2009) مخزن۔۱ (افسانے:آٹھ

(نمبری، عندلیپ، باصر) ، مخزن۔۲(افسانے:امینہ، کنول کا پھول۔شاعری

مخزن۔۳(شاعری) ، مخزن۔۴ (شاعری) ، مخزن۔۵ (شاعری) ، مخزن۔۶

(شاعری)

(مخزن۔۷(شاعری

(خواجہ محمد عارف۔برمنگھم ۔برطانیہ مخزن۔۹(مضمون: برطانیہ میں اردو کا مستقبل

ڈاکٹر عمران مشتاق 1998۔برطانیہ مخزن۔۴(افسانے: بولتی آنکھیں، اپنا خون،

(فنتاسی) ، مخزن۔۵(افسانہ: یوتھینسنیما

(مخزن۔۶ (افسانہ: بے چہرگی کا عذاب) ، مخزن۔۷(افسانہ: معاہدہ

رضا الجبار 1981۔ کینیڈا مخزن۔۴ (افسانے: سہاروں کے موسم، چھرے چہرے کی
،(خراش، شب کے دامن کا سویرا
،(مخزن۔۵ (افسانہ: شہر نگاراں)، مخزن۔٦ (افسانہ: بوجھل دل
(مخزن۔۷ (افسانہ: چاہت، سسکی، آہٹ
ساحر شیوی 27 جون 1994۔ برطانیہ مخزن۔۲ (افسانہ: کیچ برڈ۔ مضمون: جوش
(ایک مفکر
سائیں سچا 1965۔ سویڈن مخزن۔۴ (افسانے: گیلی، سراب، فوٹو سیشن) ، مخزن۔٦
(افسانہ: نجات)
(ستارہ لطیف خانم ستمبر 1976 ۔ برطانیہ مخزن۔۱ (افسانے: سراب، ٹشو، اس پار
(سلیم الرحمٰن 1961۔ برطانیہ مخزن۔۲، ۳ (شاعری
(سوہن راہی نومبر۔۱۹٦۳۔ برطانیہ مخزن۔۲، ۴، ۵، ٦، ۷ (شاعری
سیدہ سلیم عالم۔ برطانیہ مخزن۔۲ (افسانے: اس بار پرتگال، آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ
(طور کی
ش صغیر ادیب 1965 ۔ برطانیہ (وفات: 13 نومبر 2008) مخزن۔۱ (افسانے:
(اگر، خواب، لاکھوں میں ایک)، مخزن۔۵ (افسانہ: زادِ سفر
شریف احمد قیصر تمکین علوی 27 ستمبر 1976 ۔ برطانیہ (وفات: 25 نومبر 2009،
لیڈز) مخزن۔۱ (افسانے: شاطر، باب الابواب، سیر گل خوب نہ دیدم) ، مخزن۔۲
(شہزاد سو گئی، کفن کھسوٹ)

افسوس کہ بلبل ہزار داستان خاموش ہوگیا مخزن۔۳ (صدی کے موڑ پر، یہ رزاقی نہیں
(ہے)، مخزن۔۴ (افسانے: چراغ تلے، واعظاں کیں، بھو بھل
،(مخزن۔۵ (مقالہ: مغرب میں اردو فکشن کا رجحان) ، مخزن۔٦ (افسانہ: رد عمل
(مخزن۔۷ (افسانہ: مرحبا
شمسہ مسعود 1969 ۔برطانیہ مخزن۔۱ (افسانے: بجھتے چراغ، خوشبو کا سفر، کاربوٹ
(سیل) ، مخزن۔٦ (افسانہ: جال
(شوکت برجیس 1968 ۔برطانیہ مخزن۔۲ (شاعری
صفیہ صدیقی 18 اکتوبر 1961 ۔برطانیہ مخزن۔۱ (افسانے: منزل، اور سمندر رونے
لگا، چھوٹی سی بات) ۔ مخزن۔۲ (افسانے: فیصلہ، ایک اور
(موت)، مخزن۔۳ (افسانے: مکالمہ، بدلتے زمانے، بکھرتے لوگ
،(مخزن۔۴ (افسانے: ماضی کے دریچے سے، بے عنوان زندگی، ایک طوفانی شام
(مخزن۔۵ (افسانہ: جب زنجیریں ٹوٹ گئیں)، مخزن۔٦ (افسانہ: شاید کہ سحر ہو
(مخزن۔۷ (افسانہ: ایک پرانی کہانی)، مخزن۔۹ (خود نوشت: میرا نام ونشاں
(ضیاء جلالپوری جنوری 1968 ۔برطانیہ مخزن۔۲ (شاعری
طلعت سلیم یکم جون 1967 ۔برطانیہ مخزن۔۱ (افسانے: تم کو خبر ہونے تک، منزل
(منزل، ایک آئینہ ٹوٹ جانے سے) ، مخزن ۔ ۲ شاعری
مخزن ۔۳ (شاعری) ، مخزن۔۴ (شاعری)، مخزن۔۵ (شاعری)، مخزن۔٦ (افسانہ:
ایک آئینہ ٹوٹ

(جانے سے)، مخزن۔۷ (شاعری

(عابد ودود 1970 ۔برطانیہ مخزن۔۲، ۴، ۶ (شاعری

عطیہ خان جون 1969۔برطانیہ مخزن۔۲ (افسانے: چارپائی کا مرثیہ، عمر دراز)،

(مخزن۔۶ (افسانہ: یہ رشتے

فہیم اختر جون 1993۔برطانیہ مخزن۔۲ (افسانے: رشتوں کا درد، ایک آس)، مخزن۔

،افسانے: کتے کی موت، ایک گریزاں لمحہ) ۴

(خواب کا ایک نیا انجانا رشتہ) ، مخزن۔۵ (افسانہ: سرکل لائن

فیروز مکرجی۔برطانیہ مخزن۔۲ (افسانے: انمول ورثہ، صداقت حسین خاں کی کہانی ان

(کی زبانی

فیروزہ جعفر ستمبر 1968 ۔برطانیہ مخزن۔۱ (افسانے: لنچن کلب، گیتوں کے دکھ،

(زائچہ

قمر یوسف جنوری۔1963 ۔برطانیہ مخزن۔۲، ۵، ۷، ۶ (شاعری)، مخزن۔۹ (مضمون:

(شاعر بلند مقام۔ محسن احسان

لطیف راز لیورپول۔برطانیہ مخزن۔۹ (مضمون: گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ

(ہے

محسنہ جیلانی دسمبر 1965 ۔برطانیہ مخزن۔۱ (افسانے: چھٹی چادر، مہندی اور خون،

ٹیمز اداس ہے)، مخزن۔۴ (افسانے: صدیوں کا

اندھیرا، ہم سو رہے ہیں، رسوائے جہاں ہو جاؤگے)، مخزن۔ ۵ (افسانہ: اے

(دل۔۔اے دل

(مخزن۔٦ (افسانہ: ٹیمز میں پھول)، مخزن۔٨ (افسانہ: کس کی موت

(محمد سرور رجا 1980 ۔برطانیہ مخزن۔۴ (شاعری

(محمد عارف جون۔1968 ۔برطانیہ مخزن۔٢ (شاعری

(محمد فرید سپرو۔بریڈ فورڈ۔برطانیہ مخزن۔٩ (مضمون: والدین اور اردو

محمد یعقوب مرزا٦ اپریل 1959۔برطانیہ مخزن۔١ (افسانے: ناہید صدیقی کہ ہے ایک
(رقاصہ، ولائیت پاس، اکھنور

محمود ہاشمی۔برطانیہ مخزن۔۴ (مضمون: لیڈز یونیورسٹی کی یادیں۔۔افسانہ: مشرق کی
(کہانی

مقصود الہی شیخ ١٣ مئی 1968۔برطانیہ مخزن۔١ (افسانے: رُت آئے۔رُت
،جائے، گھاؤ، موہے پیا ملن کو جانا)، مخزن۔٢ (افسانے: رگ سنگ
وابستگی۔وابستگی)۔ مخزن۔٣: (افسانے: طرز تغافل نہ عرض تمنا، سچ مچ)، مخزن۔۴
افسانے: بر سورے)
نینوا مورے، پلوں کے نیچے بہتا پانی، چلو ہٹو)، مخزن۔۵ (افسانہ: صبح شب فراق)،
: مخزن۔٦ (افسانہ
مقدر)، مخزن۔٧ (افسانہ: سہم)، مخزن۔٨ (افسانہ: گرداب۔۔ دریا کا سمندر
ہونا۔۔احمد ندیم قاسمی
(پر تحریر)، مخزن۔٩ (افسانہ: درد سے بھرے سنگ وخشت

(منور احمد کنڈے ۸ دسمبر 1965۔برطانیہ مخزن۔۲، ۳، ۴، ۵، ۶ (شاعری

نجمہ عثمان 1969۔برطانیہ مخزن۔ا (افسانے: مجو میاں، سیتا کا بن باس،

،کلا سیفیکیشن) ، مخزن۔۲ (افسانے: رشتوں کی دہلیز پر

بعد دعا کے معلوم ہو)، مخزن ۔۳ (شاعری)، مخزن۔۴ (افسانے: سنگ گراں، پیڑ سے

،بچھڑی شاخ

(چوتھی عورت)، مخزن۔۵ (افسانہ: مرتی ہوئی کہانی)، مخزن۔۶ (افسانہ: زخمی پھول

(مخزن۔۹ (افسانہ: رانی کے ہیرا موتی

(نعیمہ ضیاء الدین جرمنی مخزن۔۴ (شاعری۔۔۔افسانے: ڈسٹ بن، وصیت، مراجعت

،

، (مخزن۔۶ (افسانہ: ایک شبد کا جیون) ، مخزن۔۷ (افسانہ: پیک دان

(مخزن۔۹ (افسانہ: ایک شبد کا جیون

(نیر جہاں امریکہ مخزن۔۶ (افسانہ: دھنک سے تپتی ریت)، مخزن۔۶ (شاعری

جولائی کا مہینہ تھا اور سال 2001 کا جب مخزن نے پاک و ہند اور دنیا کے دیگر حصوں میں بسنے والے اردو کے قارئین کے دروازے پر دستک دی اور اردو زبان کے چاہنے والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ روز اول سے تادم تحریر مخزن کی مقبولیت میں اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اس وقت بھی جب یہ سطور سپرد قلم کی جارہی ہیں ، راقم کے سامنے مخزن کے کُل نو عدد رنگ برنگے شمارے بکھرے ہوئے ہیں۔۔۔ مختلف النوع رنگوں کے دیدہ ،زیب سرورق ۔۔ہر کوئی ایک دوسرے سے جدا

اپنے پڑھنے والوں کے من کو لبھاتا ہوا! ۔۔ ادھر پہلا ورق پلٹیے اور وادی اردو میں داخل ہو جایئے جہاں آپ کا استقبال قدم قدم پر بکھرے فن پاروں سے کیا جائے گا۔

جولائی 2001 سے 2010 تک شائع ہونے والے مخزن کے نو عدد شماروں کی مکمل تفصیل کچھ یوں ہے:

مخزن اول سن اشاعت: جولائی 2001 تعداد: 500

مخزن ۔۲ سن اشاعت: اکتوبر 2002 تعداد: 750

مخزن ۔۳ سن اشاعت: مارچ 2004

مخزن ۔۴ سن اشاعت: 2005 تعداد: 500

مخزن ۔۵ سن اشاعت: 2006

مخزن ۔۶ سن اشاعت: 2007

مخزن ۔۷ سن اشاعت: 2008

مخزن ۔۸ سن اشاعت: 2009

مخزن ۔۹ سن اشاعت: فروری/مارچ 2010

مخزن کے پہلے شمارے میں اردو کی نئی بستیوں یا دیار فرنگ میں آباد بارہ

افسانہ نگاروں کے کل تین تین افسانے شامل ہیں جبکہ ان افسانوں کا تجزیہ پیش کرنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ ہلکے زرد رنگ میں راجا نیر کا بنایا سرورق جداگانہ نظر آتا ہے۔ یہ شمارہ کل 236 صفحات پر مشتمل ہے۔ مخزن کے دوسرے شمارے میں افسانوں کے ساتھ ساتھ شاعری، متفرق مضامین، تحقیقی مضامین کو بھی جگہ دی گئی جبکہ افسانوں کا تجزیہ جانے مانے اہل قلم نے کیا۔ گہرے نیلے رنگ کا باوقار سرورق سادگی کی مثال ہے۔ مخزن کا یہ شمارہ 436 صفحات پر مشتمل ہے۔ مخزن کے تیسرے شمارے میں برطانیہ کے بارہ افسانہ نگاروں کی چھتیس تخلیقات اور ان پر پاکستان کے معروف تجزیہ نگاروں کے تجزیے شامل کیے گئے ہیں۔ مذکورہ شمارہ 378 صفحات پر مشتمل ہے جبکہ سرورق پر سمندر کی خوبصورت سیپیوں کی تصویر ہے۔ جناتی حجم کا حامل مخزن کا چوتھا شمارہ 810 صفحات پر مشتمل ہے۔یاد رہے کہ تاحال مخزن کا کوئی شمارہ حجم میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکا، ایک لحاظ سے ہم اسے مخزن کا خاص نمبر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس شمارے میں افسانوں کے علاوہ ڈرامے، تجزیے، شاعری، سفرنامہ وغیرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ شمارے میں" کشمیر اداس ہے" کے مصنف اور معروف قلمکار محمود ہاشمی کے لیے ایک گوشہ مخصوص کیا گیا ہے۔ مخزن کے چوتھے شمارے کے گہرے نیلے رنگ سے تخلیق کردہ سرورق پر گول دائرے میں بند دنیا میں آگرہ کے تاج محل، اسلام آباد کی شاہ فیصل مسجد اور امریکہ کے مجسمہ آزادی کی حقیقی تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ 249 صفحات پر مشتمل مخزن کے پانچویں شمارے کا سرورق

جمی آرٹسٹ نے تخلیق کیا ہے۔ اس شمارے میں پاک و ہند کے معروف تجزیہ نگاروں کی آرااور دیار فرنگ میں آباد لکھاریوں کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں ۔ مخزن کا یہ شمارہ اس لحاظ سے منفرد رہا کہ اس میں تخلیقات پر تجزیے پیش نہیں کیے گئے بلکہ تخلیق کاروں نے پہلی مرتبہ خود اپنا تعارف پیش کیا۔ مخزن کے چھٹے شمارے کے سرورق پر ہلکے سبز و نیلے رنگوں میں ایک گول گیند کی شکل میں دنیا کا نقشہ دکھایا گیا ہے جس کے کونے میں ایک قلم اپنی نوک سے لفظ مخزن تحریر کرتا دیکھا جا سکتا ہے۔ ثاقب فیروز کے بنائے سرورق کے حامل اس شمارے کے کل صفحات 456 ہیں اور اس میں مضامین، افسانے، شاعری اور یاداشتوں کے عنوانات سے مختلف تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ مخزن کے ساتویں شمارے کے سرورق پر برطانیہ کے بلند و بالا پہاڑ کی جاب ایک شاہراہ جاتی دکھائی گئی ہے جس کے دونوں اطراف میں گھاس کے میدان ہیں۔ ذرا غور کرنے پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ یہ شاہراہنہیں بلکہ کسی لباس کی زپ ہے ۔ 312 صفحات پر مشتمل اس شمارے میں افسانوں اور شاعری کے علاوہ مختلف مضامین شامل کیے گئے ہیں ۔ اس شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ تخلیق کاروں کے علاوہ تجزیہ نگاروں کے کوائف بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مخزن کے آٹھویں شمارے کا منفرد و شوخ رنگوں کا حامل سرورق احمد ندیم قاسمی کی نواسی نفیسہ حیات قاسمی نے تخلیق کیا ہے۔

سرورق پر احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر درج ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

312 صفحات پر مشتمل اس شمارے میں افسانوں، خودنوشت اور سفرناموں کے منتخب ٹکڑوں کے ساتھ ساتھ شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ احمد ندیم قاسمی کے لیے ایک گوشہ بھی مخصوص کیا گیا ہے۔

مخزن کے آٹھویں شمارے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں برصغیر کے نامور جاسوسی ادیب جناب ابن صفی پر ان کے فرزند، احمد صفی کے دو خصوصی مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مذکورہ مضامین کی مخزن جیسے موقر اور خالصتاادبی پرچے میں اشاعت ابن صفی کے ان گنت پرستاروں کے لیے ایک خوشگوار تحفے سے کم نہ تھی۔ گرچہ اس سے پیشتر بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، رئیس امروہوی، نصراللہ خان، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، امجد اسلام امجد، شاعر لکھنوی، سرشار صدیقی اور پروفیسر حسن عسکری جیسی نابغہ روزگار شخصیات ابن صفی کی ادبی خدمات کا برملا اعتراف کرچکی ہیں لیکن مخزن میں ان مضامین کو شائع کرکے جناب مقصود الہی شیخ نے صفی صاحب کی اردو ادب میں ان کی مسلمہ حیثیت و مقام کو کشادہ دلی سے تسلیم کیا جس کے لیے وہ بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ابن صفی نے جس مسلک کج کلاہی کی سمت ایک دفعہ اپنا قبلہ راست کرلیا، پھر اسے تاعمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہد وفا

میں علاج گردش لیل و نہار ڈھونڈا۔ اور یہ انھوں نے اس زمانے میں کیا جب اردو زبان کے سری ادب کو تازہ خون کی اشد ضرورت تھی۔ کتنے ایسے ہیں جو قریبا نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں ؟ ابن صفی کے چنے ہوئے راستے سے ادب کے رہنماؤں کو اختلاف کیوں نہ رہا ہو لیکن اپنی بے مثال تحریروں کے ذریعے اردو زبان کے پھلاؤ، قانون کا احترام اور پڑھنے والوں کی ذہنی و فکری تربیت جیسے کام جس پامردی و استقامت سے انھوں نے کیے وہ لائق تحسین و تکریم ہیں۔ مخزن کے نویں شمارے میں بہار، ہندوستان سے قاسم خورشید نے اپنے خط میں کیا خوب کہا کہ" پہلی بار اب ہمارے ادب میں ابن صفی پر سنجیدہ گفتگو ہونے لگی ہے، یہ جان کر تقویت کا احساس ہوا"۔۔۔اسی طرح ظہیر انور نے کولکتا سے تبصرہ کیا کہ" فن اور تصوراتی کاوشوں کے حوالے سے تخلیق کیا گیا ادب وہ ادب ہوا کرتا ہے جس کو عوام نے قبولیت کی سند بخشی ہو، عام آدمی ایسے ادب میں اپنی خوشی اور غم کی پوری کائنات کی جھلک دیکھ پاتا ہے، ابن صفی میں کوئی شے تو ایسی تھی کہ وہ ہر طبقے میں بیحد مقبول تھے"۔

مخزن کا نواں شمارہ 344 صفحات پر مشتمل ہے، سرورق دعا عباس کا تخلیق کردہ جبکہ اس کے ایک کونے میں نسیم سید کا یہ خوبصورت شعر درج ہے:

پڑی ہوئی تھی کسی در پہ ٹھیکرے کی طرح

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اٹھ کے کوہسار ہوئی

افسانوں، خود نوشت کے منتخب حصوں، شاعری کے علاوہ اس میں مخزن کے پچھلے شمارے پر قارئین کے خطوط پر مشتمل تبصرے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مولانا یوسف لدھیانوی کے مشہور سلسلے آپ کے مسائل اور ان کا حل کو بھی مذکورہ شمارے میں جگہ ملی اور قارئین اس کے عقبی ورق پر مقصود الہی شیخ صاحب کو ادب کا تمغہ امتیاز وصول کرتے دیکھ کر مسرور ہوئے۔

تارکین وطن ہم عصر دنیا کا نیا موضوع ہیں۔ جادو ٹونوں کی سرزمینوں سے لوگ کھیل تماشوں کے پنڈالوں میں چلے آئے ہیں۔ دنیا ٹیلی وژن کی اسکرین میں سمٹ آئی ہے۔ حقیقت اب اسی کا نام ہے جو کیمرہ دکھا دے۔ جو منظر اوٹ میں ہے یا دکھانے، بتانے والے کے معیار پر پورا نہیں اترتا، اس کا اسکرین پر کوئی وجود نہیں ہے۔ جو اسکرین پر موجود نہیں، اس کے بارے میں تصور اور تخیل متحرک نہیں ہو پاتے۔ لیکن تمثیل اور تخیل کا کل اجارہ ٹیلی وژن کے پاس نہیں ہے۔ لفظ تخلیق کرنے والے ابھی موجود ہیں اور ان کو پڑھنے والے دستیاب! --یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعداد روز.بروز کم ہوتی چلی جارہی ہے۔

ساتھ ساتھ ہمیں اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ تیزی سے انحطاط

پذیر معاشرے میں جہاں انسانی و اخلاقی قدریں پامال ہوئیں ہیں اور بد عنوانی نے ہر طبقے کو اس بری طرح متاثر کیا ہے کہ گلو خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، وہاں معاشرے کا سوچنے اور غور و خوص کرنے والا طبقہ بھی اس بگڑتی صور تحال سے متاثر نظر آتا ہے۔ ذیل میں دو ایسے اہل قلم کی حالیہ آرا شامل کر رہا ہوں جو معاشرے کے نباض کہلاتے ہیں۔پہلا تبصرہ جناب کمال احمد رضوی (الف نون فیم) کا ہے جن کی تحریریں الف نون کی شکل میں آج کم و بیش تیس برس گزر جانے کے بعد بھی تر و تازہ ہیں ۔ وہ کہتے ہیں:

" جو کچھ اس وقت پاکستان میں ہو رہا ہے وہ ڈوبنے کا مقام ہے۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ اب لکھنے والی بات ختم ہو گئی ہے ،معاشرے کی اصلاح کوئی نہیں کر سکتا۔اب تو صرف یہ بات کریں کہ معاشرے کو اور زیادہ کس طرح بگاڑا جا سکتا ہے۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین صرف یہ بتاتا ہے کہ کس نے کتنی چوری کی ہے لیکن ان چوروں کو کون سزا دے گا؟ آج تک کتنے دہشت گرد ہاتھ آئے ہیں؟ کیا کسی کو پھانسی ہوئی ہے ؟ پاکستان آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے، اوپر سے قدرت بھی آپ کا ساتھ نہیں دے رہی۔انسان ایک حد تک کوشش کر سکتا ہے اس کے آگے وہ بے بس ہے۔ "

اسی طور معروف شاعر جناب حمایت علی شاعر بھی رو بہ زوال معاشرے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ظاہر پرستی کا زمانہ ہے۔ خدا کی حیثیت اب دو نمبر کی ہے۔ تہذیبی اقدار نہیں " ہیں۔ پیسے کے رشتے ناطے ہیں۔ پورا معاشرہ یہودی ہو چکا ہے۔ میں اپنے پڑوسی کو نہیں پہچانتا اگر وہ پیسے والا نہیں ہے تو۔ ہماری پوری تاریخ منافقت سے ہوئی ہے۔ ہم سچ بات بول نہیں سکتے، لکھ نہیں سکتے۔ ہم نے لفظوں کی حرمت کھو دی ہے۔ ہمارے یہاں مقابلے کا فقدان ہے۔ ہم کسی سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ضعیف " حکایات بتا کر نجانے ذہنوں کو کس راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے

اب دستِ سامری میں عصائے کلیم ہے

بین السطور آرا کے بعد اگر اس تمام معاملے کا روشن پہلو دیکھا جائے تو حوصلہ افزا بات یہ سامنے آتی ہے کہ 2001 میں مخزن کے اجرا سے لے کر 2010 تک انؔ لڑھکے ہوئے پتھروںؔ نے اپنے تخلیق کردہ ادب کے لیے جتن سے لفظ حاصل کیے اور پر بنا کر لگا دیے ۔ اب دیکھیے کہ ان سے بنتا کیا کچھ ہے۔ فاختائیں یا کبوتر۔ بقول شخصے ضرورت تو دونوں کی ہے، فاختاؤں کی امن کے لیے اور کبوتروں کو نامہ بر کا کردار ادا کرنے کے لیے۔ ان سب تک جو اپنی اپنی کہانی اوڑھے بیٹھے ہیں،۔۔۔ لکھنے کا یارا نہیں رکھتے ۔۔ دل پر جھیلتے ہیں۔

ان لڑھکے ہوئے پتھروں کی کہی ہوئی کہانیاں مشرقی و مغربی تہذیب، معاشرت، ثقافت اور انسانی رویوں کی آیئنہ دار ہیں جس میں کہیں تارکین وطن کا نوحہ، کہیں اعلی اقدار کی پامالی، کہیں استعماری قوتوں کی ریشہ دوانیاں، کہیں طبقاتی کشمکش تو کہیں نادار و بے کس انسانوں پر روا رکھے جانے والے مظالم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مشرق و مغرب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقدار کا خوبصورتی سے احاطہ کی گیا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو اپنا کام کر چکے۔۔اور شاہراہ ادب پر نمایاں مقام پر ایستادہ بھی ہو چکے۔۔۔اب ضرورت ہے اس بات کی کہ ان جیسے مزید تازہ دم قلمکار سامنے آئیں کہ یہ سلسلہ چلتا رہنا چاہیے۔۔اگر تھم گیا تو گراں خوابی کا شکار یہ معاشرہ جسے ہر دور میں نشتر زنی کی ضرورت درکار ہوئی ہے، مجبوری و گھٹن کی صورت اس شعر کی تفسیر بن جائے گا :

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے

اپنے ہی دل سے اٹھے، اپنے ہی دل پر برسے

اور اردو زبان فراق گورکھپوری کے بقول شاید اتنا ہی کہہ پائے گی :

تو پھر عشق دنیا میں کہیں کا بھی نہ رہ جائے

زمانے سے لڑائی مول لے ! تم سے برا بھی ہو

لیکن ٹھہرو دوستو! ۔۔۔۔۔ مخزن کے شمارہ نمبر ۹ میں امجد مرزا نے" برطانیہ کے ابھرتے ہوئے قلمکار اور ان سے وابستہ توقعات" کے عنوان چند لکھاریوں کے مختصر کوائف بیان کیے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ برطانیہ میں اردو کی بقا کا غم کھانے والے مقصور الٰہی شیخ کو اس بارے میں چنداں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔۔۔اردو کا مستقبل دیارفرنگ میں تابناک ہے۔۔۔۔مذکورہ لکھاریوں کے نام اس طرح سے ہیں:

ثمینہ بلال، نرگس جمال سحر، رخسانہ زخشی، سائرہ بتول، شہباز خواجہ، راحت بھٹی، سلیم فگار، اشتیاق زین، مظفر احمد مظفر۔

یہاں مخزن کے اجرا کے بنیادی مقصد اور اس کے مرتب کی انتھک کاوشوں کے پس منظر میں مخزن کے متفرق شماروں ہی سے چند اہل قلم کی آرا شامل کی جارہی ہیں:

شیر افضل خان بریکوٹی:" انگلستان میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے والا مورخ جب چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھے گا تو وہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ اس ملک کے

اندر بریڈ فورڈ میں مقصود الہی شیخ بھی تھا۔"

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ، ہندوستان): "یہ تارک الوطنی مہاجرین لائق تحسین ہیں جو مغرب میں بھی اپنے مذہب اور اپنی مشرقی تہذیب و ثقافت پر نہ صرف یہ کہ قائم رہے بلکہ جلد ہی وہ منظم ہو کر ادب کے ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ آج وہ مغربی دنیا کو اردو ادب کا ایک تیسرا بڑا مرکز بنا دینے میں کماحقہ کامیاب ہیں۔"

ڈاکٹر جلیس سہسوانی: (ایڈیٹر: گلکدہ، اترپردیش، ہندوستان): "دیار غیر میں رہ کر "اردو اور اردو شعر و ادب کی خدمت دیکھ کر بے اختیار منہ سے واہ واہ کی صدا نکل گئی۔

ظہیر انور: (ماہنامہ انشا، کولکتا): "اردو زبان و ادب کی جڑیں سمندر پار تک پھیل چکی ہیں، دور دراز ملکوں میں زبان کی مختلف اصناف کو فروغ ملا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا ذائقہ اور احساس بھی۔ انگلستان تو اردو ادب کے ایک مستقل گہوارے میں تبدیل ہو چکا ہے۔"

حقانی القاسمی: (بزم سہارا، دہلی): "مخزن دراصل میر تقی میر کی چھتری کی طرح ہے جو سمندر کے احوال کی خبر دیتی ہے۔

فخر زمان، لاہور: ”مخزن کے ذریعے علم و ادب کی یہ خدمت آب زر سے لکھی جائے گی اور مقصود الٰہی شیخ کے نام اور کام کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل تصور نہیں کی جائے گی۔“

امجد مرزا امجد: ”کہتے ہیں کہ جواری جب سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو کوڑیوں سے کھیلنا شروع ہو جاتا ہے مگر کھیل سے باز نہیں آتا۔ مقصود الٰہی شیخ سے ادب کی بنجر ہوتی ہوئی زمین کو دیکھا نہ گیا۔ ”راوی“ کے بعد اس منہ سے ایک اور چشمہ پھوٹا جس نے ساری دنیا کو سیراب کر دیا۔ ایک ایسا پلُ بنا جس نے دنیا کے ہزاروں لکھاریوں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔“

سید ظفر ہاشمی (دوماہی گلبن، لکھنو): ”مخزن نامی اشاعتی سلسلے کو شیخ مقصود الٰہی نے ایک پل سے تعبیر کیا ہے جس کا مقصد مغربی ممالک میں آباد ادیبوں اور شاعروں کو برصغیر میں ان کی جڑوں سے جوڑنا تھا نیز دیار غیر میں مقیم قلمکاروں کو ہندوپاک میں متعارف کرانا تھا، ان کی تخلیقات سے قارئین کو مستفید کرانا اور برصغیر کے ناقدین کو ان تخلیقات کا تجزیہ کرنے کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ اس کار عظیم کو انہوں نے مختلف انداز سے انجام دینے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ مخزن کا ہر مجلّہ انفرادی انداز سے نمودار ہوا۔“

مضمون کی ابتدا میں جناب مقصود الٰہی شیخ کا تبصرہ کہ ”سخت اور سنگلاخ راہوں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے، مخزن پاکستان و ہندوستان کے درمیان ادبی پل بنا“ شامل کرچکا ہوں اور اس کی توثیق مشاہیر ادب کی مندرجہ بالا حقیقت پر مبنی آرا بجا طور پر کرتی نظر آتی ہیں۔

اس مضمون کے اختتام پر میں یہ کہنے میں کلی طور پر حق جانب ہوں کہ اجنبی سرزمین پر رہتے ہوئے شیخ صاحب اردو زبان کی ترویج کا جو مشن لے کر چلے تھے اسے انہوں نے بطریق احسن پورا کیا اور مخزن آج ان کے خواب کی تعبیر کی صورت میں موجود ہے۔

اس بات کی صداقت کے ثبوت میں مَیں کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ ع

زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو

میر کے تاج محل کا ملبہ یا ظفر اقبال کے ملبے کا تاج محل

کراچی کے ادبی مجلے مکالمہ کے شمارہ نمبر 19 (مارچ 2012) میں جناب ظفر اقبال کا مضمون "میر کے تاج محل کا ملبہ" شائع ہوا ہے۔ مکالمہ کا یہ شمارہ اس لحاظ سے یادگار ہے کہ اس میں شائع ہوا الزامات سے بھرپور یہ مضمون سخن فہم حضرات کے لیے بحث و تنقید کے نئے راستے کھولے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بغور مطالعے کے بعد سخن فہم، سخن اور فہم دونوں ہی سے ہاتھ دھوتے نظر آرہے ہیں۔ ظفر اقبال نے زیر تذکرہ مضمون میں یگانہ کے بعد اب میر تقی میر کو نشانہ بنایا ہے۔ اس سے قبل یگانہ پر ان کا مضمون 'میرزا یاس یگانہ۔ایک معمولی شاعر' شائع ہو کر ہر خاص و عام سے 'غیر مقبولیت' کی سند پا چکا ہے۔ میر پر اپنے اس مضمون میں وہ صرف ایک بات کہنا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ خدائے سخن کے کلام میں ہر شعر درخور اعتنا نہیں ہے، یہ بات وہ مدیر کے نام اپنے یک سطری مکتوب میں بھی کہہ سکتے تھے، لیکن اتنی سی بات کہنے کے لیے الزامات کے جو تانے بانے انھوں نے بنے، اس کی زد میں خود ان کا آنا بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔

بزبانِ خامہ بگوش، اتنی تیزی سے تو کسی کو رسوائی بھی نہیں ملتی جتنی تیزی سے ظفر اقبال کو شہرت ملی۔ ان کے مجموعہ کلام 'آب رواں' کا دوسرا ایڈیشن

شائع ہوا، جس میں آب تو بقدرِ اشکِ بلبل تھا، رہی روانی سو اس مجموعہ کلام کو پڑھنے کے بعد اس کا قاری بجق شاعر رواں تو ہوا لیکن کسی بھی قسم کے کلمہ خیر کے بغیر۔ انتظار حسین تو اس قدر جز بز ہوئے کہ تنگ آ کر حال ہی میں ایک سالم کالم لکھ دیا۔ انتظار حسین لکھتے ہیں: " آب رواں پر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک پر مغز دیباچہ باندھا ہے۔ فاروقی صاحب کا قلم اس وقت اور ہی شان سے رواں ہوتا ہے جب ظفر اقبال کی شاعری زیر بحث ہو۔ فاروقی صاحب صحیح کہتے ہیں کہ عام حالات میں تو آب رواں کے "مصنف کو زندگی بھر ان اشعار کی کمائی کھانا چاہیے تھی۔

پروفیسر فاروقی کے بیان سے یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر اقبال کی اپنے اشعار کے ذریعے حاصل کی گئی کمائی اب ختم ہو گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق انتظار حسین نے بھی کی ہے، مزید لکھتے ہیں: " تو پھر کیا ہوا، ظفر اقبال نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور :گلافتاب کی اوبڑ کھابڑ کھاڑی میں جا اترے اور ایسے شعر لکھنے لگے

لہو لہلوٹ سیاہی پھیلویں پھب
کڈھب کاغذ طلب تحریر نے کی

کوؤں کے شور مچانے سے کوئی مر تو نہیں جاتا۔ تو کرتے رہیں یار اغیار ظفر

اقبال کی کڈھب غزل پر تھو تھو، اس نے ایک معتبر نقاد سے سند لی اور اجتہاد کا شرف حاصل کر لیا۔ ارے ہم (انتظار حسین) تو اردو کی سخت جانی کی دلیل یہیں سے لاتے ہیں کہ یہ زبان ظفر اقبال کے تشدد کو مسلسل سہہ رہی ہے اور زندہ اور پائندہ چلی آ رہی ہے۔"

ظفر اقبال ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت ہیں جن کے بارے میں نقاد اب لکھتے لکھتے تھک چکے ہیں بلکہ کئی ایک تو یہ دنیا ہی چھوڑ چکے ہیں مثال کے طور پر خامہ بگوش جنھوں نے ایک سے زائد کالمز میں ہمارے ممدوح پر قلم اٹھایا تھا۔ اپنے ایک کالم میں خامہ بگوش لکھتے ہیں: "انیس ناگی ایک نہایت عمدہ ادبی رسالے دانش ور سے بھی وابستہ ہیں۔ اس رسالے کی پیشانی پر ایک لیبل چسپاں ہوتا ہے جس پر یہ الفاظ درج ہیں: 'نئے ادب کا ترجمان' ۔ لیکن جو ادب اس میں چھپتا ہے وہ نئے پن سے آگے کی چیز ہے۔ مثلاً اس کے تازہ شمارے میں ظفر اقبال کی نئی غزلیں شامل ہیں، ایک غزل کے یہ دو شعر ہم نے بطور نمونہ استاد لاغر مراد آبادی کو سنائے:

جو آن کے ہمسائے ہمارے میں رہیں گا
تحقیق کہ خود ہی خسارے میں رہیں گا
اس گھر کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ شوخ
ایک بار رہیں گا تو دوبارے میں رہیں گا

:استاد گرامی نے یہ شعر سن کر فی البدیہہ فرمایا

ناگی نے جو چھاپیں ظفر اقبال کی غزلاں

جو ان کو پڑھیں گا وہ خسارے میں رہیں گا

میر کے تاج محل کا ملبہ' میں ظفر اقبال نے ارشاد فرمایا ہے کہ ' میر کے ہاں کڈھب' اور ناملائم الفاظ کا استعمال زیادہ ہے جس سے سلاست اور روانی بھی مجروح ہوتی ہے تاہم جہاں میر سلیس زبان استعمال کرتے ہیں، وہاں سب سے آگے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔'

میر کے بہتر نشتر ہیں اور ان تمام نشتروں کا جواب ظفر اقبال نے مذکورہ بالا فرمان کے ذریعے دینے کی کوشش کی ہے، حیرت کی بات یہ ہے یہ فرمان جاری کرتے وقت وہ اپنے کلام کو شاید سرے سے فراموش کر بیٹھے جو 'کڈھب اور سلیس' دونوں کی ایک :نرالی مثال ہے، یہ اشعار ملاحظہ کیجیے

رنگت ہی بدل گئی بدن کی

جب سانپ نے پہلی بار ڈسا

ڈھیلے ہیں پڑے ہوئے میاں تو

بیگم کا ابھی وہی ہے ٹھسا

پانی اتنا ملا کے اس نے
لسی کا کر دیا ہے لسا

ظفر اقبال نے اپنے مضمون میں خدائے سخن میر تقی میر کے تاج محل کے ملبے کی جانب قارئین کی توجہ دلانے کی کوشش تو کی ہے لیکن خود ان کی شاعری کے ملبے کا تاج محل کھڑا کرنے والے اپنے محسن پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کو بھی نہیں بخشا۔ فرماتے ہیں۔" شمس الرحمان فاروقی قابل مواخذہ اس لیے ہیں کہ انہوں نے جدیدیت کا جھنڈا سب سے اونچا اٹھا رکھا ہے اور خود غزل لکھتے بھی ہیں لیکن وہ انصاف اور ایمانداری سے بتائیں کہ کہ جدید غزل میں ان کا کنٹری بیوشن اور مقام کیا ہے ؟ "

یہ معاملہ دو بڑے لوگوں کے درمیان ہے لہٰذا اس میں دخل دینا ہمارے لیے مناسب نہیں لیکن جب ہم نے یہ استاد لاغر مرادآبادی کے گوش گزار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ عزیز یہ بات کیوں بھول جاتا ہے کہ شمس الرحمان فاروقی کے بلند کیے ہوئے " ' جدیدیت کے جھنڈے پر تو یہ خود کئی برس سے براجمان ہے۔

اپنے مضمون میں ظفر اقبال نے انکشاف کیا ہے کہ ' ایک مرتبہ میں نے شمس الرحمان فاروقی کے جریدے شب خون میں لکھا تھا کہ جو شخص جدید غزل کی تنقید

لکھتا ہے۔ اگر اس کی اپنی غزل جدید نہیں ہے تو اسے جدید غزل پر تنقید لکھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جس پر اسی شمارے میں انہوں (فاروقی) نے ترنت جواب دیا کہ ظفر اقبال جتنے اچھے شاعر ہیں، اتنے ہی بڑے نقاد بھی ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تینوں (انتظار حسین، حسن عسکری، شمس الرحمٰن فاروقی) اور ایسے سب حضرات باہر کے "لوگ ہیں، انہیں غزل جیسی اندر کی چیز پر ہاتھ صاف کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

یہاں پھر ہمیں مجبوراً استاد لاغر مرادآبادی کو زحمت دینی پڑی، خامہ بگوش کی رحلت کے بعد وہ عملی طور پر گوشہ نشین ہی ہو گئے ہیں لیکن گاہے گاہے ان سے ایسے معاملات میں ہم تبصرے کی درخواست کرتے رہتے ہیں۔ استاد نے یہ بیان سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ 'غزل جیسی اندر کی چیز پر تو تمہارے شاعر نے ایسا ہاتھ صاف کیا ہے کہ خود اسی کے الفاظ میں، لسی کا لسا کر دیا ہے، بھئی وہ میرا یار خامہ بگوش، ظفر اقبال کو پیار سے ''علامہ ظفر اقبال' (علامہ اقبال اور ظفر اقبال کا مرکب) یونہی تو نہیں کہتا تھا۔'

یہاں ہم نے خامہ بگوش کا ایک اور تبصرہ استاد کے گوش گزار کیا کہ " یہ تو سب کو معلوم ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جس شاعر کی تعریف کر دیں اس کی دنیا تو کیا عاقبت بھی سنور جاتی ہے یعنی وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

فاروقی نے شعر شور انگیز کے نام سے کلام میر کی جو شرح لکھی ہے، اس میں جگہ جگہ ظفر اقبال کے شعر، میر کے شعروں کے بالمقابل پیش کیے گئے ہیں، اگر یہ شرح میر کی زندگی میں لکھی جاتی تو یہ ان کی زندگی کا دوسرا صدمہ ہوتا۔ پہلا صدمہ دلی کا اجڑنا تھا " جسے وہ.برداشت کرگئے مگر دوسرا صدمہ آخری صدمہ بن جاتا۔

ظفر اقبال نے اپنے مضمون 'میر کے تاج محل کا ملبہ' میں چومکھی لڑی ہے۔ بات میر تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن انہوں نے ساتھ ہی ساتھ پروفیسر شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر محمد حسن عسکری، انتظار حسین، حتی کہ خواجہ میر درد کو بھی لپیٹے میں لے لیا۔ زیر تبصرہ مضمون یوں تو اس قابل ہے کہ تمام کا تمام ہی یہاں نقل کردیا جائے لیکن مضمون اور صاحب مضمون، دونوں کی طوالت کے خوف سے ایسا کرنا مناسب نظر نہیں آرہا، لہٰذا مضمون سے چند اچھوتے فرمودات یہاں نقل کیے جارہے ہیں:

۔ میر کے.براہ راست متاثرین میں فراق گورکھپوری اور ناصر کاظمی کا نام لیا جاتا ہے، ان میں احمد مشتاق بھی شامل تھے لیکن وہ اس جال سے بہت جلد اپنے آپ کو نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔

۔میر کے دور کی شاعری اب زیادہ تر محققین ہی کے کام آنے والی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔

۔ہر شاعر کی طرح بھرتی کے اشعار غالب کے ہاں بھی فراوانی سے دستیاب ہیں۔

۔عسکری سمیت یہ حضرات مناسباتِ لفظی اور دیگر انسلاکات کے اہتمام کو نہ صرف شاعری سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ دوسروں کو اسے منوانے پر بھی مصر ہیں۔

۔میر صاحب نے رونے کے مضمون کو اس تکرار اور کثرت کے ساتھ باندھا ہے کہ اس سے جی ہی اوبھ گیا ہے حتی کہ اس قبیل کے اشعار دیکھ کر رونے دھونے میں شامل ہونے کے بجائے ہنسی آتی ہے۔

۔اب وقت آگیا ہے کہ میر کا کلام جس جھاڑ جھنکار سے بھرا پڑا ہے، اسے اس سے صاف کرلیا جائے۔

۔میر کو کبھی خدائے سخن کہا گیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ خدائے سخن ہی رہیں۔اس وقت سخن کا جو عالم تھا، وہ اس کے خدا ہو بھی سکتے تھے لیکن اب سخن کی صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے، حتی کہ اب میر کے بہتر نشتروں میں بھی کئی اشعار باقاعدہ مزاحیہ لگتے ہیں۔

۔خدائے سخن ہونا تو درکنار، آج کے دور میں میر فرشتے کے منصب کو بھی پہنچتے نظر نہیں آتے۔

۔میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد حسن عسکری ہوں یا انتظار حسین ،ان کا غزل کے ساتھ کیا تعلق ہے جو وہ اس کے بارے میں اتنی اتھارٹی کے ساتھ بات

کرتے ہیں، یہ اتھارٹی انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

۔جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے۔رومال دو دو دن تک جوں ابرِ تر رہے ہے۔۔۔۔ میر کے اس شعر کی تعریف میں عسکری صاحب آپے سے باہر ہو رہے ہیں، یہ ایک تھرڈ کلاس شعر ہے۔

:۔میر کا شعر ہے

جو اس شور سے میر روتا رہے گا۔تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

روتا کون نہیں ہے لیکن رونے کی بھی ایک تہذیب ہے۔ایک نمونہ (ظفر اقبال کا اپنا)

:ملاحظہ ہو

مسکراتے ہوئے ملتا ہوں کسی سے جو ظفر

صاف پہچان لیا جاتا ہوں رویا ہوں میں

۔۔۔۔

جناب ظفر اقبال کے ان فرمودات پر مزید تبصرہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ اسے بہتر طور سے سمجھنے کے لیے جہاں جہاں میر تقی میر کا نام آیا ہے، وہاں وہاں مضمون نگار (میر کے تاج محل کا ملبہ) کا اپنا نام رکھ کر اِسے پڑھنے سے صورت حال خاصی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ رہا سوال حسن عسکری اور انتظار حسین کے اتھارٹی حاصل کرنے کا تو اس سلسلے میں یہی عرض ہے کہ دونوں حضرات نے یہ اتھارٹی وہیں سے حاصل کی ہے جہاں سے پروفیسر فاروقی نے ظفر

اقبال کی شاعری کو بطور سند پیش کرنے کے سلسلے میں اسے حاصل کیا تھا۔ جناب ظفر اقبال نے میر کے کلام میں موجود جھاڑ جھنکار کو صاف کرنے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ یہاں میر کے طرفدار جناب ظفر اقبال کی شاعری کے جھاڑ جھنکار میں موجود کلام کو صاف کرنے کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسی کسی بھی کوشش کے نتیجے میں یہ کوشش کرنے والا ' ہمارا تن بدن ہی جھاڑ ہو جھنکار ہو جیسے ' کی تفسیر بن سکتا ہے۔

اپنی شاعری میں جھاڑ جھنکار کو صاف کرنے کی بات سے یہاں ہمیں جناب ظفر اقبال کے اس انٹرویو کے مندرجات یاد آ رہے ہیں جسے انہوں نے بی بی سی کے انور سن رائے کو دیا تھا۔مذکورہ انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ " میں تو اپنی شاعری کو خود مسترد "کرتا ہوں اور کسی بھی وقت اسے منسوخ بھی کر سکتا ہوں، ساری کی ساری کو۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ یہ نیک کام بھی کر ہی لیا جائے۔

انٹرویو میں ایسی مزے دار باتیں ہیں کہ جو بجائے خود ایک علاحدہ مضمون کے لکھے جانے کی متقاضی ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں " میری شاعری میں جو عاجزی ہے، جو انکسار ہے، مثلاً میں نے کبھی تعلی کا شعر نہیں کہا، کبھی دعوی نہیں کیا

کہ میں نے یہ کیا ہے، میں نے یہ کہا ہے۔ابرار احمد کہا کرتے ہیں کہ یہ میری چالاکی ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ چالاکی ہے تو کرکے دکھاؤ۔ایرج مبارک کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی ہر غزل میں کم از کم تین شعر اپنے خلاف کہے ہوئے ہیں۔اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر یہ چالاکی ہے تو کرکے دکھائیں، لکھیں ایک دو شعر اپنی غزل میں۔ ایک اور بات سے اس کا شبہ مجھے ہوتا ہے کہ شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں لیکن وہ دونوں بیک زبان یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ظفر اقبال ہی اس وقت اردو دنیا کا ,برصغیر کا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے۔"

اللہ بخشے حفیظ ہوشیارپوری زندہ ہوتے تو اس چالاکی کے مضمون سے تاریخ نکال لیتے لیکن کیا کیجیے کہ چالاکی سے تاریخ تو نکالی جا سکتی ہے لیکن چالاکی سے شاعری نہیں کی جا سکتی۔

جناب ظفر اقبال کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دو لوگ زندگی میں کسی ایک بات پر متفق ہو جائیں تو گمان ہے کہ ان کے خون کی پیاس بجھ چکی ہے اور اب وہ کسی تیسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب ! یہاں ہمیں جناب ظفر اقبال ہی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

مقبولِ عام ہو گیا ہوں۔۔۔ یعنی کہ تمام ہو گیا ہوں

انٹرویو میں ایک جگہ جناب ظفر اقبال نے ' ان گھڑ مقلدین' کی ترکیب استعمال کی جس پر انور سن رائے نے استفہامیہ لہجے میں اسے دوہرایا۔ ظفر اقبال نے مصاحبہ گو کی ادب نا شناسی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا ' 'ان گھڑ، یعنی جو ابھی تیار نہیں ہوتے اور ظفر اقبال کی نقل شروع کر دیتے ہیں اور مار کھا جاتے ہیں۔" ۔

ایک موقع پر تو جناب ظفر اقبال نے انور سن رائے کو یہ کہہ کر بدحواس کر دیا کہ " جہاں تک میرے لب و لہجے کا سوال ہے تو میں اسے تبدیل کرتا رہتا ہوں۔ میں تو کہیں ٹک کر بیٹھتا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام زیادہ ترا یکڈیمک ہے۔ میری شاعری مشاعرے کی شاعری نہیں ہے۔ نہ یوں ہے کہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے شعر کہتا ہوں۔ لوگ قاری کو راغب کرتے ہیں، میں قاری کو اشتعال دلاتا ہوں با قاعدہ۔ " بعض اوقات۔ ایک چیلنج کے طور پر کہ تیری ایسی کی تیسی دیکھو یہ۔

میر تقی میر کے 72 نشتر مشہور ہیں، خامہ بگوش نے مندرجہ ذیل 73 واں نشتر میر ہی کے دیوان سے دریافت کیا تھا :

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر

مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

ان حالات میں تو یہ 73 واں نشتر جناب ظفر اقبال کے لیے ہی تجویز کیا جا سکتا ہے جو زیر تبصرہ مضمون 'میر کے تاج محل کا ملبہ' میں ایک جگہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

' میں پچپن سال سے اس کوچے (شاعری) میں جھک مار رہا ہوں۔

ہم جناب ظفر اقبال سے مودبانہ عرض کریں گے کہ اس قسم کے تبصروں سے گریز ہی کیا کیجیے، مضمون میں قاری جہاں آپ کی تمام باتوں سے اختلاف کرے گا وہاں وہ کسی ایک بات سے اتفاق بھی کر سکتا ہے۔"

کتابوں کا اتوار بازار۔ہندوستانی مہمان اور قومی عجائب گھر

علی گڑھ یونیورسٹی کی شعبہ فارسی کی چیئیر پرسن نے اپنے شہر سے اڑان بھری اور کراچی آکر دم لیا۔انٹرنیٹ نے باہمی رابطوں کو کس قدر آسان بنادیا ہے اس کی ایک مثال تو خاتون کے شوہر کی راقم الحروف سے ملاقات ہے جو ہندوستان میں مقیم اردو کے ایک معروف بزرگ ادیب کی معرفت ہوئی تھی۔ خاتون کے شوہر پروفیسر صاحب دو عدد فارسی مخطوطات کی تلاش میں سرگرداں تھے، کسی نے ان کو آگاہ کیا کہ فلکیات کے موضوع پر لکھے دونوں نسخے بابائے اردو کے قائم کردہ ادارے انجمن ترقی اردو میں محفوظ ہیں۔پروفیسر صاحب کے لیے ان مخطوطات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگلے برس ان کا انگلستان میں پڑھا جانے والا مقالہ ان مخطوطات کی عدم دستیابی کی بنا پر ادھورا رہ جائے گا۔پروفیسر صاحب پاکستان کے نظام کار سے شاید ناواقف تھے، مجھ سے ان مخطوطات کی سی ڈی کی فراہمی کی درخواست کرتے رہے۔ مخطوطات کے مصنفین دونوں ہندوستانی، لیکن اصلی نسخے سوائے انجمن کے، دنیا میں کہیں دستیاب نہیں ہیں۔خدا جانے یہ بابائے اردو کا کمال تھا کہ کسی کا دیا ہوا تحفہ، مخطوطات اب انجمن کی ملکیت ہیں۔بظاہر آسان نظر آنے والا کام

اتنا آسان نہ نکلا، گزشتہ ہفتے کے روز پروفیسر صاحبہ کو اپنے ہمراہ لے کر انجمن پہنچا، ادھر سید معراج جامی صاحب کو اپنی مدد کے لیے پکارا تو وہ بھی انجمن چلے آئے۔ معلوم ہوا کہ مخطوطات کا ذخیرہ تو انجمن والے کب کے قومی عجائب گھر کے حوالے کر چکے ہیں گرچہ ان کی ملکیت کے حقوق تاحال انجمن ترقی اردو کے پاس ہی ہیں۔ یہ سن کر ہمارے چھکے چھوٹ گئے۔ قومی عجائب گھر جانے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا، منزل قریب آتے آتے دور جاتی محسوس ہوئی۔ جامی صاحب نے جھٹ انجمن کی جانب سے ایک درخواست لکھوانے کا حکم صادر کیا۔ واپسی پر کیا دیکھا کہ ایک کمرے میں پروفیسر سحر انصاری براجمان ہیں، پتہ چلا کہ ان دنوں انجمن کے اعزازی معتمد ہیں۔ لیجیے ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ پروفیسر صاحب نے حسب عادت تعاون کی یقین دہانی کرائی اور ہم اس روز انجمن سے خالی ہاتھ گھر چلے آئے۔ دن گزرتے گئے، گزشتہ ہفتے کی صبح انجمن ترقی اردو کی جانب سے لکھی درخواست اس شان سے ملی کہ اس پر پروفیسر سحر انصاری کے دستخط اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ لکھا تھا:

"موصوفہ کو ان میں سے دو مخطوطات کی عکسی نقل بھی درکار ہے۔ اگر آپ کی رائے میں عکسی نقل کا لیا جانا مخطوطات کی ہیت پر اثر انداز نہ ہو تو ازراہ نوازش اس کی اجازت بھی مرحمت فرما دی جائے۔"

انجمن کے دفتر سے پروفیسر صاحبہ کو اپنے ہمرہ لے کر قومی عجائب گھر کا رخ کیا۔ یہ عجائب گھر 17 اپریل 1950 کو قائم کیا گیا تھا جبکہ اسے 1970 میں موجود عمارت میں منتقل کیا گیا۔ یہ عمارت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ پر واقع ہے۔ قومی عجائب گھر میں موجود نوادرات کی کچھ تفصیل یہ ہے: (بشکریہ وکیپیڈیا انسائیکلو پیڈیا) :

The Museum has a collection of 58,000 old coins (some dating from 74 Al-Hijra), and hundreds of well preserved sculptures. Some 70,000 publications, books and other reading material of the Archeology and Museums Department were also shifted to the National Museum so that general public could see them. For the preservation of the collection, a conservation laboratory is also a part of the Museum. Every year National Museum holds around a dozen exhibitions on National Days and other occasions. The Museum premises also has an auditorium with 250 seating capacity

لوگوں کی آمد آمد تھی، جناب حمزہ فاروقی کے الفاظ میں، پہلا طبقہ مراعت یافتگان، دوسرا ایستادگان اور تیسرا افتادگان کا تھا۔ عجائب گھر میں قدم

رکھنے سے قبل ہم خود کو تیسرے طبقے کا فرد محسوس کر رہے تھے لیکن ہمارے حق میں بات تیسرے سے پہلے طبقے میں جا ٹھہری۔ وہ ایسے کہ داخلی دروازے پر ملے ایک ایسے صاحب جن کی وضع قطع انتہائی سادہ تھی، قمیص شلوار میں ملبوس، سر پو ٹوپی۔ ہم نے مدعا بیان کیا اور انہوں نے انتظار گاہ میں بیٹھے کا کہا، اندر ایک فرینچ خاتون اردو اور فارسی کے مخطوطات میں گم، دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔ قصہ مختصر، کچھ ہی دیر بعد سادہ مزاج والے حضرت مطلوبہ مخطوطات ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوئے اور ہمارے حوالے کر یہ جا وہ جا۔ مخطوطات کی نقل بنوانے کی اجازت نہیں تھی، یوں بھی دونوں نسخوں کی نقل بنوانے کی بات کر کے ' خود بھی شرمسار ہو۔ مجھ کو بھی شرمسار کر" پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہتا تھا کہ ان کی حالت یہ تھی ادھر ہاتھ لگاؤ، ادھر مٹی ہونا شروع، ایک نسخے کے درمیانی صفحات پر دیمک ہم کو آنکھیں دکھاتی ہوئی نظر آئی۔۔۔۔۔ شاید میں ان مخطوطات سے استفادہ کرنے والا آخری آدمی کہلاؤں۔ایک مخطوطہ رتن سنگھ زخمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جو اس کے مصنف کے نام کے لاحقے کی تعریف پر پورا اترتا تھا۔ پروفیسر صاحب کی سی ڈی بنوانے کی خواہش تو ایک طرف، مخطوطات کی نقل بھی بنوانا ناممکن نکلا۔

مجھے اندازہ تھا کہ کیا کرنا ہے۔ میں ایک طاقتور ڈیجیٹل کیمرہ اپنے ہمراہ لے کر گیا تھا، ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر میں نے تصاویر محفوظ کرنے کا کام

شروع کر دیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا، بالترتیب 162 اور 62 صفحات پر مشتمل دونوں مخطوطات محفوظ کر کے اطمینان کا سانس لیا، اب ان امیج فائلز کو یکجا کر کے پی ڈی ایف (Portable Document Format) کی شکل میں 'بھینچ' کر اور خوب محفوظ کیا جائے گا اور علی گڑھ میں بیٹھے پروفیسر صاحب کی طلب پوری ہو گی۔
واپسی پر میں انتظار گاہ میں موجود ایک شخص سے، جو ہماری موجودگی میں سہولت کار کے فرائض انجام دیتا رہا تھا، سادہ وضع قطع والے صاحب کے بارے میں دریافت کر بیٹھا۔ اس نے جواب دیا اور ہمارے چھکے جو انجمن میں چھوٹ چکے تھے، ایک مرتبہ پھر چھوٹے۔ وہ صاحب تو قومی عجائب گھر کے ڈائریکٹر نکلے۔ بے اختیار ان کی تلاش میں نکلا۔ رستے میں گلزار کی فلم 'لیکن' یاد آئی جس کے مرکزی کردار کو اس کا باس تازہ اسائنمنٹ کو سونپتے وقت ریل کا ٹکٹ بھی تھما دیتا ہے اور وہ بے اختیار کہتا ہے: اگر سب آپ کی طرح کام کرنے لگیں تو یہ حکومت سچ مچ چلنے لگے گی۔
ڈائریکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ ہم نے ان کے ساتھ تصویر بھی بنوائی!

اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں کا تعارف یہ ہے

پولیس افسر کی ڈائری
خودنوشت
مصنف: دلاور حسین لودھی
صفحات: 192
ناشر: شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی
سن اشاعت: 1993

چراغ علم

یاداشتیں

مصنف: پروفیسر ابوبکر احمد حلیم

صفحات: 150

ناشر: سید سلیمان ندوی اکیڈمی کراچی

سن اشاعت: 1995

خاکہ نما
خاکوں کا مجموعہ
منظر علی خاں منظر
صفحات: 224

ناشر: افسر پبلیکیشنز کراچی

سن اشاعت: 1991

کون دلاں دیاں جانے

افسانے

مصنف: ڈاکٹر شیر شاہ سید

صفحات: 86

ناشر: شہرزاد کراچی

سن اشاعت: مارچ 2011

شب چراغ
خاکوں کا مجموعہ
مصنف: حکیم نثار احمد علوی
صفحات: 208
ناشر: کاکوری اکیڈمی کراچی
سن اشاعت: 1982

یادوں کا سفر
خودنوشت
مصنف: اے جی خان
صفحات: 189
ناشر: مصنف نے کراچی سے شائع کی
سن اشاعت: 1989

مجھے یاد آیا
یاداشتیں

(ضیاء الحق قاسمی (عطاء الحق قاسمی کے بڑے بھائی

ناشر: قاسمی پبلیکیشنز کراچی

سن اشاعت: 2002

صفحات: 312

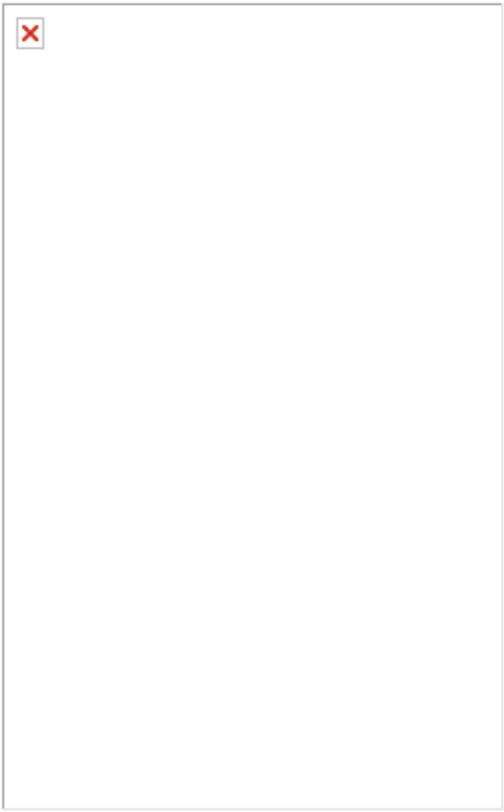

سفر آدھی صدی کا

خودنوشت

عبدالکریم عابد

ناشر: ادارہ معارف اسلامی کراچی

سن اشاعت: 2002

صفحات: 320

فتوحات اتوار بازار۔ بیان م حسن لطیفی و ظفر اقبال کا

یکم اپریل۔ ۲۱۰۲

شہر کراچی کے حالات کے برعکس پرانی کتابوں کا اتوار بازار حسب معمول مہربان رہا، احباب صبح صبح پہنچ جاتے ہیں، ایک دوسرے کو کتابوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے، بازار میں رکھی کوئی کتاب کسی ایک کے پاس پہلے سے موجود ہو تو دوسرے کو اسے خریدنے کا مشورہ دیتے ہوئے، کسی دوسرے کو درکار کتاب فراغ دلی سے فوٹو کاپی یا اسکیننگ کے لیے فراہم کرتے ہوئے۔ گھر سے نکلا تو رستے میں عابدہ رحمانی صاحبہ یاد آئیں جنھوں نے مہینہ بھر قبل انٹرنیٹ پر موجود 'بزم قلم' نامی ایک ادبی فورم پر شامل کی گئی ایک روداد کے جواب میں کہا تھا کہ بھارت میں ٹنڈ لکر اور پاکستان میں پیٹرول اور ڈالر سو کا ہندسہ عبور کر جائے تو آگاہ کرنا۔ اب انتظار ڈالر کا ہے کہ بقیہ دو تو منزل پر پہنچ کر شاد ہوئے ہیں لیکن دم پھر بھی نہیں لیا، مزید آگے جانے کا ادارہ رکھتے ہیں۔ علی گڑھ سے کراچی آئی پروفیسر صاحبہ آج صبح عازم وطن ہوئیں، ان کے قیام کے دوران کراچی کے حالات اچھے نہ رہے، پروفیسر صاحبہ کے ارادوں میں کھنڈت پڑتی رہی، ادھر میں فون پر ان کی ڈھارس بندھاتا تھا کہ یہ تو معمول' کی بات ہے، ہمارے لیے تو اسے معمول بنے کئی برس گزر چکے ہیں۔ حضرت' صبا اکبر

: آبادی نے برسوں پہلے شعر کہا تھا

یہ ہمیں ہیں کہ ترا درد چھپا کر دل میں

کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

اہل کراچی تمام تر خدشوں کے باوجود اپنے کام بدستور کیے جاتے ہیں۔۔۔۔۔

اس مرتبہ ایک بہت کمال کی کتاب ہاتھ لگی ہے، یہ ہے " ناصر کاظمی-ایک دھیان " مصنف: شیخ صلاح الدین، انیس سو بیاسی میں شائع ہوئی تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی، اس کا ذکر بہت سنا تھا۔" ناصر کاظمی-ایک دھیان " یاد نگاری کا بہترین مرقع ہے، شیخ صاحب نے موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔کتاب کو احباب کے لیے اسکین کررہا ہوں، ایک ممکنہ طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ احباب کے 'برقی آڈرز' موصول ہوں اور کتاب جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پر روانہ کردی جائے۔یاد رہے کہ محدود تعداد میں کاپیاں ہونے کے سبب پہلے آیئے اور پہلے پایئے کے زریں اصول پر عمل کیا جائے گا لہذا اپنے آرڈر ابھی سے بک کرالیجیے۔

ناصر کاظمی پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، ایک حالیہ ملاقات میں ہم نے یہ گلہ انتظار حسین صاحب سے کیا کہ ان کی خودنوشت چراغوں کا دھواں میں ناصر

کاظمی کا ذکر دلنواز ہے تو سہی لیکن ایک تشنگی پھر بھی باقی رہ گئی ہے۔انتظار صاحب نے انکشاف کیا کہ وہ ان دنوں اپنے عزیز از جان دوست ناصر کاظمی پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔

"ناصر کاظمی-ایک دھیان" کے مصنف شیخ صلاح الدین کا ذکر چراغوں کا دھواں میں انتظار صاحب نے بھی کیا ہے:

آ شیخ صلاح الدین
جا شیخ صلاح الدین
پنجابی میں وہ بولا
یا شیخ صلاح الدین

مذکورہ تک بندی حفیظ ہوشیار پوری کے ذوق سخن کا نتیجہ ہے جو ہر کس و ناکس کو دیکھتے ہی رواں ہوجاتے تھے، مبارک احمد پر نظر پڑی تو پکار اٹھے :

اس کی خالہ کا ہو خدا حافظ

جس کا خالو ہے مبارک احمد

صفدر میر کو دیکھا تو شعر موزوں کیا :

دیکھیو نہ رہ جائے کوئی در کھلا

پھر رہا ہے شہر میں صفدر کھلا

ان دنوں ذکر حضرت ظفر اقبال کا ہے، کراچی کے ادبی پرچے مکالمہ میں 'میر کے تاج محل کا ملبہ' لکھ کر تو آپ پہلے سے زیادہ مشہور ہوگئے ہیں۔ اکثر یہ دیکھا ہے جس کسی کتاب یا معلومات کی جب جب بھی خصوصیت سے ضرورت پڑی، انہی دنوں میں اتوار بازار سے مطلوبہ کتاب مل گئی ۔کچھ ایسا ہی اس بار بھی ہوا جب حضرت ظفر اقبال کا شعری مجموعہ 'رطب و یابس' اتوار بازار میں رکھا نظر آیا۔ بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ ظفر اقبال کی شاعری دراصل ایک خوبصورت بٹن کی مانند ہے، ایک ایسا بٹن جو لنڈے" کے پرانے کوٹ سے اتار کر شہر کی سب سے دیدہ زیب عورت اپنے چمڑے کے چمکیلے کوٹ میں ٹانک لے' ۔ اس بٹن میں چار سوراخ ہیں اور تمنا کی ابتری کا مضبوط دھاگہ' بٹن کے ایک سوراخ میں اس کے ،

زبان کے تجربات ہیں، دوسرے سوراخ سے گھروں کے اندر جھانکا جاسکتا ہے، تیسرے سوراخ سے گلابی مزاح کی دھوپ جھلکتی ہے اور چوتھا سوراخ بہت مہیب اور غم دیدہ ہے"

سبحان اللہ۔۔۔ بانو آپا، آپ کے کیا کہنے۔۔۔ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے تو آپ پر اور اشفاق صاحب پر جان چھڑکتے ہیں۔ یہ بھی تو سوچیے کہ حضرت ظفر اقبال کی شاعری پڑھنے کے بعد ان کے بے بس و بے کس قاری کے سر میں جتنے سوراخ ہوئے ہیں ان کا مداوا کرنے والا کون ہے ؟

شہر کی سب سے دیدہ زیب عورت حضرت کی شاعری کا بٹن اپنے کوٹ میں جب بھی ٹانکے گی، گمان ہے کہ اسکا کوٹ چمکیلا ہر گز نہیں رہے گا، ہمیں تو آپ کا بیان کردہ دھاگہ تمنا کی ابتری کا کم اور تمنا کی افراتفری کا زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ رہا سوال چوتھے سوراخ کا جو آپ کا الفاظ میں "بہت مہیب اور غم دیدہ ہے"، تو عرض یہ ہے کہ یہی چوتھا سوراخ حضرت کی شاعری میں نمایاں اور بڑا نظر آتا ہے اور بعض نقادوں کی نظر میں سوراخ مذکورہ سے جناب شاعر کی شاعری اسی مہیب خلا میں جا گری ہے جس کا ذکر آپ کرچکی ہیں، رہ گئی غم دیدگی کی بات تو اس کے متاثرین میں جناب شاعر نہیں بلکہ ان کا قاری شامل ہے۔

فلیپ لکھنا تو ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہندوستان کے ایک بہت پڑھے لکھے شخص نے آخری عمر میں کہا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں اب تک جتنی کتابوں پر فلیپ لکھے ہیں، میں ان سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔ ذرا ملاحظہ تو کیجیے کہ کتاب میں دھرا کیا ہے :

ستر پوشی ہے قافیہ بندی
ہاں ذرا کس کے باندھیے شلوار
*
سوچیے شعر کا نیا کوئی کوڈ

ساتھ چلتا نہیں ہے یہ بھی موڈ

☆

دھوپ سے کچھ بچاؤ رہتا ہے
سر پہ رکھتے ہیں شاعری کا ٹوپ

☆

خیر آپ بھی بدمعاش ہوں گے
میں ہوں ذرا مختلف لفنگا

☆

میں اتنا بدمعاش نہیں یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ، سوئٹر اتار دے

☆

بانو قدسیہ اکیلی ہی نہیں ہیں، انیس ناگی بھی کمر کس کے ان کی مدد کو پہنچے تھے، کیوں نہ آتے کہ اپنے پرچے 'دانش ور' میں ظفر اقبال کی 'غزلاں' جو شائع کرتے تھے۔ خامہ بگوش نے دانش ور میں چھپی ان کی ایک غزل کے یہ دو اشعار استاد لاغر مراد آبادی کو سنائے تھے:

جو آن کے ہمسائے ہمارے میں رہیں گا

تحقیق کہ خود ہی خسارے میں رہیں گا

اس گھر کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ شوخ

ایک بار رہیں گا تو دوبارے میں رہیں گا

اور استاد گرامی نے یہ شعر سن کر فی البدیہہ فرمایا تھا:

ناگی نے جو چھاپیں ظفر اقبال کی غزلاں

جو ان کو پڑھیں گا وہ خسارے میں رہیں گا

اپنے قارئین کے لیے ہم نے 'رطب و یابس' سے کچھ 'نمونے' پیش کیے ہیں، اب ملاحظہ کیجیے کہ انیس ناگی نے کتاب مذکورہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے کیا ارشاد فرمایا ہے:

۔ظفر اقبال نے لفظ اور شے کا جو ربط دریافت کیا ہے اس کی بنیاد شخصی بوالعجبی کے بجائے ایک تہذیبی تناظر سے دوسرے تہذیبی تناظر کی طرف روانگی کا سفر ہے۔ ظفر اقبال نے الفاظ کے عمومی رشتوں سے انقطاع کے ذریعے اپنی اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔

۔ظفر اقبال نے ہمیں اپنے آپ کو اتنے قریب سے دکھایا ہے کہ خود اپنا وجود دیکھ کر گھن آتی ہے۔

۔رطب و یابس میں ظفر اقبال کا اردو غزل کی روایت کے بارے میں گہرا شعور

جھانکتا ہے۔

۔ظفر اقبال نے غزل کے لسانی اسلوب میں ممنوعات کے استعمال سے گھٹن کی فضا کو ختم کیا ہے۔

۔اقبال کے بعد کی اردو غزل موضوعاتی اعتبار سے ڈانواں ڈول نظر آتی ہے، اس کی بے ہیئتی کو ظفر اقبال نے ایک طرح کا تیقن دیا ہے۔

۔رطب و یابس کے بغیر جدید غزل کا تصور تشنہ رہتا ہے۔

انیس ناگی بلکہ حضرت انیس ناگی اور بانو قدسیہ نے زیر موضوع کتاب کے تعریف میں جو نکات بیان کیے ہیں ،ان کو پڑھنے اور بعد ازاں یہاں درج کرنے کے دوران ہمیں ایک مرتبہ پھر اپنی سخن فہمی پر شبہ سا ہونے لگا، اس شبے کو رفع کرنے کی غرض سے جی کڑا کرکے ایک مرتبہ پھر 'رطب و یابس' پر ایک یاس بھری نظر دوڑائی، جو آبدار موتی ہاتھ لگے، پیش خدمت ہیں:

امید فصل ہو بنجر، قدیم بیویوں سے کیا
گھروں کو چھوڑیے اور کھیت میں غلہ اگائیے

☆

کچھ ترے بھائیوں نے مار رکھا
کچھ پڑیں اپنے گھر سے بھی ڈانگیں
روکو تو ہم کریں گے دنگا

بن جائے گا بات کا بتنگا

☆

میں ہوں، ظفر، اوکاڑہ ہے اور خوف کی خوش بو
دشمن ہے تو پنڈی سے بھی آ مجھ کو ملے گا

☆

جس نے چوری کی تھی سو پچاس پر چھوڑا اسے
جو سڑک پر جا رہا تھا اس کو اندر کر دیا

☆

ٹانگیں توڑی ہیں ڈاکوؤں نے
سر میں بھی کھلا ہوا ہے کھپا

☆

دی ہیں یہ گاجریں خدا نے
رکھ ہاتھ میں صبح و شام رمبا
سو میل ابھی پڑا ہے ملتان
ملتان سے آگے ہے تلمبا

☆

خصی ہوں خیال و خواب جن کے
دل کیوں نہ ہو ان کا بے امنگا

☆

دیر ہو جائے گی ، نہالیں اب
حسرتوں کا بھرا رکھا ہے ٹب

☆

پلے ہی، ظفر، ہیں اس طرح کے
کتیا تو نہیں تھی ڈب کھڑبی

☆

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے قارئین سے رطب ویابس کے متعلق انیس ناگی اور بانو قدسیہ کے ارشادات کو دوبارہ پڑھنے کی استدعا کریں گے۔ آخر میں رطب ویابس میں درج حضرت ظفر اقبال کے اس شعر پر یہ تذکرہ ختم سمجھا جائے:

خاتم الشعراءہمیں مانیں نہ مانیں وہ ، ظفر
شاعری کے دین کو ہم نے مکمل کردیا

فتوحات اتوار بازار میں ایک کتاب لطیفیات (جلد اول و دوم)بھی شامل ہے۔اس کے مصنف اردو کے دانشور، صحافی، شاعر م حسن لطیفی ہیں۔ لطیفیات ان کی شاعری کا مجموعہ ہے جو سن انیس سو اٹھاسی میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ لطیفیات کی جلد اول یکم جولائی 1928 کو رفیق۔عام پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی جبکہ جلد دوم یکم فروری 1935 کو شاطو پریس ، لدھیانہ سے شائع ہوئی۔ م حسن لطیفی ہفت روزہ مطالعہ مرتب کرتے تھے اورسارا پرچہ اول تا آخر خود تحریر کرتے تھے۔ بقول صادق الخیری " ان کا اخبار سولو جرنلزم کا پہلا اور آخری پرچہ تھا، جدید آزاد نظم کے پیش روؤں میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد اور ن م راشد کا نام آتا ہے "مگر م حسن لطیفی نے بہت پہلے اور بڑے اہتمام سے اس صنف کو روشناس کرایا تھا۔

آج سے 83 سال قبل م حسن لطیفی (محمد حسن لطیفی) نے ایک شعر کہا تھا جو

ناتمام غزل' کے عنوان کے تحت علی گڑھ میگزین میں جنوری 1929 میں اور لدھیانہ'
کے جریدہ مطالعہ کے 28 اکتوبر 1933 کے شمارے میں شائع ہوا۔ شعر زبان زد عام
ہوا اور آج بھی ہے:

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا ہوا جو مجھ کو فراموش کر دیا

ناتمام غزل کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

مضراب آرزو سے ذرا دل کو اور چھیڑ
کیوں مطرب اس رباب کو خاموش کر دیا
رگ ہائے ماہتاب نے ٹپکا کے خون ناب
آسودہ موج بادہ کو سرِ جوش کر دیا
آیا جو نیم ہوش میں مخمورِ چشم مست
پھر جرعۂ نگاہ سے مدہوش کر دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا ہوا جو مجھ کو فراموش کر دیا

م حسن لطیفی، قبرستان میانی صاحب میں آسودہ خاک ہیں۔ وہ لدھیانہ سے تعلق رکھتے
تھے۔ یوں تو کئی ادیبوں نے ان کی پہلو دار شخصیت پر لکھا ہے جن میں

جناب اے حمید نمایاں ہیں لیکن چند برس قبل شائع ہونے والی اردو کے ادیب و افسانہ نگار انتظار حسین کی خود نوشت چراغوں کا دھواں میں لطیفی صاحب کا ذکر ایک منفرد انداز میں ملتا ہے۔ لطیفی صاحب 11 دسمبر 1905 کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ یورپ سے واپسی ہر کے Le Petit Nicois Nice وہ اپنے ہمراہ بیس ہزار کتابیں لائے تھے۔ وہ فرانس کے ایک روزنامے پنجاب میں نمائندے تھے۔ انہیں پنجابی، اردو، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ کئی اہم کتابوں کے علاوہ تین سو نظموں اور پچھتر انگریزی مقالات کے مصنف تھے۔ جولائی 1930 کے انقلاب میں م حسن لطیفی، حضرت ساغر سیمابی کی ایک نظم پر تنقید کرتے ہوئے 16 انہیں للکار بیٹھے تھے

:

اے ساغر سیمابی
اچھی نہیں قصابی
تو شعر نہ لکھا کر

علم ودانش کایہ پیکر آخری دنوں میں کسی دماغی خلل میں مبتلا ہوگیا تھا۔ لدھیانہ کے ایک صاحب حیثیت گھرانے سے تعلق رکھنے والے م حسن لطیفی صاحب آخری عمر میں لاہور کی سڑکوں پر سرگرداں نظر آتے تھے اور ایک مجنونانہ کیفیت ان پر طاری رہتی تھی۔

: انتظار حسین لکھتے ہیں
پاک ٹی ہاوس کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک نرالی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ لمبا لگ لگ، " بدن سینک، سلائی بر میں ہرے رنگ کا کوٹ۔گم سم۔ خاموشی سے آکر بیٹھ جاتے ہیں
"لطیفی صاحب! چائے پیجیے گا "
ناصر کاظمی ان کا کتنا احترام کرتا تھا
"جی! اور دو توس بھی منگا لیجیے"
چائے آئی۔چائے کے ساتھ دو توس آئے۔لطیفی صاحب نے دونوں توس اٹھائے اور باہر نکل گئے۔تھوڑی دیر بعد خالی ہاتھ واپس آئے اور چائے پینی شروع کردی۔لطیفی

صاحب سے چائے کا جب بھی پوچھا گیا، انھوں نے توسوں کی فرمائش ضرور کی اور ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ توس آ کر رکھے گئے، اور وہ لے کر باہر نکل گئے۔ ایک روز میں (انتظار حسین) کافی ہاوس میں اس زاویے سے بیٹھا تھا کہ میرا رخ دوراارے کی طرف تھا۔ میں نے دیکھا کہ بار بار دروازے کے شیشے پر ایک کتے کی تھوتھنی نظر آتی ہے۔ میں حیران تھا کہ یہ کتا آخر کیا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ویٹر نے پلیٹ میں دو توس لا کر رکھے ۔لطیفی صاحب نے دونوں توس رومال میں لپیٹے اور باہر نکل گئے، کچھ دیر بعد واپس آئے اور ہمارے ساتھ کافی پینے لگے۔ پھر وہ کتا نظر نہیں آیا۔

لطیفی صاحب کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ لدھیانہ کے صاحب ثروت لوگوں میں سے تھے۔ تقسیم کے بعد لاہور آئے تو یہاں بے گھر، بے در ہو گئے۔ آج یہاں کل وہاں۔

ایک رات آوارہ گردی کرتے کرتے بہت رات ہوگئی۔سعید ساتھ تھا۔ ہم اس کے گھر کے قریب تھے۔ ناصر کاظمی نے کہا کہ آج رات سعید کے گھر قیام کرتے ہیں۔ہم نے وہیں ڈیرا ڈال دیا۔ صبح ناشتے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ناشتے سے ابھی ہم نے فراغت حاصل نہیں حاصل کی تھی کہ لطیفی صاحب نمودار ہوئے۔انہوں نے میز پر اپنا بڑا سا رومال بچھایا اور حلوہ پوری، توس وغیرہ سب سمیٹ کر اس میں باندھا اور خاموشی سے نکل گئے۔ ہم ہکا بکا کہ یہ کیا ہوا۔۔۔اگلی شام میں اس راہ سے گزرا تو دیکھا کہ دو کتے سعید کے گھر کے گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں۔اسی آن لطیفی صاحب ایک بڑا سا پڑا دونوں ہاتھوں میں سنبھالے برآمد ہوئے۔ دونوں کتوں نے انہیں اپنی اداوں سے خوش آمدید کہا۔پھر وہ برابر کی گلی میں مڑ گئے جہاں مزید کتوں نے اسی شان سے ان کا استقبال کیا۔ سعید انہیں اپنے گھر لے گیا۔ سعید محمود کا ایک شوق یہ بھی تھا کہ کسی ادیب میں جنون کے آثار دیکھتا اور وہ بے ٹھکانا ہوتا تو اسے اپنے گھر لے جاتا۔سعید کا گھر میرے (انتظار حسین) راستے میں پڑتا تھا۔صبح صبح جب میں سائکل پر سوار

دفتر کے لیے روانہ ہوتا تو سعید کے گھر کے احاطے میں جو درخت تھے، ان پر چڑیوں کے غول کے غول اترتے نظر آتے۔ چڑیوں نے سخت شور مچایا ہوتا۔ چند دنوں تک سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس راہ میں آخر اسی ایک گھر پر چڑیوں کی یورش کیوں ہوتی ہے۔ ایک دن لان پر جو نظر گئی تو دیکھا کہ لطیفی صاحب کھڑے ہیں، ان کے دونوں کاندھوں پر چڑیاں لدی ہوئی ہیں۔ باقی کچھ درخت سے اتر اتر کر ان کے گرد پھر رپھر راڑ رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں۔ لطیفی صاحب کے ہاتھوں میں روٹی کے ٹکڑے یا دانا دنکا قسم کی کوئی چیز ہے۔ وہ اسے بکھیر رہے ہیں۔

ایک دن لطیفی صاحب نے اپنا بوریا بستر باندھا اور اس گھر سے چلے گئے۔ کتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے میں نے ان کے جانے پر اس علاقے کے کتوں پر اس کا رد عمل جاننے کا تردد نہیں کیا۔ ہاں چڑیوں پر جو ان کے جانے کا اثر ہوا وہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ صبح کو گزرتے ہوئے میں اس گھر پر ضرور نظر ڈالتا تھا۔ چڑیوں کی چہک مہک غائب ہو چکی تھی۔ کچھ دنوں تک تو یہ لگا جیسے اس علاقے کی چڑیاں چہکنا ہی بھول گئی ہیں۔" (چراغوں کا دھواں از انتظار حسین)

حکیم ناصر نے کیا خوب کہا تھا:

سارا ہی شہر اس کے جنازے میں تھا شریک
تنہائیوں کے خوف سے جو شخص مر گیا

:م حسن لطیفی کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے

تاریخ وفات

میاں محمد حسن لطیفی صحافی پسر محمد شاہ صاحب رئیس لودیانہ

مئی 1959 مطابق 14 ذیقعد 1378 ہجری، 23

وائے حسن لطیفی قادر بیاں ادیب

پسر سخی محمد شاہ ولی و سعد

آں گنج بخش فیض کرم مظہر سخا

مفلس را ابر باراں و منعم را مثال رعد

رفت از جہان فانی و ممکن نمی گذاشت

پیدا کند زمانہ حریفش بدور بعد

سیدم از سروش تاریخ رحلتش

گفتا بشب ماہ کمال از ما ذیقعد

ذیقعد 1378 ہجری 14

:م حسن لطیفی کا یہ شعر ملاحظہ ہو

شاعر کی لرزتی ہوئی پلکوں سے جو ٹپکا

اس بیش بہا موتی کا ساحل تھا نہ بازار

:اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے

دلی یاد آتی ہے۔یاداشتیں ۔مصنفہ: روح افزاء حیدر۔ناشر: ملٹی گرافکس اسلام آباد۔ سن اشاعت: 2002۔ صفحات: 295

ناصر کاظمی ایک دھیان۔ مصنف: شیخ صلاح الدین۔ناشر: مکتبہ خیال لاہور۔ سن اشاعت: 1982۔ صفحات: 130

رطب ویابس۔شاعری۔ ظفر اقبال اناشر: جنگ پبلیکیشنز لاہور سن اشاعت: 1991 صفحات: 226

لطیفیات۔شاعریا۔ حصہ اور و دوم۔م حسن لطیفی۔ناشر: ادارہ نقوش لاہور۔ سن اشاعت: 1988۔ صفحات: 351

اردو ڈائجسٹ۔آپ بیتی نمبر۔ سن اشاعت: اپریل 2000۔ صفحات: 350

اردو ڈائجسٹ۔ عظیم سفرنامے نمبر۔ سن اشاعت: سالنامہ 2000۔ صفحات: 396

کتابوں کا اتوار بازار- 8 اپریل 2012 -بیان مولانا عبدالسلام نیازی کا

اتوار بازار کا ہفتہ وار پھیرا اب احباب کی ملاقات کا دوسرا نام بن گیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔کتاب کسی ایک کو مل جائے تو اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ دوسرے اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بھائی چارے کی کیسی کیسی مثالیں چشم فلک نے اس بازار میں دیکھی ہیں۔ گزشتہ اتوار ملنے والی کتاب "ناصر کاظمی -ایک دھیان" ہمارے کرم فرما جناب قیصر کریم کو ملی تھی، انہوں نے ہمیں سونپ دی کہ پہلے آپ پڑھ لیجیے اور اسکین کرکے محفوظ بھی کرلیجیے۔ ان کے توسط سے کتنے ہی دوستوں نے یہ دلچسپ کتاب پڑھی۔

دو روز قبل شاہد احمد دہلوی کے دلی کی نابغہ روزگار شخصیت مولانا عبدالسلام نیازی پر لکھے خاکے کی طلب ہوئی، اور اتفاق دیکھیے کہ شاہد دہلوی کی کتاب اجڑا دیار ایک ایسے کتب فروش کے پاس کتابوں کے ڈھیر میں پڑی ملی جہاں "ہر مال بیس روپیہ" کی آوازیں لگائی جارہی تھیں۔ مولانا عبدالسلام نیازی کا خاکہ کتاب مذکورہ میں موجود ہے، مولانا کی ایک نادر تصویر بھی کتاب میں شامل ہے، اس سے قبل ہمیں مولانا کی کوئی تصویر دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ روڑہ دلی کا ہو اور مولانا کے تذکرے کے بغیر آگے

بڑھ جائے، یہ ناممکن ہے۔ شاہد دہلوی کے علاوہ اخلاق احمد دہلوی نے بھی اپنی خودنوشت 'یادوں کا سفر' میں مولانا عبدالسلام نیازی کا ذکر کیا ہے۔ نوعمری کا زمانہ تھا، اخلاق احمد دہلوی اپنے والد کے ہمراہ مولانا کے پاس پڑھنے کی غرض سے تھر تھر کانپتے ہوئے پہنچے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان کے والد بھی خوف سے کانپ رہے تھے۔ بقول اخلاق دہلوی یہ وہ بزرگ تھے جن کے سامنے مفتی اعظم ہند مولوی کفایت اللہ کا پتہ بھی پانی ہوتا تھا۔

سراکبر حیدری نظام حیدرآباد کا کوئی پیغام لے کر مولانا سے ملاقات کی خاطر ان کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ مولانا کی پاٹ دار آواز آئی

کون ہے؟

اکبر حیدری نے اپنا نام اور مقام بتایا۔

مولانا نے جواب دیا: بس، آپ کی خدمت میں مولوی عبدالسلام کے کوٹھے کی یہ تین سیڑھیاں ہی لکھی تھیں۔ چوتھی سیڑھی پر قدم نہ رکھنا اور اپنے رئیس سے کہنا کہ اگر اس کی ساری دولت ایک پلڑے میں ترازو کے رکھ دی جائے اور دوسرے حصے میں ہمارے جسم کا کوئی رواں، تو ترازو کا یہ پلڑا زمین پر لٹکا رہے گا اور پہلا پلڑا معلق رہے گا۔ خدا خوش رکھے۔۔ خدا خوش رکھے۔

!سراکبر حیدری مایوس واپس لوٹ گئے

کچھ ایسا ہی اخلاق احمد دہلوی کے ساتھ بھی ہوا۔

مولانا عبدالسلام نیازی نے اخلاق دہلوی کے والد سے پوچھا۔اچھا، خدا خوش رکھے، تو یہ وہی صاحبزادے ہیں آپ کے جو مفتی صاحب سے فقہ پڑھنے میں ان کا ناطقہ بند اور قافیہ تنگ کرتے رہے۔ یہ کہہ کر مولانا نے اخلاق دہلوی کی جانب دیکھا اور کہا: خدا آپ کو علم کا پہاڑ بنا دے، ماشاء اللہ، خدا خوش رکھے۔بس جایئے اور اپنے والد کو بھی اپنے ساتھ لے جایئے۔

ایسی کیا بات تھی کہ ایک عالم مولانا سے ملاقات کا متمنی رہتا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے بھی یادوں کی برات میں مولانا عبدالسلام نیازی کا ذکر کیا ہے۔

جوش لکھتے ہیں:

وہ مشرقی علوم کے حرف آخر انسان اور شہنشاہ تھے۔ قران، حدیث، منطق، حکمت، " تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی فوائد، ادب اور شاعری کے امام تھے۔ جید عالم ہونے کے باوجود علمائے سو کے تشابہ سے بچنے کے لیے انہوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کردیا تھا۔ وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے، اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے مزارات کے چکر لگاتے، اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں وہ اس قدر سختی کہ ساتھ خلوت پسند اور خود نشیں

ہوگئے تھے کہ تقریباً بائیس برس کی مدت میں، وہ اپنے دہلی کے ترکمان دروازے کی "" پتلی سی گلی کے بالا خانے سے کبھی ایک بار بھی نیچے نہیں اترے تھے۔

اپنی اس متشددانہ طبیعت کی بنا پر مولانا کے روپے بھی اسی جیسے ہوگئے تھے۔ جوش اکثر ان سے ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے، مولانا نے جوش کو حکم دے رکھا تھا کہ

خبردار! جب تک کہ کوئی شخص حسین یا عالم نہ ہو، میرے پاس ہرگز مت لے کر آنا۔

جوش ایک مرتبہ اپنے ہمراہ ساغر نظامی کو لے گئے۔ مولانا خوش ہوئے اور فرمایا:

" اچھی چیز لائے ہو"

جوش ملیح آبادی نے مولانا عبدالسلام نیازی کے بیان میں جو باتیں مذکورہ بالا بیان کے علاوہ لکھی ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ یہاں نقل کی جاسکیں۔۔ "خوف فساد خلق بزم قلم منجانب راقم" کا خدشہ لاحق ہے۔ جن احباب کو یقین نہ آئے، یادوں کی برات کا مطالعہ کرلیں۔

ایک مرتبہ جوش مولانا عبدالسلام نیازی کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک وردی پوش نے آکر کہا کہ نیچے ہزہائی نیس فلاں فلاں کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو حاضر ہوں۔

مولانا نے جواب دیا کہ " اگر وہ میرے سامنے آ کر یہ کہیں کہ میرے تاج سے
" عبدالسلام کی جوتی اونچی ہے تو شوق سے آئیں ورنہ گاڑی بڑھا دیں۔
ہزہائی نیس" سمجھدار تھے، اوپر آئے اور مولانا کے پاس بیٹھ کر نہایت ادب سے "
باتیں کیا کیے۔
حیدر آباد کے وزیر تعلیم نواب مہدی یار جنگ، مولانا کے کوٹھے سے نیچے اتر رہے تھے
کہ جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش نے کہا حضرت خیریت، آپ یہاں۔
نواب صاحب نے کہا کہ خواجہ حسن نظامی نے مجھے مولانا عبدالسلام نیازی کے پاس بھیج
کر ذلیل کروا دیا۔ جوش حیران ہو کر سیڑھیاں چڑھے اور مولانا سے قصہ دریافت کیا۔
: مولانا کا جواب ملاحظہ کیجیے
مہدی یار جنگ نے جب مجھ سے یہ کہا کہ میں آپ کو حضور نظام سے ملواؤں گا، "
آپ میرے ساتھ حیدر آباد چلیے، وہ آپ کا وظیفہ مقرر کردیں گے تو میرا ناریل چیخ گیا
اور میں نے اسے کہا کہ آپ کے نزدیک کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں اس جاہل نظام کے
سامنے، اپنی وجاہت علمی کی کمر میں، ذلت کی پٹی باندھ کر جاؤں اور اس مسخرے کو
" خداوند نعمت اور اپنے آپ کو فدوی کہوں؟
جوش نے اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اسے یہاں نقل کرنے کی تاب راقم میں نہیں ہے۔

یہ جرات تو ڈاکٹر خلیق انجم بھی نہیں کرسکے جنھوں نے 2008 میں خاکوں کی کتاب
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا" میں مولانا عبدالسلام نیازی کا خاکہ لکھا تھا۔"
خلیق انجم لکھتے ہیں کہ اس کے بعد مولانا نے نظام حیدرآباد کی شان میں کو قصیدہ پڑھا
میں اسے یہاں نقل نہیں کرسکتا، آپ خود ہی یادوں کی برات میں پڑھ لیجیے۔ (مولانا
(عبدالسلام نیازی، صفحہ 208، مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، انجمن ترقی اردو ہند
خلیق انجم کے تحریر کردہ خاکے میں کئی دلچسپ باتیں ہیں۔ ہم نے بین السطور جوش ملیح
:آبادی کی یادوں کی برات میں درج خاکے سے یہ اقتباس نقل کیا تھا کہ
وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے، اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے"
مزارات کے چکر لگاتے، اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا
"کرتے تھے۔
:خلیق انجم کی تحریر سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتے ہیں
جے پور کی دو "گانے والیاں" تھیں، ببو اور گوہر۔ مولانا ان دونوں کے گانے کے "
مداح اور اور حسن کے شیدائی تھے۔ جے پور کی ایک اور گانے والی تھیں، اس

کا نام بے نظیر تھا، مولانا کو ان سے عشق تھا۔ اکثر مزاروں پر اس محبوبہ کے ساتھ جاتے تھے، جوش نے یادوں کی برات میں اسی کا ذکر کیا ہے۔"" (صفحہ 203)

مولانا عبدالسلام نیازی کو ایک مرتبہ ہندو مذہب کے مطالعے کا شوق ہوا۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھیں لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ بلاآخر ہندوؤں کا بھیس بدل ہری دوار کی راہ لی، بارہ برس ہری دوار، لکشمی جھولا اور رشی کیش میں رہے۔ ہندو سادھوں کی طرح سادھی لگاتے تھے۔ ایک روز انہیں خیال آیا کہ مجھے اتنے برس ہو چکے ہیں ان لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے، اب تک نہیں پہچان سکے کہ میں مسلمان ہوں، جب یہ لوگ مجھے نہیں پہچان سکے تو خدا کو کیا پہچانیں گے ؟۔ اسی شام کو مولانا جنگل سے گزر رہے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ سادھو سامنے سے چلا آ رہا ہے۔ اس جنگل میں سادھو کو دیکھ کر مولانا حیرت میں پڑ گئے اور ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ جب وہ آگے نکل گیا تو مولانا اس کے پیچھے چلے، تھوڑی دور پر ایک جھونپڑی تھی۔ سادھو اس جھونپڑی میں چلا گیا۔ مولانا باہر چھپے کھڑے رہے۔ انہیں پھر یہ خیال آیا کہ جب یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے تو خدا کو کیا پہچانیں گے۔ اچانک جھونپڑی میں سے سادھو کی آواز آئی، عبدالسلام ! چھپو نہیں، آ جاؤ۔ مولانا اپنا نام سن کر خائف ہو گئے اور بے اختیار ان کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ جھونپڑی میں داخل ہوئے تو سادھو نے کہا

کہ تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو، ہم نے دس گیارہ سال پہلے جب تمہیں دیکھا تھا، اسی وقت پہچان گئے تھے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ تم دہلی واپس چلے جاؤ، وہاں خلق خدا کی زیادہ خدمت کر سکو گے۔

! مولانا دہلی واپس لوٹ گئے

مولانا کا مزاج ایسا تھا کہ اچھے اچھوں کو بے طرح جھڑک دیا کرتے تھے۔ ایک عالم ان کے پاس اکتساب علم کے حصول کی غرض سے آنے کا خواہشمند رہتا تھا۔ مسائل دریافت کرنے والے اس پر مستزاد۔

ایک صاحب حج سے واپس آئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کسی نے مولانا کو پہلے ہی بتادیا تھا کہ ان صاحب کی دو غیر شادہ شدہ لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں، بہت کم آمدنی ہے پھر بھی قرض لے کر حج پر گئے ہیں۔ یہ سن کر مولانا بھڑک ہی تو گئے۔

آپ اتنے دن بعد حج سے واپس کیوں آئے ہیں ؟ " مولانا نے اس صاحب سے " دریافت کیا

وہ صاحب بولے: " حضرت، جب شمع جل رہی ہو تو پروانہ اندھیرے کی طرف کیسے " جائے

مولانا بپھر گئے، ضبط کھو بیٹھے، ڈپٹ کر کہا: " سالے ! تو یوں کروں، اس کا

مطلب ہے کہ ہم اندھیرے میں رہتے ہیں، تو قرض لے کر روشنی میں گیا تھا
""نکل یہاں سے تیری۔۔۔۔۔۔
وہ صاحب جوتیاں چھوڑ کر بھاگے۔

تقسیم ہند کے بعد مولانا عبدالسلام نیازی کے کئی دوست پاکستان چلے گئے۔ جوش ملیح آبادی جانے سے پہلے ان سے ملنے گئے لیکن اس مرتبہ مولانا نے انہیں بھی بے نقط کی سنائیں۔ دلی کا یہ روڑہ گھر تک محدود ہو کر رہ گیا۔ بلاآخر 30 جون 1966 کو چند دن بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔

زیر نظر پوسٹ کے ہمراہ شاہد دہلوی کی کتاب "اجڑا دیار" سے مولانا عبدالسلام

نیازی کا خاکہ منسلک ہے۔

:اتوار بازار سے اس مرتبہ ملنے والی کتابوں کی تفصیل یہ ہے

اجڑا دیار۔شاہد احمد دہلوی۔ناشر: مکتبہ دانیال، کراچی۔سن اشاعت: 1981 دوسری بار (اشاعت اول: 1961)۔صفحات: 432

غبار خاطر۔ابو الکلام آزاد۔مرتبہ: مالک رام۔ناشر: ساہیتہ اکیڈمی دہلی۔سن اشاعت: ۔صفحات: 1981435

کتاب زیست۔خودنوشت۔الحاج محمد زبیر۔ناشر: ایجوکیشنل پریس کراچی۔سن اشاعت:

: مئی 1982۔ صفحات

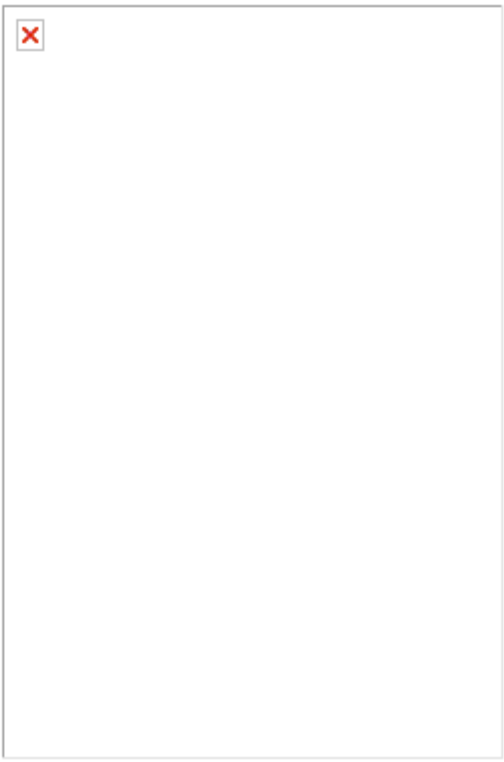

خشک چشمے کے کنارے۔مجموعہ مضامین۔ناصر کاظمی۔ناشر: مکتبہ خیال، لاہور۔سن اشاعت: مارچ 1982۔صفحات: 184

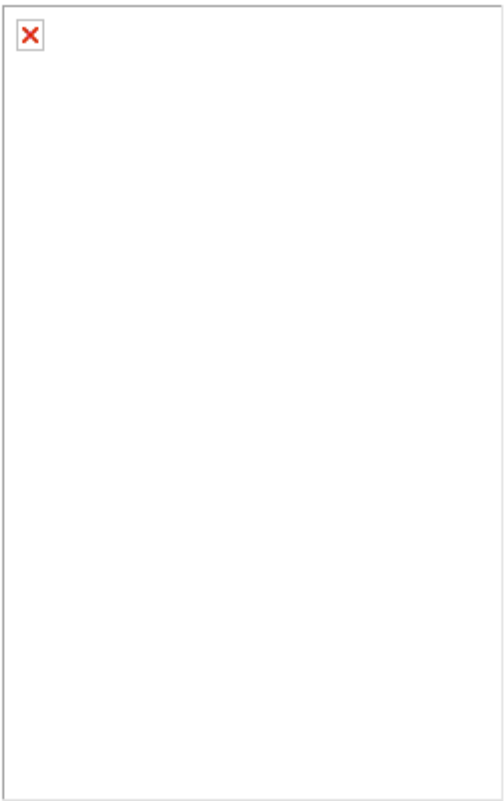

دکن سے ایک مہمان کی کراچی آمد

ایک نشست کا احوال

اپریل 2012 کی 15 تاریخ کی صبح دس بجے سید معراج جامی صاحب کے گھر پر موجود 'خاتون' و حضرات نے نظام آباد دکن سے آئے ہوئے بزرگ صحافی جناب فرید تبسم خاں کو خوش آمدید کہا۔ فرید صاحب روزنامہ مارننگ ٹائمز سے وابستہ ہیں۔ شرکاء کی موجودگی ایک ادبی نشست میں تبدیل ہو جائے گی، اس بات کا علم مجھے پہلے سے نہ تھا۔ دکنی شیروانی میں ملبوس حیدرآبادی نستعلیق اب و لہجے کے مالک فرید تبسم خاں اپنے ہمراہ ایک قیمتی کتاب لیتے آئے تھے۔، قیمتی اس لیے کہ یہ بمبئی فلمی صنعت سے وابستہ گیت کار و شاعر راجہ مہدی علی خاں پر پی ایچ ڈی کا پہلا تحقیقی مقالہ تھا جسے نظام آباد دکن کے ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر نے تحریر کیا ہے۔ راجہ صاحب پر اس سے قبل تحقیق نہیں کی گئی تھی اور مصنف نے ہندوستان و پاکستان میں اس بات کی تصدیق کے بعد ہی اس موضوع پر اپنے کام کا آغاز کیا۔ پاکستان میں ان کا رابطہ ڈاکٹر جمیل جالبی سے تھا۔

'راجہ مہدی علی خاں کی ادبی خدمات' کے عنوان سے زیر تحت لکھی یہ کتاب 2006 میں دکن سے شائع ہوئی تھی۔

نشست کے آغاز میں ایک نوجوان شاعر انجینئر عبداللہ محی الدین نے اپنے کلام سنایا:

مجھ پہ یہ تیری یاد کا احساں ہے بہت
یہ دل غم حیات سے انجان ہے بہت
جو ہم نہ ہوں تو یاد میں تڑپے گا تیری کون
ورنہ تو جان دینا بھی آسان ہے بہت
قرآن کا حق تو یہ کہ اس پر عمل کرو
ورنہ تو احترام کو جزدان ہے بہت

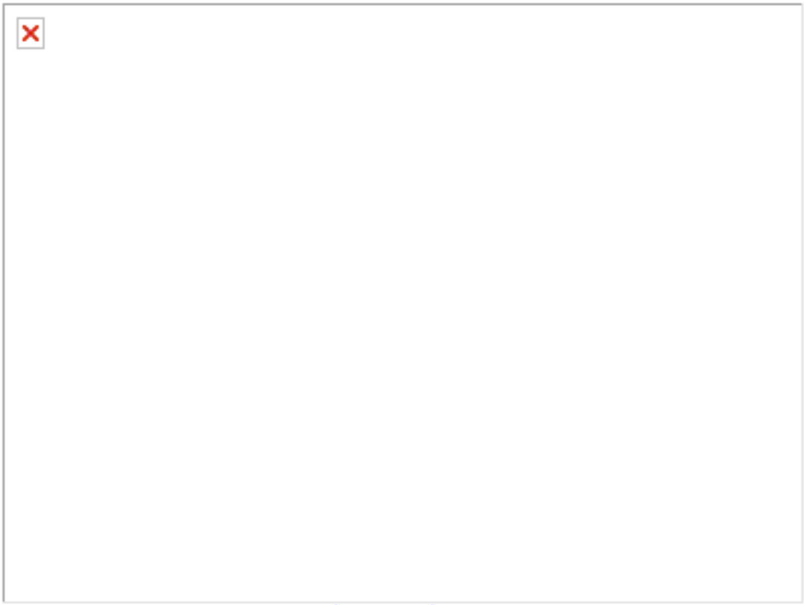

ایک گروپ فوٹو

شرکاء نے لفظ جزدان کے استعمال پر شاعر کو داد سے نوازا اور کہا کہ اس سے قبل کسی نے یہ خیال شاعری میں اس انداز سے نہیں باندھا تھا۔

اس کے بعد جناب عزیز احسن نے اپنی حمد کے چند اشعار پیش کیے:

للہ الحمد کہ منسوب میں اس ذات سے ہوں
خوب سرسبز عنایات کی برسات سے ہوں
فکر ہے دین مری ذات سے بدنام نہ ہو
اپنی حد تک تو نہ خائف میں کسی مات سے ہوں
دولت دیں مجھے اصحاب محمد سے ملی
متمتع میں انہی لوگوں کی خدمات سے ہوں
زہد و تقوی کے تو آثار نہیں ہیں لیکن
شکر، صد شکر، بہت دور خرافات سے ہوں

اختر اندوری

عزیز احسن کے بعد جناب اختر اندوری نے حاضرین کو اپنے کلام سے نوازا۔ یہ ترنم سے پڑھتے ہیں اور مشاعرہ گاہ اگر کسی کمرے کا دوسرا نام ہو تو قریب بیٹھے حضرات 'کان سنبھال کر بیٹھتے ہیں:

اختر کیسے بتاؤں گزرتی ہے مجھ پہ کیا
دے کے ہنر بنایا گیا بے ہنر مجھے
کس منزل عجیب کی جانب گامزن ہوں میں
پہچانتا نہیں ہے کوئی راہبر مجھے

....

کرلیا آپ سے آپ ہی کو طلب
دل کی جرات کو ہم دیکھتے رہ گئے
اور اس وقت آپ آئینہ خانے میں
اپنی زلفوں کے خم دیکھتے رہ گئے
ناخدا و خدا بحر میں ساتھ تھے
دست ہمت کے نزدیک ساحل بھی تھا
باوجود اس کے کشتی ڈوبی وہیں

جانب چرخ ہم دیکھتے رہ گئے
باغ نشیمن کو جب آگ دی
شاخ ہی کیا متاع وفا جل گئی
اف بھی کرنے کی ہم کو اجازت نہ تھی
خامشی سے ستم دیکھتے رہ گئے
اف وہ پر کیف دھاروں کی انگڑائیاں
نغمہ راگ و باراں نوائے فضا
کشتی آغوش بحر میں سو گئی
رقص موجوں کا ہم دیکھتے رہ گئے
ذکر میلاد و مجلس سے تھی برہمی
اس کو کافر کہا اور اسے بدعتی
آئے بزم سیاست میں جب شیخ جی
نغمہ ماترم دیکھتے رہ گئے
حادثہ کچھ حرم میں یہ ایسا ہوا
عمر بھر اس کا اختر مجھے غم رہا
یہ صنم میرا ایماں لوٹا کیے
اور اہل حرم دیکھتے رہ گئے

بائیں جانب سے: معراج جامی، عزیز احسن، فرید تبسم خان

اختر اندوری کے بعد سید معراج جامی صاحب نے غزل پیش کی:

میں سراپا ناتواں
اور کاندھوں پر جہاں
تیر سب پیوست جاں
ہاتھ میں خالی کماں
ہے گماں تجھ پر یقیں
مجھ سے تو ہے بدگماں

ہو گیا ہے بوالہوس
آج کا ہر نوجواں
تنگ ہے میرے لیے
یہ مکاں اور لامکاں
جان کا آزار ہے
پھر بھی ہے آرامِ جاں
میری آہِ سرد سے
جل گیا ہے آسماں
زندگی کی ناؤ ہے
اور شکستہ بادباں
کون سمجھا ہے مجھے
میں عیاں ہوں میں نہاں
کس کی یہ تصویر ہے
نقش ہیں سارے دھواں
چاہتے ہیں بت مجھے
اب کہاں جاؤں بتاں
سوئے منزل لے چلوں!
اے امیرِ کارواں

زندگی کے تجربے

ہو گئے سب رائیگاں

آسماں اوڑھے ہوئے

جامی بے خانماں

جامی صاحب کے بعد جناب انور احمد علوی نے ایک مکتوب بہ انداز غالب سنایا۔ایک منتخب حصہ ملاحظہ ہو:

"بھائی علوی! تم بھی لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو کہ خط میرا تمہارے کسی ہم نام کے ہاتھ جاپڑا۔ بھائی! ایسے فلیٹوں میں کیوں رہتے ہو جہاں پر دو انور علوی ہوں۔ اب میری سنو! کیا ہوا، پچھلے دنوں آم کھا کر بے دھیانی میں دانتوں کے بجائے اپنی آنکھ میں خلال کر بیٹھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ گھبرا کر باہر کو نکلا۔ آغا خان اسپتال پہنچا جس کو میں طبّی تجربہ گاہ کہتا ہوں۔ سات بجے شام ایمر جنسی میں لایا گیا تھا، رات پونے دو بجے ڈاکٹر میرے معائنے کو آیا۔ آنکھ سے برابر پانی بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد فلو کا اثر بتلایا اور خون کا ٹیسٹ لکھ کر دے دیا۔ وہ میں نے نہ کرایا کہ اپنے خون پر شک کرنا ہم ترکوں کی حمیت کے خلاف ہے اور دوائی لے کر گھر چلا آیا۔ بی بی نے سنا تو دوا اس نے جھپٹ لی۔ کس واسطے کہ اس کو فلو تھا اور اگلے روز

ڈاکٹر سے آنکھوں کی دوائی لے کر لوٹی تھی۔ آج تمہارے دل کی خوشی کے واسطے کاغذ قلم لے کر بیٹھا ہوں۔ دو حرف لکھتا ہوں، دو بھیجتا ہوں۔ کس بات کو صحیح جانوں؟ عامل اثر بتلاتا ہے، حکیم نے جگر پر ورم بتلایا ہے۔ ڈاکٹر ڈپریشن کہتا ہے۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے مطابق ماں بننے والا ہوں۔ ہومیو پیتھ شوگر کا خدشہ ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ اس کے اپنا ای سی جی نکلوایا تھا۔ رپورٹ کے بموجب دل کی حرکات منظم نہیں۔ صاحب! جو حرکتیں دل کے ہاتھوں سرزد ہوں، وہ کیونکر منظم ہو سکتی ہیں؟ ہارٹ اسپیشلسٹ نے تین ماہ بعد کی تاریخ دی ہے۔ بہتیرا سمجھایا، بھائی میں تمہاری بچی کی تاریخ نہیں مانگ رہا، بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ سنا ہے تمہارے یہاں کچھ اصحاب میری تکلیفات اور شخصیت پر کام کرکے ڈاکٹر بن رہے ہیں۔ معلوم کرکے بتلاؤ، ان کا شمار کس قسم کے ڈاکٹروں میں ہوتا ہے اور وہ کن امراض کا علاج کر سکتے ہیں۔ سوچتا ہوں، اب انھی میں سے کسی کو دکھا لوں۔ یہ لوگ میری رگ رگ سے واقف ہیں۔ شہر کی بابت تمہارے سوال کا جواب یہ ہے۔ یہاں کوئی امر نیا واقع نہیں ہوا ہے۔ وہی حالات واطوار ہیں جو دس بارہ برس قبل دیکھ کر گئے ہو۔ لوگ مرتے ہیں، پر غم میں وہ پہلی سی شدت نہیں۔ استاد ذوق کی موٹر قلعے کے باہر سے اٹھ گئی، کنجی ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ تفتہ کی آٹو سائکل بھرے بازار میں چھن گئی۔ میر مہدی کا گھر دن دہاڑے لٹ گیا۔ میری میم صاحب کے گہنے سرراہ ڈاکو لے اڑا۔ بھائی! یہ شخص مجھ کو اور میرے بھائی یوسف مرزا کو بھی لوٹ چکا ہے۔ بندہ خدا ہمارا دفیلی

ڈاکو' بنتا جارہا ہے۔ اے لو بھول گیا، آج صبح ایک عالم دین قتل کردیے گئے۔ بادشاہ سلامت سے شہادت پر ان کی افسوس کیا تو کہنے لگے مرزا! تمہارے علماء اپنے لیے شہادت کی دعائیں کرتے ہیں، ان کا قتل ہونا ظہور ان کی دعا کی قبولیت کا ہے، نہ کہ "سرکار کی نااہلیت کا۔ جو کچھ ہوا، موافق رضائے الٰہی ہوا، اس کا کیا گلہ۔ میں چپکا ہو رہا۔

بائیں جانب سے: انور علوی، عبداللہ محی الدین، معراج جامی

شرکاء کے قہقہے گاہے گاہے بلند ہوتے رہے!

:اس کے بعد شاہینہ فلک صدیقی نے ناصر کاظمی کی زمین میں اپنی غزل پیش کی

دل کو رنجش کا سبب یاد نہیں
کیا بتائیں تجھے جب یاد نہیں
وہ ترے ہجر کے قاتل لمحے
پہلے تو یاد تھے، اب یاد نہیں
اک تعلق کو نبھانے کے لیے
غم سہے اتنے کہ اب یاد نہیں
کھیلتے ہیں جو لہو کی ہولی
کیا انہیں اپنا نسب یاد نہیں
وحشتیں ناچ رہی ہیں ہر سو
اب ہمیں شام طرب یاد نہیں

:اس کے بعد جناب عارف منصور نے اپنا کلام پیش کیا

جہاں بھی شب کی ردائے سیاہ پھیل گئی
فراق نور میں ہر اک نگاہ پھیل گئی
تھے خار زار نمایاں ہر ایک منظر میں
شکستہ پائی کو دیکھا تو راہ پھیل گئی

خود اپنے آپ سے اک جھوٹ میں نے بولا تھا
پھر اس کے بعد یہ فصل گناہ پھیل گئی
ہوا میں رقصاں ہے جو گرد باد کی صورت
یوں لگ رہا ہے کہ ذرے کی آہ پھیل گئی

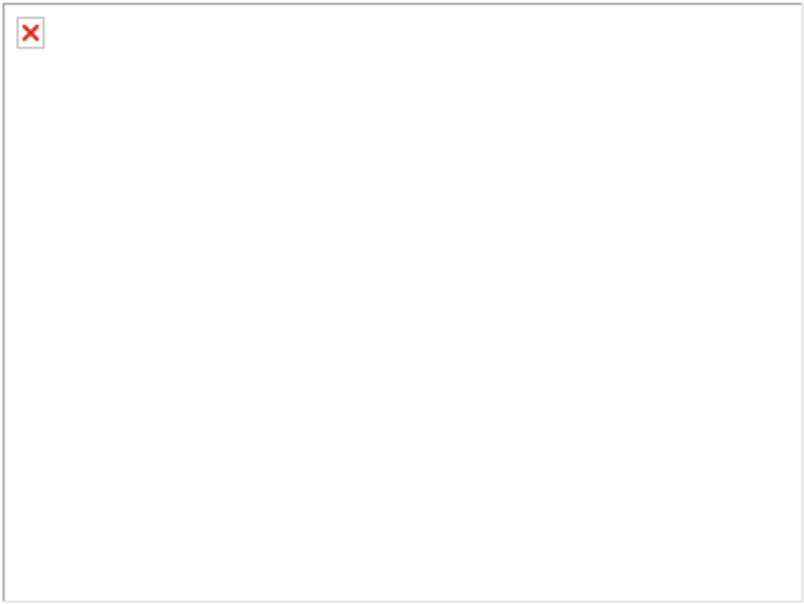

دائیں جانب سے: فرید تبسم خان اور عزیز احسن

نشست کے آخر میں احباب کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا ۔ فرید تبسم خاں صاحب نے دکنی لہجے میں معراج جامی صاحب کی پیش کردہ کتاب سے منتخب کلام سنایا۔ شرکاءمتفرق اشعار سناتے رہے اور سننے والے محظوظ ہوتے رہے۔ چند

:مثالیں پیش خدمت ہیں

کسی کے حصے میں مکان آیا، کسی کے حصے میں دکان آئی
(میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا، میرے حصے میں ماں آئی (منور رعنا

بیعت عشق کی ہے میں نے
(صاحب سلسلہ تو میں بھی ہوں (شبنم رومانی

گرمی لگی تو خود سے الگ ہو کے سو گئے
سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا
بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں پڑی
(ہر شخص نے مکان کا ملبہ پہن لیا (بیدل حیدری

آنکھ منزل پر لگی ہے اور کان آواز پر
اک مسافر پھر کھڑا ہے نکتہ آغاز پر

بیچتا پھرتا ہوں بچے کی دوائی کے لیے
(شہر والو میں نے اپنا خون سستا کر دیا (حق نواز خرم

حیات.برف کے کہسار کھودنے میں لگی

مجھے گماں سا ہوا تھا شرارے کا

دستاویز کا ادبی رسائل و جرائد نمبر - اک ولولہ نو کی طرح

جناب عزیز نبیل کی زیر ادارت دستاویز (دوحہ/دہلی) کا "اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد نمبر-2011 ۔2012 " شائع ہوگیا ہے۔750 صفحات پر مشتمل سالانہ عالمی اردو ادب کے سلسلے کی اس اہم ترین کڑی کو محض ایک ادبی مجلّہ کہنا درست نہ ہوگا، گزشتہ ایک سو دس برس پر مشتمل اردو زبان کے ادبی رسائل و جرائد کا احاطہ کرتی یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس سے قبل سال 2011 میں دستاویز کا پہلا مجلّہ شائع ہوا تھا۔

بقول شخصے اتنا ضخیم پرچہ نکالنا اپنے آپ پر پرچہ دینے کے مترادف ہے!

مذکورہ شمارے میں اردو کے اہم جرائد سے منتخب مضامین شامل کیے گیے ہیں۔ آغاز شیخ عبدالقادر کے مخزن کے پہلے شمارے سے ہوا ہے جو 1930 میں منظر عام پر آیا تھا جبکہ شب خون کے جون 1966میں شائع ہونے والے اولین شمارے پر اختتام کیا گیا ہے۔ زیر نظر تحریر کی مدد سے اس پرچے کی ایک ہلکی سی جھلک ہی دکھانا ممکن ہے۔ دوحہ قطر میں بیٹھ کر یہ جناتی کام کیسے کیا گیا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پاک و ہند میں رابطوں کو متحرک کیے بغیر یہ کام ناممکن تھا، گمان ہے کہ اس کام کے لیے نیک نیت اشخاص پر مبنی ایک گروہ نے اپنا آپ مدیر اعلی کو سونپ دیا ہوگا، مختلف کتب خانوں میں جاکر جرائد کے نایاب نسخے حاصل کیے ہوں گے اور ان کی نقل بنوا کر سائل کو روانہ کیا ہوگا۔عام آدمی سے اس کی امید رکھنا عبث ہے، یہ تو دیوانوں کے کرنے کا کام ہے۔ اردو کے تمام اہم ادبی جرائد و رسائل کے سرورق کے عکس بھی مجلے میں شامل کیے گئے ہیں۔ دستاویز کے اس شمارے میں پاک و ہند کے جن مشاہیر ادب کی تخلیقات کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں علامہ اقبال، داغ، سیماب اکبر آبادی، استاد اختر انصاری اکبر آبادی، خواجہ حسن نظامی، حالی، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری، وحشت، یھانہ، نیاز فتحپوری، اکبر، حسرت، جوش، فانی، اختر شیرانی، مجاز، اخترالایمان، منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ماہر

القادری، فیض، فراق، ناصر کاظمی، سردار جعفری، میرا جی، مجروح، محی الدین قادری زور، غیاث احمد گدی، قدرت اللہ شہاب، احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا شامل ہیں۔

پرچے کے اولین صفحے پر موضوع کی مناسبت سے حفیظ میرٹھی کا یہ شعر اپنی بہار دکھاتا نظر آتا ہے :

اف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

زیر موضوع مجلے میں اردو کے جن رسائل و جرائد سے نثر و شاعری پر مبنی

:انتخاب شامل کیا گیا ہے ان کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے

مخزن۔ لاہور / دہلی اجرائی: اپریل 1930

زمانہ۔ کانپور اجرائی: فروری 1930

عصمت۔ دہلی/کراچی قاجرائی: جون 1908

الناظر۔ لکھنو اجرائی: 1909

علی گڑھ میگزین اجرائی: 1920

ہمایوں۔ لاہور اجرائی: جنوری 1921

نگار۔ بھوپال/ لکھنو/ کراچی اجرائی: اپریل 1903

نیرنگ خیال۔لاہور/ راولپنڈی اجرائی: جون 1924

ادبی دنیا۔لاہور اجرائی: مئی 1929

ساقی۔دہلی / کراچی اجرائی: جنوری 1930

شاعر۔آگرہ/ ممبئی اجرائی: فروری 1930

ادب لطیف۔لاہور اجرائی: مارچ 1935

ایشائی۔میرٹھ/ممبئی اجرائی: اگست 1935

سب رس۔حیدرآباد دکن اجرائی: جنوری 1938

آج کل۔دہلی اجرائی: نومبر 1942

افکار۔بھوپال/کراچی اجرائی: اپریل 1945

سویرا۔لاہور اجرائی: جنوری 1947

نقوش۔لاہور اجرائی: مارچ 1948

ماہ نو۔کراچی اجرائی: 1948

شاہراہ۔دہلی اجرائی: 1949

تحریک ۔دہلی اجرائی: مارچ 1953

نیا دور۔لکھنو اجرائی: اپریل 1955

سوغات۔بنگلور اجرائی: 1959

فنون۔لاہور اجرائی: 1963

سیپ۔کراچی اجرائی: ستمبر 1964

اوراق۔لاہور اجرائی: جنوری 1966

شب خون۔الہ آباد اجرائی: جون 1966

الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر زیب النساءنے اپنے مضمون میں جن پاکستانی جرائد کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے ان میں آئندہ ، ادبیات، دنیا زاد، آج، اجرائ، اسالیب، الحمرائ، تخلیق، چہارسو، بادبان، سمبل، مکالمہ، روشنائی، سویرا، ارتقائ، ماہ نو، قومی زبان، جریدہ، تسطیر، خیال، نقاط، ادب لطیف، فنون، نیرنگ خیال، نگار، اردو نامہ، بیلاگ، تجدید نو، ادب دوست، معاصر، انشائ، کاغذی پیرہن، سفید چھڑی، الاقربا، عطاءاور اجمال شامل ہیں۔

دکن سے تعلق رکھنے والے میرے کرم فرما جناب اعجاز عبید اردو کی برقی کتابیں کے تحت ایک دنیا بسائے بیٹھے جہاں موجود کتابیں " متن۔ کاپی لیفٹ۔ حوالے کے ساتھ نقل کرنے کی مکمل اجازت ہے۔" کی معصومانہ سی شرط کے ساتھ دستیاب رہتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس شرط کو اکثریت نظر انداز کرجاتی ہے۔ اعجاز عبید نے اپنے مضمون " آن لائن ادبی رسائل و جرائد" میں انٹرنیٹ پر دستیاب ادبی جرائد ، بلاگز اور مختلف ویب اوراق کا جائزہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ مضمون میں آن لائن جرائد کو مختلف زمروں میں نہایت موزوں طریقے سے تقسیم کیا گیا ہے یعنی وہ جرائد جو کلیتا ادبی ہیں، وہ جو رنگا رنگ نوعیت کے ہیں لیکن جن میں

ادب کا گوشہ بھی موجود رہتا ہے، وہ جرائد جو پرنٹ اور انٹرنیٹ دونوں پر موجود ہیں اور وہ جرائد جو محض انٹرنیٹ ہی پر موجود ہیں۔ ان جرائد میں شامل نام یہ ہیں۔ سمت، دیدہ ور، شعر و سخن، کائنات، تخلیق نو، ادب لطیف، جدید ادب، دستاویز، اثبات، اردو کیمپس، کسوٹی جدید، نیا ورق، اسالیب، دستک، تحریر نو، مضراب، الاقربا،، بزم سہارا، گلدستہ، سنگت، اردو دنیا، فکر و تحقیق، وسیلہ، سب رس، سائبان، حیات، اردو امکانات۔

محی الدین قادری نے اپنے اہم مضمون " اردو کے علمی و ادبی رسائل" میں اردو زبان میں شائع ہونے والے جریدوں کی تاریخ بیان کی ہے اور ان رسائل کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے مطابق پہلے دور کا آغاز 1850 میں اخبار

خلائق، خیر خواہ ہند، محب ہند، نور علی نور، تحفۃ الحدائق، تعلیم الخلائق، زبدۃ الاخبار، سراج الاخبار، سید الاخبار، مظہر الاخبار اور اعظم الاخبار سے ہوا تھا۔

دستاویز کے اس شمارے میں برصغیر کے معاصر ادبی رسائل کے مدیران سے انٹرویو بھی لیے گئے ہیں جن میں یکساں نوعیت کے سوالات پوچھے گئے ہیں۔ مدیران میں ماہنامہ شاعر ممبئی کے افتخار امام صدیقی، ماہنامہ آج کل دہلی کے ڈاکٹر ابرار رحمانی، ماہنامہ کتاب نما دہلی کے ڈاکٹر خالد محمود، ایوان اردو دہلی کے انیس اعظمی، سہ ماہی آج کراچی کے اجمل کمال، پرواز و سفیر اردو کے سید معراج جامی، رنگ دھنبا جھارکھنڈ کے مشتاق صدف، کسوٹی جدید کے انور شمیم، عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے ارشد خالد، جدید ادب جرمنی کے حیدر قریشی، اور سہ ماہی اثبات ممبئی کے اشعر نجمی شامل ہیں۔ مختلف مدیروں نے 'کیا کسی ادبی رسالے کا مدیر ہونے کے لیے شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے؟" اور "کیا آپ کو اپنے رسالے کے زیادہ تر نسخے اعزازی طور پر روانہ کرنے پڑتے ہیں" جیسے دلچسپ سوالات کے جوابات بھی دلچسپ اور مختلف النوع دیے ہیں۔

دستاویز کے آخر میں چوبیس صفحات پر مشتمل " اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد کا اشاریہ" مرتب کرکے ایک نہایت اہم کام سرانجام دیا گیا ہے۔ یہ اشاریہ 600 ادبی رسائل و جرائد پر مشتمل ہے۔ اشاریے میں شامل نام رسالہ، مقام اشاعت، وقفہ اشاعت، جاری یا موقوف ، سن اجرائ، مدیر اول اور موجودہ مدیر/آخری مدیر جیسی نایاب معلومات کو یکجا کردیا ہے ۔

دستاویز کے مدیر اعلٰی اپنے اداریے میں کہتے ہیں " ہم نے گزشتہ شمارے میں وعدہ کیا تھا کہ ہماری کوشش ہوگی کہ ہر شمارہ ایک مختلف دستاویز ہو، اپنی مثال آپ ہو، ہم اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں ، یہ فیصلہ اب آپ کے ہاتھونمیں ہے۔"

مدیر محترم کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جہاں

اردو زبان کا مستقبل کچھ غیر یقینی سا ہے، اردو زبان سے محبت اور وابستگی و پابستگی کی تمام منزلیں تو آپ طے کر گئے ہیں، گمان ہے کہ اس دوران شاید آپ اور آپ کے آشفتہ سر رفقاء نے اردو کی محبت میں ' وہ قرض بھی اتار ڈالے ہوں جو واجب بھی نہیں تھے '۔۔۔۔ لیکن اس کے عوض جو 'دام' آپ کو اردو سے محبت کرنے والے قاری کی جانب سے ملیں گے، ان کا کوئی مول ہو گا نہیں۔۔۔۔ فیصلہ تو کب کا ہو چکا، راقم کے یہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ شاید پہلا رد عمل کہلائیں کہ پرچہ کل ہی موصول ہوا ہے، دنیا بھر سے ستائش کا آنا باقی ہے، خلوص نیت پر قبولیت کی مہر ثبت ہوتی ابھی سے نظر آ رہی ہے۔

کتابوں کا اتوار بازار۔6 مئی، 2012

مسکرا دے، قصہ امید کر دے مختصر

گزشتہ ایک پوسٹ میں خاکسار نے "استفادہ حاصل کیا" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اہل دانش اعتراض کریں گے کہ اس میں لفظ 'حاصل' کا بیجا استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں میں اس غلطی پر اعتراف جرم کرتا ہوں، کاتب کے سر بھی یہ وبال نہیں ڈالا جاسکتا کہ مذکورہ روداد کا کاتب بھی خود ہی ہوں۔ اپنی اس غلطی پر حضرت مولانا غلام قادر کا ایک فقرہ یاد آرہا ہے، واقعے کے راوی ہیں مولانا عبدالمجید سالک جنھوں نے ایک مرتبہ مولانا غلام قادر سے نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی شاعری کے بارے میں مولانا کا خیال دریافت کیا، جواب ملا: " خامی میں پختہ ہوگیا ہے۔" اور سالک صاحب اس جامع مانع رائے کو سن کر پھڑک اٹھے۔

خدا نہ کرے کہ اس وضاحت کو پڑھنے والے پھڑک اٹھنے کے بجائے بھڑک اٹھیں!

اتوار بازار کا احوال لکھتے ایک برس بیت چلا ہے، ادھر ایک کرم فرما نے اتوار بازار کی ان رپورٹوں کو کتابی شکل میں شائع کروانے کا مشورہ دیا ہے۔

خاکسار کے زیادہ تر مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور بہتیروں کو لکھ کر اور پال لگا کر ایک طرف ڈال دیا ہے۔ شائع ہو گئے تو ٹھیک بصورت دیگر بقول خامہ بگوش "آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔۔یقینا یہ آپ کا نقصان ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہو گئے۔" (ایک ادیب کے گھر لگنے والی آگ اور اس کے نتیجے میں ان کی مطبوعات کے خاکستر ہو جانے پر رد عمل)

اس مرتبہ کے اتوار بازار میں "حاصل بازار" کتابوں میں سر فہرست ہندوستان کے شاعر جناب کلیم عاجز کی خود نوشت 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" رہی، ایسے کتنے لوگ ہوں گے جن کی زندگیوں میں بیان کرنے لائق رنگا رنگ واقعات ہوں گے اور جو تنہا بیٹھے غم جاناں کا حساب کرتے کرتے شاید ایک دن یہ سوچیں کہ زندگی کے سفر میں وہ بہت دور نکل آئے ہیں اور کیوں نہ ان لوگوں کی جلتی بجھتی یادوں کو صفحہ قرطاس پر یکجا کیا جائے جن کی یادیں آج بھی ان کے ذہن میں بمثل چراغ روشن ہیں۔

بر سبیل تذکرہ، کلیم عاجز کی دوسری خود نوشت "ابھی سن لو مجھ سے" ہے، سٹی پرنٹ، نئی دلی نے اس کتاب کو 1992 میں شائع کیا تھا۔

اس کے علاوہ نقوش کے 1964 میں شائع ہوئے آپ بیتی نمبر (حصہ دوم) کا ملنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔ "محمد نقوش" نے مذکورہ نمبر دو حصوں میں شائع کیا تھا۔ دونوں حصوں کے صفحات کی کل تعداد 1856 کے قریب ہے۔ راقم کو اسی بازار سے ایک برس قبل مذکورہ پرچے کا پہلا حصہ ملا تھا۔

علی الصبح بازار سے کتابوں کی خریداری مکمل کرنے بعد ہم لذت کام و دہن کی آزمائش کی خاطر کراچی صدر کی مشہور صابری نہاری کا قصد کیے چند احباب کی معیت میں نکلا ہی چاہتے تھے کہ ایک کرم فرما نے رستہ روکا اور سرگوشی کے انداز میں کہا "چپکے سے چلے آیئے"

فوری طور پر خیال آیا کہ شاید کسی کتاب کی قیمت ادا ہونے سے رہ گئی ہے اور کتب فروش نے سربازار آواز لگا کر مرکز رسوائی بننے سے بچانے کی خاطر ان کرم فرما کو بھیج دیا ہے کہ مشکیں کس کر لے آیئے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک ایسی جگہ لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں کلیم عاجز کی خودنوشت اور نقوش میز پر دھرے تھے۔

انتہائی مطلوبہ کتابوں کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہائی ویلیو ٹارگٹ

اچانک زد میں آجائے۔

کتابوں کو ہاتھ میں تھام کر اک نگاہ التجانہ بازار کے سب سے گھاگ کتب فروش پر ڈالی:

مسکرادے، قصہ امید کردے مختصر

یا بڑھالے چل ذرا سی بات کو افسانہ کر

اس کا دل پسیجا، قصہ امید مختصر ہوا، دام مناسب کیے . . . بصورت دیگر نوبت عموما" بہ

ایں رسید :

میں وہ شعلہ تھا جسے "دام" سے تو ضرر نہ تھا

پہ جو وسوسے تہ "دام" تھے ،مجھے کھا گئے

کتابیں بغل میں داب، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔

کراچی کی سب سے قدیم نہاری کی دکان کے سامنے بیٹھے ہیروئن کے نشے میں چور چند ہیرونچی اپنے سامنے کھڑے پانچ افراد کو ملتجیانہ نظروں سے اس سے بات سے بے خبر انہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ پانچوں "ادب" کے نشے میں چور ہیں۔

نہاری کھانے کے بعد جب احباب کو دکان کے باہر کھڑے گفتگو کرتے آدھ گھنٹہ گزر چلا، تو سید معراج جامی صاحب نے یک دم سے کہا: "" بھئی اب چلو! اونٹ کروٹ بدل رہا ہے۔""

نہاری اونٹ کے گوشت ہی کی تو تھی!

کتابوں کی تفصیل اس طرح سے ہے:

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی

خودنوشت

کلیم عاجز

عرشی پبلیکیشنز-دہلی

سن اشاعت : 1981

صاحب

شخصی خاکوں کا مجموعہ

محمد طفیل

ناشر: ادارہ فروض اردو لاہور

سن اشاعت: 1964

نقوش-آپ بیتی نمبر
جون 1964
مدیر: محمد طفیل
حصہ دوم-صفحہ-837 تا 1856

اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا
الطاف فاطمہ

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

سن اشاعت: 1961

عکس ناتمام

شخصی خاکوں کا مجموعہ

رحمت روحیلہ (ہر مال بیس روپیہ کی 'لاٹ' سے)

ناشر: امانت اکادمی کراچی

سن اشاعت: 2006

قائد اعظم محمد علی جناب-میری نظر میں
حسن اصفہانی
یاداشتیں (ہر مال بیس روپیہ کی 'لاٹ' سے)
ناشر: روٹا پرنٹ ایجنسی- کراچی
سن اشاعت: 1968

کتابوں کا اتوار بازار۔20 مئی 2012

’کراچی کی رہت اور کراچی کی رت‘

شہر کراچی میں 19 مئی کی رات گرد کا طوفان آیا۔خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں صبح تک یہ کیفیت قائم نہ رہے کہ اتوار بازار میں رکھی کتابیں اور کتب فروش، دونوں ہی پہچانے میں نہ آئیں گے۔ اتفاق دیکھیے کہ اس مرتبہ حضرت رئیس امروہوی کے فن اور شخصیت پر ملنے والی نایاب کتاب میں درج ایک شعر بھی اس صورتحال میں موزوں ہوا:

کراچی کی رہت اور کراچی کی رتُ
بنادے گی انساں کو مٹی کا بتُ

اتوار کی صبح مطلع اور دل، دونوں ہی صاف نکلے۔ اس مرتبہ انجینئرنگ کے زمانے کا ایک ایسا ہم جماعت رفیق سفر تھا جس کو دور دور تک کتابوں سے واسطہ نہ تھا۔ہم نے شعر داغ دیا:

الجھے ہوئے ہیں گردش دوراں میں آج کل

تم یہ نہ سمجھنا کہ تعلق نہیں رہا

لگتا ہے شاعر نے یہ شعر اس وقت کہا تھا جب اس کے میٹرک کے امتحان ہو رہے تھے۔" اپنے دوست کا یہ تبصرہ سن کر بقیہ رستے غیر شاعرانہ گفتگو کرنے ہی میں عافیت جانی۔

! رستہ طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو سمیٹتے کٹ گیا

اس مرتبہ اتوار بازار میں شاعر ناصر زیدی کی درجنوں کتابیں فٹ پاتھ کی زینت بنی نظر آئیں۔ لاہور سے یہ کتابیں کراچی کیسے پہنچیں، ناصر زیدی ہی جانتے ہوں گے۔ تقریبا تمام کتابوں پر ان کے مصنفین کے دستخط موجود تھے جنھوں نے نہایت اپنائیت سے انہیں ہمارے شاعر کو پیش کیا تھا۔ شاعر سے وضاحت کون طلب کرے۔ اس

: صورتحال پر ناصر زیدی کا ہی ایک شعر یاد آتا رہا

تم پر تو اے ہم نفسو! کچھ جبر نہیں، تم تو بولو

ہم تو چپ سادھے بیٹھے ہیں اور زباں پر تالے ہیں

! ہم نفسوں کی زبان پر تالے ضرور ہوں، قلم تو آزاد ہے

لیکن ناصر زیدی کتابوں کے کراچی پہنچنے کے معاملے میں اکیلے نہیں ہیں، لگتا ہے کہ لاہور سے پہنچنے والی کھیپ کے پیچھے کتب فروشوں کا کوئی طاقتور مافیا

کارفرما ہے یا پھر ان کتابوں کے مالکان نے کوئی اور مصروفیت تلاش کرلی ہے۔ مدیر نقوش محمد طفیل بلکہ بقول شخصے 'محمد نقوش' کے صاحبزادے جاوید طفیل کا نام بھی لیا جائے گا کہ جگن ناتھ آزاد نے نہایت محبت و خلوص کے ساتھ ان کو جو کتاب تحفے میں پیش کی تھی، وہ بھی چپ چاپ ایک کونے میں نوحہ کناں نظر آئی۔ یہ تھی تلوک چند محروم لٹریری سوسائٹی دہلی سے شائع ہوئی "جگن ناتھ آزاد۔ فکر و فن"۔ اندورنی صفحے پر جناب آزاد نے اپنا دل کھول کر جاوید طفیل کے سامنے رکھ دیا۔ 17 مئی 1999 کو لکھے اس نوٹ میں آزاد کہتے ہیں:

"قرآن نمبر کی جلد اول اور دوم موصول ہو چکی ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، اس گراں قدر تحفے کی شکریے کے ساتھ اطلاع دے چکا ہوں۔

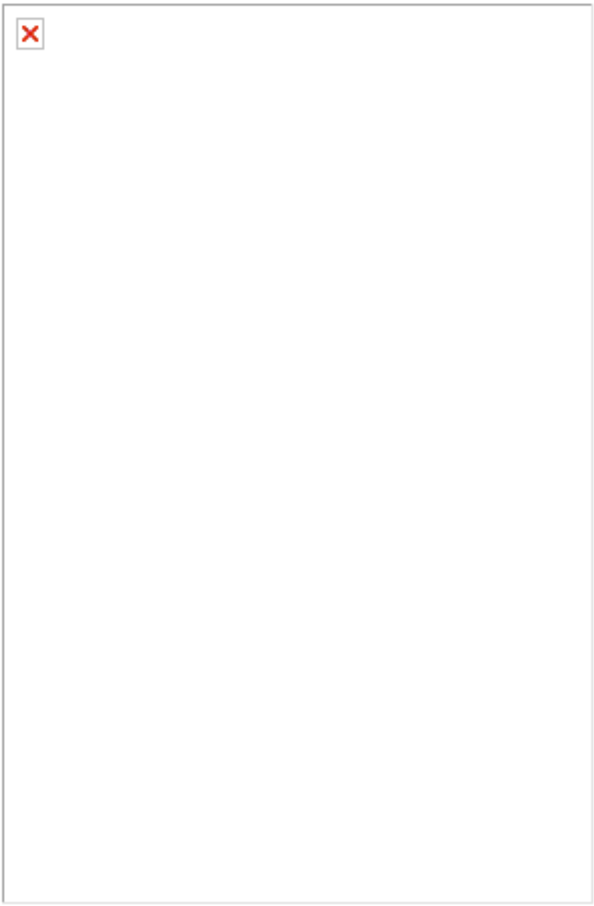

عمر اسی سے تجاوز کرچکی ہے، ہر بات اب یاد بھی نہیں رہتی۔اب تو صرف یہ آرزو ہے کہ زندگی میں ایک بار اور عیسیٰ خیل، میانوالی ،ملتان اور لاہور کو دیکھ لوں "پیار کے ساتھجگن ناتھ آزاد جاوید طفیل نے آزاد کے پیارکے جواب میں "جگن ناتھ آزادفکر وفن" کو آزاد کردیا۔

جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

رام لعل کے افسانوں کا مجموعہ ' ہر مال بیس روپیہ' کے ڈھیر میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ کسی نجات دہندہ کی تلاش میںجو اسے زمین پر پڑے ہے تو قبری کے اس انبار سے نکال کر اپنے کتب خانے کی زینت بنا سکے۔کتاب پر ' فخر الدین میموریل کمیٹی،اتر پردیش، لکھنو ٔ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی' کے جادوئی الفاظ کندہ تھے۔ہم اپنے یہاں اس قسم کے اداروں کی موجودگی کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ۱۱ فروری 1977 کو انتقال کرجانے والے ہندوستانی صدر فخر الدین علی احمد نجی زندگی میں ایک سادہ انسان تھے۔ ہندوستانی صدور حلیے ہی سے نہیں، ہمارے والوں کے مقابلے میں شکل و صورت سے بھی مسکین نظر آتے ہیں۔ جناب رضا علی عابدی کو جرنیلی سڑک پر بس کے سفر کے دوران ایک درزی ملا تھا جو صدر جمہوریہ کی شیروانی کا ناپ لینے جارہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ان کا

خاندانی درزی ہے۔ دوسری جانب آج کے اخبارات میں ہمارے ملک کی اعلی شخصیت کے اہل خانہ کا ذکر خیر ہے جنھوں نے گزشتہ کل لندن کے مشہور زمانہ اسٹور " ہیروڈز " سے خریداری کی۔ حال ہی میں صاحب کے اثاثوں کی تفصیل جاری کی گئی ہے جس کے مطابق ان کے پاس ذاتی کار تک نہیں۔ صاحب کے لیے تین سوٹ خریدے گئے جن کی قیمت ۴۵ ہزار پونڈز ادا کی گئی، پاکستانی روپوں میں یہ 80 لاکھ بنتے ہیں۔ اسٹور کے ملازمین انہیں کسی شاہی خاندان کے فرد سمجھے تھے۔ آج (25 مئی) کو علی الصبح ایک ٹی وی چینل پر ایک رفاہی و خیراتی ادارے پر ایک پروگرام دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں لوگوں کو مفت میں کھانا کھلایا جاتا ہے، کراچی کا ایک مشہور نام۔۔ لوگوں کا جم غفیر تھا۔۔ لمبی قطار میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ایک عورت پروگرام کی خاتون میزبان کو اپنا حال بتاتے بتاتے بری طرح رو پڑی، اس کے آنسو تیزی سے بہہ کر نقاب میں جذب ہوتے جاتے تھے۔۔ فرط جذبات سے مغلوب وہ بار بار خاتون کو 'سر جی' کہہ کر پکار رہی تھی۔۔۔ اسے تو اپنی بات بھی کہنی نہیں آتی تھی، ایک ہم ہیں کہ صبح سے شام لفظوں کے جال بنتے ہیں، غلط کو صحیح ثابت کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ صبح سات بجے سے شام پانچ بجے کی محنت کے بعد اس عورت کو ڈھائی ہزار روپے ملتے ہیں۔ دل کچھ ایسا خراب ہوا کہ ہاتھ سے لقمہ ایک جانب رکھ دیا۔

تم ہو یا میں یہاں بفضل خدا

سب شہیدوں کی صف میں شامل ہیں
سب یزیدوں کی صف میں شامل ہیں
دفتر کی ایر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھ کر کراچی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے روزانہ بسوں میں جانوروں کی طرح ٹھنسے ہوئے لوگوں پر نظر پڑتی ہے، یہ منظر دیکھتے اب تو سات برس ہو چلے ہیں، ایک ساتھی ہیں جو ساتھ والی نشست پر بیٹھتے ہیں، ان کی اور میری رفاقت طویل ہے۔مذہبی ہیں،ایک دن بسوں کی چھتوں پر لوگوں کو بیٹھا دیکھ کر کہنے لگے : کیا سمجھتے ہیں آپ ، یہ لوگ جو بسوں کی چھتوں پر سفر کرتے ہیں ، روز قیامت بھی اسی طرح نظر آئیں گے ؟ میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔وہ گویا ہوئے: بھائی یہ اللہ کے مقرب بندوں کی صف میں ہوں گے کہ اپنے حصے کا دکھ تو یہ دنیا ہی میں جھیل چکے، آپ اور ہم سے سوال ضرور ہوگا۔میں نے گھبرا کر پوچھا: تو کیا کیا جائے حضرت ؟ ۔۔جواب ملا: مستحق آپ کے پاس چل کر نہیں آئے گا، اسے ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔ ان کی اس بات سے ذہن دو برس پیچھے چلا گیا۔گلشن اقبال کراچی کی ایک مشہور دکان ہے،۔بروسٹ بناتے اور بیچتے پندرہ سال تو ہوگئے ہوں گے۔گاہکوں کے لیے فٹ پاتھ پر کرسیاں لگی رہتی ہیں۔ایک روز چند احباب کے ہمراہ ہم وہاں بیٹھے تھے۔شام کا وقت تھا تمام دن کی کڑی محنت کے بعد گھر لوٹتے بسوں کی چھتوں ،

پر بیٹھے مزدور یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے۔ایک بس ہمارے سامنے آ کر رکی۔ مزدور جس طرح ہماری پلیٹوں کی جانب دیکھ رہے تھے، ان نظروں کو آج تک فراموش نہ کرسکا ہوں، اسی وقت ایک فیصلہ یہ کیا کہ آئندہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کبھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔

ایک کثیر الاشاعت اخبار میں عبدالقادر حسن کالم لکھتے تھے، اب تو خیر سے ان کی بھی ترقی ہو گئی ہے کہ ایک دوسرے اخبار سے وابستہ ہوگئے ہیں اور اکثر اسی اخبار کے ٹی وی چینل پر بھی بیٹھے نظر آتے ہیں۔ قادر صاحب نے اپنے ایک بیس برس پرانے کالم میں آسائشوں کی عادت کی بارے میں لکھا تھا کہ کس سرعت سے انسان ان کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ لاہور میں مال روڈ پر پیدل جارہے تھے کہ ساتھ ہی ایک نئے ماڈل کی مرسڈیز آ کر رکی، اس میں ان کا کالج کے زمانے کا ایک دوست بیٹھا تھا جو ترقی کرکے ایک معروف صنعتکار بن چکا تھا، اس نے انہیں ساتھ بٹھا لیا۔ عبدالقادر حسن نے لکھا کہ صرف بیس منٹ کے سفر کے بعد مجھ میں یہ تبدیلی آئی کہ فٹ پاتھ پر پیدل چلتے لوگ مجھے کیڑے مکوڑوں کی طرح حقیر لگنے لگے۔

لیکن ان سب باتوں کا، روز مرہ زندگی میں نظر آنے والے ایسے دلخراش مناظر کا جہاں انسان کی مجبوری ایک گالی بن کر رہ جائے، دیکھنے والوں پر اثر کتنا

: دیرپا ہوتا ہے ؟ بقول جناب ابن صفی

بلاآخر تھک ہار کے یارو ہم نے یہ تسلیم کیا

اپنی ذات سے عشق ہے سچا، باقی سب افسانے ہیں

معاف کیجیے گا! آج اتوار بازار کے باب میں آپ کو خوب بور کیا۔

:کتابوں کی تفصیل اس طرح سے ہے

آہنگ بازگشت

خودنوشت

مصنف: مولوی محمد سعید

ناشر: کمانڈو پرنٹر لاہور

سن اشاعت: 1979

صفحات: 501

دود چراغ محفل
خودنوشت
مصنف: زاہد حسین
ناشر: سٹی بک پریس، کراچی
سن اشاعت: 2000
صفحات: 145

جگن ناتھ آزاد۔ فکر و فن

مرتبہ: محمد منظور عالم

ناشر: محروم میموریل لٹریری سوسائٹی۔ نئی دہلی

سن اشاعت: 1999

صفحات: 626

اکھڑے ہوئے لوگ
افسانوں کا مجموعہ
مصنف: رام لعل
ناشر: ادارہ فکر جدید-نئی دہلی
سن اشاعت: 1986

صفحات: 360

سرجیکل وارڈ
نامور شعرا کے شخصی خاکے
تحریر: ضیاءساجد
ناشر: مکتبہ القریش لاہور
سن اشاعت: 1994
صفحات: 312

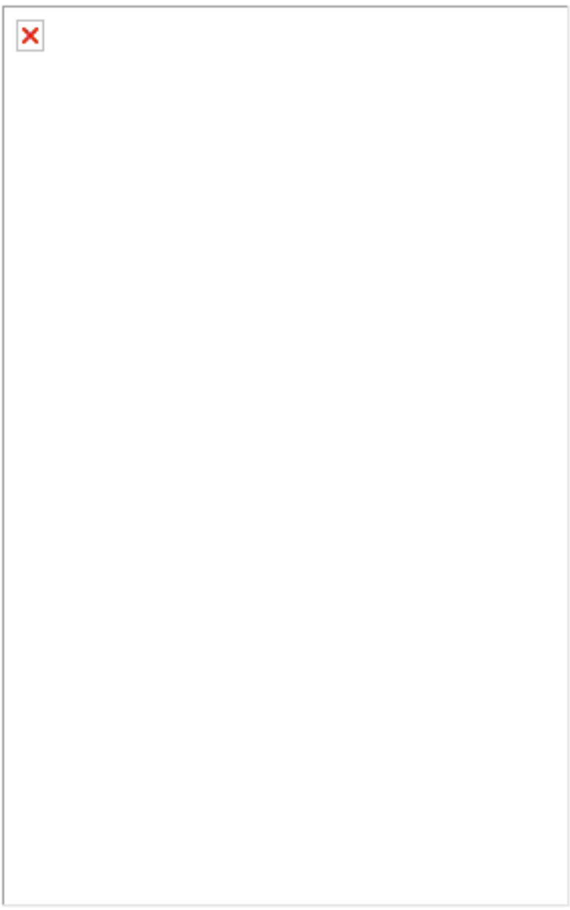

رئیس امروہوی-فن اور شخصیت
مرتبہ: صبا لکھنوی
ناشر: رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ کراچی
سن اشاعت: 1990
صفحات: 452

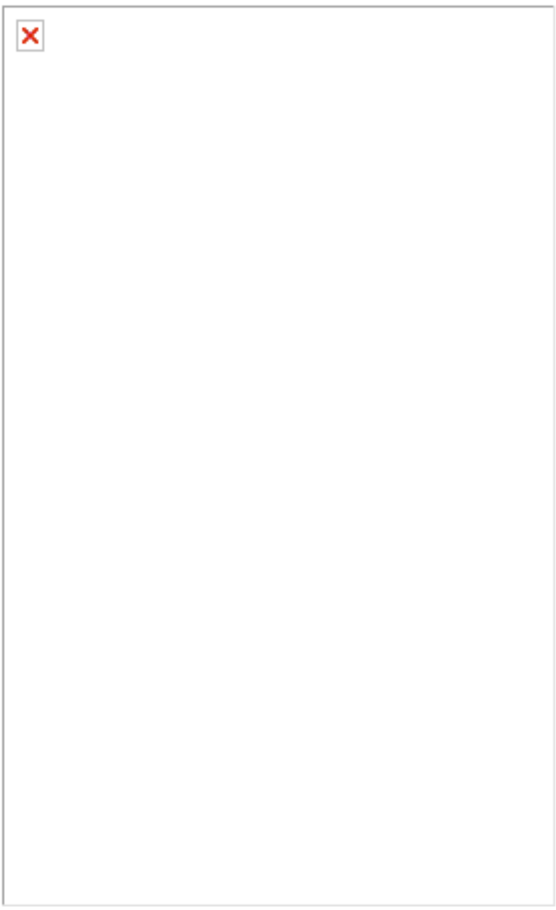

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے ؟

گزشتہ بازار کے احوال کے جواب میں احباب کے تبصرے موصول ہوئے اور ادھر میں حیران ہوا کہ جس تحریر کو لکھنے کے دوران بار بار آنکھیں صاف کرنا پڑی تھیں، کیا اسے پڑھا بھی اسی کیفیت میں گیا ہے ؟۔۔ علی گڑھ سے میرے کرم فرما جناب پروفیسر اطہر صدیقی کا جواب یہ تھا:

"دنیا میں اس قدر غربت ہے کہ آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے، حتی المقدور جو ہو سکتا ہے وہ کرکے اپنے ضمیر کو چادر سے ڈھانک لینا چاہیے ورنہ زندہ رہنا مشکل ہے۔"

ادب سرائے کے منتظم جناب ناصر علی سید نے ایک نجی پیغام میں لکھا:

ka to pata nahi be maza zazoor howa k dhundlaee hovee aankhoun se parh raha tha aur AAP NE kahani KHATM KAR DI....chalo achcha howa k tumhi RUKK gaey dastaN kehte kehte.......warna ashkoun k jal thal main aur

kahaN parha jata......salamat raho jeete raho.nasir

خیر کتابوں کو فٹ پاتھ پر دیکھنے کی تو اب عادت سی ہو گئی ہے، کل کا تجربہ بھی کچھ مختلف نہ رہا۔۔۔ لیکن وطن عزیز میں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی غربت نے کیا کیا منظر دکھلانے شروع کر دیے ہیں، اس بارے میں یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ وقت اتنی سرعت سے آ جائے گا۔

: سوچتا ہوں کہ چند باتیں مزید اسی تعلق سے کرتا چلوں

گزشتہ اتوار بازار کی روداد میں دفتر کے ایک ساتھی کا ذکر بھی آیا تھا، یہ صاحب ایک روز مجھے فون کر کے کہا کہ چلے آیئے، گاڑی لیتے آیئے، ایک جگہ جانا ہے۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ صاحب دو بڑے تھیلے گھسیٹتے ہوئے چلے آ رہے ہیں، انہیں گاڑی میں رکھا اور کراچی میں بہادر آباد کے علاقے میں واقع "عالمگیر ویلفئیر ٹرسٹ" پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ان تھیلوں میں ہمارے صاحب کی شادی کے کپڑے تھے، دس سال سے جی جان سے لگا رکھا تھا اور اب خیال آیا کہ انہیں کسی مستحق تک پہنچا دیا جائے۔ میں ٹرسٹ والوں سے پوچھ بیٹھا کہ ان کا کیا کیا جائے گا؟ جواب میں انہوں نے کراچی کی ایک مضافاتی بستی کا نام لیا کہ رواں ہفتے ہی دو بچیوں کی شادی میں یہ تمام قیمتی ملبوسات وہاں استعمال ہو جائیں گے۔ ہمارے دوست کا کہنا تھا کہ ہمیں ایسے اداروں کو مضبوط کرنا چاہیے جو اس

نوعیت کے کام کرتے ہیں اور شہر کراچی میں عالمگیر ٹرسٹ کے علاوہ سیلانی ویلفیر ٹرسٹ بھی ایک ایسا ہی ادارہ ہے۔ مولانا ایدھی کا ایدھی ٹرسٹ تو بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔

سیلانی ویلفیئر ٹرسٹ کے مالک اپنی تشہیر پسند نہیں کرتے۔ 1999 میں فٹ پاتھ سے آغاز کرنے والے آج سال کے کروڑوں روپے مستحقین میں بانٹ رہے ہیں، فٹ پاتھ پر کھانا کھلانے کا سلسلہ اب اس قدر مقبول ہوگیا ہے کہ بعض اوقات لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ وہاں جانا ہوا تھا، دیکھا کہ دوپہر کے کھانے کے لیے رنگ و روغن کرنے والے کاریگروں، کوڑا کرکٹ چننے والے افغان بچوں کے ساتھ ہی ایک سفید پوش بزرگ بھی وہاں بیٹھے ہیں جو آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

ایدھی ٹرسٹ نے اپنا گھر کے نام سے بے سہارا بزرگ لوگوں کو چھت فراہم کرنے کا سلسلہ عرصہ دراز سے شروع کر رکھا ہے۔ اکثر ٹی وی چینل والے وہاں جانکلتے ہیں اور دیکھنے والے ان بزرگوں کی روداد سنتے ہیں جنہیں ان کی اولاد نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔

یادش بخیر، ایک مرتبہ ایدھی کے مردہ خانے جانے کا اتفاق ہوا، جن صاحب کے

ساتھ گیا تھا ان کے بھائی کی میت کو سرد خانے میں منتقل کرنے کے لیے نگراں کارنے ہم ہی سے درخواست کی۔ بڑے بھائی کے جسم پر کپکپی طاری دیکھ کر میں اندر چلا گیا۔ اندر کا منظر کیسا ہو سکتا تھا، اس کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

واپسی پر ایک سوال ذہن میں تھا۔ دو کروڑ کے شہر میں بلا معاوضہ خدمات فراہم کرنے والا ایک وسیع مردہ خانہ بھی ہونا چاہیے، اس کا خیال سب سے پہلے صرف مولانا ایدھی ہی کو کیوں آیا؟ لوگ انہی پر ہی بھروسہ کیوں کرتے ہیں؟

اتوار بازار کے گزشتہ مضمون کے جواب میں جو مکتوبات موصول ہوئے ان میں سے دو کرم فرماؤں جناب اطہر صدیقی صاحب اور جناب ظہیر الدین دانش صاحب کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ پاک و ہند کے مسائل اب ایک ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دونوں ملکوں میں غربت کی صورتحال کا موازنہ کرتے ہوئے کہا جاتا تھا کہ جیسا بھی ہو پاکستان میں رات کو کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ اب یہ صورتحال بدل چکی ہے۔ ایک تازہ اطلاع کے مطابق اٹھارہ کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں اب یہاں سات کروڑ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گزشتہ چار برسوں میں غربت کی شرح میں آٹھ فیصد کے تناسب سے اضافہ ہوا ہے۔

تین برس قبل ہونے والی قیامت خیز بارشوں کے بعد آنے والی تباہی میں میڈیا پر دکھایا گیا ایک منظر ذہن میں نقش ہوگیا تھا۔ مظفر آباد اور خیر پور میں حکومت نے مفت آٹے کی فراہمی کا اعلان کیا تھا، دونوں شہروں سے اس تقسیم کے دوران چار چار لاشیں اٹھی تھیں، یہ تمام لوگ اس دوران کچل کر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مظفر آباد کا ایک بوڑھا شخص بھی ان میں شامل تھا۔دوسری جانب یہ حال ہے کہ بینکوں سے قرضہ حاصل کرنے والا "قرض خور" مافیا قرضے کا فارم حاصل کرنے سے پہلے، قرضہ معاف کرانے کا فارم حاصل کرتا ہے!

میں اکثر سوچتا ہوں کہ یوٹیلٹی اسٹورز پر سستے آٹے کے حصول کی خاطر لمبی قطاروں میں کھڑے جن لوگوں کے ہاتھوں میں آخری سو کا نوٹ ہے، جس روز یہ نوٹ بھی نہ رہا تو وہ ان قطاروں سے نکل کر آپ اور ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس بھوکے شخص کو اور کچھ یاد ہو یا نہ ہو، انقلاب فرانس میں بادشاہ لوئی 16 اور عوام کو روٹی نہ ملنے پر کیک کھانے کا مشورہ دینے والی ان کی ملکہ انقلاب، روس میں زار روس نکولس دوم اور رومانیہ کے چاؤ شسکو خوب یاد ہیں!

اس مرتبہ اتوار بازار سے ملنے والی دو عدد کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

کچھ یادیں کچھ باتیں

شوکت تھانوی

ناشر: ادارہ فروغ اردو، لاہور

سن اشاعت: 1964

بازار کی قیمت: 50 روپے

نایاب ہیں ہم

مصنف: آوارہ سلطان پوری

بمبئی کے ادباءو شعرا کی یاداشتوں اور تذکروں سے مزین

ناشر: اردو قبیلہ

سن اشاعت: 1997

"نایاب ہیں ہم" پر ہندستانی شاعر افضل منگلوری کے دستخط ہیں، یہ دلچسپ و نایاب کتاب انہوں نے کراچی کے شاعر "عارف شفیق" کو تحفے میں پیش کی تھی۔

ادبی دنیا نامی جریدہ عارف شفیق اور افضل منگلوری نکالا کرتے تھے، غالبا اب افضل صاحب اس سے علاحدہ ہوگئے ہیں۔

آوارہ سلطان پوری کا انتقال بمبئی میں 1992 میں ہوا۔
آوارہ صاحب کا ایک شعر دیکھیے:

جو سمندر میں بانس ڈالے گا
اپنی پگڑی وہی اچھالے گا

آوارہ صاحب، دوسری جنگ عظیم سے قبل 18 برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ برما کے محاذ پر بندوق اور قلم ساتھ ساتھ چلاتے رہے۔ 1946 میں قلم، بندوق پر حاوی آگیا لہٰذا فوج کو خیر باد کہا اور 1950 میں بمبئی آ گئے۔ بمبئی کے مضافاتی ممبرا میں سکونت اختیار کی (وہیں آسودہ خاک ہیں)۔ گردش حالات نے مکان سے جھونپڑے میں رہنے پر مجبور کیا، اہلیہ کے انتقال کے بعد حالات بہتر ہو گئے اور اسی جھونپڑے کی جگہ ایک شاندار عمارت کے مالک بنے۔

ان کے ایک رفیق تھے، مولانا شمیم گونڈوی، ممبرا مسجد کے پیش امام تھے، وہی ان کے ممبرا میں آباد ہونے کا سبب بنے تھے۔ اسٹیشن کے بالکل سامنے تین ہوٹل، بنیے کی ایک دکان، کیلے والے اور دس گھر کی بستی جس میں ایک بھوت بنگلہ بھی شامل تھا، یہی تھی اس زمانے میں ممبرا کی کل کائنات۔ دیکھا تو جگہ پسند آ گئی۔ پیچھے پہاڑی اور سامنے ریلوے لائن اور سمندر کی کھاڑی یعنی مرنے کی تمام آسانیاں موجود۔ آوارہ صاحب کی بیگم دیہاتن تھیں، یہ ماحول دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ صاف مٹی، کھلی ہوا اور دھوپ۔ بقول آوارہ صاحب، بمبئی والوں کو یہی تین چیزیں نصیب نہیں ہوتیں۔ اسٹیشن کے سامنے ہوٹل والے باوا کی ایک آنے کی

اسپیشل چائے، دو آنے کی بالائی اور پایا، یہی تین چیزیں مشہور تھیں۔ ہوٹل والے باوا ماں، بیوی اور گود کی بچی کو چھوڑ کر نوجوانی میں ٹاٹا نگر سے بھاگے تھے اور بھٹکتے ہوئے خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر دھونی رما کر بارہ برس تک بیٹھے رہے۔ ممبرا آئے تو کالے کپڑے، بڑی بڑی جٹا اور ہاتھ میں کمنڈل تھا۔ اب وہ اس علاقے کے مشہور آدمی تھے۔

باواکے ہوٹل کے ساتھ شکیل بھائی کی پان کی دکان تھی۔ آوارہ صاحب کو دیکھ کر کہنے لگے: آپ کا نام وصی احمد ہے۔؟

آوارہ صاحب حیران ہوئے کہ ان کا اصلی نام تو کوئی نہیں جانتا۔

استفسار پر شکیل بھائی بولے؛ آپ 1947 میں جبل پور میں ملٹری ٹریننگ سینٹر میں حوالدار تھے نا؟

!معلوم ہوا کہ وہ بھی فوج کی روٹی کھائے ہوئے ہیں

آوارہ سلطان پوری کہتے ہیں کہ اس وقت ممبرا میں ایک آنے کا عمدہ چیکو ملتا تھا اور کیلا تھا دو آنہ درجن۔ کلیان سے وی ٹی تک مہینے بھر کا پاس سات روپے میں بنتا تھا۔ کھاڑی سے ریت نکلتی تھی اور پہاڑ سے پتھر کے ٹکڑے۔ اس زمانے میں ممبرا کا یہی کاروبار تھا۔

:آوارہ سلطان پوری کتاب میں شامل انٹرویو میں کہتے ہیں

میری زندگی تلخ و شیریں تمام لذتوں سے راقف ہے۔ کبھی سات پیسہ گز بکنے والی " جاپانی ڈوریا کے لیے ترسا ہوں تو کبھی اطالین کمبل درجنوں کے حساب سے بانٹے ہیں۔ زندگی کی بیشتر راتیں ہوادار کمروں میں بسر کی ہیں تو کبھی چٹ گاؤں کے جنگی مورچوں کے سڑے ہوئے پانی میں چھ چھ گھنٹے بیٹھا رہا ہوں۔ فوجی زندگی ہی کا بیشتر حصہ آفس میں بجلی کے پنکھے کے نیچے قلم چلاتے ہوئے گزارا ہے تو کچھ حصہ اراکان.برما کی پہاڑیوں میں.برین گن کی گولیوں کو چلاتے ہۓ بیتا ہے۔ کبھی دو پیسے کی چائے کی پڑیا خریدنے کی استطاعت نہیں تھی تو کبھی ہزاروں روپیہ بغیر مانگے ہوئے ضرورت مندوں کو دوسروں کے ذریعے پہنچا دیے۔ اب اپنے گھر کے قالین پر بیٹھا زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ خوشی یا سکون صرف دوسروں کو خوش کرکے ہی نصیب ہوتا ہے۔ اس سلسلے
:میں میرا یہ شعر سن لیجیے

دوستو! غم بھی کھاتی ہے دنیا

" تلخ ہے بے مزہ تو نہیں ہے۔۔۔۔

آپ نے جوش کی یادوں کی.برات میں ان کے زمانے کی چند عجیب ہستیوں کا احوال

پڑھا ہوگا۔ آوارہ سلطان پوری کی کتاب "نایاب ہیں ہم" اس قسم کے تذکروں سے پر ہے۔

:مائل دہلوی کے احوال میں آوارہ سلطان پوری بیان کرتے ہیں

فاطمہ بلڈنگ میں میرا چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ چار پانچ کاریگر کام کرتے تھے۔ ایک دن مظفر شاہجہان پوری ایک بزرگ ساتھ لائے اور فرمایا: لو بھئی! استاد سے ملو۔ میں سمجھا مظفر صاحب تفریح کے موڈ میں ہیں۔ عزت سے سلام کرکے بٹھایا۔ چائے والے کو آواز دی اور استاد سے مخاطب ہوا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، ٹخنے سے ایک بالشت اونچی ماندہ کی معمولی لنگی، معمولی کپڑے کا مٹ میلا کرتہ، ہاتھ میں المونیم کا دو ڈبے والا ٹفن، داڑھی بڑھی ہوئی اور داڑھی کے بالوں میں روئی کے ریشے اٹکے ہوئے۔ مظفر شاہجہان پوری نے کہا کہ استاد جنسیاتی شاعری کے استاد ہیں۔ چائے پی کر استاد کہنے لگے: میں مل میں کام کرتا ہوں، وہاں مجھے سیٹھ استعمال کرتا ہے، گھر میں بیوی اور "باہر دوستوں کی حاجت رفع کرتا ہوں۔

اوپر لکھی ہوئی ہیت کا یہ آدمی اگر چار سو تیرہ روپیہ پچاس پیسہ تنخواہ پاتا ہے تو پچاس پیسہ سمیت پوری تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ مائل دہلوی، رفیع احمد خاں اور عریاں حیدرآبادی کے رنگ کی شاعری کرتے ہیں۔

کمہار واڑہ میں ایک تھے بھیاجی جو ڈائیاں بنانے کے کام میں ماہر تھے۔ گرم اور ٹھنڈے سبھی طرح کے کام میں ایکسپرٹ تھے۔ وہ تھے لکھنوکے، ان کے آباء توپیں بنانے میں ماہر تھے۔ بھیاجی نے ایک واقعہ سنایا:

اگلے وقتوں میں کوئی بڑے مہاجن تھے، راجہ اور مہاراجاؤں کو قرض دیتے تھے۔ وہ اتفاق سے بیمار پڑ گئے۔ خبر ملتے ہی روساء آنے لگے۔ مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ کھایا پیا، واپس گئے۔ ڈاکٹروں، حکیموں کی بن آئی۔ نذرانے، دوا کے کام، تیمارداری کے اخراجات۔ شفا ہوئی تو غسل صحت کا جشن اور اس جشن میں راجہ، نواب اور روسائے شہر کی مہمانداری۔ پھر مبارکباد کے ساتھ ساتھ رخصتی کے تحائف۔ جب فرصت ہوئی تو ساہوکار نے لڑکے کو بلایا اور حساب پوچھا۔ لڑکے نے حساب کرکے بتایا کہ پچیس ہزار خرچ ہوئے ہیں۔ بڈھے نے سر پیٹ لیا اور بیٹے سے کہا:

آخر مجھے بچا کر تمہیں کیا لابھ ہوا؟ پچیس ہزار خرچ ہو گئے اور ابھی مرنے کا مرنا باقی "

"

عرض و سماع۔ایک فراموش کردہ داستان حیات

چند روز ہوئے امریکہ میں مقیم بزرگ ادیب اور میرے کرم فرما جناب ابو الحسن نغمی نے فون پر مجھ سے کہا: "کچھ کتابیں کم نصیب ہوتی ہیں، ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور وہ وقت کی دھول میں کہیں گم ہو جاتی ہیں، میرے دوست مظفر حسین کی خودنوشت 'عرض و سماع' بھی ایسی ہی ایک کتاب ہے۔ لیکن یہ آپ کو کہاں سے مل گئی؟"

نغمی صاحب کے اس سوال کا جواب ذرا طویل ہے۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ مذکورہ کتاب کی نقل مجھے میرے ایک کرم فرما نے فراہم کی۔ان تک بھی یہ محض ایک اتفاق کی بنا پر پہنچی اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔ خودنوشتوں سے راقم کی دلچسپی سے وہ بخوبی واقف ہیں سو سب سے پہلے انہیں خاکسار ہی کا خیال آیا۔ کراچی میں انجمن کے دفتر سے 500 کی معقول تعداد میں جون 1990 میں شائع ہوئی، کل 384 صفحات پر مشتمل ایک منفرد عنوان کی حامل یہ خودنوشت ریڈیو کے ادارے سے وابستہ رہے دونوں پیروں سے معذور ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اتنا تو غیر معروف نہ تھا کہ اس کی دلچسپ داستان حیات شہر کراچی کے اس

نابغہ روزگار شخص کے پاس بھی نہ پہنچی ہو جسے خودنوشتوں سے از حد لگاؤ تھا اور جو شہر میں خودنوشتوں کے سب سے بڑے ذخیرے کا مالک تھا۔ یہ ذکر مشفق خواجہ مرحوم کا ہے۔ اسی طرح شہر کی چند معروف لائبریروں میں بھی اس کتاب کی کوئی جلد موجود نہیں ہے۔ اردو خونوشتوں پر کیے گئے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے بیشتر مقالوں میں اس کا نام کہیں نہیں آیا، آپ بیتیوں پر لکھے گئے تحقیقی مقالے بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ سید مظفر حسین نے بچوں کے لیے تین ناول بھی لکھے تھے، کامران اور بھارتی جاسوس، کامران اور شاہی خنجر اور کامران اور شاہی خزانہ نامی تینوں مشہور ناول، فیروز سنز لاہور نے شائع کیے تھے۔ اس کے علاوہ تراجم میں ربیکا اور حکایات از شیکسپیئر شامل ہیں۔

عرض و سماع برصغیر پاک و ہند کے ایک سابق ریڈیو اور ٹی وی نیوز ریڈر و براڈکاسٹر کی سرگزشت ہے جو 1942 سے 1982 تک کے ان اہم حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے جن کے چشم دید گواہ نے 19 ستمبر 1943 کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے باقاعدہ ملازمت کا آغاز کیا۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ عرض و سماع، نصف صدی کے آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان اور لاہور ٹی وی کے پروڈیوسروں، ڈرامہ نگاروں و فنکاروں، شاعروں، ادیبوں اور دیگر مشاہیر ادب کی باتوں سے لبریز ہے۔ یہ خودنوشت کسی صورت ریڈیو کے ذوالفقار علی بخاری کی داستان حیات 'سرگزشت' سے کم نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں چھوٹے بخاری کا ذکر کچھ اچھے الفاظ میں نہیں ملتا۔ مصنف نے ان کو جس حال میں دیکھا، من و عن بیان کردیا، یوں کہا جائے کہ عرض و سماع میں وہ 'غلط بخاری' ہی کے طور پر سامنے آتے ہیں، بیجا نہ ہوگا۔

سید مظفر حسین کا تعلق دو شہروں سے تھا، یعنی شملہ اور دہلی۔ مشہور زمانہ الیزیم ہوٹل ان کے دادا کی ملکیت تھا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس کے عین سامنے واقع کوٹھی میں قائم ریڈیو کے اسٹوڈیو کے لان کے ایک پرانے کنوئیں میں ذوالفقار علی بخاری گر پڑے تھے اور قریب قریب جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، بعد ازاں کنٹرولر فیلڈن نے انہیں بحالی صحت کے لیے چھ ماہ کے لیے آسٹریلیا بھجوا دیا تھا۔ زیڈ اے بخاری نے اس واقعے کا ذکر سرگزشت میں کیا ہے۔ مظفر

حسین کو اوائل عمری ہی سے ریڈیو اناونسر بننے کا شوق تھا۔ کم عمری میں انہوں نے اپنے
گھر میں ایک اسٹوڈیو بھی بنایا تھا۔ ریڈیو کی ملازمت کیا ملی، مظفر حسین کو اپنے خوابوں
کی تعبیر مل گئی، وہ شملہ سے دلی آ گئے۔ یہاں سحاب قزلباش سے ان کی دوستی ہو گئی۔
مظفر حسین بیان کرتے ہیں کہ 1934 میں ڈاکٹر گوئبلز کی نگرانی میں جرمن پروپیگنڈا
اس قدر کامیاب تھا کہ ہندوستان کے لوگوں نے آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی پر یقین
کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مظفر حسین رات کو ڈیڑھ بجے ریڈیو سے واپس آتے تو ان کے دادا
سید الطاف حسین ان اس روز کی تازہ خبریں معلوم کرتے اور جب وہ بتا چکتے تو کہتے: "
جھوٹ !سب جھوٹ ! تم روز جھوٹ بولتے ہو۔" ۔۔ مظفر حسین لکھتے ہیں: " برلن کے
علاوہ روم ریڈیو سے سردار اجیت سنگھ انگریزوں اور خاص طور پر سکھ راجاؤں،

مہاراجاؤں کو اردو میں وہ مغلظات سناتے تھے کہ ایسی بے ہودہ اور غلیظ گالیاں شاید ہی
دنیاکے کسی اور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی ہوں۔ یہ سردار اجیت سنگھ اس سردار بھگت
سنگھ کے چچا تھے جس کو انگریزوں نے باغیانہ سرگرمیوں کے الزام میں موت کی سزا
دے دی تھی۔ دشمن کی ان نشریات کو مانیٹر کرنے کے بعد وزارت نشریات کو بھیجا جاتا
تھا جہاں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے کہ انگریز اردو کی تمام
نشریات اور خاص طور پر سردار اجیت سنگھ کی گالیوں کو صحیح طور پر سمجھ

"کر ان کی روح تک پہنچ سکیں۔

عرض و سماع مزے دار واقعات سے بھرپور ہے۔ ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ کتاب کے آغاز میں مظفر حسین نے بیان کیا ہے۔ ریڈیو سے دنیا کی کئی زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ایک روز ڈائرکٹر جنرل پطرس بخاری نے ایرانی یونٹ کے انچارج حکیم اور بیگم حکیم کو اپنے آفس میں بلوالیا اور معطل کر دیا۔ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہوا۔ دونوں میاں بیوی کا رنگ اڑ گیا۔چوتھے روز دونوں بحال کیے گئے اور ان کے ساتھیوں کو اصل بات کا علم ہوا۔جنگ کا زمانہ تھا، ڈاک کا نظام ٹھپ پڑا تھا، لہٰذا ان دونوں نے ترسیل پیغامات کا ایک آسان طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ شام کو جب بیگم حکیمی خبریں نشر کرتیں تو خبروں کے درمیان اپنی والدہ کو بھی اپنی خیریت سے مطلع کر دیتیں۔ پیغام اس قسم کے ہوتے تھے :

کل رات حکیمی نے بہت شراب پی لی تھی، بڑی دیر تک مجھ سے لڑتا رہا۔۔۔

آج دوپہر حکیمی کے ایک دوست نے ہماری دعوت کی تھی، کھانے بہت مزیدار اور قسم کی شراب تھی۔۔۔

میں آج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی، اس نے کہا ہے کہ اگلے ماہ کی دس تاریخ تک بچہ ہو جائے گا۔

اپنی دانست میں حکیمی اور بیگم حکیمی نے ڈیوٹی روم کے افسران کی فارسی سے ناواقفیت کا فائدہ اٹھایا تھا، مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ تہران کے برطانوی سفارت خانے میں ان کی خبریں باقاعدگی سے سنی جاتی ہیں۔چونکہ ان کی اس حرکت میں حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں تھی، لہٰذا پطرس بخاری نے انہیں معاف کردیا۔

اس زمانے میں مظفر حسین کی دوستی اپنے ساتھی چڈھا سے ہوگئی۔چڈھا صاحب کا کمال تھا کہ وہ گفتگو بالکل مسلمانوں کی طرح کرتے تھے اور سبحان اللہ، ماشاءاللہ، بسم اللہ کا استعمال خوب کرتے تھے۔ایک روز مظفر حسین کو رات کو اسٹیشن پر رکنا پڑا، اس روز انہیں معلوم ہوا کہ چڈھا روز رات کو اسٹوڈیو ہی میں سویا کرتے ہیں، شیو کا سامان ان کے پاس ہوتا تھا، صبح اٹھ کر شیو کیا، نہائے اور کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ایک روز مظفر حسین نے اپنے دوست سے کہا' تم مولانا چراغ حسن حسرت کی طرح بولنے کی کوشش کیوں کرتے ہو اور سگرٹ بھی انہی کے انداز میں پیتے ہو جیسے حسرت صاحب چھنگلی اور اس کے برابر والی انگلی میں دبا کر پیا کرتے ہیں۔"۔حسرت کا نام سنتے ہی چڈھا نے قلم میز پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے کان چھو کر بولے' توبہ کیجیے صاحب، میں کہاں اور حسرت صاحب کہاں۔وہ میرے استاد ہیں، میں نے ان کی جوتیاں سیدھی کرکے صحافت

کا علم حاصل کیا ہے۔ میرے بھائی، میں ان کا شاگرد رشید ہوں۔' ۔۔

ایک روز چڈھا غائب ہوگئے اور پھر اس شان سے واپسی ہوئی کہ ایک لمبی سی کار ریڈیو کی عمارت میں داخل ہوئی، ریشم سوٹ میں ملبوس چڈھا برآمد ہوئے، ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی اور کلائی پر سونے کی گھڑی۔ سحاب قزلباش انہیں دیکھ کر چیخ اٹھیں ۔معلوم ہوا کہ دہلی کے کسی چیف انجینئر کی اکلوتی مگر انتہائی موٹی اور بھدی بیٹی سے شادی کرنے کے عوض ہری چند

چڈھا کو ایک لاکھ روپیہ ملا ہے اور اب دنیا کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔

یہ ریڈیو کا وہ سنہرا دور تھا جب سعادت حسن منٹو، میرا جی،اوپندر ناتھ اشک اور رفیع پیرزادہ جیسے لوگ اس سے وابستہ تھے۔ مظفر حسین نے عرض و سماع میں اس زمانے کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ میرا جی مظفر حسین سے کبھی کچھ رقم ادھار لیتے اور کچھ ہی دیر میں واپس بھی کردیتے تھے۔یہ کہتے ہوئے کہ ' سوا روپے کا ٹھرا، چار آنے کی دال اور چار آنے چپراسی کو حق خدمت، اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔' ۔۔رفیع پیرزادہ جب کام میں مگن ہوتے تو سب کچھ بھول جاتے تھے سوائے سگرٹ کے، ایک سے دوسرا جلاتے تھے، کھانا پینا بھی یاد نہ رہتا تھا۔آرٹسٹ تھک کر چور چور ہوجاتے تھے لیکن رفیع پیر ویسے ہی تازہ دم رہتے۔ ایک روز سحاب قزلباش نے ایک کارٹون بنایا جس میں دکھایا کہ اسٹوڈیو میں بیچ میں مائکروفون رکھا ہے، تمام آرٹسٹ مرے پڑے ہیں اور رفیع پیر منہ میں سگرٹ

دبائے، بال بکھیرے، سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے مردہ آرٹسٹوں کو دیکھ رہے ہیں۔ سحاب نے نیچے لکھا تھا ' پیر صاحب کی ریہرسل۔

پاکستان بنا اور مظفر حسین پہلے لاہور اور بعد ازاں پشاور ریڈیو اسٹیشن پر تعینات رہے۔ پشاور میں ان کا قیام بارہ سال تک رہا۔ ان دوران ان کی دوستی کئی اہل علم اشخاص سے ہوئی جنھوں نے ہر طرح سے مظفر حسین کا خیال رکھا۔ ان میں احمد فراز، محسن احسان اور خاطر غزنوی شامل تھے۔ مظفر حسین بیان کرتے ہیں کہ پشاور ریڈیو پر ایک صاحب تھے جو کلرک تھے، وہ شاعر بھی تھے، انہیں ریڈیو پر بولنے اور ڈرامائی پروگراموں میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا، انھوں نے پرائیوٹ طور پر بی اے پاس کیا اور ریڈیو میں ملازم ہوگئے، اور ایک روز کلرک سے ریڈیو پروڈیوسر ہوگئے، بعد ازاں ایم کرنے کے بعد پہلے لیکچرر اور پھر پروفیسر ہوگئے ۔یہ خاطر غزنوی تھے۔ پشاور کے دنوں کی بات ہے۔ایک روز ایک مظفر حسین بچوں کے پروگرام کی تیاری میں مصروف تھے کہ ان کے ایک واقف کار ایک بچے کو اپنے ساتھ لائے اور کہا کہ اس کا تعارف پروگرام میں کرادیجیے، یہ میرے دوست کا بھائی ہے۔پروگرام کا آغاز ہوا تو مظفر حسین نے اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پیار سے کہا بیٹا! آپ کا نام کیا ہے۔یہ سننا تھا کہ وہ بچہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مظفر حسین نے اسے باہر بھیج دیا۔کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ پروگرام کے ماحول سے مانوس ہوا اور باقاعدگی سے شرکت کرنے

لگا۔ یہ سلسلہ کافی عرصے تک چلا، اس دوران اس نے میٹرک کرلیا اور پشاور کے ڈراموں میں بھی حصہ لینے لگا۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ بچہ ایک روز محمد قوی خان کے نام سے جانا جائے گا۔

مظفر حسین انہی دنوں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ایک شام میں نے اناونسمنٹ کرکے آٹھ بجے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اس وقت کے آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل نذیر تقریروں کے درمیان اندر جھانک رہے ہیں، میں نے وجہ پوچھی تو گھبرا کر بولے ، دراصل آپ کے اسٹوڈیو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، جی چاہتا ہے میں بھی یہاں کام کروں۔ یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں وہاں سے رخصت ہوگئے۔ صبح میں ڈیوٹی پر آیا تو سات بجے کی خبروں سے معلوم ہوا کہ بہت سے فوجی افسر بشمول فیض احمد فیض، حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کرلیے گئے ہیں۔ ان میں جنرل نذیر کا نام بھی تھا۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی کے انتقال کا دن مظفر حسین کو بہت عرصے تک یاد رہا۔ کراچی سے شکیل احمد نے مولانا کے انتقال کی خبر ان الفاظ میں نشر کی تھی: ' آج سہ پہر کو مولانا شبیر احمد عثمانی کو گولی مار کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔'

گولی مار، کراچی کا ایک گنجان آباد علاقہ ہے۔

سید مظفر حسین 1979 میں لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے تھے جہاں 1982 میں وہ ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہوئے۔ 1983 میں ان کی ملاقات کراچی کے ایک رسالے شوبزنس کے ایڈیٹر ناصر رضا سے ہوئی جس نے انہیں اپنی سرگزشت لکھنے پر آمادہ کیا، رسالے میں اس کتاب کے بیس ابواب شائع ہوئے لیکن انہیں اس کا معاوضہ نہیں دیا گیا۔ 1988 میں مظفر حسین نے شوبزنس کے مالک سہام مرزا سے رابطہ کیا تو انہوں نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ عرض و سماع کے دیباچے میں مظفر حسین نے ان دونوں حضرات کو کاغب اور غاصب قرار دیا ہے۔ ان دنوں مظفر حسین کے معاشی حالات بیحد خراب تھے۔ 1982 میں ریڈیو سے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں گریجو ئٹی کی مد میں صرف سترہ ہزار روپے ملے تھے جبکہ پینشن نہیں تھی۔ دو ماہ بعد وہ شدید بیمار ہوئے اور دس روز تک بیہوش رہے۔ ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ گریجو ئٹی کی تمام رقم علاج کی نذر ہو چکی ہے۔ ایسے میں ان کے دوست نبی جان صدیقی ان کے کام آئے جنہوں نے عرض و سماع کی اشاعت کے لیے رقم اپنے دوست کو رقم فراہم کی۔

عرض و سماع کے آخری صفحات میں مظفر حسین لکھتے ہیں: " ایک روز میں نے صدر مملکت ضیاء الحق کو اپنی حالت سے مطلع کیا، خط کی رسید تو ملی لیکن جواب نہ آیا۔ ایک زمانے میں بیگم عطیہ عنایت اللہ میرے ساتھ لاہور میں انگریزی کا

پروگرام کرتی تھیں۔ وہ معاشرتی فلاح و بہبود کی مشیر تھیں، ان کو خط لکھا لیکن ان کی طرف سے نہ کوئی عطیہ ملا، نہ کوئی عنایت ہوئی۔ ہو سکتا ہے وہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے معاشرہ تلاش کرتی رہی ہوں اور فلاح و بہبود کا موقع ہی نہ ملتا ہو البتہ ان کے بیانات ان کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ میں معذور بھی تھا، سفید پوش بھی اور غیرت مند بھی۔ آج میں پہلی بار اپنے آپ کو بے حد بے بس، بے کس اور مجبور محسوس کر رہا ہوں۔ میری بیوی اپنی ضروری خرید و فروخت کے لیے میری طرف دیکھتی ہے میں آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہوں کہ اوس سے کرلے فرشتے تک اوپر سے ہی آتے ہیں۔"

سید مظفر حسین کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا، وفیات کی کتابیں بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ عرض و سماع کے ذریعے ایک معذور شخص اپنے قاری کو جینا سکھا گیا۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم، پختہ شدم، سوختم

کتابوں کا اتوار بازار۔ 3 جون 2012

کچھ باتیں 1857 کے غدر کی

ذکر پرانی کتابوں کے اتوار بازار کا ہے۔اس مرتبہ جامعہ کراچی کے شعبہ ابلاغ عامہ کے استاد سید شاہد رضا نے کراچی میں 2008 میں دوسری عالمی کانفرنس کے تحت " جدو جہد آزادی 1857اور برصغیر میں آزادی صحافت " کے عنوان سے منعقدہ تقریب کی کاروائی کا کتابچہ تھما دیا۔ چونکہ یہ وقوعہ اتوار بازار میں روز روشن میں پیش آیا، لہٰذا اس مرتبہ کے احوال میں کتابچے کا تذکرہ نامناسب نہ رہے گا۔اپنی کتاب کی تقسیم کی بھلا اتوار بازار سے اچھی جگہ کونسی ہوگی، اب یہ رواج بھی فروغ پارہا ہے کہ یار لوگ اپنی تازہ شائع ہوئی کتابیں اتوار بازار لیے چلے آتے ہیں کہ دکانوں پر کون جا کر کب خریدے گا، کیوں نہ یہیں دکان سجالی جائے، بازار میں موجود شناساؤ ں کو ایک ایک نسخہ دے دیا جائے، تشہیر کی تشہیر ہو اور سامنے والا بھی مطمعین لوٹے کہ پلے سے کچھ دیے بنا کچھ تو ہاتھ لگا۔

جد و جہد آزادی 1857 اور برصغیر میں آزادی صحافت " کے مطابق پروفیسر متین الرحمٰن مرتضی نے اپنے مقالے ' جنگ آزادی میں صحافت کا کردار اور مزاحمتی

تحریریں' میں غدر کے زمانے کے اخباروں سے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ سقوط اودھ کے بعد لکھنو سے 16 جنوری 1857 کو شائع ہونے والے اخبار طلسم کی خبر تھی:

"لکھنو میں سنیچر آیا ہے، چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے، جو سانحہ عجائب ہے۔ آنکھ جھپکی، پگڑی غائب ہے۔ جس دن سے سلطنت نہ رہی، شہر بگڑا، چوروں کی بن آئی۔ کسی بیں حالت نہ رہی۔ اس نابینائی پہ حکومتی اندھیر ہے۔ صاف اندھے کے ہاتھ میں بٹیر ہے، روز باتیں عجائب ہوتی ہیں۔"

صاحبو! بیانئے کا بھی عجب انداز ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ 1857 نہیں بلکہ 2012 کی بات کی جارہی ہے۔ لکھنوٴ کے اخبار سحر سامری کے 15 دسمبر 1856 کی یہ خبر ملاحظہ ہو:

"ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانی خاطر کی ارزانی ہے، اس قدر مہنگا اناج ہے، آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ جور فاقہ سے افاقہ نہیں۔ بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا۔ جس نادان و دانا نے حال بربادی سنا، رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں تو تلاش نہیں، دوسرے وفور غم سے گزری، رنگ پر بشر نیلا ہوا، گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ حالم اس طرف عنانِ توجہ پھیرتا نہیں، بس کیا کریں کہ آکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔"

اس عمومی معاشرتی بے چینی کے ساتھ فوج میں اختیار کی جانے والی بے تدبیریوں نے بھی اضطراب میں شدت پیدا کی۔ فوج میں نئے کارتوس متعارف کرائے گئے جن کے بارے میں مشہور ہوا کہ ان کا منہ جس چیز سے بند کیا گیا ہے اس میں سور اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ انہی دنوں گارساں دتاسی نے لکھا: " ان منحوس کاتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخبارات نے، جو بے دلی پھیلانے میں پہلے ہی مستعدی دکھا رہے تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہند کو ان کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا۔"

غدر کے دنوں کی ایک اخباری خبر ملاحظہ ہو:

حقیر (رپورٹر) ہر طرف میگزین گیا تو مسجد نواب حامد علی خاں سے آگے بڑھ کر دیکھا کہ نکسن صاحب کا لاشہ سر دفتر کمشنری پڑا ہے اور کسی ظریف نے ایک بسکٹ بھی ان کے منہ کے پاس رکھ دیا ہے۔ (دہلی اردو اخبار۔ 17 مئی، 1857)

دہلی سے آئے سینئر صحافی اور دہلی میں روزنامہ ڈان، کراچی کے خصوصی نمائندے جاوید نقوی نے اپنی تقریر میں کہا:

" ہر طرف کمرشلائزیشن ہے، آپ اپنی جگہ خود پیدا کیجیے اور اسی کے اندر کام کیجیے۔ کیونکہ لالہ جی تو آپ کو کام کرنے نہیں دیں گے، اس لیے کہ ان کی اپنی

دکان ہے۔ کہیں یہودی چلا رہا ہے، کہیں مارواڑی چلا رہا ہے اخبار کو۔ شریف آدمی تو بہت مشکل سے ملتا ہے اس کو چلانے کے لیے۔جب ابراہم لنکن مرا تو خبر یورپ سے آنے میں بارہ دن لگے، کیونکہ بحری جہاز کے راستے خبر آئی، اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ امریکہ سے جب جہاز چلا تھا اور جو ایلچی خبر لا رہے تھے، لیورپول سے کوئی چھ ناٹیکل میل پہلے جن کے پاس ایک ہومنگ پیجن تھا، انھوں نے ایک پرچی لکھی اور اسے بھیج دیا۔لیورپول کے اسٹاک ایکسچینج پر اس نے وہ چھوڑ دی اور وارے نیارے ہوگئے۔آج بھی یہی سلسلہ ہے صحافت کا۔اسٹاک ایکسچینج اور اسٹاک مارکیٹ سے وہی سلسلہ ہے۔"

ڈاکٹر محمود غزنوی نے اپنے مقالے میں کہا کہ غدر کے دنوں میں ایک انگریز نے ایک ہندوستانی کو گولی سے ہلاک کیا اور عدالت سے بری ہوگیا تو اخبار انجمن پنجاب (1870) نے اس پر سرخی جمائی۔" ہماری جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری۔"

دہلی سے آئے ڈاکٹر خلیق انجم نے 1835 سے 1857 تک شائع ہوئے 52 اخباروں کے نام و سن اجراء بیان کیے جو مذکورہ کتابچے میں محفوظ کردیے گئے ہیں۔

بی بی سی کے وسعت اللہ خان نے اپنی تقریر میں کہا: " اگر آج منشی محبوب

عالم زندہ ہو جائیں تو انہیں کسی قومی اخبار میں سب ایڈیٹر کی بھی نوکری نہیں ملے گی اور اگر مل بھی گئی تو چند دنوں میں ہی زندہ درگور ہو جائیں گے ۔ اسی طرح ٹائم مشین میں بٹھا کر آج کے کسی نوجوان و نوآزمودہ صحافی کو بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ٹرانسپورٹ کر دیا جائے تو یہ بات طے ہے کہ اسے منشی محبوب عالم کے پیسہ اخبار میں " پہلی مرتبہ کی ڈانٹ پھٹکار کے بعد دوسری مرتبہ گھسنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔

:کتابچے کے آخر میں بزرگ ادیب جناب جمیل الدین عالی نے خطبہ اختتامیہ میں کہا جیو ٹی وی سے پچھلے برس کہا گیا کہ یہ دو آدمی نکال دو، میں نام نہیں لوں گا۔ پوچھا ان" کا قصور کیا ہے۔ جواب ملا کہ یہ اپنی مرضی سے لوگ بلاتے ہیں اور ان کو ایسے موضوعات دیتے ہیں جن میں حکومت کی برائی ہی برائی نکلے ، اچھائی نہ نکلے۔ ٹی وی والو ں نے کہا کہ ہم انہیں نہیں نکال سکتے تو ان کو پابند نہیں کیا، قانون بنانا مشکل تھا، مار پیٹ "نہیں کی، گرفتار نہیں کیا، بس ان کے اشتہار بند کر دیے۔

اس مرتبہ ضیاء شاہد کی 1968 کی ترجمہ کی ہوئی کتاب 'پراسرار کہانیاں' بھی ہمارے حصے میں آئی۔ ضیاء شاہد اب خبریں اخبار کے مالک ہیں۔ ضیاء شاہد اور مقبول

جہانگیر ،دونوں نے غیر ملکی کہانیوں کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ’پراسرار کہانیاں‘ سے تین منتخب کہانیاں جلد پیش کی جائیں گی۔

:اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں کا تعارف یہ ہے

پیر پگارا کی کہانی-کچھ ان کی کچھ میری زبانی

مصنف: اظہر سہیل

ناشر: فیروز سنز لاہور

سن اشاعت: 1987

صفحات؛227

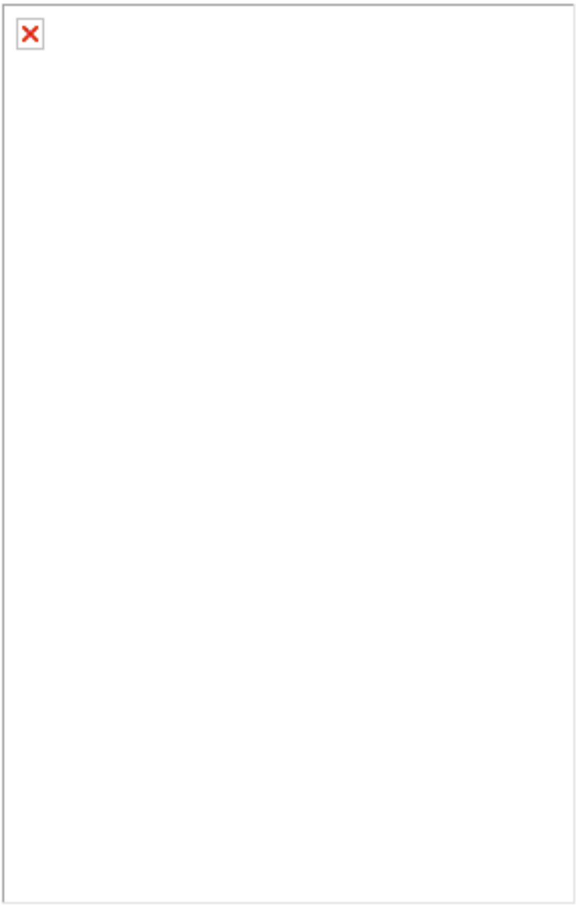

جدوجہد آزادی 1857 اور برصغیر میں آزادی صحافت

ترتیب و ادارت: سید شاہد رضا

شعبہ ابلاغ عامہ وفاقی اردو یونیورسٹی۔ کراچی

سن اشاعت: 2012

پراسرار کہانیاں
مترجم: ضیاءشاہد
سن اشاعت: 1968
ناشر: مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور
صفحات: 296

منازل
خودنوشت اور شاعری
سید باقر حسین رضا
ناشر: عمیر پبلشر لاہور
سن اشاعت: 1999

کتابوں کا اتوار بازار۔10 جون 2012

'کتابوں پہ تیری عجب وقت آکے پڑا ہے'

اس مرتبہ علی صبح اتوار بازار کا رخ کرتے وقت ذہن میں ایک ناخوشگوار واقعے کی یاد تازہ تھی۔ گزشتہ ہفتے فیروز سنز میں ہوئی آتشزدگی کی خبر آئی تھی ۔اس سے کچھ ہی عرصہ پیش آنے والے واقعے کا تذکرہ رہ گیا سو آج کتاب سے محبت رکھنے والے احباب یہ بھی جان لیں کہ کچھ عرصہ قبل پروفیسر سحر انصاری کا کتب خانہ بھی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آیا اور اتفاق تو دیکھیے کہ یہ سانحہ عین اس روز پیش آیا جس روز عالمی یوم کتب تھا۔ آگ اور پانی وہ عناصر ہیں جو زندگی کے وجود کو قرار بخشتے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ پروفیسر صاحب کے معاملے میں قدرت کے یہی دو عناصر بے قابو ہوئے۔ ۲۲ اپریل 2012 کا دن تھا جب ناظم آباد میں واقع ان کے کتب خانے میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نادر و نایاب کتابیں جاں سے گزر گئیں، مخطوطات و نادر قلمی نسخے سوختہ ہوئے اور ساتھ ہی ان کے مالک کا دل بھی۔ کتاب کی محبت میں سرتاپا غرق وہ وہ مالک جس نے راقم کو ایک مرتبہ بتایا تھا کہ بہت برس ہوئے جب اس کے والد نے عید پر کپڑے خریدنے کے لیے پیسے دیے تھے اور وہ ان کی کتابیں خرید لائے

تھے۔۔۔پھر بروز عید، تمام دن پروفیسر صاحب پرانے ملگجے کپڑے پہن کر گھوما کیے۔

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے
میں جانوں کچھ ہوئے
جس کے کارن میں جوگن بنی
وہی نہ جلتا ہوئے

اس سے قبل بھی پروفیسر صاحب پر یہ کڑا وقت گزر چکا ہے۔ ۵ مئی 2000 کو وہ یہ دکھ جھیل چکے تھے۔ اس وقت خامہ بگوش زندہ تھے۔ چٹکی لینے سے باز نہ آئے اور گمان ہے کہ پروفیسر صاحب بے مزہ نہ ہوئے ہوں گے۔ خامہ بگوش نے 2000 میں ہوئی آتش زدگی کے واقعے پر لکھا تھا:

اتفاق سے ایک مشہور ادیب کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ان کے کتب خانے کی بہت سی " نادر کتابیں جل گئیں۔ کئی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی جل کر خاک ہو گئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے دوست اظہار ہمدردی کے لیے ان کے ہاں پہنچے۔ ہر دوست نے اپنی بساط کے مطابق آتش زدگی کے واقعے پر اظہار افسوس کیا۔ البتہ ایک دوست نے منفرد انداز سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا: " اس میں کوئی

شک نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے لیکن یاد رکھیے کہ ہر شر میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے، وہیں آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔یقیننا یہ آپ کا نقصان ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیئے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہو گئے۔ "

اکثر کتابوں کے شائق افراد کی کتابوں کو ان کی بیویاں اپنی سوکن قرار دیتی ہیں۔پروفیسر صاحب نے اس صورتحال سے بچنے کا حل یہ نکالا کہ خود کہیں اور مقیم ہوئے اور کتابوں کے لیے ایک علاحدہ 'قیام گاہ' کا بندوبست کیا۔ لیکن شرپسندوں کے ہاتھ وہاں تک بھی جا پہنچے۔ کسی ستم ظریف نے اس لمحے کی تصویر بھی اپنے کیمرے میں محفوظ کر لی جب پروفیسر سحر انصاری آتشزدگی کے بعد سوختہ کتابوں کی راکھ کرید رہے تھے۔ گھر کو آگ گھر کے چراغ سے تو نہ لگی لیکن کتابوں کی راکھ کریدتے وقت دل کے پھپھولے سینے کے داغوں سے جل اٹھے۔۔۔۔

پروفیسر صاحب نے سن 2000 میں ہوئی آتشزدگی کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے کہا:
اس روز ناظم آباد میں میرے کتب خانے میں ایک نوجوان آیا جسے انسائیکلوپیڈیا میں" کوئی لفظ

دیکھنا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ لفظ موجود ہے آپ اسے لکھ لیں۔ وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا، اسے لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم کی تلاش تھی۔ اس لمحے وہ مجھے خاصا غیر سنجیدہ معلوم ہوا۔ خیر، وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد میں بھی کتب خانے کو تالا لگا کر گھر چلا آیا۔ گھر پہنچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے کتب خانے میں آگ لگنے کی اطلاع ملی۔ میں شدید پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ پچھلی گلی سے کتب خانے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر کوئی آتش گیر مادہ اندر پھینکا گیا تھا جس کی وجہ سے تین کمروں میں موجود کتابوں میں آگ لگ گئی۔"

اس مرتبہ عالمی یوم کتب 2012 کے موقع پر پروفیسر صاحب کے کتب خانے کے کسی بوسیدہ برقی تار نے خود پر پڑنے والے بوجھ کو مزید سہارنے سے انکار کیا اور نتیجتا پروفیسر سحر انصاری نے جو مال متاع ان بارہ برسوں میں قطرہ قطرہ کرکے جمع کیا تھا، ایک مرتبہ پھر نذر آتش ہوا۔

آگ اور پانی نے مل کر مجھے برباد کردیا۔ میں کتابوں کا رسیا ہوں۔ میری زندگی میں" ان کی بڑی اہمیت ہے۔ مجھے جلی ہوئی کتابوں کے درمیان بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا، گویا میں اپنے عزیزوں کی جلی ہوئی لاشوں پر بیٹھا ہوں۔"۔۔۔۔۔

دل گرفتہ سحر انصاری ایک اخباری نمائندے سے کہہ رہے تھے۔

☆

اس مرتبہ کتابوں کے اتوار بازار سے مختلف النوع قسم کی کتابیں ملیں۔ میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کی 1949 میں مرتب کی ہوئی 'نودرات غالب' کرم خوردہ ہی سہی لیکن ایک اہم کتاب ہے۔ یہ مرزا غالب کے وہ غیر مطبوعہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے ایک مداح اور سخن فہم منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے تھے، انہیں مقدمہ و حواشی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ آفاق حسین تک یہ خطوط میر مہدی مجروح اور میر افضل علی کے توسط سے پہنچے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر 1847 میں دہلی آئے تھے اور مرزا غالب کے پاس قیام کیا تھا۔ دوران قیام شعر و سخن کے مذاکرے بھی خوب رہے۔ ذوق علم و ادب کا یہی تعلق اخلاص و محبت کے رشتہ کا باعث بنا جو تاعمر قائم رہا۔

کتاب کا مقدمہ سرنامہ کے عنوان سے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحریر کیا ہے۔ میرن صاحب، غالب کے عاشق تھے،انہوں نے غالب کے ہاتھ کے لکھے کئی خطوط مولوی صاحب کو تحفتا پیش کیے تھے۔ آفاق حسین کو یہ ترکہ ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے نہ صرف خطوط مرتب کیے بلکہ ساتھ ہی ساتھ مرزا کے بہت سے نجی حالات، قلعہ سے تعلق اور روز مرہ کی زندگی کی بہت سی باتیں بھی 'نودرات غالب' میں محفوظ کردی ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ کتاب کے آخر میں مرتب نے غالب کے

شاگردوں کی فہرست بھی درج کی ہے۔ بقول مولوی صاحب، بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں یہ علم ہوگا کہ غالب کے شاگردوں کی تعداد 'ترانوے' ہے۔ آفاق حسین کو جن لوگوں نے کتاب کی تیاری میں تحقیق مواد فراہم کیا ان میں ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر اظہر علی، مرزا نعیم اللہ بیگ، کوثر دہلوی، طالب دہلوی، فضل حق قریشی دہلوی، منور لکھنوی، شیو راج بہادر، شیخ محمد اکرام اور شمس زبیری شامل ہیں۔

مرزا غالب منشی نبی بخش حقیر کا ذکر کرتے ہوئے ہر گوپال تفتہ کے نام 10 فروری 1849 کو لکھے ایک مکتوب میں کہتے ہیں: "خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درمان اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں، میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔"

غالب اور حقیر، دونوں کی بیماریاں بھی ایک جیسی ہی تھیں۔ مرزا کی طرح، حقیر بھی احتراق اور فساد خون سے پیدا ہونے والے امراض میں مبتلا تھے۔ حقیر کی وفات اکتوبر 1860 میں ہوئی۔ منشی نبی بخش حقیر کے مختصر کلام کو 'نودرات

غالب' میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

بڑھ گئی توقیر میری اتنساع دخل سے.

اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھکو اس کے درباں دیکھ کر

ستمبر 1853 کو منشی حقیر کے نام ایک مکتوب میں غالب اس شعر کی تعریف کرتے ۳)

ہوئے لکھتے ہیں: واللہ کیا شعر ہے۔ یہ ایک روش خاص ہے، ہر کوئی اس کو نہیں جانتا)

☆

شانے نے بل نکال دیے زلف یار کے

سیدھا کیا ہے موذیوں کو مار مار کے

☆

وہ نگاہیں جن سے تھی مجھ کو تسلی کی امید

تشنہ خوں، آفت دل، دشمن جاں ہو گئیں

☆

سایہ قصر ترا یاد آیا

پھر ہمیں ظل ہما یاد آیا

ید بیضا کا جو مذکور رہا

ان کا نقش کف پا یاد آیا

پھر گریباں کے اڑیں گے پرزے
پھر وہی چاک گریباں یاد آیا
خط جو غیروں کو کیے اس نے رقم
ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا
بسکہ مصنوع ہے صانع کی صفت
بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا
آج پھر اس بت کافر نے حقیر
وہ ادا کی کہ خدا یاد آیا

☆

ڈاکٹر ظہور الحسن شارب کی تحریر کردہ "دلی کے بائیس خواجہ" نامی کتاب تاج پبلشر نے 1977 میں دلی سے شائع کی تھی۔کتاب کے نام کی برکت سے جب اس کی قیمت طے پانے کا تکلیف دہ مرحلہ آیا تو کتب فروش کی آنکھوں پر گویا پٹی بندھ گئی، بصورت دیگر کتاب ہندوستان سے چھپی ہو تو یہ قوم ذرا لحاظ نہیں کرتی۔ ہندوستانی کرنسی ہی میں قیمت وصول کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ دس کے بیس۔۔۔ ہمارا روپیہ اور سیاست دان، کب کے اپنی قدر کھو چکے۔ادھر ڈالر آنکھیں دکھا رہا ہے۔95 پر پہنچ کر کچھ دم لیا ہے، گمان ہے کہ ایک پھریری سی لے کر اگلی جست لگائے گا۔ ٹنڈ لکر، پٹرول اور ڈالر میں سے پہلے دو تو سو کا ہندسہ کب کے

عبور کر چکے۔
باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی
:کتاب میں دلی کے جن بائیس خواجگان کی تفصیل دی گئی ہے ان میں شامل ہیں
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری، حضرت خواجہ بدر الدین غزنوی، حضرت خواجہ نجیب الدین متوکل، شیخ المشائخ نظام الدین اولیاء،
حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت خواجہ امیر خسرو، حضرت خواجہ شمس الدین محمد یحییٰ، حضرت خواجہ علاو الدین نیلی چشتی، حضرت خواجہ محی الدین کاشانی، حضرت خواجہ کمال الدین، حضرت مخدوم سماء الدین سہروردی، حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی، محب النبی حضرت مولانا محمد فخر الدین فخر جہاں، حضرت خواجہ مرزا جانِ جاناں مظہر شہید، حضرت شاہ علی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ محمد فرہاد دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت شاہ محمد آفاق، حضرت خواجہ ابو سعید۔
دیگر کتابوں میں ایک مختصر مگر جامع کتاب 'گفت و شنید' کے نام سے بھی ہاتھ آئی۔ محروم ہاشمی نامی مصنف کے متفرق مضامین و یادداشتیں۔کتاب کا اندرونی صفحہ غائب ہے، لہٰذا اس اشاعت کی تصدیق کے لیے کراچی میٹروپولیٹن لائبریری

کی مہر سے مدد لینی پڑی جس پر 1975 کندہ ہے لیکن بعد ازاں کتاب میں شامل مضمون 'دلی کے چند حکیم' کے مطالعے سے علم ہوا کہ مرحوم ہاشمی نے یہ کتاب 1941 میں لکھی تھی۔ لائبریری کی جانب سے کتاب کے آخر میں چسپاں "لین دین" کے ریکارڈ پر مبنی صفحے کو سادہ پایا۔ اس کے پہلے قاری ہونے کی سعادت راقم کے حصے میں آئی۔ گفت و شنید' کے کئی صفحات جڑے پائے۔ کتاب میں شامل مضامین میں دلی کے چند شرفائ، دلی کے چند مصنفین اور دلی کے چند حکیم کے مطالعے کے بعد مذکورہ کتاب کی اہمیت اور مصنف کے دلنشیں طرز تحریر کا پتہ ملتا ہے۔

ہاشمی صاحب کون تھے، کیا ہوئے، خدا ہی جانے لیکن کتاب کے مضامین پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم سا ہو تو سامنے آئے!

چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۔۔ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر ہندوستاں جنت نشاں میں سودا سلف بیچنے کے لیے وارد ہوئی تھی۔ جس طرح حضرت موسی کوہ طور پر آگ لینے گئے تھے اور پیغمبری لے کر لوٹے تھے، اسی طرح کمپنی بہادر بھی اسباب تجارت لے کر آئی اور حکومت سنبھال کر بیٹھ گئی۔ (فرنگی اردو)

۔۔استاد ذوق فرماتے ہیں: مجھے ایک دن بادشاہ نے اپنی غزل کا مسودہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ اسے ابھی بنادو۔ برسات کا موسم تھا۔ گھٹائیں تلی کھڑی تھیں۔

دریا بھی چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوان خاص میں جاکر دریا کے رخ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے تھے۔ مجھ سے کہا ' ول ! آپ کیا لکھتا ہے ؟ '۔۔ میں نے جواب دیا ' غزل ہے '۔۔ پوچھا ' آپ کون ہیں ؟ '۔۔ میں نے کہا ' نظم میں حضور کی دعا گوئی کرتا ہوں '۔۔ فرمایا ' کس جبان میں ؟ '۔۔ میں نے کہا ' اردو

میں '۔۔ پھر پوچھا ' آپ کون کون سی جبان جانتا ہے ؟ '۔۔ میں نے کہا ' عربی، فارسی بھی جانتا ہوں '۔۔ دریافت کیا ' آپ انگریزی بھی جانتا ہے ؟ '۔۔ میں نے کہا ' نہیں '۔۔ فرمایا ' کیوں نہیں سیکھا؟ '۔۔ میں نے کہا ' ہمارا لب و لہجہ اسے قبول نہیں کرتا '۔۔ صاحب نے کہا ' ول ! یہ کیا بات ہے، ہم آپ کا جبان بولتا ہے '۔۔ میں نے جواب دیا ' جناب ! پختہ سالی میں غیر زبان سیکھنی بہت مشکل ہے '۔۔ انہوں نے پھر کہا ' ول ! ہم آپ کا تین جبان ہندوستان میں آکر سیکھا، آپ ہمارا ایک جبان نہیں سیکھ سکتا '۔۔

بھلا یہ بھی کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے، اسے تو' زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں۔' استاد ذوق نے یہ جواب شاید دل ہی دل میں دیا ہوگا۔ ۔۔زبان و بیان کی نزاکتوں کے بیان میں مرحوم ہاشمی نے چند مزید قصے بیان

کیے ہیں۔لندن میں محروم ہاشمی ڈاکٹر اسٹوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر رہ چکے تھے، ہاشمی صاحب سے کہنے لگے 'آپ کا مزاج شریف ہے؟' اور ہاشمی صاحب ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

۔۔ محروم ہاشمی کے ایک دوست آکسفورڈ سے تکمیل تعلیم کے بعد ہندوستان آئے۔ایک شام کو چائے پی رہے تھے جو ذرا ہلکی تھی جبکہ وہ تیز چائے کے عادی تھے۔بولے بھئی میں تو مضبوط چائے پیوں گا۔یہ انہوں نے اسٹرونگ ٹی کا ترجمہ کیا تھا جو تہی مایہ اردو کے دامن کو محاورہ اور معنی کی دولت سے مالامال کرگیا۔

۔۔ محروم ہاشمی کے ایک بچپن کے دوست تھے، نام تھا محمد عبدالجمید لودھی۔دونوں دوست ایسے بچھڑے کہ اگلی ملاقات زمینداری کے ایک قضیئے میں پندرہ برس بعد اس وقت ہوئی جب انہیں ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہونے کا موقع ملا۔ڈپٹی کمشنر کا نام ایم اے لاڈی تھا۔معلوم ہوا کہ یہ ان کے بچپن کے دوست محمد عبدالجمید لودھی ہیں۔لودھی صاحب نے اپنے دوست کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔صبح جب ہاشمی صاحب کی آنکھ کھلی تو 'لاڈی' صاحب نہایت رعب سے ملازم پر گرج رہے تھے " ول! ڈیکھو چھوٹا حاضری سے پہلے صاحب کا گسل لگا ڈینا اور ہمارا ایک ڈم شیو لگاؤ۔اور ڈیکھو ہمارا کالا جوتا لگاؤ۔ہمارا نیلا سوٹ لگاؤ۔ہم چھوٹا حاضری کے بعد گسل لے گا۔"

۔۔۔ایک دن میں (محروم ہاشمی) خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب کے پاس بیٹھا تھا ایک صاحب کچھ عجب دھج سے تشریف لائے، تہہ بند باندھے، بہت نیچا کرتہ پہنے، سرپر، اونچی چو گوشیہ ٹوپی، لیکن تمام لباس سر سے پاؤں تک گہرے سرخ رنگ کا، سلیم شاہی پھولدار جوتا، وہ بھی سرخ، ایک بڑا سا لال رومال ہاتھ میں، چوڑا چکلا چہرہ، سرخ رنگت، میانہ قد اور چھریرا بدن۔ مجھے ان کی وضع دیکھ کر ان سے دلچسپی سی ہو گئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ایک بزرگ انگارا شاہ نام کے مرید ہیں۔ان کے انتقال کے بعد یہ بھی انگارا شاہ کہلانے لگے ہیں۔ان کا اصل نام اکرام علی خاں تھا۔ باتیں ایسی لچھے دار کہ آج تک لطف دے رہی ہیں۔ عربی فارسی خوب جانتے تھے، حافظ قران بھی تھے، طب بھی پڑھی تھی ،انگریزی سے بقدر ضرورت واقف تھے ۔اپنے حالات کبھی کبھی سناتے تھے، کہتے تھے 1857 کے قیامت خیز ہنگامے کے وقت ان کی عمر سولہ برس تھی۔ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ (دلی کے چند شرفائ)

۔۔۔ چلیے میرے ساتھ کشمیری دروازے چلیے اور حضرت آغا شاعر قزلباش سے ملیے۔ سنئے صاحب ! جن لوگوں نے آغا صاحب کو جوانی کے عالم میں دیکھا ہے، وہ اب ان کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ بھاری بھرکم جوانی سے بھرپور جسم، قابل رشک صحت، خمار آلود بڑی بڑی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، نہایت شاندار چڑھی ہوئی

مونچھیں، صاف داڑھی، سر پر مشہدی لنگی وہ بھی ایک خاص انداز سے بندھی ہوئی، کبھی سوٹ بوٹ کبھی افغانی شلوار، راہ چلتوں کی نظر انہی پر پڑتی تھی۔ جس زمانے میں ان کا شباب تھا، ان کی شاعری بھی شباب پر تھی۔ ان کی زندگی کے آخری ایام بے کسی اور بے بسی کی عبرت ناک تصویر ہیں۔ آیئے فصیلوں میں مڑ چلیں، وہ صبح شام اکثر یہیں ٹہلا کرتے ہیں۔ لیجیے دیکھ لیجیے، یہ حضرت آغا شاعر قزلباش ہیں۔ اف کیسی بری حالت ہے، ان سے بات نہ کیجیے گا، نہیں تو بچوں کی طرح رونے لگیں گے، دیکھیے ہاتھ پاؤں پر سوجن ہے، اختلاج قلب کے مریض ہیں، معدہ اور جگر بالکل بیکار ہو چکا ہے، ان کا حال دیکھا نہیں جاتا، کس قدر پریشان ہیں۔ افسوس آسمان شاعری کا درخشاں ستارہ 12 مارچ 1940 کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ (دلی کے چند مصنفین)۔

۔۔۔ دلی بھی کیا مقام ہے۔ نام لینے سے جان آتی ہے۔ چلیے چاندنی چوک کی سیر کریں۔ اس کی بہاروں میں ٹھٹکنے کا سماں نہیں۔ اس کی رعنائیوں پر محو ہو جانے کا موقع نہیں۔ یہ لیجیے فوارہ آگیا۔ یہ سنہری گنبدوں والی مسجد، سنہری مسجد کہلاتی ہے۔ نادر شاہ نے قتل عام کا حکم اسی مسجد میں پہنچ کر دیا تھا۔ حکم کیا دیا تھا۔ آدھی تلوار نیام سے باہر نکال کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ اس تباہی سے بیچاری دلی مدتوں نیم جان رہی۔ وہ دیکھیے دائیں ہاتھ کو نیل کا کٹرہ ہے اور بائیں ہاتھ کو بلی ماروں کا بازار۔ دائیں ہاتھ کو گلی قاسم جان

ہے اور بائیں ہاتھ کو ایک سفید محراب دار پھاٹک، مخلوق کی آمد کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔بڑے حکیم یعنی حکیم اجمل خاں صاحب کا مطب یہیں ہے۔بڑے۔بڑے مایوس العلاج مریض آتے ہیں اور خاک کی چٹکی سے شفا پاتے ہیں۔ آیئے ان کے مطب کا نقشہ بھی دیکھیں۔ یہ دیکھیے دلان در دلان۔ دودھ جیسی چاندنی کا فرش۔اس پر ایرانی اور افغانی قالین۔ باہر کے دلان کی آخری محراب میں حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ پیچھے گاؤ تکیہ دھرا ہے۔ پہلو میں قیمتی ادویات کا بکس رکھا ہے۔دونوں دلان مریضوں سے بھرے ہیں۔ حکیم صاحب کے دائیں بائیں کتنے ہی شاگرد بیٹھے ہیں۔ دیکھیے اس پر رعب شخصیت سے ہر شخص مرعوب ہے۔ رنگ بہت کھلتا ہوا گندمی، بلکہ گورا۔ قد درمیانہ سا۔بڑی بڑی پر رعب آنکھیں، سیاہ داڑھی، نگاہیں نیچی،آواز بہت ملائم بلکہ زیر لب۔ مطب میں کس غضب کی خاموشی ہے، دھکا پیل نہیں، افرا تفری نہیں۔ حکیم صاحب بڑے خلیق اور ہر دل عزیز ہیں ۔وہ شیدا تخلص کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دلی کا بچہ بچہ ان پر شیدا ہے۔ 1919 میں دلی میں ہڑتال ہوئی ۔ان دنوں خلافت اور کانگریس کا بڑا زور تھا اور حکیم صاحب ان تحریکوں کے روح رواں تھے۔ہڑتال کے باعث شہر بالکل سونا پڑا تھا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بڑا ہنگامہ ہونے والا ہے۔چیف کمشنر نے لال قلعہ میں ایک میٹنگ کی اور ضروری معاملات پر غور کرنے کے لیے حکیم صاحب کو بھی بلایا۔ادھر حکیم صاحب تو قلعہ میں تشریف لے گئے،ادھر شہر میں افواہ پھیل گئ کہ حکیم صاحب کو دھوکے سے بلا کر قلعہ میں نظر بند کر دیا ہے۔ اس خبر کا

اترنا تھا کہ دلی میں کھلبلی مچ گئی اور مخلوق قلعے کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئی۔ ہمارے یہاں ایک عورت مریم نامی ملازمہ تھی۔ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو ہم ہوچو ہوچو کہا کرتے تھے۔اس ہوچو نے جب یہ خبر سنی تو وہ آپے سے باہر ہوگیا اور چولھے میں سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی نکال کر قلعے کی طرف بے تحاشا بھاگا۔ہائے کیا مخلوق تھی اور کیسے محبت والے لوگ تھے۔اب یہ باتیں افسانہ ہو گئیں۔چودہ سال ہوئے کہ حکیم صاحب 1927 میں اس دنیا سے سدھار گئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔

(دلی کے چند حکیم ۔گفت و شنید از محروم ہاشمی)

☆

سرورِ علم ہے، کیفِ شراب سے بہتر

کوئی رفیق نہیں ہے، کتاب سے بہتر

:اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں کی تفصیل یہ ہے

نادرات غالب

مرزا غالب کے خطوط

مرتب: آفاق حسین آفاق

ناشر: ادارہ نادارات کراچی

سن اشاعت: 1949

صفحات: 160

گفت و شنید

مضامین/یاداشتیں

محروم ہاشمی

سن اشاعت: 1975

صفحات: 190

دلی کے بائیس خواجہ
ڈاکٹر ظہور الحسن شارب
ناشر: تاج پبلشر، بیری والا باغ-دہلی
سن اشاعت: جون 1977
صفحات: 272

جوئے شیر

علامہ اقبال کے اردو کلام کا مکمل اشاریہ مشتمل بہ بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز

مرتب: داؤد عسکر

ناشر: رشید اینڈ سنز- کراچی

سن اشاعت: فروری 1979

صفحات: 630

شخصیت
حمید کاشمیری نمبر
زیر اہتمام: ٹیلنٹس گلڈ-کراچی

سن اشاعت: 2001

صفحات: 500

کتابوں کا اتوار بازار۔ 24 جون، 2012

کنور مہندر سنگھ بیدی کی یاد میں

اتوار بازار کا قصد اور اس سے قبل ٹیلی وژن پر حالات حاضرہ پر ایک نظر، گویا ایک معمول ہے۔ لیکن سامنے کیا آتا ہے۔۔ادھر ٹیلی وژن کھولا ادھر سب سے پہلا منظر رات بھر میں گرنے والی لاشوں کا دیکھنے میں آتا ہے۔ صاحبو! عجب معاملہ ہے، ان سطور کا راقم علی الصبح خبروں میں رات بھر میں شہر سے ملنے والی بوریاں کھلنے پر لاشیں برآمد ہونے کا منظر دیکھتا ہے اور کچھ ہی دیر بعد کتابوں کے اتوار بازار میں کتابوں کی بوریوں کے کھلنے کا منتظر ہوتا ہے۔اول الذکر معاملے میں اطراف میں مولانا ایدھی کے رضاکار کھڑے ہوتے ہیں جبکہ کتابوں کی بوریاں کھلنے پر کتاب دوست حضرات گھیرا ڈالے ارد گرد کھڑے ہوتے ہیں۔ قیادت راتوں رات بدل گئی ہے، پٹے ہوئے مہرے دوبارہ لائے جا رہے ہیں: ع۔۔۔

جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

اس صورتحال پر اپنے محبوب مصنف جناب ابن صفی کے ناولوں سے فال نکالی تو جو کچھ سامنے آیا، پیش کرتا ہوں۔ ابن صفی ناول ہوں یا ان کے پیشرس، دونوں میں اپنے دل کی بات کہہ جاتے تھے۔ انداز ایسا ہوتا تھا کہ آج بھی وہ فقرے ذہن میں روز اول کی طرح تازہ ہیں۔اپنی شہرہ آفاق عمران سیریز کے ایک ناول دوسرا پتھر کے پیشرس میں :رقمطراز ہیں

ایک بھائی نے پوچھا ہے کہ جمہوریت اچھی ہے یا ڈکٹیٹر شپ ؟ اور اسلامی مزاج ان" دونوں میں سے کسے سہار سکتا ہے ؟۔۔۔

بھائی ! اگر آپ اسلامی نکتہ نظر سے پوچھتے ہیں تو پہلے بھی کبھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت جیسی کسی شے کی گنجائش نہیں۔اسلام تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہے۔ جمہوریت میں دھارے کے ساتھ بہنا پڑتا ہے جبکہ اسلام میں دھارے پر چڑھنے کو کہتے ہیں۔اسلامی مملکت کے لیے صرف ایک ایماندار فرد کی حکومت کافی ہے کہ وہ ایماندار فرد اپنے احکامات نہیں بلکہ قرانی احکامات ہم سے منواتا ہے۔ لہٰذا میرے بھائی ! اسلام اور جمہوریت کو اجتماع ضدین سمجھیے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں جمہوری نظام پنپ نہیں سکا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں جمہوریت کے علمبرداروں کو بھی ڈکٹیٹر بننا پڑا ہے اور بلاخر یہی چیز ان کے زوال کا باعث بنی کہ زبان

پر تو جمہوریت کا نعرہ ہوتا تھا لیکن کرتوت ڈکٹیٹروں سے بھی بدتر۔
غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔
پھر جمہوریت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں صرف ووٹ گنے جاتے ہیں، بقول اقبال 'بندوں کو پرکھا نہیں جاتا'۔۔جو چاہے دولت کے بل بوتے پر بحیثیت امیدوار کھڑا ہو کر منتخب ہو جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دفتر کی کلرکی کے لیے تو آپ کو فرسٹ کلاس گریجویٹ چاہیے لیکن قوم کی باگ ڈور" لٹھ" قسم کے افراد کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ مرغی سپلائر، انگوٹھا چھاپ تو اسمبلی میں پہنچ کر قانون سازی فرمائیں اور سکنڈ کلاس گریجویٹ کو چپراسی بنانے کے لائق بھی نہ سمجھا جائے۔" (۳نومبر1979
شہر کراچی سے صاحب علم ہیں کہ اٹھتے جاتے ہیں۔ موسیقی کے قدردان ابھی مہدی حسن خان کو روتے تھے کہ پروفیسر آفاق صدیقی بھی گئے اور پیچھے پیچھے عبید اللہ بیگ صاحب نے رخت سفر باندھا۔ گزشتہ برس کراچی کی آرٹس کونسل میں بیگ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، ذرا دیر میں ان کی دلکش شخصیت اور نستعلیق لہجے نے طبیعت کو باغ باغ کردیا تھا۔ہاتھ میں "بینسن اینڈ ہیجز" کا ڈبہ تھامے

سگرٹ سے سگرٹ جلاتے تھے۔ سگرٹ کے ڈبے اور عبید اللہ بیگ کے چہرے کا رنگ، دونوں ایک جیسے لگتے تھے۔۔ سنہرا۔۔۔ کچھ عرصہ قبل ان کا ناول 'راجپوت' شائع ہوا تھا۔ یہ ایک طویل ناول ہے، صفحات ۵۱۴۔ یہ ایک رزمیہ داستان ہے۔پروفیسر رئیس فاطمہ نے اپنے کالم میں مذکورہ ناول کا ایک اقتباس نقل کیا تھا :

ان کے جانے کے بعد میں چپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ سوچتا رہا اور خود سے سوال کرتا رہا۔ " جمشید خان کیا ہو رہا ہے ؟ کیا ہونے والا ہے ؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا ؟ ۔۔ یہ سچ ہے کہ ریاستوں کے ختم ہو جانے سے عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے روشن چراغ بجھ جائیں گے۔ لیکن کیا نیا دور غریبوں کے جھونپڑوں کو محلوں میں بدل دے گا ؟ ۔۔یا ان راجوں مہاراجوں کی جگہ سیٹھوں، تاجروں ، مہاجنوں اور صنعت کاروں کا ایک نیا طبقہ برسر اقتدار آ کر عوام کو ایک قدم بھی نہ آگے بڑھنے دے گا۔ ان کو ان کے جھونپڑوں میں قید رکھے گا۔

تعلیم اور ترقی کے تمام موقع اپنے لیے مخصوص کرے گا۔۔۔یعنی ایک استحصالی طبقہ ختم ہوگا تو کئی استحصالی طبقے جنم لیں گے۔ "

☆

اس مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی صدر کراچی میں واقع پرانی کتابوں کے اتوار بازار میں نظر آئے اور ہم نے ان کی یاد میں اک نعرہ مستانہ بلند کیا :

موہوم سی حوروں کی کہانی نہیں آئی
بے کار ہمیں عمر گنوانی نہیں آئی
ہم رند خرابات بڑھاپے میں جواں ہیں
واعظ پہ جوانی میں جوانی نہیں آئی

کنور صاحب سے دو برس قبل بھی اتوار بازار ہی میں 'ملاقات' ہوئی تھی جب ان کی خودنوشت 'یادوں کا جشن' بمعہ ان کے دستخط بازار سے ملی تھی۔ یہ خودنوشت انہوں نے اپنے دورہ کراچی کے موقع پر شکیلہ خانم نامی خاتون کو مرحمت کی تھی۔ کنور صاحب نے یادوں کا جشن کا عنوان اپنے عزیز ترین دوست جوش ملیح آبادی کی خودنوشت 'یادوں کی برات' کے وزن پر رکھا تھا۔ جوش سے ان کی دوستی سے ایک عالم واقف تھا۔ پھر یہ ہوا کہ جوش پاکستان چلے گئے، گویا اس قصر نشاط کے بنیادی پتھروں میں سے ایک پتھر ہل گیا۔

کنور صاحب نے 1973 میں 'من جیت جگ جیت' نامی فلم بھی بنائی تھی، اس کے علاوہ تین فلمیں مزید بنائیں لیکن راجندر سنگھ بیدی کی طرح وہ بھی اس میدان میں نہ چل سکے تھے۔اس مرتبہ کے ایل نارنگ ساقی کی مرتب کردہ کتاب " ہمارے کنور صاحب" ہمارے حصے میں آئی۔ جشن کنور مہندر سنگھ بیدی، نئی دہلی کی جانب

سے شائع کردہ یہ کتاب 1986 میں منظر عام پر آئی تھی۔ کنور صاحب پر مضامین لکھنے والوں میں کرنل بشیر حسین زیدی، مالک رام، ڈاکٹر جمیل جالبی، جگن ناتھ آزاد، عابد علی خاں، خواجہ محمد شفیع، رئیس امروہوی، مجتبیٰ حسین، گوپی چند نارنگ، ساحر ہوشیار پوری، جوگندر پال، گوپی ناتھ امن، یوسف ناظم، ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ حسن نظامی ثانی، نریندر لوتھر، کشمیری لال ذاکر، سید شریف الحسن نقوی، رئیس قمر، ظفر پیامی، پروفیسر عنوان چشتی، فکر تونسوی، نفیس بانو شمع، ڈاکٹر شارب ردولوی، سرور تونسوی، حیات لکھنوی، رعنا سحری اور ڈاکٹر کامل قریشی شامل ہیں۔ جبکہ کنور صاحب پر نظمیں لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی، گوپی ناتھ امن، قتیل شفائی، عزیز وارثی، مخمور سعیدی، راہی شباب، راز لائل پوری، دلیپ بادل اور متین امروہوی کی تخلیقات شامل ہیں۔

کنور صاحب کا دیہانت 17 جولائی 1992 کو ہوا تھا۔ "ہمارے کنور صاحب" ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کے ایل نارنگ ساقی نے 'کلیاتِ سحر' 1992 میں مرتب کی تھی جبکہ "ہندوستانی ادب کے معمار۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر" 2007 میں ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے شائع کی۔ اس سے قبل 1962 میں طلوع سحر کے نام سے کنور صاحب کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سرکاری ملازم تھے۔ ان کی ملازمت کا زمانہ مختلف

حیثیتوں میں پنجاب، ہریانہ اور دلی میں گزرا۔ وہ جہاں بھی رہے، ان کے زمانہ قیام میں اس علاقے کے علم دوست حضرات اور ثقافتی گروہ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ مجلسی انسان تھے، جہاں گئے، داستانیں چھوڑ آئے۔ایک ہمارے مرحوم فوجی ادیب صدیق سالک ان کی طرف سے بدگمان نظر آئے تھے، سالک 1971 میں ہندوستان کی قید میں گزرے دنوں کی یاداشتوں کو لکھنے بیٹھے۔۔ کنور مہندر سنگھ بیدی انہیں ایک چالاک حرفوں کے بنے ہوئے انسان کے طور پر یاد رہ گئے تھے جو جنگی قیدیوں کے سامنے اس، ڈھنگ سے آیا کہ سر پر رومال ڈال، نعت سنائی شروع کر دی۔

کنور صاحب کی ملازمت کا آخری دور چندی گڑھ میں گزرا جہاں وہ ڈائرکٹر پنچایت پنجاب کی حیثیت سے 1968 میں سبکدوش ہوئے۔اس سے قبل وہ 1963 سے تک، ڈپٹی کمشنر کرنال کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ تقسیم ہند کے موقع پر کنور 1964 مہندر سنگھ بیدی ضلع کانگڑہ کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں ۔۔"اس زمانے میں، میں نے سڑکوں پر، پلیٹ فارموں پر، کھیتوں میں، ہر جگہ لاشوں کے انبار دیکھے تھے لیکن مشرقی پنجاب میں ایک ضلع ایسا بھی تھا ۔۔۔کانگڑہ۔۔۔جہاں کا نگراں کار ہمارا محترم دوست کنور مہندر سنگھ بیدی تھا۔ گورو نانک دیو کے خاندان کا چشم و چراغ۔۔ جس نے خدا جانے وہاں کے سکھوں اور ہندووں پر کیا جادو کر دیا تھا کہ بتانے والے بتاتے ہیں کہ سارے ضلع میں

"کسی مسلمان کی نکسیر بھی تو نہیں پھوٹی۔

خواجہ محمد شفیع اپنے دلچسپ مضمون 'دلی کی ادبی محفلیں اور کنور صاحب' میں لکھتے ہیں:

دلی چھوڑتے ہوئے بہت کچھ چھوڑا، کیا کیا بیان کروں۔ لیکن جو تین یادیں آج بھی تڑپا دیتی ہیں اور شاید تادم واپسیں تڑپاتی رہیں گی ان میں ایک دلی کی جامع مسجد، دوسری ماں کی قبر اور تیسری یاد کنور بھائی۔ محافل کنور صاحب کی جان تھیں اور یہ محافل کے روح رواں۔ کالجوں میں مشاعرے ہوتے، دہلی کاٹن ملز کا سالانہ مشاعرہ دھوم دھام سے ہوتا تھا، بیخود دہلوی کے دولت کدے پر نشستیں ہوتی تھیں۔ دلی کے پنجابی سوداگران مشاعرہ کراتے، پر تکلف دعوتیں ہوتی تھیں۔ انواع اقسام کے طعام ہوتے تھے جن میں بالخصوص دنبہ کا قورمہ اور چھینٹے اور بغیر چھینٹے کی باقر خوانیاں۔ دنبہ کی چکتی کی بڑی بڑی بوٹیاں۔ کچھ نہ پوچھیے، اب بھی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ سر شنکر لال کی کوٹھی پر دعوتیں ہوتی تھیں۔ ٹھیکری کی بینگن روٹی کا بھرتہ خاص طور پر تیار ہوتا تھا اور قیمہ اور ہری مرچیں، سیخ کباب اور بے شمار قسم کی چٹنیاں اور اچار۔ ایک دو قسم کے سالن ہوتے تھے، خصوصیت سے روے میدے کے گرم گرم پراٹھے اور ربڑی اور اس کے بعد مشاعرہ۔ کنور بھائی خوش خوراک تھے لیکن بیش خور نہیں۔ فیض جھنجھانوی، ماہر دہلوی اور نخشب جارجوی بلا نوش تھے۔ اچھا حضور، اب بوڑھا تھک گیا ہے، مزید نہیں لکھا جاتا۔ کنور بھائی کا حق۔ حق تو یہ ہے کہ حق

ادانہ ہوا۔ کنور بھائی ہر بزم ادب میں گل سر سبز تھے اور در شہوار۔ شعر میں جتنی
”خوبیاں ہو سکتی ہیں، ان کے کلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی اور مجتبیٰ حسین، دلی کی بلند و بالا عمارت میں کسی کام سے گئے، اس وقت بجلی غائب تھی اور لفٹ بیکار۔ مجتبیٰ حسین 48 برس کے تھے جبکہ کنور صاحب 74 برس مکمل کر چکے تھے۔ سیڑھیوں سے ایسے اوپر چڑھے کہ تیرہ منزلیں چڑھ گئے، جانا ساتویں منزل پر تھا۔ مجتبیٰ حسین ان کے پیچھے گرتے پڑتے چلے آرہے تھے۔ کنور صاحب نے انہیں ڈانٹا کہ آپ کم عمری میں ہی ہانپ گئے۔ مجتبیٰ حسین بولے ' بیس برس کی عمر کا گدھا، ساٹھ برس کے آدمی سے کہیں زیادہ بوڑھا ہوتا ہے۔'۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا کہ کنور صاحب اس قول سے ایسے ہی محظوظ ہوئے جیسے کہ ایک سچے سکھ کو ہونا چاہیے۔

ایک محفل میں جب جوش اپنی تہلکہ خیز نظم 'گلبدنی' سنا رہے تھے تو والہانہ داد دیتے ہوئے مہندر سنگھ بیدی نے کہا' حضرات! ملاحظہ ہو، ایک پٹھان کیسی اچھی نظم سنا رہا ہے۔"۔ جوش نے جواب دیا" حضرات! یہ بھی ملاحظہ ہو کہ ایک سکھ کتنی اچھی داد دے رہا ہے۔" ۔ جوش نے مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے 'یادوں کا جشن' میں لکھا ہے: " میں بڑی دیانت داری سے کہتا ہوں کہ جب دنیا کے دو پاؤں پر چلنے والے اربوں درندوں کے درمیان، جن کو دھوکے

سے آدمی سمجھا جاتا ہے۔ بیدی صاحب کے سے انسان کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس ہولناک ماحول میں بیدی صاحب کا سا انسان کیونکر پیدا ہوگیا۔ ہو نہ ہو یہ روزگار کا ایک عظیم اعجاز ہے۔ ان کا کاسہ سر اس قدر موزوں ہے کہ تاج انسانیت اس پر ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے۔ نہ ڈھیلا ہوتا ہے نہ تنگ۔"

ساحر ہوشیارپوری بیان کرتے ہیں : " کنور صاحب اکتوبر 1947 میں دوبارہ دہلی آئے تو تقریباً ساڑھے پانچ سال تک بطور سٹی مجسٹریٹ اور محکمہ بحالیات میں ہاوسنگ اینڈ رینٹ آفیسر تعینات رہے۔ میں بلاناغہ ان کے دفتر میں یا پھر ان کی کوٹھی پر قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز بعد دوپہر کچہری کے ریٹائرنگ روم میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت بیخود دہلوی مرحوم لاٹھی ٹیکے اور کسی نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھے تشریف لائے۔ کنور صاحب نے سلام عرض کیا اور بصد احترام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیخود صاحب گراں گوش تھے، عمر بھی نوے سال کے لگ بھگ تھی، کرسی پر بیٹھتے ہی کڑک کر بولے ' دونالی بندوق کا لائسنس لینے آیا ہوں، شکار کھیلوں گا۔ '۔ کنور صاحب کو ان کی دل شکنی منظور نہیں تھی۔ سفید کاغذ سامنے رکھا اور کہا کہ اس پر دستخط کر دیجیے، میں درخواست ٹائپ کرالوں گا، انشاءاللہ چند روز میں لائسنس مل جائے گا۔ '۔ بیخود صاحب بولے ' اور بندوق کہاں سے آئے گی ؟ '۔ کنور صاحب نے کہا کہ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا، آپ اطمینان فرمایئے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ فی

البدیہہ ایک غزل عنایت فرمادیجیے۔ بیخود صاحب بولے: ' دیجیے مصرع"۔ کنور صاحب نے ' جواب کیا ہوگا، ثواب کیا ہوگا' کی زمین تجویز کردی۔ دو، تین منٹ کے بعد ہی اس زمین میں مطلع فرمادیا اور پھر اسی طرح ڈیڑھ دو منٹ کے بعد

ہی اس زمین میں مقطع فرمادیا اور پھر اسی طرح پر ڈیڑھ، دو منٹ کے وقفے سے جو شعر "کہنے شروع کیے تو اپنے مخصوص رنگ میں پانچ اشعار کی غزل مکمل کرکے رکھ دی۔

مہندر سنگھ بیدی کے حلقہ احباب میں ایک ایسی صنف بھی تھی جسے عرف عام میں منظور نظر' کہا جاتا ہے۔ایک نوجوان شاعر طارق بدایونی ان کے منظور نظر ہوئے، اس' نے بدایوں میں مشاعرے کا اہتمام کیا، کنور صاحب اس کے حسب خواہش فلم اسٹار دلیپ کمار کو بدایوں کی گلیوں میں کھینچ لائے۔ ڈاکٹر ایچ ایس گلاٹی نظر پر چڑھے تو محمد رفیع، اوم پرکاش اور جانی واکر کو 'رڑکی' میں لا کھڑا کیا۔ یوپی کے گورنر گوپال ریڈی اور اکبر علی خاں سے ان کے مشاعروں کی صدارت کرادی۔ روی بھاردواج ان کا شاگرد بنا تو جودھ پور میں اس کا جشن کروادیا۔ کرن جھانسوی سے متاثر ہوئے تو اسے پورے ہندوستان میں گھمادیا۔ قیصر حیدری کو اپنا ادبی سیکریٹری بنا لیا اور ہلال سیوہاروی کو غالب صدی میں لندن تک لے گئے۔ان کا منظور نظر بننے کے لیے کسی خاص صلاحیت، امتیاز یا وصف کی ضرورت نہیں تھی، بس:

کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا والا معاملہ تھا۔

ڈاکٹر خلیق انجم دلی کے روڑے ہیں۔ مہندر سنگھ بیدی سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اپنی یادوں کو سمیٹے ہوئے بیان کرتے ہیں: " دلی میں مشاعرے بہت ہوتے تھے، ہم چھپ چھپ کر جایا کرتے تھے۔ وہاں ہمارے لیے دلکشی کے دو وجوہ تھے، ایک تو شعر و شاعری اور دوسرے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، گلزار دہلوی اور ایک خاتون۔ خاتون کا قد درمیانہ تھا، گورا رنگ، لمبوترا چہرہ، نرگسی آنکھیں، لب و لہجہ مردانہ اور گفتگو میں رس تھا۔ سامعین کی توجہ کا مرکز خوب رہتیں۔ عمر میں ہم سے بہت بڑی تھیں۔ اس خاتون کے سلسلے میں کنور صاحب کی ایک بات بہت ناگوار گزرتی تھی۔ مشاعروں میں یہ خاتون کنور صاحب کے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی، ہمیں اس قربت پر اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ جب کوئی شاعر اچھا شعر پڑھتا تو کنور صاحب دل کھول کر داد دیتے اور داد دیتے ہوئے پاس بیٹھی اس خاتون کی کمر کو تھپتھپاتے اور اس طرح تھپتھپاتے کہ ہاتھ خاتون کی کمر پر زیادہ دیر رہتا اور ہوا میں بہت کم دیر۔۔۔ ایک بار کا ذکر ہے دہلی کے رام لیلا گراونڈ میں مشاعرہ ہو رہا تھا، کنور صاحب میر مشاعرہ تھے۔ ساغر نظامی انہی دنوں بمبئی سے دہلی آئے تھے، وہ بھی مشاعرے میں شریک تھے۔ ساغر صاحب کو دعوت دیتے ہوئے کنور صاحب نے ان کے فن کی بہت تعریف کی لیکن کہیں شامت اعمال سے یہ بھی کہہ دیا کہ ' ساغر صاحب ملک کے سب سے بڑے قوال ہیں'۔ کنور صاحب کا یہ

کہنا تھا کہ ساغر نظامی مائک پر آئے اور ایسا بھڑکے کہ الٰہی توبہ۔ انہوں نے کنور صاحب کو بہت بھلی بری سنائیں۔ یہ کنور صاحب کی شرافت اور انسانیت تھی کہ خاموش بیٹھے مسکراتے رہے۔ ساغر صاحب غصے میں کہنے لگے، جب سے یہ شیر دلی آیا ہے لومڑیوں کی جان پر بن گئی ہے۔ اس موقع پر گلزار صاحب نے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کیا، حضور! آپ جنہیں لومڑیاں کہہ رہے ہیں، دلی آئی تھیں تو یہ بھی خود کو شیر کہتی تھیں۔"

☆

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مولانا محمد عمران ندوی کی مرتب کردہ ہے۔ اس کتاب کو مجلس نشریات اسلام، کراچی نے 1979 میں شائع کیا تھا۔ ابتدا میں یہ کتاب 26 مئی کو دارالعلوم ندوۃ، لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب میں جن شخصیات نے 1946 موضوع کی مناسبت سے اپنے مضمون تحریر کیے ہیں ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، پروفیسر عبدالباری ندوی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مناظر احسن گیلانی، میاں بشیر احمد، مولانا بدرالدین، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مولانا اعزاز علی، پروفیسر سید نواب علی، مولانا شاہ حلیم عطائی، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا عبدالسلام، خواجہ غلام السیدین، مولانا ابواعلی مودودی اور مولانا ابوالحسن ندوی شامل ہیں۔

مندرجہ بالا تمام شخصیات نے اپنے مضامین میں ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے عمر کے کسی نہ کسی حصے میں وہ متاثر رہے تھے۔یہ وہ کتابیں تھیں جنھوں نے ان مضامین کے لکھنے والوں کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کہ بچپن میں طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ کے اسیر تھے، جوانی میں پرچہ الہلال کو پڑھ کر ایک روز مسجد میں تقریر کے لیے کھڑے ہوگئے۔لکھتے ہیں " مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ طرز بیان کی نقل اتارنے کی صلاحیت محسوس کرکے میں اچانک پہلی دفعہ پبلک کے سامنے تقریر کے لیے کھڑا ہوگیا۔ٹونک کی تاریخ میں وہ یادگار دن تھا، جامع مسجد بھری ہوئی تھی۔"وامتاز والیوم ایھا المجرمون" کے ساتھ میری کڑکتی ہوئی تقریر کا آغاز ہوا، جو جہاں تھا تھرا کر رہ گیا، پھر مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا کہا۔پندرہ بیس منٹ بعد ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ خود رو رہا ہوں اور ساری مسجد میں کہرام بپا ہے۔۔۔روپیہ کا ڈھیر میرے قدموں کے سامنے ہے، لوگ واقعتا کپڑے پھاڑتے تھے، بال نوچتے تھے، منہ پر تھپڑ مارتے تھے، ساری مسجد دیوانی ہورہی تھی۔میں خود حیران تھا کہ قصہ کیا ہے؟اور آج تک اس کی توجیہ میری سمجھ سے خارج ہے۔شاید میرے دبے دبائے جذبات یکایک ابھر پڑے۔"

:اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں کی تفصیل یہ ہے

ہمارے کنور صاحب۔ کنور مہندر سنگھ بیدی پر مضامین
مرتبہ: کے ایل نارنگ ساقی
ناشر: جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی-دہلی
سن اشاعت: 1986 ۔ صفحات: 288

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ۔
مرتبہ: مولانا محمد عمران خان ندوی
ناشر: مجلس نشریات اسلام-کراچی
سن اشاعت: 1979 ۔ صفحات: 200

خون کا سمندر ۔ مترجم: ضیاءشاہد

ناشر: مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور

سن اشاعت: 1967

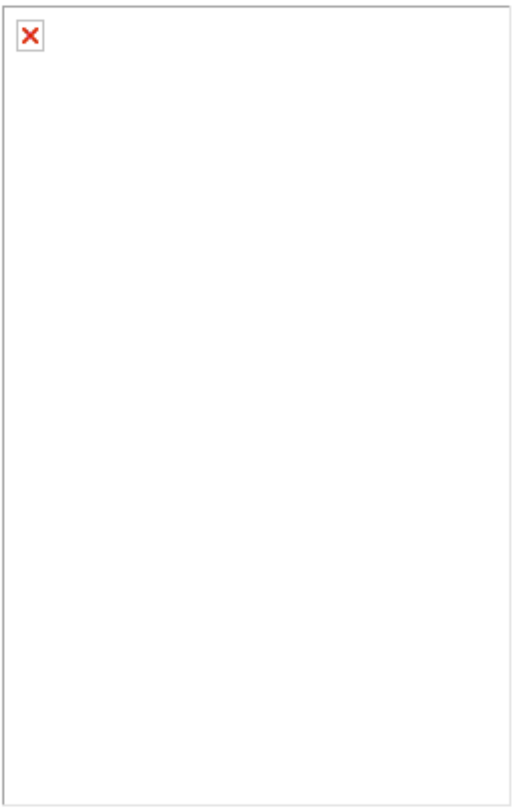

ناول کی تاریخ اور تنقید ۔ علی عباس حسینی
ناشر: لاہور اکیڈمی ۔لاہور
سن اشاعت: 1964 ۔ صفحات: 510

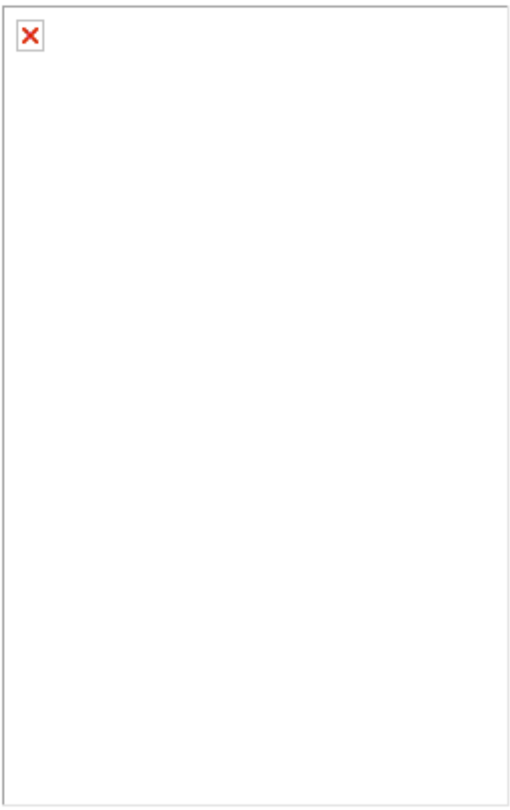

صبح لطافت۔مضامین کا مجموعہ
مصنف: ملا رموزی
ناشر: میری لائبریری ۔لاہور
سن اشاعت: 1962

نعت ریسرچ سینٹر کی نئی کتابیں

نعت ریسرچ سینٹر کے تحت جناب صبیح رحمانی نے چار عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ جریدہ نعت رنگ کا پہلا شمارہ اپریل 1995 میں شائع ہوا جبکہ 2002 میں اقلیم نعت کے زیر اہتمام کراچی میں نعت ریسرچ سینٹر کا عمل میں آیا۔ نعت ریسرچ سینٹر کی شاخیں بھارت اور لندن میں بھی قائم ہوچکی ہیں۔

:کتابوں کی تفصیل اس طرح سے ہے

:اول: نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش

اس کتاب کے مصنف پروفیسر محمد اکرم رضا ہیں۔پروفیسر صاحب ابتدایئے میں لکھتے ہیں:

جب محسوسات کی پاکیزہ اور مقدس دنیا میں فقط خوشنودی رسول ﷺ کا حسن جلوہ " ریز ہو تو پھر نعت کہتے ہوئے غلطی کا گمان نہیں ہوتا۔اگر کبھی تمام تر احتیاط کے باوجود احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر کسی صاحب فکر کے توجہ دلانے پر بلا تاخیر رجوع کرنے اور فکری شاہل سے دلان فکر کی آلودگی دور کرنے کا اہتمام مجبوراً نہیں بصد شوق کیا جاتا ہے۔ تنقید و تحقیق کا مطلب تنقیص یا عیب جوئی نہیں بلکہ اصل، حقیقت نعت کی شاہراہ پر

چلنے والوں کی رہنمائی ہے۔ بعض ناقدین کی فکری سوئی فقط اس بات پر اٹکی ہے کہ جب صنف نعت اتنی ہی پاکیزہ اور مقدس ہے تو اس پر تنقید کیسے ہو سکتی ہے۔اس طور وہ نعت گو کو تقدس مابی کا لبادہ اوڑھا کر اسے ادب کی بلند ترین مسند پر بٹھا دیتے ہیں۔ حقیقت میں ہمارا مقصد نعت گو کے مقام و مرتبہ پر حرف زنی نہیں بلکہ نعت پارے کے مواد، مفہوم اور ہیت کے اچھے ،برے پہلوؤں کی جانچ کرنا ہے تاکہ نعت گو شاعر ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کرپائے بلکہ ہر آن اس پیغام کو پیش نظر رکھے:

قران سے میں نے لذت گوئی سیکھی

یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

پروفیسر محمد اکرم رضا ایک جگہ لکھتے ہیں:

" نعت گو شعرا کی تعداد فکر و تخیل سے زیادہ ہوئی تو تنقید نعت کا تصور وقت کا تقاضا بن کر ابھرا۔ اگر تنقید و تحقیق کا پرچم اپنے وجود کا احساس نہ دلاتا تو رطب و یابس کے نام پر لغت میں وہ کچھ آنے لگتا جو کسی صاحب ایمان کو گوارا نہ تھا۔ خصوصی داد و تحسین کے مستحق ہیں سید صبیح رحمانی جنھوں نے مجلّہ نعت رنگ کا پہلا شمارہ ہی تنقید نعت کے موضوع پر منظر عام پر لا کر سب کو چونکا دیا۔ صبیح رحمانی نے خود کو نعت رنگ کی اشاعت تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تنقیدی ذوق سے آراستہ نعت نگاروں کے دامان تخلیق سے تنقید نعت کے

ادبی شہ پارے برآمد کرکے ان کے شایان شان اشاعت کا اہتمام کیا۔ زیر تذکرہ تصنیف
" نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش' بھی جناب رحمانی کی جرات آزمائیوں کا شاخسانہ ہے۔ '

:کتاب میں نعت پر تنقید و تبصرے کے تعلق سے مختلف مشاہیر کی آراء شامل کی گئی ہیں
حضرت احمد رضا خان محدث بریلوی فرماتے ہیں: ' حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل کام ہے۔اس میں تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے "اور کمی کرتا تو تنقیص ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی کہتے ہیں : " کبھی کبھی ہم حضور ﷺ کی توصیف افراط تفریط کا باعث ہو جاتے ہیں۔ کبھی تو کسر شان کا یہ انداز کہ انہیں اپنے جیسا بشر سمجھتے ہیں اور کبھی ازراہ مبالغہ انہیں اللہ کی مخصوص صفات اور اختیارات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ اللہ کے پردے میں وحدت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے سب کچھ حضور ﷺ سے ہی مانگنا ہے۔ کیا نعت کے ایسے مضامین قران اور سنت کے مزاج کے مطابق اور دانش و معرفت کے " اصول و اخلاق سے مناسبت رکھتے ہیں؟

:پروفیسر شفقت رضوی کتاب ' نعت رنگ کا تجزیاتی تنقیدی مطالعہ' میں لکھتے ہیں

اردو صحافت میں نعت کا جائزہ لیتے ہوئے تیزی سے بلندیوں کو طے کرنے والے نعت " رنگ کا خصوصی تفصیلاتی جائزہ لیا گیا۔ مدیر نعت رنگ نے بلاشبہ تنقید نعت کے چراغ جلائے ہیں اور ہر قسم کے تعصبات اور ادبی چشمک سے بالاتر رہنے کی کوشش کی ہے۔"

دوم : سرکار کے قدموں میں
Reverence Unto His Feet
Translator: Sarah Kazmi
Second Print: 2012
Designed & Printed By: Fazlee Sons-Karachi
Publisher: Naat Research Center

سارہ کاظمی ایک نوجوان شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔لاہور یونیورسٹی میں انگریزی کی لکچرر ہیں۔پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم فل کر رہی ہیں۔نعت سے بے پناہ شوق رکھنے کے باعث انہوں نے سید صبیح رحمانی کی نعتوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

اس در کی سلامی نے مجھ کو وہ کیف دوامی بخشا ہے
اب جس کے اثر سے شام و سحر دل وجد میں ہے، جاں وجد میں ہے

Offering salutation at his gate, has granted an ecstasy that perpetuates

Whose influence silhouettes in my evening and days, heart entranced self entranced

سوم: مرقع چہل حدیث (منظوم فارسی، اردو، پنجابی ترجمانی اور انگریزی ترجمے کے ساتھ)

پروفیسر جاوید اقبال اپنی اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: " بعث کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ رسول پاک ﷺ کے حضور جبریئل علیہ السلام کلام حق لے کر آئے۔ آپ ﷺ نے وحی کو جلدی جلدی یاد کرنا شروع کر دیا مبادا بھول جائیں۔ اللہ تعالی نے فرمایا صرف غور سے سنتے رہیئے، اس کلام کو پڑھوانا اور یاد کرانا ہمارے ذمے ہے۔ حضور ﷺ بعض قرانی مقامات کی وضاحت اسی وقت چاہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالی نے فرمایا: ترجمہ: اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔ قران پاک میں ہر بات کی مکمل تشریح موجود نہیں بلکہ وہ الگ سے حضور ﷺ کو سمجھائی گئی۔ آپ ﷺ کی ہر بات تابع الہامی ہوتی ہے۔ جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ جو شخص چالیس حدیثیں یاد کرے گا، انہیں محفوظ کرے گا اور دوسروں تک پہنچائے گا، اسے قیامت کے دن علماء اور فقہا کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اس فرمان اقدس کے تحت ابتدا ہی سے ایسی چالیس احادیث کا انتخاب ہوتا رہا جو مختصر ہوں اور آسانی سے یاد ہو جائیں۔ چناچہ اربعین کا سلسلہ چل نکلا۔ اربعین اس مجموعہ احادیث کو کہتے ہیں جس میں چالیس حدیثیں کسی مناسبت سے یکجا کی جائیں۔"

چہارم : نعت شناسی
اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر ابو الخیر کشفی ہیں اور اسے ڈاکٹر داؤد عثمانی نے مرتب کیا ہے۔
ڈاکٹر داؤد عثمانی لکھتے ہیں:

" استاد محترم ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے تفہیم قران و حدیث اور مختلف موضوعات پر فکر انگیز مضامین لکھے۔ اخبارات میں کالم لکھے۔غزلیں اور نظمیں کہیں۔ سفرنامے لکھے، لسانیات پر لکھا، بچوں اور نوخواندہ بالغوں کے لیے لکھا۔ درسی کتاب کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ لیکن ذکر مصطفی ﷺ سے آپ کا قلبی اور روحانی تعلق ہمیشہ سے گہرا رہا ہے۔ آپ نے سیرت نبی پر کتابیں لکھیں، نعتیں کہیں۔سو کے قریب نعتیہ مجموعوں پر پیش لفظ، مقدمے اور تقا ریظ لکھیں اور نقد نعت کے حوالے سے بھی کئی مضامین لکھ کر

نعت شناسی اور نعت فہمی کے نئے در وا کیے۔ پچھلی تین دہائیوں سے پاکستان کے ادبی منظر نامے پر شاعری کا نعتیہ آہنگ گونج رہا ہے۔ نعتیہ تخلیقات جب زیور طباعت سے آراستہ ہونے لگیں تو حرف و صوت کی اس عقیدت آمیزیک جائی میں ادبی محاسن تلاش کرنے اور نواردان بساط نعت کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں کشفی صاحب پیش پیش نظر آئے۔ادبی قد و قامت کے حوالے سے کشفی صاحب ہی واحد نقاد تھے جو نعتیہ ادب کی ترویج واشاعت میں اپنی قابل قدر ادبی رائے کے ذریعے ناقد ہائے بے زمام کو سوئے قطار لانے کی سعی فرماتے رہے۔"

:نعت ریسرچ سینٹر کا پتہ یہ ہے
بی۔ ۰۵۔ سیکٹر ۱۱ اے۔نارتھ کراچی۔۷۵۸۵۰

جناب صبیح رحمانی اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اگر کسی کرم فرما کے پاس فن نعت گوئی کے تعلق سے کوئی نادر کتاب موجود ہے تو اسے نعت ریسرچ سینٹر کے مندرجہ بالا پتے پر ارسال کردیں، کتاب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے گا۔ کتاب ارسال کرنے سے قبل ذیل میں درج ای میلز پر رابطہ کیا جاسکتا ہے:

naatrc@gmail.com

naatrang@yahoo.com

نعت گوئی کے فن سے متلعق صبیح رحمانی کی نگرانی میں انٹرنیٹ پر چار ویب سائٹس دستیاب ہیں:

www.sabihrehmani.com

www.naatresearchcenter.com

www.naatrang.net

www.visaaleyar.com

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

ابن صفی پر ایک تازہ کتاب

جناب ابن صفی پر 1972 سے 2012 کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے مشاہیر ادب کے مضامین کے انتخاب پر مبنی راقم الحروف کی کتاب " کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا" 30 جون، 2012 کو شائع ہوئی۔ مذکورہ کتاب کراچی کے اردو بازار میں واقع ویلکم بک پورٹ اور فضلی سنز پر دستیاب ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب، جناب رضا علی عابدی اور ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے تبصرے شامل ہیں۔

کتاب میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر انوارالحق، جناب رئیس امروہوی، جناب شاعر لکھنوی، جناب عزیز جبران انصاری، جناب شکیل عادل زادہ، جناب مشتاق احمد قریشی، جناب مجاور حسین رضوی (الہ آباد)، جناب سرشار صدیقی، جناب احمد صفی (فرزند ابن صفی)، جناب عارف وقار (بی بی سی)، محترمہ زاہدہ حنا، محترمہ بشری رحمان، محترمہ صفیہ صدیقی، جناب شاہد منصور، محترمہ ریحانہ لطیف (جناب ابن صفی کی ہمشیرہ)، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر خالد جاوید (جامعہ

ملیہ میں اردو کے استاد)، جناب عارف اقبال (اردو بک ریویو دلی کے مدیر)، جناب ابن سلطان ناروی، جناب شکیل جمالی (الہ اباد میں ادارہ نکہت سے وابستہ ادیب/ابن صفی کے دیرینہ دوست) و دیگر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں جرمنی میں اردو کی محقق ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹرہیلڈ اور ناروے کے پروفیسر فین تھیئسن کے انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں۔

کتاب کے لیے ابتدائی مضامین تحریر کرنے والوں میں جناب احمد صفی، جناب محمد حنیف، جناب خرم علی شفیق اور جناب سید معراج جامی شامل ہیں۔

کتاب کا عنوان فرزند ابن صفی جناب احمد صفی کا تجویز کردہ ہے۔

زیر نظر کتاب کو مرتب کیے جانے کے سلسلے میں کچھ ایسے لوگوں نے کرم فرمائی کی جن کی مدد کے بغیر یہ کام کرنا ناممکن ہوتا۔ ان میں سرفہرست جناب احمد صفی اور جناب محمد حنیف ہیں۔ احمد صفی صاحب نے کتاب کے آغاز میں شمولیت کے لیے ایک ایسا مضمون تحریر کیا جسے جناب ابن صفی کے پرستار اپنی آنکھیں نم کیے بغیر نہیں پڑھ سکتے۔ حنیف صاحب نے کتاب کے لیے انگریزی سے ابن صفی کا تعارف اردو میں منتقل کیا۔جناب شکیل عادل زادہ کی عنایات مجھ حقیر پر رہیں، سید معراج جامی صاحب نے بحیثیت ناشر نہیں بلکہ ابن صفی کے ایک پرستار کی صورت اس کام میں غیر معمولی دلچسپی لی۔کتاب کے حواشی سخت محنت کے بعد مرتب کیے گئے ہیں۔اس دوران کتاب میں شامل چند مضامین کے جن مصنفین نے مطلوبہ معلومات فراہم کیں ان میں جناب مشتاق احمد قریشی ، جناب شاہد منصور ، جناب ایچ اقبال، محترمہ زاہدہ حنا اور لاہور سے جناب عارف وقار اورجناب حسن نثار شامل ہیں۔ ادھر ممبئی سے اکرم الہ آبادی مرحوم کی صاحبزادی ناہید خاتون ، دلی سے محترم عباس حسینی کے صاحبزادے جناب اعجاز حیدررضوی ، الہ آباد سے پروفیسر مجاور حسین رضوی، جناب کمال احمد رضوی (الف نون)، حیدرآباد یونیورسٹی دکن کے سابق پروفیسر رحمت اللہ یوسف زئی، دکن سے برقی جریدہ سمت کے مدیر جناب اعجاز عبید اور الہ آباد سے جناب چودھری ابن النصیر نے مطلوبہ معلومات کی فراہمی میں بے مثال تعاون کیا۔ بریڈ فورڈ میں مقیم بزرگ افسانہ

نگار جناب مقصود الہی شیخ اور حیدرآباد دکن میں ماہنامہ قومی زبان کے مدیر جناب ارشد زبیری نے چند مطلوبہ فائلز ارسال کیں۔ اللہ تعالی ان سب کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔

اس موقع پر میں محترم ڈاکٹر عبدالقدیر خان (ایٹمی پروگرام کے خالق)،ڈاکٹر معین الدین عقیل ممبئی کے فلمی کہانی کار و مکالمہ نویس جاوید صدیقی اور صاحب طرز قلمکار جناب رضا علی عابدی کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی گراں قدر آرا سے نوازا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ اس کتاب کو مرتب کیے جانے کے دوران جامعہ کراچی سے ایک مدرس جناب محمد یاسین نے راقم سے مدد کی غرض سے رابطہ کیا، وہ ایم فل کر رہے ہیں اور ان کے انگریزی مقالے کا موضوع ابن صفی ہیں۔ یہ ایک اہم پیش رفت ہے۔ مجھے اس بات پر کامل یقین ہے کہ آنے والے وقت میں جناب ابن صفی کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فن پر مزید تحقیقی کاموں کا آغاز ہوگا۔

کتاب میں جناب ابن صفی کی چند یادگار تصاویر بھی شامل ہیں، ان میں ان کے بچپن کی ایک تصویر بھی شامل کی گئی ہے۔ دیگر تصاویر میں ابن صفی کے والدین، ان کے اہل خانہ کی تصویریں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ طالب جوہری کے ہمراہ ایک نایاب تصویر بھی شامل ہے۔

کتاب میں فلم دھماکہ کے پرڈیوسر مولانا ہپی کی ایک حالیہ تصویر ہے جو چالیس برس کے طویل عرصے بعد زیر تذکرہ کتاب کے ذریعے پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔

قیمت: 500 - رعایت: 25 فیصد
صفحات: 384
ناشر: بزم تخلیق ادب، کراچی
پوسٹ بکس نمبر 17667
کراچی-75300

ای میل: maerajjami@yahoo.co.uk

0321-8291908

ناشر کو 350 روپے کا منی آرڈر کرکے یہ کتاب.براہ راست بھی منگوائی جا سکتی ہے۔

اس قیمت میں ترسیل کی لاگت شامل ہے۔

رابطہ نمبر اردو بازار، کراچی

ویلکم بک پورٹ:

021-3639581

فضلی سنز:

021-32212991

021-32629724

لاہور میں عنقریب یہ کتاب سرائے پر دستیاب ہوگی جن کا پتہ یہ ہے:

کتاب سرائے

فرسٹ فلور

الحمد مارکیٹ

غزنی اسٹریٹ

اردو بازار لاہور

فون نمبر: 37320318 -042

راولپنڈی و اسلام آباد میں کچھ دنوں کے بعد یہ "کتاب گھر" پر دستیاب ہوگی:

کتاب گھر

اقبال روڈ

کمیٹی چوک

راولپنڈی

فون نمبر: 5552929-051

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ایک گمنام انسان کی گمنام خودنوشت

دہلی سے اپریل 2012 میں شائع ہونے والے ایک ادبی پرچے کا تازہ شمارہ راقم الحروف کو بھیجا گیا۔ اس میں درج مختلف موضوعات پر مشتمل کتابوں کی ایک طویل فہرست میں ایک خودنوشت کا نام شامل تھا۔ اس کے لکھنے والے مسعود علی نامی صاحب تھے جن کا پتہ بھی فہرست میں درج تھا۔ یہ کراچی کی ایک دور افتادہ بستی میں مقیم 72 سالہ آرٹسٹ جناب مسعود علی ہیں جن کے غلط پتے کو ہم نے کچھ دیر کی محنت کے بعد کھوج نکالا۔ وہ اس وقت اپنی قیام گاہ پر تنہا تھے۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو وقت گزرنے کا علم ہی نہ ہوا۔ مسعود صاحب کا دل ہمیں جلدی رخصت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اپنا گھر بھی دکھایا اور خودنوشت ہاتھ میں تھام کر اس کے مندرجات بھی پڑھ کر سناتے رہے۔

تین بیٹیوں کی شادیاں کرنے کے بعد مسعود علی اور ان کی اہلیہ کا خیال تھا کہ اکلوتے بیٹے اور اس کے دو ننھے بچوں کے سہارے بقیہ زندگی چین سے کٹ جائے گی لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ چند برس پیشتر ان کا بیٹا کلفٹن میں گاڑیوں کی دوڑ کے مقابلے کو دیکھنے گیا جہاں ایک گاڑی بے قابو ہوئی اور اگلی صبح ایک

بوڑھا باپ اپنے جوان بیٹے کی قبر کو مٹی دے رہا تھا۔ اس حادثے نے انہیں اور ان کی اہلیہ کو توڑ کر رکھ دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مسعود علی کی فطری بذلہ سنجی عود کرآئی اور بظاہر وہ یہ غم بھلانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس عمر میں بھی ایک ادارے میں ملازمت کرتے ہیں، وقت پر سونا، وقت پر جاگنا اور خوش رہنا۔۔۔ یہ ان کی زندگی کے چند زریں اصول ہیں جن پر عمل کرکے وہ آج بہتر برس کی عمر میں بھی کم از کم اپنی عمر سے بیس برس چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ دوران گفتگو ان کی اہلیہ بھی آگئیں۔ مسعود علی اپنے کمرے کے غسل خانہ کا دروازہ کھول کر دکھانے لگے: " یہ دیکھیے ! خاصا بڑا ہے۔ 'نہلانے' میں آسانی رہے گی"۔۔۔ ان کے اس جملے پر میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوئے" ارے بھئی ! میں نے تو اپنی تینوں بیٹیوں کی شادیاں بھی کراچی ہی میں کی ہیں، یہ سوچ کر کہ انتقال کے بعد کوئی امریکہ سے آتی تو کوئی لندن سے اور میں ادھر ایدھی کے سرد خانے میں دو روز تک پڑا ان کا انتظار کرتا رہتا۔"

۔۔۔

مسعود صاحب کی صاف گوئی نے مجھے ایک لحظے کو سن کر دیا۔۔۔ !

اچھا یہ تو بتائیے کہ 'بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے ' بقول آپ کے نہ تو بازار میں رکھوائی گئی اور نہ ہی کسی اخبار میں اس پر تبصرہ شائع ہوا، پھر یہ دہلی کیسے پہنچی حضرت ؟ " ۔۔میرے اس سوال پر مسعود علی نے کہا کہ وہ خود حیران ہیں کہ یہ کیا معمہ ہے۔کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے " رسالہ ہمدرد صحت میں اس کا مختصر تعارف شائع ہوا تھا۔" ۔۔ادھر میں جھٹ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ہمدرد کراچی کے علاوہ یہ ادارہ دہلی میں بھی تو ہے جہاں اسے حکیم سعید کے والد حکیم عبدالمجیدنے 1960 میں قائم کیا تھا۔یقیناً ہمدرد صحت کا وہ شمارہ دہلی گیا ہوگا جہاں سے اس پرچے کے مدیر تک پہنچا ہوگا جس میں کتابوں کی وہ فہرست شائع ہوئی ہے جس میں مسعود علی کی کتاب کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔

کچھ وقت گزرا کہ مسعود علی اپنا لیپ ٹاپ اٹھا لائے جس میں ان کے مارچ 2012

کے دورہ لکھنو کی ویڈیو محفوظ تھی۔ ہم کراچی کے ایک دور پرے کے علاقے میں خوشگوار ٹھنڈی ہوا میں لکھنو میں گزرے لمحات کو دیکھتے رہے۔ بقول مسعود علی، انہوں نے یہ خودنوشت اپنے دوستوں اور عزیز اقارب کے لیے لکھی ہے لیکن اکثریت ایسی ہے جنھوں نے اسے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں انہیں اس کتاب کو اردو بازار میں کتابوں کی چند بڑی دکانوں پر رکھوانے پر آمادہ کرتا رہا۔

مسعود علی کے والد لکھنو کے موضع کیولی سے تعلق رکھتے تھے۔ سرکاری ملازم تھے، طبیعت میں سختی تھی۔ ان کے والد اپنے دیگر اہل خانہ کے ساتھ تقسیم ہند کے فورا بعد کراچی آ گئے تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ان کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے وہ بدل ہو گئے۔ وہ ایک روز کہیں بس میں سفر کر رہے تھے۔ کنڈکٹر بار بار آگے بڑھنے پر اصرار کر رہا تھا۔ وہ ہر مرتبہ اس کے ہانک لگانے پر آگے بڑھ جاتے تھے۔ آخر میں کنڈکٹر زور سے بولا ' اوئے شیر وانی ! آگے بڑھو' ۔۔۔ مسعود علی کے والد کا پارہ چڑھ گیا۔ لاحول پڑھ کر کہنے لگے اس ناہنجار نے ہمیں شیر اونی کہہ کر مخاطب کیا۔ انہوں نے بس رکوائی اور نیچے اتر گئے۔ گھر پہنچ کر اپنے بچوں سے کہا کہ یہ ملک رہنے کے قابل نہیں ہے، یہاں کسی کی کوئی عزت ہی نہیں ہے، سو میں واپس لکھنو جا رہا ہوں۔ سب لوگوں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ واپس گئے تو ایسے کہ پھر پاکستان کبھی نہیں لوٹے۔

ہندوستان میں مسعود علی کے والد نے آسودہ حال زندگی گزاری۔ وہ نیپال کی ترائی میں ریاست نانپارہ میں تعینات تھے۔ مسعود علی تقسیم سے قبل اپنی بچپن کی یادوں کے باب میں لکھتے ہیں: " والد صاحب شکار کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ان کو قورمہ زیادہ پسند تھا۔اس کے ساتھ گرم روٹیاں پکا کر بھیجی جاتی تھیں۔ مرتبانوں میں چٹنیاں اور اچار بھی دستر خوان کی زینت بڑھاتے تھے۔ سبزی اور دال تازہ گھی میں بگھاری ہوتی تھی، قورمے میں دو انگل چکنائی کا تار ضروری تھا۔پودینے کی چٹنی اور خشکہ چاول تو دستر خوان کے لازمی جز تھے۔ سالن دو طرح کے ہوتے تھے، کبھی لوکی گوشت، کبھی پالک گوشت۔ شکار کے گوشت کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔کالے اور بھورے تیتر مسلم بھون کر پکائے جاتے تھے۔ سارا کھانا اصلی گھی میں پکتا تھا۔جب سرسوں کی فصل تیار ہوتی تھی تو والد صاحب قرب و جوار کے گاؤں سے شہد کے بڑے بڑے چھتے منگواتے تھے۔اس پیلے شہد کا ایک منفرد ذائقہ ہوتا تھا، سال بھر کی ضرورت کے لیے شیشے کی بوتلوں میں بھر کر رکھ لیا جاتا تھا۔ "

مسعود علی نے بچپن میں ہر وہ کام کیا جو ایک بچے کو کرنا چاہیے۔ان کے دوستوں نے کھیت میں طوطے پکڑنے کا طریقہ وضع کیا ہوا تھا۔پتلی رسی میں بانس کی نلکیاں ڈال کر اسے لمبائی میں کھیت کے اوپر باندھ دیتے تھے ۔جونہی طوطوں کاجھنڈآکر اس کے اوپر بیٹھتا تھا، وہ نلکیاں گھوم جاتی تھیں اور طوطے الٹے لٹک جاتے تھے۔طوطے کی یہ خصلت ہے کہ جب تک وہ سیدھا نہ ہوگا، نلکی کو سختی سے پکڑے الٹا ہی لٹکا رہے گا اور آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہے گا۔اسی سے فائدہ اٹھا کر انہیں دبوچ لیا جاتا تھا ، دن بھر کی قید کے بعد شام کو یہ طوطے آزاد کردیے جاتے تھے اور اس طرح وہ دوبارہ کھیت کا رخ کرنے سے اجتناب برتتے تھے۔ بارشیں معمول سے زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ اس دوران ندی میں مگرمچھ آجایا کرتا تھا، بکری اس کی مرغوب غذا تھیں۔ گاؤں والوں نے مگر مچھ سے نمٹنے کا ایک انوکھا حل نکلا تھا۔ بکری کے بچے کی کھال میں چونا بھر کر اس کی سلائی کردیتے تھے اور اسے بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ تالاب کے کنارے لے جاتے تھے۔ چونے سے بھرا بکری کا بچہ ندی کنارے کھڑا کردیا جاتا تھا اور کچھ

دیر بعد بکریوں کو محفوظ جگہ پر لے جایا جاتا تھا۔ سب لوگوں کے جانے کے بعد مگر مچھ تیزی سے اپنے 'ڈمی' شکار پر حملہ آور ہوتا تھا اور اسے ہڑپ کرنے کے بعد واپس پانی میں چلا جاتا تھا۔ اس کے پیٹ میں موجود چونے کو جیسے ہی پانی ملنا شروع ہوتا، چونا آہستہ آہستہ گرم ہو کر کھولنے لگتا، مگر مچھ اس ناگہانی افتاد سے پریشان ہو کر پانی میں بھاگا بھاگا پھرتا اور بالآخر دم توڑ دیتا تھا۔

مسعود علی تقسیم کے بعد پہلے لاہور اور بعد ازاں کراچی آئے۔ کراچی میں ان کا قیام بہار کالونی میں تھا جہاں زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ نئی جگہ، نیا ماحول۔ ایک واقعہ تو ان کے ساتھ خاصا دلچسپ پیش آیا۔ مسعود علی کا ہم جماعت جس کے وہ ساتھ مل کر پڑھائی کیا کرتے تھے، ایک روز نہ آیا، یہ اس کے بتائے ہوئے پتے پر اس کی تلاش میں نکلے۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی اور سفید کرتہ پاجامہ پہنے مسعود علی گلیوں گلیوں بھٹک رہے تھے کہ انہیں احساس ہوا کہ ایک گھر کی چار دیواری پر بیٹھے چار پانچ لڑکے انہیں حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نے انہیں کرخت لہجے میں آواز دی: " اوئے ایتھے آ"۔ مسعود علی نے بوکھلا کر عقب میں دیکھا کہ شاید مخاطب کوئی اور ہے، پھر غلطی کا احساس ہوا تو بے اختیار ان لڑکوں کے پاس چلے گئے اور لکھنو کے نستعلیق لہجے میں گویا ہوئے: " فرمایئے"۔ اس سننا تھا

کہ وہ تمام لڑکے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کہنے لگے " لو بھئی فرماؤ۔۔۔اے کیہڑی شے اے "۔ مسعود علی حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگے۔ بہت برسوں بعد ایسا ہی کچھ ایک مرتبہ دوبارہ ہوا جب مسعود علی کے دفتر میں ایک دبلے پتلے لکھنوی بزرگ ملازم رکھے گئے۔ عید کا دن تھا۔ دفتر کے ایک اور ملازم مجید صاحب کہ بہت لمبے تڑنگے تھے اور پنجاب سے ان کا تعلق تھا، ان لکھنوی بزرگ سے عید ملنے کے لیے ان کے گلے لگ گئے، خوب بھینچ بھینچ کر عید ملتے رہے۔ ادھر وہ بزرگ چلاتے رہے کہ قبلہ ! خدارا مجھے چھوڑ دیجیے۔ مجید صاحب نے جب انہیں چھوڑا تو وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ اب تو مجید صاحب بہت گھبرائے، سب نے انہیں اٹھایا اور اسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان بزرگ کی دو پسلیاں ٹوٹ چکی ہیں۔

خودنوشت کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں ان کے بچپن کی یادوں پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ اس میں مسعود علی نے اپنے اہل خانہ کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں ، کچھ واقعات دفتر کیے ہیں۔ کتاب میں چند خطوط شامل کیے گئے ہیں اور آخر میں مصنف اور ان کی اہلیہ کے سفر لکھنو کی روداد بھی موجود ہے۔

"بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے ' ' ایک بذلہ سنج انسان کی داستان حیات ہے۔ انداز تحریر میں شوخی ہے۔ مسعود علی نے یہ کتاب اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے لیے تحریر کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ عام قارئین تک بھی پہنچے۔

لاہور کے ادبی جریدے الحمراء جولائی 2012 میں شائع ہوا ایک خط

مکرمی، تسلیمات

الحمرا کا مئی 2012 کا شمارہ موصول ہوا۔ گزشتہ شمارے کی رسید نہ دے سکا تھا۔ خاکسار کے مکتوب کو پروفیسر جمیل آذر نے خلوص و پسندیدگی کی سند بخشی، ان کا شکر گزار ہوں۔ تازہ شمارے میں پروفیسر صاحب کا مضمون 'غالب۔پہلا علامتی شاعر' خاصے کی چیز رہی۔ امید ہے کہ پروفیسر صاحب' غالب بطور امیجسٹ' سے بھی جلد نوازیں گے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا مضمون 'حکیم نیر واسطی' ایک نابغہ روزگار شخصیت کی یادوں کو سموئے ہوئے ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنے خاکوں کے مجموعے 'کہاں سے لاؤں انہیں' میں حکیم صاحب کا عمدہ خاکہ تحریر کیا ہے۔ مظہر شیرانی صاحب نے حکیم نیر واسطی کو نباض الملک بجا طور پر کہا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا مضمون پڑھ کر ذہن و قلب میں 'جہان دانش' کی یاد تازہ ہو گئی۔ احسان دانش کو حکیم صاحب کے پاس پہلی مرتبہ اختر شیرانی لے کر گئے تھے۔ حکیم صاحب کا لاہور میں نام تھا، مقام تھا، بڑے بڑے رئیس ان کے یہاں آتے تھے۔ جہان دانش میں ایک واقعہ تو ایسا پڑھا تھا کہ جس نے خون رلا دیا، اور جو آج تک ذہن پر نقش ہے احسان دانش بیان کرتے ہیں کہ: " ایک دن حکیم صاحب کے مطب میں ایک مفلوک الحال اور نادار قسم کا انسان آیا اور نہایت عاجزی سے کہنے لگا حکیم صاحب ! میری لڑکی

بیمار ہے آپ اللہ کے لیے اسے چل کر دیکھ لیں۔ اس فقرے کے ادا کرتے کرتے اس کی پتلیاں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ وہ بیکو کمپنی کا ایک مزدور تھا جو حکیم صاحب کے مطب سے چار فرلانگ کے فاصلے پر رہتا تھا۔ حکیم نیر واسطی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیے۔ میں (احسان دانش) حیران تھا کہ یہ تو بڑے بڑے امرا کے یہاں اس طرح نہیں جاتے اور پھر اس وقت جب مطب مریضوں سے بھرا ہوا ہے۔ حکیم صاحب اس کے کوارٹر میں گئے، میں ان کے ساتھ تھا، دیکھا کہ ایک کمزور مگر جوان لڑکی ایک جھلنگے کے چوکھٹے میں ڈوبی ہوئی لیٹی ہے اور ٹانگوں پر پرانے اخباری کاغذ ڈھکے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب نے پوچھا یہ اس کی ٹانگوں پر اخبار کیوں ڈالے ہوئے ہیں، پھر خفگی سے کہا ہٹاؤ انہیں۔ لڑکی کے باپ نے جھکی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا حکیم جی! بے پردگی کے خیال سے کاغذ ڈھک دیے ہیں، بچی کا پاجامہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔

حکیم صاحب تو یہ سن کر سناٹے میں آ گئے، کھڑے کھڑے آنسوؤں سے گلا بھر گیا اور ہونٹ کانپنے لگے۔ بمشکل ضبط کیا اور نبض دیکھ کر کچھ اور سوالات کیے جو لڑکی کی بیماری سے متعلق تھے۔ اس کے فوراً بعد لڑکی کے باپ کو ساتھ لے کر مطب گئے اور اپنے دوا ساز سے جلد دوا تیار کرنے کے لیے تاکید کرکے اپنے زنان خانے میں گئے اور دوا کے تیار ہونے تک اپنی بیگم کے دو نئے جوڑے، ایک چادر اور بیس روپے دیتے ہوئے ،مزدور سے کہا دیکھو یہ کپڑے اس بچی کو پہناؤ

چادر اڑھاؤ اور اس معمولی سی رقم سے کھانے پینے کا سامان لا کر گھر میں رکھو، بلاناغہ دوا خانے سے آ کر دوا لے جانا، اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔

(پھر نہ جانے کب تک دوا جاتی رہی۔" (جہان دانش

لیجیے ڈاکٹر خورشید صاحب! یہ واقعہ لکھتے لکھتے آنکھوں کی خوب صفائی ہو گئی۔

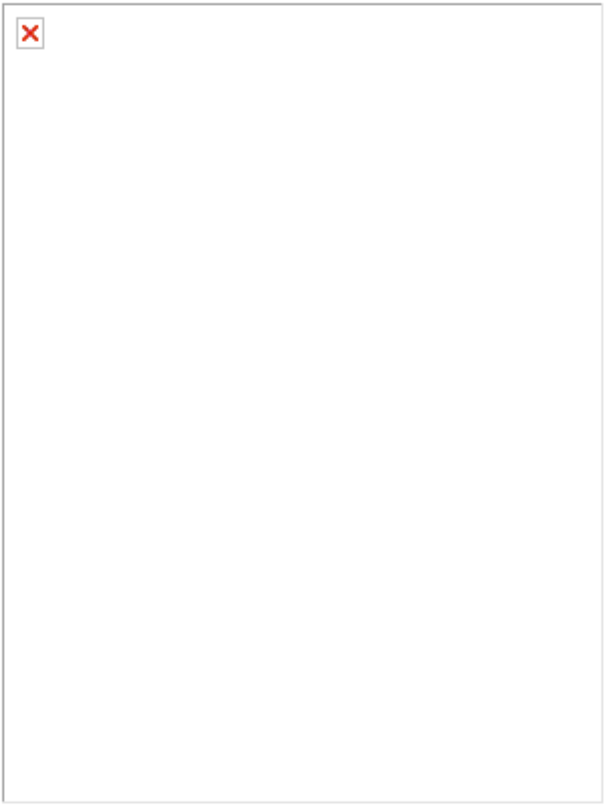

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے جناب مشفق خواجہ کو یاد کیا ہے۔ عرض کرتا چلوں کہ حیدرآباد (دکن) یونیورسٹی میں ایک صاحب مشفق خواجہ پر پی ایچ ڈی کررہے

ہیں، انہوں نے خاکسار سے رابطہ کیا تھا۔ان کی بہتیری مدد تو لاہور میں مقیم کتاب گھر کے حسن علی کر ہی چکے تھے، مشفق خواجہ کی تصاویر و دیگر مواد کی فراہمی کی ذمہ داری' راقم کے ذمے آئی ہے۔

الحمراء میں قسط وار شائع ہونے والی آپ بیتیاں سج سج آگے بڑھ رہی ہیں، قارئین کو انتظار رہتا ہے۔ محمودہ احمد بشیر صاحبہ اپنے شوہر کی یاداشتوں کو سمیٹ رہی ہیں، یہ مستحسن کام ہے، یوں تو 'دل بھٹکے گا' اور 'جو ملے تھے راستے میں' کے مطالعے کے بعد احمد بشیر صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند قاری کے سامنے آ جاتی ہے لیکن ان کی اہلیہ کے لکھے واقعات کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔

الحمراء میں خطوط کا گوشہ بھی کچھ الگ ہی مزہ دیتا ہے۔ مضمون لکھنے کے بجائے مکتوب لکھ بھیجیے، کچھ خاص فرق تو نہیں۔ گھر بیٹھے ادبی دنیا کی معلومات آپ کے دروازے پر پہنچ جاتی ہیں۔ اس مرتبہ محفل احباب کے سرخیل جناب ڈاکٹر انور سدید کے خطوط سے آغاز ہوا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: " میں نے پچھلے دنوں آپ سے حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر جاوید مقدر "کا ذکر کیا تھا جنھوں نے راجہ مہدی علی خاں پر مقالہ لکھ کر عثمانیہ یونیورسٹی" دکن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ یہ مقالہ چھپ گیا ہے لیکن پاکستان میں کسی کے "پاس نہیں پہنچا۔

ڈاکٹر صاحب ! ادب کا یہ طالب علم اس لحاظ سے خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہے کہ ماہ اپریل میں مذکورہ مقالہ ایک کرم فرما کے توسط سے اس کی دسترس میں آگیا تھا۔ بلاشبہ یہ راجہ مہدی علی خاں صاحب پر اپنی نوعیت کا پہلا کام ہوا ہے۔ مقالہ نگار کا درست نام " ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر " ہے۔اب اس کی کچھ تفصیل عرض کرتا ہوں۔اپریل کی 15 تاریخ کو میرے ایک کرم فرما کی رہائش گاہ پر موجود 'خاتون' و حضرات نے نظام آباد دکن سے آئے ہوئے بزرگ صحافی جناب فرید تبسم خاں کو خوش آمدید کہا۔ فرید صاحب روزنامہ مارننگ ٹائمز سے وابستہ ہیں۔ شرکاء کی موجودگی ایک ادبی نشست میں تبدیل ہوجائے گی، اس بات کا علم مجھے پہلے سے نہ تھا۔ دکنی شیروانی میں ملبوس حیدرآبادی نستعلیق لب و لہجے کے مالک فرید تبسم خاں اپنے ہمراہ ایک قیمتی کتاب لیتے آئے تھے۔ قیمتی اس لیے کہ یہ بمبئی فلمی صنعت سے وابستہ گیت کار و شاعر راجہ مہدی علی خاں پر پی ایچ ڈی کا پہلا تحقیقی مقالہ تھا۔ راجہ صاحب پر اس سے قبل تحقیق نہیں کی گئی تھی اور مصنف نے ہندوستان و پاکستان میں اس بات کی تصدیق کے بعد ہی اس موضوع پر اپنے کام کا آغاز کیا۔ پاکستان میں ان کا رابطہ ڈاکٹر جمیل جالبی سے تھا۔ 'راجہ مہدی علی خاں کی ادبی خدمات' کے عنوان سے زیر تحت لکھی یہ کتاب سن 2006 میں دکن سے شائع ہوئی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید یہ کام حال ہی کیا گیا ہوگا۔ ڈاکٹر مقدر نے اس کے ساتھ ہی راجہ صاحب کے خطوط کو

بھی یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کردیا ہے۔
متذکرہ مقالہ 540 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں راجہ صاحب کی نادر تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔راجہ مہدی علی خاں کا غیر مطبوعہ کلام بھی اس ضخیم کتاب میں شامل ہے۔ اللہ بخشے راجہ صاحب کو، کیا باغ و بہار انسان تھے ۔پژمردہ لوگوں کو پل میں جی اٹھنے پر مجبور کر دینے والے۔ افسوس کہ ان کی عمر اور ایک عاقبت نااندیش رشتہ دار نے ان سے وفا نہ کی۔راجہ صاحب کو ذیابطیس کا مرض لاحق ہوگیا تھا،اس رشتہ دار نے انہیں چونا ملا ہوا پانی پینے کا مشورہ دیا، وہ اس پر باقاعدگی سے عمل کرنے لگے تھے۔اس کے نتیجے میں ان کے گردے خراب ہوگئے ، ان دنوں گردوں کا عصری علاج نہ تھا، سو 23 ستمبر 1915 کو وزیر آباد میں پیدا ہونے والا ہنس مکھ انسان، افسانہ نگار رام لعل اور کنہیا لال کپور کا بے تکلف دوست، 27 جولائی 1966 کو محض اکیاون برس کی عمر میں انتقال کرگیا۔ یہاں مجھے ممتاز مفتی یاد آرہے ہیں جن کو کسی معمولی بیماری کی شکایت ہونے پر ایسے ہی کسی عقل مند نے چونا ملا پانی پینے کا مشورہ دیا تھا۔ ممتاز مفتی پرانی دیواریں تاکتے تھے،ان سے چونا اتار ، پانی میں گھول، غٹ غٹ پی جاتے تھے، دن میں کئی کئی گلاس ٹھکانے لگا دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تکلیف تو ویسے کی ویسی ہی رہی، ساتھ کوئی اور بیماری چمٹ گئی۔

یوں تو راجہ صاحب نے بمبئی کی فلم نگری کے لیے ایک سے ایک گیت لکھے لیکن جب جب بھی راجہ صاحب کا لکھا، لتا منگیشکر کا گایا، مدن موہن کا کمپوز کیا ہوا " آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے" سنتا ہوں، بے اختیار بیس برس کی عمر میں لاہور میں 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کو ایڈٹ کرنے والے ،انسان دوست، راجہ مہدی علی' خاں کی یاد آجاتی ہے۔ راقم 2007 میں جناب اے حمید سے ملاقات کی غرض سے لاہور گیا تھا اور اس درویش صفت انسان کی ہم نشینی میں کافی وقت گزارا اور جہاں ان سے اور کئی موضوعات پر بات ہوئی، وہاں راجہ مہدی علی خان کا احوال بھی ان کی زبانی سنا۔ گرچہ یہ ہم بہت عرصہ قبل ان کے ایک مضمون میں پڑھ چکے تھے۔ یاد کیجیے اے حمید صاحب کا بیان کردہ دہلی کے تیس ہزاری کوارٹرز کا دلچسپ احوال جہاں کرشن چندر، راجہ مہدی علی خاں، اوپندر ناتھ اشک، منٹو، ن م راشد جیسی شخصیات مقیم تھیں۔

بمبئے ٹاکیز کے تحت بننے والی فلم 'آٹھ دن' میں منٹو، میرا جی اور اشک کے ساتھ ساتھ راجہ صاحب نے بھی ایک مختصر سا کردار ادا کیا تھا۔

خاکسار الحمراء کے زیر تبصرہ شمارے کے لیے مکتوب نہ بھیج سکا، اور نہ ہی ایک ماہ سے ڈاکٹر انور سدید کی "تنہائی جگمگا اٹھنے" کا سبب بنا۔ وجہ ٹھہری جناب ابن صفی پر اپنی کتاب کی تیاری۔ اس کام میں گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے

غرق' ہوں۔ یہ صفی صاحب پر 1972 سے 2012 کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے' اہم مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ مضمون نگاروں میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، سرشار صدیقی، رئیس امروہوری، دہلی کے ادیب و مدرس ڈاکٹر خالد جاوید، نصر اللہ خاں، الہ آباد کے پروفیسر مجاور حسین رضوی، پروفیسر انوار الحق، شکیل عادل زادہ، زاہدہ حنا، حسن نثار، عارف وقار و دیگر مشاہیر ادب شامل ہیں۔ کتاب کے حواشی کے لیے تو جان لڑا دی ہے۔ پاک و ہند کے ادب دوستوں کی جانب سے برابر کمک پہنچتی رہی۔ یہ صفی صاحب کے ایک ادنی پرستار، جو ان پر ایک محقق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، کی جانب سے اس شخص کو ایک خراج تحسین و عقیدت ہے جس کی تحریریوں نے آج کے بہتیرے ادیبوں اور نقادوں کو اردو ادب کی جانب مائل کیا تھا۔

پروفیسر عبدالکریم نے سعادت حسن منٹو کو بروقت یاد کیا۔ حال ہی میں منٹو صدی زور و شور سے منائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو ایک اہم اطلاع دیتا چلوں۔ امریکہ میں مقیم بزرگ ادیب جناب ابوالحسن نغمی نے سعادت حسن منٹو پر ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ نغمی صاحب کی منٹو کے آخری تین برسوں سے جڑی یادوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مسودہ خاکسار کے پاس ہے اور عنقریب یہ کتاب کراچی سے شائع ہو گی۔

محمد ابراہیم خلیل صوابی کی تجویز کہ الحمراء انٹرنیٹ پر ہو اور اس کا ایک عدد ای میل بنوایا جائے، نہایت مناسب ہے۔ یوں اس کی پر زور تائید کروں گا۔ اب تو کتابوں پر بھی مصنفین کے ای میل کو درج کیے جانے کا رواج عام ہو چلا ہے۔ چند روز قبل جسٹس حاذق الخیری کی خودنوشت 'جاگتے لمحے' شائع ہوئی۔ کراچی میں اس کی تقریب رونمائی منعقد کی گئی۔ ہم ایسے طالب علموں کی آسانی کی خاطر جسٹس صاحب نے اپنا ای میل کتاب میں درج کیا ہے۔ خودنوشت دلچسپ ہے، چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس طور بیان کرتے چلے گئے ہیں کہ آغاز سے اختتام تک، قاری ہلنے نہ پائے۔ کچھ کتاب کی دلچسپی کی وجہ سے اور کچھ جسٹس صاحب کے خوف سے۔ ایک جگہ جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ فلاں کی حویلی کے باہر ہاتھی " جھوما" کرتے تھے۔ ہمیں آسانی ہو گئی، جسٹس صاحب کو جھٹ ایک ای میل روانہ کیا اور، گرچہ کہ وہ اب ریٹائر ہو چکے ہیں، جان کی امان مانگ کر عرض کیا کہ حضور! ہاتھی جھولا کرتے تھے، یہ ترکیب تو ہم نے پڑھی تھی، حویلی کے باہر کہیں وہ ہاتھی آپ کے کسی عدالتی فیصلے کو سن کر تو نہیں جھومتے تھے؟ خدا نہ کرے کہ وہ اس گستاخانہ تبصرے کا از خود نوٹس لے لیں۔ جناب اختر تنویر سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں بھی راہنمائی فرمائیں۔ 'استفادہ حاصل کرنا' کی ترکیب کے سلسلے میں ڈاکٹر اختر تنویر کی 'کمک' نے ڈھارس بندھائی، اب مجھے کس بات کی فکر، دھڑلے سے استعمال کروں گا۔ ویسے کچھ عرصے قبل اجمل کمال صاحب نے بھی اسی سلسلے میں خاکسار کی تشفی کر دی تھی۔ اجمل صاحب سے فیس بک پر مستقل رابطہ رہتا ہے اور

رہا سوال ملاقات کا تو اس کے لیے صدر کراچی کے علاقے ریگل چوک میں واقع پرانی کتابوں کا اتوار بازار کافی ہے جہاں ہر اتوار کی صبح راقم کا 'پھیرا' ایک طے شدہ معمول ہے، اجمل صاحب وہاں اکثر علی الصبح ٹہلتے ٹہلتے آ نکلتے ہیں۔ڈاکٹر اختر تنویر سے عرض ہے کہ 'چاکیواڑہ میں وصال' علی گڑھ پہنچی اور پروفیسر اطہر صدیقی نے پڑھ ڈالی، مگر اس کو کیا کیجیے کہ انہوں نے یہ ناول زولوجی کے ایک پروفیسر کی آنکھ سے پڑھا اور اس کو کچھ خاص نہ پایا۔ جبکہ خالد صاحب کی تحریریں پڑھتے وقت ادھر اپنا وہی حال ہوتا ہے جو بانو قدسیہ صاحبہ کا ہوتا تھا کہ بقول اشفاق احمد مرحوم، وہ پڑھتی جاتی تھیں اور ہنستی جاتی تھیں۔ گزشتہ برس میں طارق روڈ قبرستان میں خالد صاحب کی قبر ڈھونڈتا تھا جو بلاآخر ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد اس شان سے ملی کہ پھولوں کی ایک شاخ میں چھپے کتبے پر جلی حروف میں لکھا دیکھا: " چاکیواڑہ کا درویش"۔ گزشتہ دنوں محمد خالد اختر کے ناول ' چاکیواڑہ میں وصال' کا عنوان بہت یاد آیا۔ کئی معصوم بے گناہ لوگوں کا لیاری آپریشن میں چاکیواڑہ میں 'وصال' ہی تو ہوا۔

الحمراء کے اپریل کے شمارے سے سلسلہ شروع ہوا جناب مستنصر تارڑ کے ذکر کا اور مئی تک اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کے خط میں بارے جناب تارڑ تبصرہ بھی نظر سے گزرا۔ نیلم احمد بشیر نے تو اپنے مضمون

میں خود کو 'پدی' ڈکلئیر کر ہی دیا (نیلم صاحبہ افسانہ ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں، اگر وہ خود کو پدی کہنے پر مصر ہیں تو پھر اگلی سطور میں احقر جو لکھنے کی جسارت کر رہا ہے اسے پدی کا شوربہ' ہی سمجھا جائے تو بہتر)۔۔ یونس جاوید نے جوابی مضمون سے ' نوازا۔ غرض یہ کہ جناب تارڑ کا تذکرہ چہار سو ہے۔ چلتے چلتے یہ خاکسار بھی بقدر ظرف اس میں اپنا حصہ ڈال دے۔۔۔ فروری 2012 میں ایک انگریزی روزنامے میں مستنصر حسین تارڑ کا انٹرویو شائع ہوا۔ ماسکو یونیورسٹی کی Professor Galina Dushenko کے لیے پاکستان یا تو فیض کی شاعری ہے یا پھر مستنصر کا ناول۔ ان کے الفاظ میں:

"For us, Pakistan is Faiz's poetry and Tarrar's novels

فیض کی شاعری تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، البتہ خاتون پروفیسر کے بیان کے دوسرے حصے کو پڑھ کر ماسکو اور اسلام آباد کے خراب تعلقات کا سبب اب ذرا واضح طور پر سمجھ میں آیا ہے۔ گزشتہ 35 برس میں تو ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب یہ یہ حالات خطرناک حد تک خراب ہو گئے تھے، خبریں گرم تھیں کہ روس کی جانب سے حملہ اب ہوا کہ تب ہوا۔ یہ بات بھی قابل تشویش ہے کہ خاتون پروفیسر کے لیے پاکستان، تارڑ صاحب کا ناول ہی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، خاتون نے ناول کا نام نہیں لکھا۔ یہاں ایک مطلب تو سیدھا سیدھا یہ نکلتا ہے کہ شاید خاتون کا اشارہ یہاں تارڑ صاحب کے ناول راکھ کے عنوان کی جانب ہے کہ وطن

عزیز میں گزشتہ چند برسوں سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر خیال "راکھ" اور خس و خاشاک' ہی کی جانب جاتا ہے۔ ماسکو یونیورسٹی میں 35 برس سے تارڑ صاحب' کی چند تحریریں نصاب میں شامل ہیں۔ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام عموما سارا سال ہی ہوتے رہتے ہیں اور ان کے عوض پی ایچ ڈی کی سند بھی جاری کی جاتی ہے، ہمیں امید ہے کہ یہ تارڑ صاحب کی تحریروں پر بھی پی ایچ ڈی کی جائے گی یا ہو سکتا ہے کہ اب تک کی جاچکی ہو۔

خامہ بگوش نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ:

مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں جن کاموں پر سزا ہو سکتی ہے، انہی کاموں پر بعض" پسماندہ ایشیائی ممالک میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔ تارڑ صاحب کے معاملے میں مندرجہ بالا بیان کو الٹ کر (مہذب ممالک سے ایشیائی ممالک کے الٹ پھیر کے ساتھ) پڑھا جائے تو مفہوم واضح ہوتا نظر آتا ہے۔

الحمراء کی محفل احباب کے کرم فرما سوچ رہے ہوں گے اب تک ہم نے تارڑ صاحب کی تحریروں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کیوں محفوظ کر رکھی ہے سو اس بارے عرض ہے کہ ہم اوائل عمری ہی سے ان کے بڑے مداح رہے ہیں، نکلے تری تلاش میں خانہ بدوش،، اندلس میں اجنبی، جپسی، پیار کا پہلا شہر، ہنزہ داستان، کے ٹو کہانی تو ہم نے گھول کر پیے ہوئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کے بعد کے

سفرناموں اور ناولوں نے گھلنے سے انکار کردیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں ہمیں اپنے محبوب مصنف جناب ابن صفی کا تحریر کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے جسے درج کرنے میں ہمیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی:

ایک بار کا ذکر ہے کہ انگریزی کے مشہور مصنف ایڈگر ویلس نے اپنے مداحوں کے ایک مجمع میں بڑے خلوص سے کہا۔ " پچاس ناول لکھنے کے بعد ہی مجھے ناول لکھنے کا سلیقہ ہوا ہے۔

چھوٹتے ہی ایک صاحبزادی نے فرمایا" کاش ایسا نہ ہوا ہوتا! اب تو آپ بور کرنے لگے ہیں۔ شروع شروع کی کتابوں کا کیا کہنا۔ کاش آپ ماضی میں چھلانگ لگا سکیں۔"

واللہ اعلم بالصواب

خیر اندیش

راشد اشرف

کراچی سے

حضرت علامہ طالب جوہری سے ایک ملاقات

تذکرہ ابن صفی

"بڑا ظلم ہوا" ۔۔۔۔۔۔۔ علامہ صاحب نے اپنی مخصوص آواز و انداز میں فرمایا۔ اس انداز پر فدا ہونے والوں کی تعداد کتنی رہی ہوگی، خدا ہی جانے لیکن میں تو ان کے بہت قریب بیٹھا ٹکٹ ٹک انہیں جناب ابن صفی کو یاد کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ کہہ کر ایک لحظے کو خاموش ہوگئے اور میں یہ فقرہ سن کر دم بخود۔ ان کا اشارہ ادب میں صفی صاحب کے مقام کو تسلیم نہ کیے جانے کی طرف تھا یا ان کی زندگی میں ادب کے ٹھیکیداروں کے ناروا سلوک کا، علامہ صاحب سے یہ دریافت کرنے کی ہمت مجھ میں کہاں تھی۔ ٹوکنا مناسب نہ تھا،اس موقع پر علامہ صاحب ہی کا ایک شعر یاد آتا رہا تھا:

چمن میں ہر پنکھڑی بکھر کے کہے گی رودادِ قیدِ ہستی
بمقتضائے اصولِ فطرت ابھی تو منہ بند ہے کلی کا

خاکسار کی صفی صاحب پر کتاب میں علامہ صاحب کی ایک یادگار تصویر شامل ہے، وہ اسے دیکھ کر جیسے کھو سے گئے تھے، یاد ماضی نے جیسے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا ہو، آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی تھی، کیا خبر اپنا ہی شعر یاد

:آگیا ہو

میرا آنسو تیری آنکھ سے ٹپکا ہے
جوگی رستہ بھول گیا تھا ڈیرے کا

یہ ملاقات 27 جولائی، 2012 کی ایک شام کو ہوئی۔میں علامہ صاحب کو اپنی صفی صاحب پر کتاب " کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا" پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت میں احمد صفی صاحب کا سلام پیش کرچکا تھا۔اول اول میں اپنی ابن صفی صاحب پر کتاب کے تعارف میں بے تکان بولتا چلا گیا۔ ابتدائی دس منٹ علامہ صاحب خاموش بیٹھے ، انہماک سے سنتے رہے، ہاتھ میں سگرٹ تو شروع ہی میں تھام چکے تھے لیکن شعلہ بیاں مقرر نے اسے شعلہ نہ دکھایا تھا۔ ذکر ابن

صفی کا تھا اور اس ذکر پر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔
سچ تو ہم سب کے سامنے کنڈلی مارے بیٹھا ہے جناب والا"۔۔۔ میں نے عرض کیا۔ ""
"اب تو نہ ماننے والے بھی ماننے پر مجبور ہیں۔
ارے میاں! یہ دن تو آنا ہی تھا"۔۔۔یہ کہہ کر انھوں ہاتھ میں دیر سے تھامی"
سگرٹ جلائی اور ایک گہرا کش لیا۔ "چائے پییں گے آپ۔۔اب سنیئے کہ ہم رہتے تھے
ناظم آباد نمبر ایک میں اور صفی صاحب کا قیام دو نمبر میں تھا۔ میں اکثر ان کے دفتر چلا
جایا کرتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر چائے اور سگرٹ پی جاتی، باتیں ہوتیں اور پھر میں واپسی کا
رستہ لیتا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ اگر کبھی ناغہ ہو جاتا تو وہ مجھ سے غیر حاضری کا سبب
پوچھا کرتے۔ایک روز میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ انہوں نے مجھے ایک کاغذ پر اپنا لکھا
:سلام تھما دیا، اس کا ایک شعر سنئے

یاد حسین میں جو آنکھ نم نہیں
وہ،نرید و شمر سے کم نہیں

ضمیر اختر وہ کاغذ لے گئے تھے۔شاید کسی کتاب میں استعمال کیا ہو انہوں نے۔ابن صفی
،بہت اچھے شاعر تھے۔نہ معلوم ان کے اشعار محفوظ بھی ہیں یا نہیں

"اس بارے میں کچھ علم ہے آپ کو۔۔۔۔

" جناب والا! متاع قلب و نظر ، ابن صفی کے شعری مجموعے کا مجوزہ نام ہے، لاہور سے شائع ہوگا تو احمد صاحب مجھے ارسال کریں گے اور اسی شام کو یہاں آپ کی اس میز پر رکھا ہوگا، یہ میری ذمہ داری ہے۔" میں نے عرض کیا ۔

اس بات پر علامہ صاحب خوش ہوگئے۔ "اچھا اپنا فون نمبر دیجیے، بلکہ یہیں کتاب پر لکھ دیجیے۔ اور یہ جو آپ ابن صفی سے متعلق یادوں کو ریکارڈ کرنے کا کہہ رہے ہیں تو میں آپ کو کسی روز بلا لوں گا، ذہن میں فوری طور پر جو باتیں آئیں، بیان کردوں گا۔ابھی تو ہمارے بزرگ کشفی صاحب کی باتیں بھی ہیں،

' ' سرور حسین آرٹسٹ بھی آیا کرتے تھے، بہت کچھ ہے

صفی صاحب کا انتقال کے روز آپ کراچی میں تھے" میرا سوال تھا "

اس روز علامہ طالب جوہری ملک سے باہر تھے۔" میں واپس آیا تو ان کے گھر گیا لیکن

"کسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔

آج میں خود سے ملا ہوں طالب

آج بھولا ہوا گھر یاد آیا

میں ساری باتیں کر بیٹھا تو ایک دم سے چونک کر کہا: " یہ فرمایئے کہ آپ کے مطالعے

" میں صفی صاحب ناول رہے ہیں؟

"چھوڑا کون سا تھا ؟ سبھی پڑھ ڈالے۔ چاندنی کا دھواں، خاص نمبر تھا، مزے دار کہانی تھی۔"۔۔یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔۔۔پھر آہستگی سے اپنی مخصوص آواز و انداز میں بولے :

"بڑا ظلم ہوا" ۔۔۔۔۔ !

جہاں تاریخ روتی ہے

معروف صحافی، شاعر و دانشور جناب محمود شام کا تازہ مجموعہ کلام "جہاں تاریخ روتی ہے" شائع ہوگیا ہے۔

محمود شام راجپورہ ریاست پٹیالہ میں 1940 میں پیدا ہوئے، 1947 میں پاکستان ہجرت کی، پہلا پڑاؤ جھنگ میں ڈالا، وہیں رہتے ادب کی طرف مائل ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ میں اور پھر لاہور کا قصد۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ، کالج میگزین راوی کے مدیر بھی رہے۔ پھر ایک اور ہجرت، اس مرتبہ عالم میں انتخاب کراچی تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہ شہر محمود شام کو راس آگیا، ملک کے سب سے بڑے اخبار سے برسوں وابستہ رہے، اس دوران ان کے اخبار کے ساتھی انہیں ملکوں ملکوں ڈھونڈتے تھے لیکن شام صاحب نایاب نہ ہوئے، گھوم پھر کر اور عالمی لیڈران کے انٹرویو لے کر رخ سوئے کراچی ہوتا تھا۔ پھر ایک روز صحافتی حلقوں میں یہ خبر حیرت سے سنی گئی کہ شام صاحب نے ادارہ جنگ چھوڑ دیا ہے، لیکن چونکہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں، سو یہ بھی ہوا۔

اپنی ویب سائٹ بنانا بیرونی دنیا واحباب سے رابطے کا آسان ترین طریقہ ہے،

:شام صاحب نے اس جانب بھی توجہ دی ہے

www.mahmoodsham.com

جہاں تاریخ روتی ہے" کے ابتدا میں میں محمود شام اپنے قاری سے مخاطب ہوئے" ہیں۔ کہتے ہیں کہ " اب جب کہ میری عمر کے 72 سال پورے ہو رہے ہیں، مجھے بھی اندازہ نہیں ہوتا، ملنے والوں کو بھی کہ اتنی مسافت طے کرچکا ہوں۔ میں نے اگرچہ قادر الکلام شاعر طاہر سردھنوی سے اصلاح لی لیکن جب میری شاعری نے آنکھ کھولی تو شیر افضل جعفری کا نام گونج رہا تھا۔ ایسے ماحول میں جب ہم سے شعر ہونے لگے تو میں بار بار یہی سوچتا تھا کہ میں اردو شاعری کی تاریخ کے جس موڑ پر مشق سخن کر رہا ہوں، میرا اسلوب کیا ہونا چاہیے۔ میں نے ٹیلی فون ، ڈائری جیسے نئے الفاظ کو شعر میں داخل کرنے کی جسارت کی، یہ ساٹھ کے عشرے کی بات ہے۔ کار، فٹ پاتھ ، اپنے شہروں کے مقامات، شاہراہیں، سب کا ذکر ضروری سمجھا۔ جب حافظ شیراز گلگشت مصلی، آب رکنا باد کا ذکر کر سکتے ہیں تو میں سندھو ندی، راوی، چناب، دی مال ، کلفٹن کا مضمون کیوں نہیں باندھوں۔ "

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کتاب سے اس مختصر انتخاب میں راقم نے حالات حاضرہ اور سلگتے ہوئے مسائل کی نشان دہی کرتی تخلیقات پر توجہ دی ہے۔ وطن عزیز یوں تو ہمیشہ ہی سے عاقبت نااندیش لوگوں کے ہاتھوں میں رہا ہے لیکن گزشتہ دو دہائیوں سے تو "جہاں میں صدیوں پہلے رد ہوئے" کاسہ لیسوں نے قوم کو جکڑ رکھا ہے۔ کراچی کی بات کریں تو ادھر کچھ اس شہر نگاراں کے لوگ بھی ظالم ہوئے ہیں، کچھ ہمیں بھی مرنے کا شوق رہا ہے، اس جانب بھی شاعر نے خصوصی توجہ دی ہے:

ماں یا بنجر پہاڑی
مرے بیٹے کو جس نے گولیاں ماریں
تشدد سے بدن کاٹا
اکہری انگلیاں توڑیں

مرے بچے کو بوری جس نے پہنائی
مجھے بھی اس سے ملوا دو
میں دیکھوں اس کے خوں آلود ہاتھوں کو
کھلی سفاک آنکھوں کو
بھری ممتا سے پھر پوچھوں
کہ اس کی ماں مرے جیسی کوئی عورت ہے
یا بنجر پہاڑی ہے

اڑتی رہتی ہے دور دور خوشی
حادثے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
خواہش انقلاب میں یوں تو
یار لوگوں کے دل مچلتے ہیں

راہبر وہ ہی رہیں راہ دکھائیں ہم لوگ
وہ تو معذور ہیں یہ فرض نبھائیں ہم لوگ

جس کے آنگن میں خواب اگتے ہیں
آئیں مل جل کر ایسا گھر دیکھیں
ہو کے آئیں زمیں کی تہہ سے کبھی
آسماں پر بھی پاؤں دھر دیکھیں

عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں
حکمراں میٹنگوں میں مصروف ہیں
رہنما میڈیا پہ شعلہ بیاں
اور لاشیں اٹھا رہے ہیں ہم
ان کی طاقت کا جو ہیں سرچشمہ

طوفاں تجزیے نہیں سنتا
ہوائیں چیختی ہیں

آسماں تک شور جاتا ہے
زمیں والے دہلتے ہیں
گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
اجالا یوں منہ چھپاتا ہے
سمندر یوں اچھلتا ہے
کہ ساحل کانپ جاتا ہے
وصال و ہجر بے معنی سے لگتے ہیں
فلک بوسوں پہ دہشت طاری ہے
حکومت، حکمرانی، حکمراں بے بس
سراسر بے اثر وعدے حفاظت کے
ہوائیں، حکمرانوں، رہنماؤں، جنرلوں کے سب عزائم کیسے بھانپیں گی
ججوں کے فیصلوں اور تبصروں سے کس طرح آشنا ہوں گی
کہ وہ خبریں نہیں پڑھتیں
کہ طوفاں تجزیے سنتا نہیں ہے

اس مجموعہ کلام کا پیش لفظ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے تحریر کیا ہے۔

زیر نظر پوسٹ کے ہمراہ "جہاں تاریخ روتی ہے" کی مکمل فہرست تخلیقات منسلک ہے۔
400 صفحات کی اس کتاب کو لاہور کے الحمد پبلشر نے شائع کیا ہے۔ قیمت "پانسو"
مقرر کی گئی ہے۔ کراچی میں یہ کتاب ویلکم بک پورٹ، اردو بازار پر دستیاب ہے۔

الحمد کا پتہ یہ ہے:

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ چوک پرانی انارکلی۔ لیک روڈ-لاہور

فون: 37231490-042

انیس شاہ جیلانی کا سفر نامہ ہندوستان اب انٹرنیٹ پر

سندھ اور پنجاب کی سرحد پر واقع قصبہ محمد آباد، تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم یار خان۔۔۔۔۔ یہاں ہوتے ہیں سید انیس شاہ جیلانی جن کی کتاب "سفر نامہ مقبوضہ ہندوستان" کے مطالعے کے بعد راقم الحروف بے اختیار ان سے ملاقات کی غرض سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ بات ہے سن 2005 کی کہ جب آتش 'نادان' تھا اور اس نادانی میں مظفر گڑھ سے ایک رات محمد آباد کا پر خطر سفر محض اس لیے اختیار کیا کہ شاہ صاحب کے درشن کیے جائیں. انہی دنوں انیس صاحب کا ایک طویل خط ارشاد احمد حقانی مرحوم اپنے کالم میں بنا کسی قطع.برید کے بعنوان 'ایک ناراض.بزرگ کا خط' شائع کر چکے تھے.

تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم یار خان اور دھول اڑاتا محمد آباد نامی قصبہ۔۔۔۔۔۔

ویرانے میں ایک دیوانے کا خواب مبارک لائبریری کی شکل میں ایستادہ نظر آیا

سید انیس شاہ جیلانی 23 اکتوبر 1937 کو محمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ سن 1926 میں ان کے والد سید مبارک شاہ جیلانی نے محمد آباد میں "مبارک لائبریری" قائم کی۔ لق و دق صحرا جہاں اردو بولنے والا تو کجا، ٹھیک سے سمجھنے والے بھی یکسر ناپید تھے۔
انیس اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اونچی آواز میں بہت کم بولتے تھے۔۔۔غصہ پینے میں بلا نوش تھے۔۔۔بڑا ہیٹا پرلے درجے کا نافرمان خود سر خود رائے بالکل الگ تھلگ۔ مگر کماؤ اور محنتی، اس سے غرض نہیں تھی ، چالبازی سے روپیہ بٹورتا ہے۔ یا جور بازاری سے۔ مرحوم کی طمانیت کے لیے یہی کافی تھا کسی کا دست نگر نہیں ہے خود کماتا اور لٹاتا ہے۔۔۔تقسیم ملک کے خلاف تھے مگر جب پاکستان بن گیا تو فلاح وبہبود کا بڑا خیال تھا۔۔۔جوانی بڑھاپے میں وزن قریب دو من دو سیر سے نہ گھٹا نہ بڑھا۔ بتیسی ہم نے ان کی دیکھی ہی نہیں۔ اتنا ضرور تھا کہ ایک ہی داڑھ رہ گئی تھی ، جس پر وہ پیسٹ اور برش گھسا کرتے تھے۔۔۔سندھی اور سرائیکی مادری پدری

زبانیں تھیں مگر وہ مرحوم اول و آخر اردو تھا۔۔۔وہ چاہتے تھے ضلعی صدر مقام رحیم یار خاں میں سرکاری سرپرستی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی وضع کا ادارہ اگر قائم کر دیا جائے تو پورا کتب خانہ نذر کر دیں گے۔۔۔ایک ڈپٹی کمشنر جناب غلام فرید خاں نے حاتم کی قبر پر بارہ مربع فٹ زمین دکھا کر دولتی جھاڑ تو دی تھی۔ غالباً لائبریری کے نام سے وہ بجھکڑ سمجھے یہ کوئی اکنی دونی کمانے کا چکر ہے۔ ایک عظیم علمی ادارے کے تصور کا متحمل ایک سرکاری دماغ کیونکر ہو سکتا تھا۔ ایسی خفتہ ملت پر لعنت کے سوا اور کیا یا کہا جا سکتا ہے۔۔۔انھوں نے جوانی کو لٹایا بھی تو اس انداز سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ بدنام نہیں ہوئے۔۔۔ایک ہی خادمہ کو آواز دیتے تھے اور بھی تھیں مگر چونکہ "اس کے نام کا صوتی اثر اچھا تھا اسی لیے کسی اور کو نہ بلاتے۔

اردو ادب میں انیس شاہ جیلانی کی پہچان ایک غصہ آور ادیب کی سی ہے، لہجہ تیکھا اور جذبات سے عاری، تنقید ایسی کہ پیشانیاں بھیگ جائیں۔ عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی کہ جب اردو زبان سے محبت کرنے والے ان کے ابا نے ان کو زبان سکھانے کی غرض سے اہل زبان "کے حوالے کر دیا۔"

رئیس امروہوی، صادقین، جون ایلیا، زاہدہ حنا اور شکیل عادل زادہ۔۔۔ انہی

شخصیات کے وہ قریب رہے، انہی کی باتیں کرتے رہے، اور جب انہی میں سے کچھ کے خاکے لکھے تو قلم میں مروت نام کی کوئی چیز پڑھنے والے نے نہ دیکھی۔ لہجے میں نہ جانے کہاں سے ایسی بے باکی در آئی کہ وہ لکھے اور شوق سے پڑھا کرے کوئی۔۔۔۔ سوائے ان کے جن پر خاکے لکھے گئے تھے۔۔ کتاب کا نام تھا "آدمی غنیمت ہے"۔

نیاز فتح پوری اور رئیس احمد جعفری ان کے آئیڈیل تھے

لیکن صاحبو! یہاں ذکر تو ہے "سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان" کا جس کی انٹرنیٹ پر شمولیت کی غرض سے راقم نے شاہ صاحب سے گزشتہ دنوں رابطہ کیا تھا اور گفتگو کچھ یوں رہی تھی:

"لائیے شاہ صاحب، اجازت دیجیے کہ اس کتاب کو دیگر لوگوں تک دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دوں۔"

شاہ صاحب نے جواب ایسا حوصلہ افزا دیا کہ جی خوش ہوگیا۔ کہا "جیسے چاہیں استعمال کریں، جو سلوک چاہیں کریں، چاہیں تو شائع کر دیں۔۔ اور اس کا ہوگا؟"

جی کس کا" ؟"

آدمی غنیمت ہے" کو بھی اسی زمرے میں شمار کیجیے۔ "

آدمی غنیمت ہے۔۔۔۔ وہ کتاب جس میں موجود زاہدہ حنا کا خاکہ ایسا ہے کہ کسی

اگر شاہ صاحب اسے کسی تقریب میں پڑھ دیتے تو زاہدہ خاتون پر وہ گزرتی جو شاید احمد بشیر کے اس خاکے کو سن کر کشور ناہید پر بھی نہ بیتی ہو گی جسے انہوں نے بھری محفل میں " چھپن چھری " کے عنوان کے تحت پڑھا تھا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ اس مقام سے آگے ہی.بڑھ جایا جائے۔

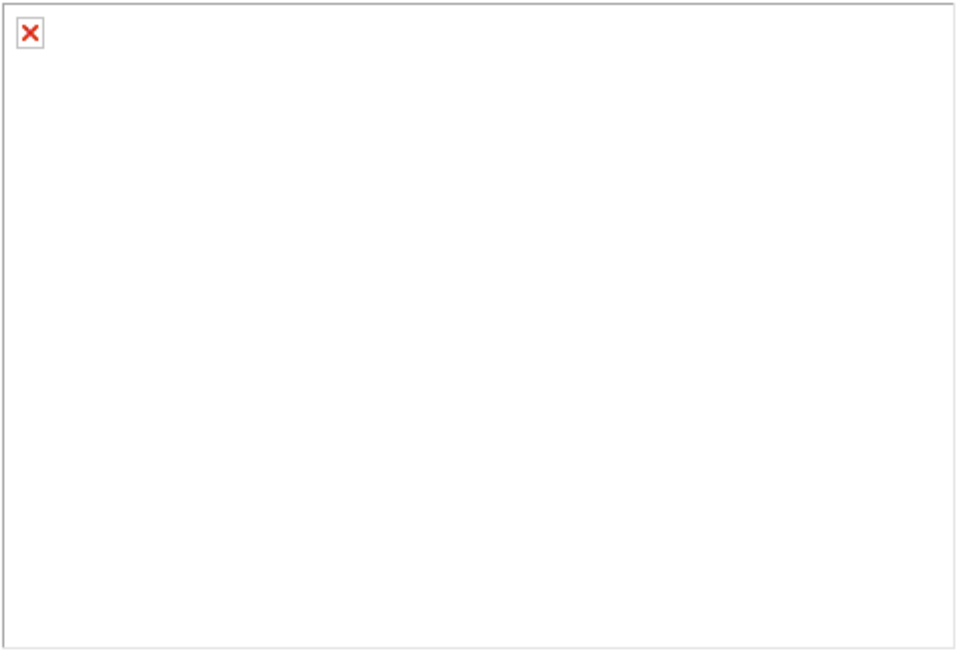

پھر یوں ہوا کہ ان کا 17 اپریل، 2013 کو لکھا اجازت نامہ موصول ہوا جو کتاب کے ہمراہ شامل کردیا گیا ہے۔ اجازت کے ساتھ لکھتے ہیں "وہ کیا کہتے ہیں، اسکین کرنا کہتے ہیں یا کیا کہتے ہیں"

اک ذرا آگے بڑھنے سے قبل یہ عرض کرتا چلوں کہ مذکورہ سفرنامے کو راقم کی ذاتی پسند سمجھا جائے، اس کے مطالعے کے بعد قارئین کے کیا تاثرات ہوں گے،

اس کا فیصلہ ان پر چھوڑتا ہوں۔

محض پرائمری تک تعلیم پانے والے انیس شاہ جیلانی کی دیگر تصنیفات میں شامل ہیں نوازش نامے، خطوط (غلام رسول مہربنام انیس) مبارک شاہ کے نام، محفلے دیدم از حیرت شملوی مرتبہ انیس شاہ جیلانی، ہندوستان کا ابن تیمیہ، دھرتی مانگے دان از جام ساقی' سندھی سے ترجمہ انیس، کاغذی پیرہن، مہانڈراڈیکھنس (سرائیکی) خاکے۔ مڑدنگ م ڑ د ن گ) سرائیکی) خاکے)

انیس شاہ جیلانی نے ہندوستان کا سفر 1982 میں کیا تھا، رئیس امروہوی، کراچی کے ایک شاعر اختر فیروز اور کراچی سے تعلق رکھنے والے تاجر محمود ان کے ہمسفر تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک موقع پر انیس سخت رنجیدہ ہوئے اور دلی میں بقیہ ساتھیوں سے علاحدہ ہوگئے۔ دل غم کی شدت سے بوجھل تھا، اوسان خطا اور جذبات پژمردہ۔۔۔ واپسی پر ساری تلخی تحریر میں امڈ آئی۔

زیر نظر سطور کو قلمبند کرنے کے دوران راقم نے 22 اپریل 2013 کو انیس شاہ جیلانی سے دوبارہ رابطہ کیا۔

میرا سوال تھا: "آپ کو یہ اندیشہ نہ تھا کہ سفرنامے کی اشاعت کے بعد رئیس صاحب سے تعلقات خراب ہوجائیں گے" ؟

شاہ صاحب نے جواب دیا: "جی نہیں۔ وہ تو اسی وقت خراب ہوگئے تھے جب میں دلی

میں ان لوگوں سے الگ ہوا تھا۔ پھر یہ تعلقات 5 برس تک خراب رہے۔ اس دوران میری اہلیہ اور والد کا انتقال ہوگیا۔ رئیس صاحب نے خطوط لکھنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ ادھر میرے بیٹوں نے بھی سمجھایا کہ آپ بھی سب کچھ بھلا دیں۔

پھر سفرنامہ تو 1993 میں شائع ہوا تھا، رئیس صاحب کو اس بارے میں معلوم نہ ہوا؟ کیا انہوں نے اسے پڑھا تھا" ؟

شاہ صاحب نے کہا: 'کتاب کی اشاعت سے قبل ہی وہ قتل کردیے گئے تھے۔ میں نے انہیں مسودہ بھیج دیا تھا، پڑھ کر انہوں نے اس کا محاکمہ لکھا اور پھر میں نے جوابی محاکمہ لکھا جو غیر مطبوعہ ہے۔

سو یہ ہے داستان "سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان" کی۔ وہ سفر جو 1982 میں کیا گیا اور جس کی روداد 1993 میں شائع ہوئی۔ انیس شاہ جیلانی کے ساتھیوں میں سے رئیس امروہوی کو قتل کردیا گیا جبکہ اختر فیروز اور محمود صاحب بھی انتقال کرچکے ہیں۔ واضح رہے کہ سفرنامے کے ابتدائی اندرونی صفحے پر موجود 'ضابطے" میں بطور ناشر، فکشن ہاؤس کا نام لکھا ہے جبکہ اسے مصنف نے ضیائ اللہ کھوکھرے تعاون سے شائع کروایا تھا اور فکشن ہاؤس کا نام محض کتاب کی مناسب فروخت کے لیے لکھا گیا تھا۔

یہ ایک تلخ سفر کی داستان ہے، مصنف کو اسے لکھتے وقت کوئی جھجھک مانع نہ تھی، کئی مقامات پر انہوں نے اپنے ہمراہیوں کو بے نقط کی سنائی ہیں، جو کچھ دیکھا اسے لکھ ڈالا ہے، وہ اپنے ہمسفروں (محمود صاحب کو چھوڑ کر) کے عجیب و غریب رویوں سے عاجز تھے اور ان کی کمزوریوں، سفر میں روا رکھنے جانے والے ناروا سلوک کو من و عن بیان کرتے چلے گئے۔ اب اس کی زد میں رئیس امروہوی آئیں یا اختر فیروز، انہیں اس کی پرواہ نہ تھی۔ اسی طرز تحریر نے سفرنامے میں ایک ایسا رنگ بھر دیا ہے جس میں اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے ماسوائے منافقت کے۔۔۔۔۔۔۔۔

سفرنامہ پیش خدمت ہے، درج ذیل لنک پر جاکر اسے پڑھا اور ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے!

:

http://www.scribd.com/doc/137019109/Safarnama-Maqbooza-Hindustan-Syed-Anees-Shah-Jeelani-Mubarak-Library-Muhammadabad-1993

زیر نظر احوال کے ہمراہ دو عدد تصاویر بھی پیش کی جارہی ہیں۔ یہ تصاویر راقم الحروف نے 2005 میں محفوظ کی تھیں جب شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک تصویر میں وہ اپنے احباب کے ہمراہ مبارک لائبریری کے سامنے کھڑے ہیں۔

صفیہ صدیقی۔ بوئے گل سو گئی

کسے خبر تھی کہ آج زیر نظر مضمون کا عنوان وہی منتخب کیا جائے گا جو صفیہ صدیقی کے اس مضمون کا تھا جو انھوں نے اپنے بہنوئی اور سری ادب کے نامور مصنف ابن صفی پر لکھا تھا۔ اردو کی دور افتادہ بستیوں کو بسانے والوں کی سرخیل صفیہ صدیقی 28 نومبر 2012 کی شام لندن میں انتقال کر گئی تھیں۔ وہ طویل عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھیں۔ افسانہ و ناول نگار کی حیثیت سے انھوں نے اردو ادب میں ایک الگ مقام حاصل کیا تھا۔ صفیہ صدیقی کا آبائی تعلق محلّہ مولویانہ، قصبہ نگرام ضلع لکھنو سے تھا جہاں وہ یکم جنوری 1935 کو پیدا ہوئی تھیں۔ وہ گزشتہ کئی دہائیوں سے لندن میں مقیم تھیں۔ان کے والد کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب وہ سات برس کی تھیں، بعد ازاں وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ اپنے نانا کے پاس رائے بریلی چلی گئیں جہاں انھوں نے پانچ برس قیام کیا۔ 1947 میں ہونے والی اسکول کی چھٹیوں میں وہ بشمول اہل خانہ اپنی خالہ کے پاس شملہ گئی ہوئی تھیں کہ اسی اثناء میں تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور تمام لوگ افراتفری میں پہلے کالکا کیمپ اور پھر والٹن کیمپ لاہور پہنچے اور وہاں سے راولپنڈی رخ کیا۔ صفیہ صدیقی لندن میں روزنامہ جنگ کے 1971 میں اجراء ہی سے اس سے وابستہ ہو گئی تھیں جہاں سے انھوں نے 1982 میں خرابی صحت کے باعث استعفی دے دیا تھا۔ صفیہ صدیقی

نے انگریزی سے تراجم کیے، افسانے لکھے، ناول لکھے، کالم نویسی کی،انٹرویو کیے اور متفرق مضامین تحریر کیے ۔۔ریڈ فورڈ کے ہفتہ وار اخبار 'راوی' سے منسلک رہیں۔ غرضیکہ ہر صنف ادب میں اپنی موجودگی کا قوی احساس دلایا۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے اور ایک ناول (وادی غربت میں) شائع ہو چکا ہے ۔ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام یہ ہیں: پہلی نسل کا گناہ، چاند کی تلاش، چھوٹی سی بات، بدلتے زمانے، بکھرتے لوگ۔ صفیہ صدیقی نے "اردو اینڈ آئی" کے عنوان سے لکھے گئے رالف رسل کے ایک طویل مضمون کو اردو کے قالب میں "یاداشتیں" کے عنوان سے ڈھالا جو 2002 میں کراچی کے مجلے 'آج' میں شائع ہوا تھا۔ لکھنو سے تعلق ہونے کے سبب انہیں زبان و بیان پر عبور حاصل تھا ۔افسانہ نگاری میں وہ ایک جداگانہ مقام رکھتی تھیں اور ان کے افسانوں آغاز تا انجام اچھوتے اور چونکا دینے والے ہوا کرتے تھے۔ ایک طویل عرصہ لندن میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے صفیہ صدیقی کے اظہار بیان میں صاف گوئی اور بے باکی کے عناصر عود کر آئے تھے۔ مغربی معاشرے کا گھناؤنا چہرہ قارئین کے سامنے عیاں کرنے میں انہیں کبھی کوئی جھجھک مانع نہ رہی اور وہ وقتاً فوقتاً اپنی کہانیوں میں اس کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔زندگی کروٹ بدلتی ہے،اور سمندر رونے لگا، فیصلہ، ایک اور موت ، منزل، چھوٹی سی بات، خواب سی زندگی، کب در زنداں کھلتا ہے، سوز غم ہائے نہانی ان کے چند عمدہ افسانے ہیں۔۔بریڈ فورڈ سے جناب مقصود الہی شیخ کی زیر ادارت دس برس تک سے شائع ہونے والے ادبی مجلے "مخزن" میں

ان کے افسانے مستقل شائع ہوتے رہے تھے۔ صفیہ صدیقی لیوٹن کے رسالے سہ ماہی سفیر اردو اور لندن کے رسالے ماہنامہ پرواز کی بھی مستقل قلمکار تھیں۔ پروفیسر ممتاز احمد خان نے صفیہ صدیقی پر اپنے تبصرے میں کہا تھا: " صفیہ کا اسلوب سادہ مگر صاف و شفاف ہنر مندی سے عبارت ہے۔" ۔ معروف افسانہ نگار محترمہ اصغرا اصغر نے کہا تھا: " برطانوی پیش منظر میں صفیہ صدیقی نے مشرقی جذبوں کی کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ غیر معمولی جذباتیت سے گریز کرنے کے باوجود "فیصلہ" اور "ایک اور موت" ' قاری کے جذبات میں ہلچل مچاتی ہیں اور دیر تک گرفت میں رکھتی ہیں۔" ۔ڈاکٹر انور سدید صفیہ صدیقی کے بارے میں کہتے ہیں " صفیہ صدیقی کی کہانیوں میں وہ عورت بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کی جڑیں اپنے وطن کی سرزمین میں گہری اتری ہوئی ہیں۔ اپنے ماں باپ اور دھرتی سے کٹی ہوئی یہ عورت اولاد، بیوی اور پھر اپنے بچوں کی ماں ہے۔ خوبصورت مکان کا حصول اس کی عزیز ترین خواہش ہے۔ 'وارمنگ پارٹیوں' میں شرکت اس کی دلچسپی کا ایک زاویہ ہے لیکن یہ زاویہ اس وقت غیر اہم ہو جاتا ہے جب اس کی بیٹی جوان ہو جاتی ہے اور حریص نظروں میں گھِر جانا ماں کو کسی طرح قبول نہیں ہوتا۔"

پروفیسر رالف رسل صفیہ صدیقی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: " میں صفیہ صدیقی کو عرصے سے جانتا ہوں لیکن مجھے ان کی تحریروں کے بارے میں تین چار سال قبل اس وقت علم ہوا جب میں نے ان کا افسانہ "کمیونٹی لیڈر" پڑھا.اس افسانے نے مجھ پر گہرااثر چھوڑا .برطانیہ میں بسنے والے پاکستانیوں کے رویہ اور انداز فکر میں جو خوب و ناخوب تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ، ان کو صفیہ صدیقی نے اس افسانے میں نہایت سچائی سے بڑے دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے صفیہ صدیقی کے تقریبا تمام افسانوں کو پڑھا ہے اور ان کی بہترین تحریریں ان خوبیوں سے مزین ہیں۔ "

اپنے بارے میں ایک مختصر سوانحی مضمون میں صفیہ صدیقی کا انداز بیاں ملاحظہ ہو . راقم الحروف سے رابطے اور ای میلیز کے تبادلے میں بھی ان کی اپنے وطن سے محبت لفظ لفظ سے عیاں ہوا کرتی تھی :

مجھے اس وقت فیض صاحب کا ایک مصرعہ یاد آ رہا ہے، خدا جانے "
کیوں۔۔۔۔ع۔۔۔ میرے درد کو جو بیاں ملے مجھے اپنا نام و نشاں ملے
اب آپ فرمائیں گے کہ آپ کو کیا دکھ ہے، انگلستان میں بیٹھی ہیں اور مزے سے زندگی گزار رہی ہیں، نہ لوڈ شیڈنگ ہے نہ چینی کی قلت، اور نہ اپنے بھائی بند کے کلاشنکوف اور بم سے خود کو سجائے بنائے، جنت میں جانے کی شدید خواہش سے بیتاب آس پاس پائے جانے کا ڈر ہے، مگر ان کو معلوم نہیں کہ وہ جو گھر تباہ۔برباد کر رہے ہیں اور معصوم اور بے گناہ جانیں لے رہے ہیں وہ بے گناہ تو جنت پہنچ جائیں گے مگر یہ خود دروازے پیٹتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ جو وطن کی فکر اور تردد ہماری زندگی میں درآیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ "
صفیہ صدیقی کے ایک یادگار افسانے " چھوٹی سی بات " سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو کہ اس میں تارکین وطن کو درپیش مصائب اور ان کی سوچ کا ذکر ایک علاحدہ ڈھنگ سے کیا گیا ہے:
" میرے دل میں درد کا طوفان اٹھ رہا تھا، مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا، وہ اندھیری شامیں اور بچوں کی اسکول سے واپسی۔ سرد کمروں کی آغوش میں انہیں اپنی ماں کی ضرورت تھی۔ماں کی توجہ کی ،دیکھ بھال کی۔شاید میں نے غلط فیصلہ

کیا تھا۔ مجھے اپنے بچوں کو محبت اور ذہنی آسودگی پہنچانے کی ضرورت تھی۔ پیسوں کی کمی کے باوجود گزر ہو ہی جاتی مگر اس وقت تو ہمیں بچوں کو بہتر معیار زندگی مہیا نہ کر سکنے کا غم رہتا تھا۔ بہتر زندگی ہی کے لیے تو یہ تکلیفیں اٹھائی ہیں، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو وقت مٹھی سے نکل چکا ہے۔ وقت کی ریت تو کب کی مٹھیوں سے نکل چکی ہے، وہ کب ٹھہرتی ہے۔ ہم نے اپنے لحاظ سے تو بچوں کے لیے اتنی قربانیاں دیں۔ کبھی اپنے متعلق نہیں سوچا۔ کپڑے لتے، گھومنا پھرنا، سینما تھیٹر۔ ساری آرزوئیں دل میں دفن ہو گئیں۔ ساری رنگینیاں اسی لندن شہر میں موجود تھیں مگر ہم ان سے بے نیاز محنت اور مشقت کے اندھیروں میں زندگی گزارتے رہے اور آج وہی کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ان کو جذباتی محرومیاں دیں۔ کمینے کہیں کے۔ آج ان کے پاس ساری آسائشیں ہیں۔ انہیں ہماری تکالیف کا کیا اندازہ۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم نے نسلی تعصب کے نام پر کتنی ذلتیں سہیں، کتنی توہین برداشت کی، دل ہی دل میں کڑھتے رہے، جلتے رہے اور بچوں کی خاطر سب کچھ سہہ گئے۔ اپنی انا، اپنی عزت نفس، خودداری۔ سب کو دبا کر زندگی کا ایک مقصد بنا لیا تھا کہ بچوں کو بہتر تعلیم اور معیار زندگی مہیا کرنا ہے۔"

راقم الحروف کے ای میل ریکارڈ میں صفیہ صاحبہ کے کئی پیغامات آج بھی محفوظ ہیں۔

24 نومبر 2011 کو ارسال کردہ ایک پیغام میں وہ رقمطراز ہیں:

" ابھی آپ کی بھیجی ہوئی میل دیکھی اور پڑھی، اور ان تصویروں میں میرے بھائی جان کی بھی ایک تصویر تھی کافی پرانی، بہت خوشی ہوئی، آپ کو شائد معلوم نہیں کہ مکین احسن کلیم میرے بڑے بھائی تھے، وہ لاہور میں تھے جب ان کا انتقال ہوا۔ قیصر تمکین صاحب نے خبر گیر میں ان کا تذکرہ کیا ہے، یہ کتاب میرے پاس ہے، جب انھیں معلوم ہوا کہ میں ان کی بہن ہوں تو تمکین صاحب میرا بہت خیال کرنے لگے تھے، وہ کوئی 14 یا 15 برس کے رہے ہوں گے جب وہ قومی آواز میں پارٹ ٹائم کام کیا کرتے تھے وہیں بھائی جان سے ملاقات ہوئی تھی۔ "

واضح رہے کہ 15 نومبر 1923 کو محمود آباد، ہندوستان میں پیدا ہونے والے ترقی پسند ادیب و صحافی مکین احسن کلیم لاہور میں 11 دسمبر 1976 کو انتقال کر گئے تھے۔ مکین صاحب کا ذکر معروف ہندوستانی افسانہ و ناول نگار آنجہانی رام لعل کی خودنوشت "کوچہ قاتل"، قیصر تمکین علوی کی خودنوشت "خبر گیر" اور اے جی خان کی خودنوشت "یادوں کا سفر" میں موجود ہے۔ مکین صاحب کا ڈاکٹر عبادت بریلوی پر لکھا ایک عمدہ مضمون 1956 میں نقوش کے شخصیت نمبر میں شائع ہوا تھا۔

ادیب و افسانہ نگار تسلیم الہی زلفی لکھتے ہیں:

"آپ صفیہ صدیقی کے تمام افسانے پڑھ جایئے بلا شبہ ان میں واقعات، افراد، قصے اور اسلوب کے اعتبار سے نمایاں فرق محسوس ہوگا، پر وہ انداز جس سے وہ زندگی دیکھتی ہیں، کسی زنجیر کی طرح ابتداء سے انتہا تک چلا گیا ہے، اور ان کا یہ انداز ہی ان کے بیان کئے ہوئے ہر واقعے کو کسی نہ کسی بنا پر سماج کی اجتماعی زندگی سے وابستہ کر دیتا ہے اور ان اثرات کو واضح کرتا ہے جو اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے مرتب ہوتے ہیں، لہذا ثابت یہ ہوا کہ صفیہ کا کردار اپنے ماحول اور معاشرے سے الگ نہیں بلکہ سماج کا ایک جزو ہے اور وقت کے تقاضوں کے زیر اثر جو بھی تبدیلی سماج کے باطن کو متاثر کرتی ہے اس سے سماج کا یہ جز و متاثر ہوتا ہے۔ صفیہ صدیقی اس زاویہ نگاہ سے اپنے ہر کردار کو پرکھنے کے بعد اپنے افسانے میں شامل کرتی ہیں۔ "

زیر نظر مضمون کے آغاز میں صفیہ صدیقی کے ابن صفی پر لکھے مضمون کا ذکر آیا تھا۔ تین دہائیوں قبل لکھے متذکرہ مضمون کو صفیہ صدیقی نے حقیقت پسندی پر مبنی جن الفاظ میں سمیٹتے ہوئے اختتام پذیر کیا تھا، آج انہی کو دوہراتے ہوئے ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کے طلبگار ہیں:

"ہم سب کو معلوم ہے کہ موت سے کسی کو رُستگاری نہیں آگے پیچھے سب کو جانا ہے یہ دنیاوی جھمیلے، یہ محبتیں، یہ رشتے ناتے سب فانی ہےں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خود جواب دہ ہوگا لیکن سب جانتے ہوئے اور

ان پر ایمان رکھتے ہوئے بھی ہم جانے والوں کے لیے کیوں روتے ہیں ؟کیا یہ ہمارے
ایمان کی کمزوری ہے۔خداوند عزوجل ہم سب کو ایمان کی قوت عطا فرمائے تاکہ ہم
اس کے احکام کی تعمیل میں انسانی کمزوریوں پر قابو پا سکیں اور اس کے فیصلوں کو بسر د
" چشم رونے دھوئے قبول کر لیں۔آمین۔

کتابوں کا اتوار بازار۔ ۱۲ مئی، ۲۰۱۳

درج ذیل احوال میں اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں سے 125 صفحات پر مشتمل منتخب ابواب، مضامین اور خاکے یہاں دیے گئے لنک پر جا کر پڑھے اور ڈاؤن لوڈ کیے جا سکتے ہیں

http://www.scribd.com/doc/140910370/Sunday-Old-Book-Bazar-Karachi-12-May-2013-Rashid-Ashraf

اتوار ۱۲ مئی کی ایک چمکیلی صبح راقم کتابوں کے اتوار بازار کی جانب رواں دواں تھا ۔۔۔'الفت کی نئی منزل کو چلا' گنگناتے ہوئے۔۔۔ ہفتے کے روز قوم دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے میں مصروف رہی تھی ۔۔۔ ہمارا 'کپتان' ہمیں ۱۲ مئی کی صبح ایک نئے پاکستان کے طلوع ہونے کی نوید تیقن کے ساتھ ایک سے زیادہ مرتبہ سنا چکا تھا۔۔اس کی بات پر یقین ایسا کہ منٹو کے 'منگو کوچوان' کو بھی کیا رہا ہوگا۔ علی الصبح ٹی وی پر چنگھاڑتے میزبانوں کی باتیں سنی تھیں ، سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر یار لوگوں کے تبصروں کی بھرمار دیکھی تھی اور دو چار اخباروں پر بھی ایک نظر ڈال چکا تھا۔ گفتنی نا گفتنی باتوں کے انبوہ کثیر میں مطلب کی بات صرف ایک تھی ۔۔۔نیا پاکستان ۔۔نیا قانون۔۔۔۔! ۔۔ صبح صبح ڈاکٹر ملیحہ لودھی کو کہتے سنا

تھا کہ ' نئی حکومت کا ہنی مون عرصہ جلد ختم ہو جائے گا اور انہیں اسی عرصے کے دوران وطن عزیز کے مستقبل سے متعلق کڑے اور نئے فیصلے کرنے ہوں گے ' ۔۔۔ ہنی مون کے دوران نئے اور اہم فیصلے ؟ ۔۔۔ رہنے دیجیے محترمہ ۔۔۔ بھلا اس دنوں کوئی کڑے فیصلے کرتا ہے ؟ یہ تو بقول شخصے وہ دن ہوتے ہیں جب انسان سوچتا ہے کہ وہ انگوٹھا چوس کر ساری زندگی بسر کر سکتا ہے ۔۔۔۔ گزشتہ حکمرانوں کو اس مرتبہ لوگوں نے مسترد کردیا تھا ۔۔ بقول وسعت اللہ خان " اس مرتبہ ان کے پاس حاضر اسٹاک میں کوئی شہید نہیں ہے جسے وہ کیش کرا سکیں " ۔۔۔۔۔ جو ہیں وہ شہید ہونے پر تیار نہ تھے ۔ بی بی سی پر وسعت اللہ نے اپنے تبصرے میں کہا کہ " اگر سابقہ حکمران جماعت کو بدلے بدلے سے پاکستان میں میں بطور وفاقی قوت خود کو برقرار رکھنا ہے تو مرثیوں اور نوحوں کی کیسٹوں کو خاندانی پوشاک میں لپیٹ کر یادوں کی الماری میں بند کرنا ہوگا ۔ مجاوری اور نااہلی کی لاٹھی ٹیکنے والی بوڑھی سیاست ساتھ ساتھ چلتے چلتے اب تھک چکے ہیں ۔ " ۔ یہ وسعت اللہ خان ہی ہیں جنہوں نے انتخابی نتائج کی نصف شب پچاسی سالہ فخرو بھائی (چیف الیکشن کمشنر) کے چہرے پر وہ اطمینان اور خوشی دیکھی جو بیٹی کی رخصتی کے بعد عموماً کوئی والد ہی محسوس کر سکتا ہے ۔

احباب نے پیغامات بھیج کر الگ ناطقہ بند کیا ہوا تھا ۔ ۱۰ مئی کو (انتخاب سے ایک روز قبل) سر شام ایک صاحب پشاور میں نئے پاکستان کے طلوع ہونے کی نوید یہ

کہہ کر سنا رہے تھے کہ ''ملک کے باقی حصوں میں رہنے والے اپنے اپنے مقامی وقت کے مطابق نیا پاکستان دیکھیں''۔۔۔۔۔ جبکہ ۱۲ مئی کی صبح ایک دوست کہہ رہے تھے کہ مبارک ہو پاکستانیوں ! پرانا پاکستان ہی ریپیر ہو گیا۔ نیا بہت مہنگا تھا''۔ راقم نے ان'' کی اس بات پر دھیان نہ دیا تھا کہ سعادت حسن منٹو کے یادگار افسانے ''نیا قانون'' کے مرکزی کردار منگو کوچوان نے اس کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔۔۔ وہ منگو کوچوان جو غیر منقسم ہندوستان میں 'انڈیا ایکٹ' کے نفاذ کی خبر پر یہ طے کر بیٹھا تھا کہ پہلی اپریل سے سب کچھ بدل جائے گا۔ ظلم واستحصال کا خاتمہ ہو گا اور ایک نئی صبح طلوع ہو گی۔ رستہ سنسان پایا، سڑکیں ویران ۔۔۔ کیا واقعی تبدیلی آچکی ہے ؟۔۔۔ قوم نے انتخابی نتائج کے دیکھنے کے لیے رت جگا کیا تھا۔۔ سویرے جو سوئے ہوں گے تو اب شام ہی کی خبر لائیں گے۔ انہی سوچوں میں غلطاں منزل کی جانب سفر جاری تھا کہ قائد اعظم کے مزار کے عقب میں صدر کو جانے والی سڑک کے کنارے چند پولیس والوں پر نظر پڑی ۔۔۔۔ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں ؟ اور ان کی ہمت کیسے ہوئی کہ تڑکے لوگوں کو پریشان کرنے یہاں آن کھڑے ہوئے ہیں ؟۔۔۔ پولیس والوں نے چند موٹر سائیکل سواروں کو روکا ہوا تھا۔۔ راقم نے ایک نوجوان کی جیب سے سرخ نوٹ طلوع ہوتا دیکھا جو ایک پولیس والے کی جیب میں غروب ہوا۔۔۔ اس ایک

منظر نے ساری غلط فہمی دور کردی۔۔۔پاکستان تو وہی پرانا ہے۔۔۔ راقم نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے تئیں ''نیا قانون'' کے اختتام کا حصہ بننے سے بچ گیا جب منگو کوچوان نے ایک گورے ٹامی کو یہ کہتے ہوئے پیٹنا شروع کردیا تھا ''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔اب ہمارا راج ہے بچہ۔۔وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔نیا قانون۔۔۔۔'' ۔۔۔اس مار پیٹ کا منگو کے حق میں وہی نتیجہ نکلا تھا جو نکلنا چاہیے تھا۔۔۔ جو کسی ایسے پرندے کا ہوتا ہے جو اپنے زور میں کسی چٹان سے ٹکرا جائے۔۔۔۔ چٹان پر لہو کا نشان بہرحال رہ جاتا ہے۔۔۔۔

راقم خود کو خوابوں کی دنیا سے نکال کر اتوار بازار پہنچا تو وہاں میدان صاف تھا۔۔۔کتب فروش گزشتہ دو اتواروں کی ہڑتالوں سے ادھ موئے ہو کر آج وقت سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے لیکن گاہک ؟۔۔۔۔ یہ جنس تو اس روز نایاب تھی ۔۔۔راقم کی کیفیت کچھ ویسی ہی تھی جیسے کسی کو کہا جائے کہ تمہارا انعام نکلا ہے اور تمہارے پاس پندرہ منٹ ہیں ۔۔۔اس دکان میں سے جو چاہو اٹھا لو۔۔۔۔ سو ایک کتب فروش کو دیکھا کہ گاہکوں کے انتظار میں اب سڑک بچھے پلاسٹک کے بڑے سے ٹکڑے پر کتابیں پھینکتا جاتا تھا اور 'تیس تیس روپے میں ۔۔۔ تیس تیس روپے میں' کی آوازیں لگاتا جاتا تھا۔ ایک کتاب پر نظر پڑی تو بے اختیار اسے اٹھا

لیا۔ پھر چند مزید۔۔۔اور پھر ایک چکر لگا کر کچھ اور 'مال غنیمت' سمیٹا۔۔۔۔

کھلا اک عمر میں، کار ہوس میں کچھ نہیں رکھا
پھر اس کے بعد میں نے دسترس میں کچھ نہیں رکھا

کتابوں کی ہمہ وقت رہتی طلب میں یہ شعر اتوار بازار کے پھیروں پر بھلا کب صادق آتا ہے؟

ابتدا ہوئی تیس روپے میں ملی اس کتاب سے ہوئی جس کا نام ہے" شاہان بے تاج" اور اس کی مصنفہ ہیں وحیدہ نسیم۔ اورنگ آباد، حیدرآباد دکن میں ۹ ستمبر ۱۹۲۷ کو پیدا ہوئی تھیں، ترک وطن کیا اور کراچی میں پڑاؤ ڈالا۔ درس تدریس کے پیشے سے منسلک رہیں اور گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔ وحیدہ نسیم ۱۹۸۲ میں اورنگ آباد گئی تھیں، اس کے بعد ۸۳ء اور ۸۵ء میں دو مرتبہ مزید جانا ہوا۔ اسی دوران انہوں نے اسی گرد و نواح میں واقع دیگر مزارات کو بھی چھان مارا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شمالی ہند کے اکثر مقامات کی سیر بھی کی لیکن ان کا دل اورنگ آباد ہی میں اٹکا رہا۔ایک جگہ لکھتی ہیں" ۱۹۸۳ء میں دورہ ہندوستان میں میں والدہ صاحبہ کی نصیحت کے مطابق اپنے ننھیال کاکوری بھی گئی جہاں قلندریہ سلسلے کے بہت بڑے بزرگ حضرت کاظم شاہ کا مزار ہے۔ وہاں میری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ سجادہ نشینوں نے

شفقت سے نوازا۔ پھر اس کے بعد فرنگی محل گئی جہاں میرے دودھیال کی ایک شاخ آباد ہے۔ پھر 'بانسہ' گئی جہاں عبدالرزاق صاحب بانسوی کا آستانہ ہے اور وہاں میری سگی پھوپھی کے پوتے سجادہ نشین ہیں۔ میں اس سفر میں کہاں کہاں پہنچی، کن کن آستانوں پر حاضری دی، نہ پوچھیے۔ ہر جگہ بزرگوں کا جلال اور ہیبت تھی یا پھر مقبروں کی ویرانی۔ ، میرا دل کہیں نہ لگا۔ مجھے اس یگانگت ، رحمت اور سکون کا احساس نہ ہوا جو خلد آباد میں تھا۔ کچھ درگاہیں بستی سے اتنی ملحق تھیں کہ وہاں ایک لمحہ بھی خاموشی نہ تھی اور کچھ آستانے اتنے ویران تھے کہ وہاں بیٹھ کر وحشت سی ہوتی تھی۔ آخر خلد آباد کی درگاہوں میں کیا خاص بات ہے؟ میں جوں جوں غور کرتی گئی ، میرے ذہن میں یہ یہ بات پختہ ہوتی گئی کہ خلد آباد اور دولت آباد کے علاوہ کہیں کی درگاہیں نہ اتنی بلندی اور اتنے پر فضا مقامات پر بنی ہیں اور نہ کسی کے ساتھ اتنے وسیع اور کشادہ صحن ہیں جو ہزاروں انسانوں کو اپنے دامن میں چھپالیں۔ "

۸۵ء میں دوران قیام وحیدہ نسیم ہر جمعے کو خلد آباد چلی جاتی تھیں اور حضرت برہان الدین غریب کی درگاہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک جمعے کے روز ایسا ہوا کہ درگاہ کے سجادہ نشین نے ان کی دستار بندی کرڈالی اور مشاعرے کا انعقاد بھی کیا۔ وحیدہ نسیم نے ''خلد آباد شریف'' کے عنوان سے ایک نظم کہی جو بعد ازاں اورنگ آباد ٹائمز' میں شائع ہوئی۔ کچھ وقت گزرا'

کہ کیلیفورنیا کے کارل۔ڈبلو۔ارنسٹ مسلم تہذیب اور ثقافت پر تحقیق کی غرض سے اورنگ آباد پہنچے جہاں انہوں نے وحیدہ نسیم کی ''خلد آباد شریف'' کو وہاں کے لوگوں کو پڑھتے سنا، تحقیق کے آدمی تھے سو تجسس نے انہیں وحیدہ نسیم تک جا پہنچایا۔ایک مکتوب کے ذریعے انہوں نے وحیدہ نسیم سے رابطہ کیا۔خاتون کراچی واپس جا چکی تھیں۔ مسٹر ارنسٹ کا مکتوب پڑھ کر وحیدہ نسیم کا سر ندامت سے جھک گیا اور بقول ان کے ''جب ان بزرگوں سے میری پرانی عقیدت میں ندامت شامل ہو گئی تو میں نے ان کے حالات تاریخ کی روشنی میں مرتب کرنے کی ٹھانی''۔۔۔۔اور اس طرح وحیدہ نسیم نے 'شاہان بے تاج' کی داغ بیل ڈالی۔مذکورہ کتاب میں اورنگ آباد کے جن بزرگان دین کا احوال محفوظ کیا گیا ہے ان میں شامل ہیں مخدوم شاہ نظام الدین، خواجہ حسین و خواجہ عمر، مومن عارف، پیر مردان الدین، جلال الدین گنج رواں، شاہ خاکسار، شیخ بہاء الدین انصاری، امیر حسن علاء سنجری، بی بی عائشہ دختر بابا فرید شکر گنج، منتجب الدین زرزری زر بخش، فرید الدین ادیب، فخر الدین عراقی، راجو اتعتال حسینی، ملک عنبر، برہان الدین غریب، زین الدین داؤد شیرازی، شمس الدین فضل اللہ، تاج محمد لشکری، شاہ نور حموی، نظام الدین مقبول الٰہی، پلنگ پوش صاحب اور شاہ مسافر۔۔۔۔اورنگ آباد کی سرزمین پر بزرگان دین کی کثیر تعداد کا ذکر کرتے ہوئے وحیدہ نسیم نے اپنے لڑکپن کا واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہاں دہلی سے ایک بزرگ تشریف لائے جو صاحب کشف تھے۔ وہ اپنی سیاحت کے دوران جہاں

جاتے، بذریعہ کشف معلوم کر لیتے کہ یہاں بزرگان دین کتنی تعداد میں ہیں۔ وہ بزرگ جب دولت آباد سے گزر کر خلد آباد پہنچے تو وہاں بھی کشف کیا اور اس کے بعد اپنے جوتے اتار کر پیدل اورنگ آباد پہنچے تھے۔ جب تک مقیم رہے، جوتے نہیں پہنے اور بقول رضا نواز جنگ ان کا کہنا تھا کہ " میں نے جب دولت آباد پہنچ کر کشف القبور کا عمل کیا تو معلوم ہوا کہ خلد آباد کی پہاڑیوں سے لے کر اورنگ آباد کی بستی تک ساری زمین پر ستارے ہی ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے کسی مقام پر اتنی تعداد میں ولیوں اور بزرگوں کی روحیں نہیں دیکھی تھیں۔"

وحیدہ نسیم کا خاندان ابتدا ہی سے تصوف کی جانب مائل تھا۔ کتاب میں 'حضرت خواجہ منتخب الدین زرزری زربخش' کے باب میں بیان کرتی ہیں " محیر العقول واقعات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سنی سنائی باتیں زیادہ ہیں ۔ البتہ اس بارگاہ کا ایک واقعہ میرے اور میرے گھرانے کے سامنے گزرا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ میری بڑی بہن کی شادی تھی۔ اقارب اور عزیز لکھنو، بارہ بنکی سے آئے ہوئے تھے ۔ دو تین ہفتے خاصی چہل پہل تھی۔ اس دوران عمی جان (مصنفہ کی تائی) نے ان سب کو بڑی سی گاڑی میں بٹھایا اور دولت آباد اور خلد آباد کے مزاروں کی زیارت کے لیے چل پڑیں۔ یہ لوگ جب حضرت خواجہ منتخب الدین زرزری زربخش کے مزار پر پہنچے تو ان میں سے ایک خاتون نے، جو رشتے میں میری چچی

لگتی تھیں ، ’ زر زری زر بخش ‘ کے الفاظ بار بار دوہرانا شروع کردیے اور پھر ازراہ مذاق ہنس کر بولیں کہ کیا ان کے دربار سے سب کو سونا ملتا ہے ؟ ہمیں سونا ملے تو جانیں۔ عمی جان نے ، جو ان کی بزرگ تھیں، ان کو تنبیہہ کی اور فاتحہ خوانی کے لیے چوکھٹ پر لا کھڑا کیا۔ انھوں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب ہاتھوں کو منہ پر پھیرا تو چھن سے آواز آئی۔ ہم لوگ سب اس آواز پر متوجہ ہوئے۔ ان کے سامنے سونے کی ایک چھوٹی سی گول پتری پڑی ہوئی تھی جس کو انھوں نے فوراً اٹھا لیا۔ ہم سب نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ پھر کیا تھا، وہ اسی چوکھٹ کے پاس بیٹھ کر زار و قطار رونے لگیں۔ یہ آنسو سچی عقیدت کے تھے۔ زر زری زر بخش نے ان کو ’زر‘ بخش دیا تھا ۔انھوں نے وہ سونا سنبھال کر رکھا اور دونوں تادم مرگ کسی کے محتاج نہ ہوئے۔ اگر یہ واقعہ میرا چشم دید نہ ہوتا اور اب تک میرے گھر والوں کو یاد نہ ہوتا تو میں ضبط تحریر میں نہ لاتی۔ ‘‘

شاہان بے تاج‘ کے آخری اوراق میں ۲۰ اپریل ۱۹۸۸ کو لکھے ایک پیغام میں مصنفہ ’ نے قارئین سے درخواست کی ہے کہ ’’خلد آباد، دولت آباد اور اورنگ آباد کی سرزمین بزرگان دین سے بھری پڑی ہے۔ میں وہاں کی اکثر درگاہوں میں گئی ہوں۔ بزرگوں کے نام جانتی ہوں لیکن کوشش کے باوجود ان کے حالات نہ مل سکے۔ اس لیے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ ان کے پاس قیمتی معلومات ہوں تو

مجھے ارسال کریں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کو شامل کرلوں۔'' ۔۔۔۔مذکورہ کتاب کے مطالعے کے بعد بے اختیار وحیدہ نسیم کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی۔ کتاب کے پس ورق ان کے تحریر کردہ نو ناولوں کے نام، تین افسانوی مجموعوں اور دو شاعری کی کتابوں کے نام درج ہیں۔ یہ علم بھی ہوا کہ انہوں نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد '' مکتبہ آصفیہ '' کے نام سے اپنا ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جہاں سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ' شاہان بے تاج' ہی تھی۔۔۔لیکن پھر وہی ہوا جو اکثر ہوتا ہے۔وحیدہ نسیم کا پتہ ملا تو ''وفیات اہل قلم'' ہی میں ملا۔وفیات سے علم ہوا کہ ان کی اسی موضوع پر مزید ایک کتاب بھی شائع ہوا تھی جس کا نام '' اورنگ آباد۔ملک عنبر سے عالمگیر تک'' تھا۔ وحیدہ نسیم ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۶ کو کراچی میں انتقال کر گئی تھیں۔ اللہ تعالی انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

:اتوار بازار سے ملنے والی تمام کتابوں کی تفصیل یہ ہے

شاہان بے تاج۔سفر نامہ ہندوستان

وحیدہ نسیم

مکتبہ آصفیہ، کراچی۔اشاعت: 1988

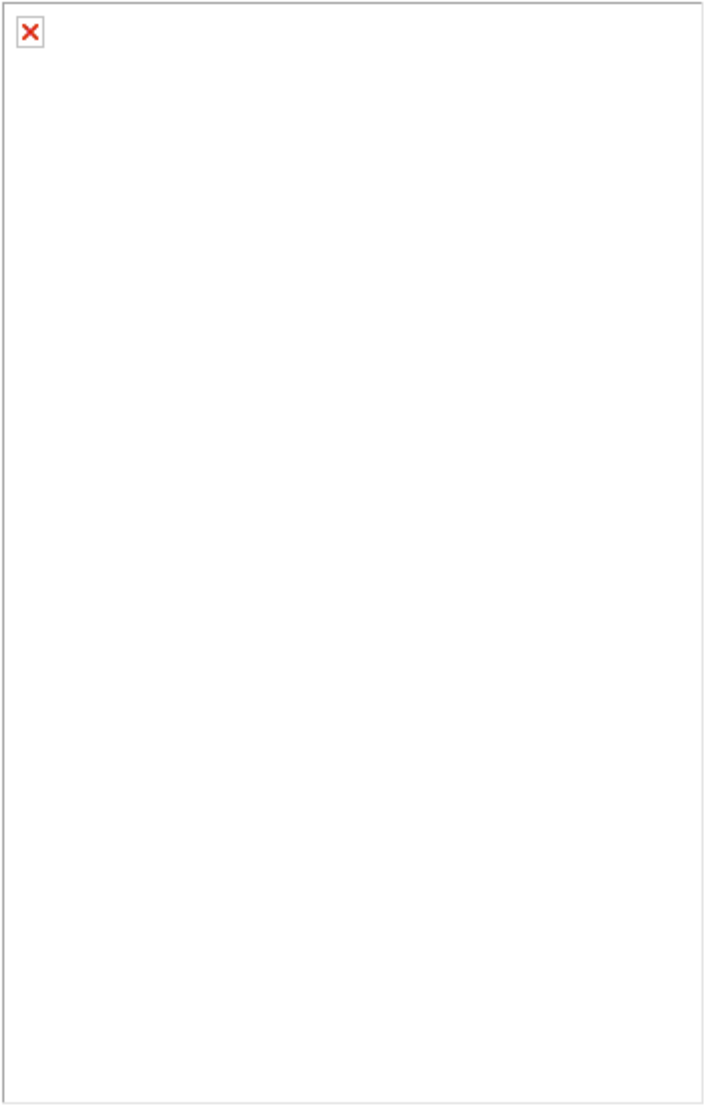

رئیس احمد جعفری-شخصیت اور فن۔آپ بیتی کے دو ابواب کے ساتھ
رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی۔اشاعت: اکتوبر 1970

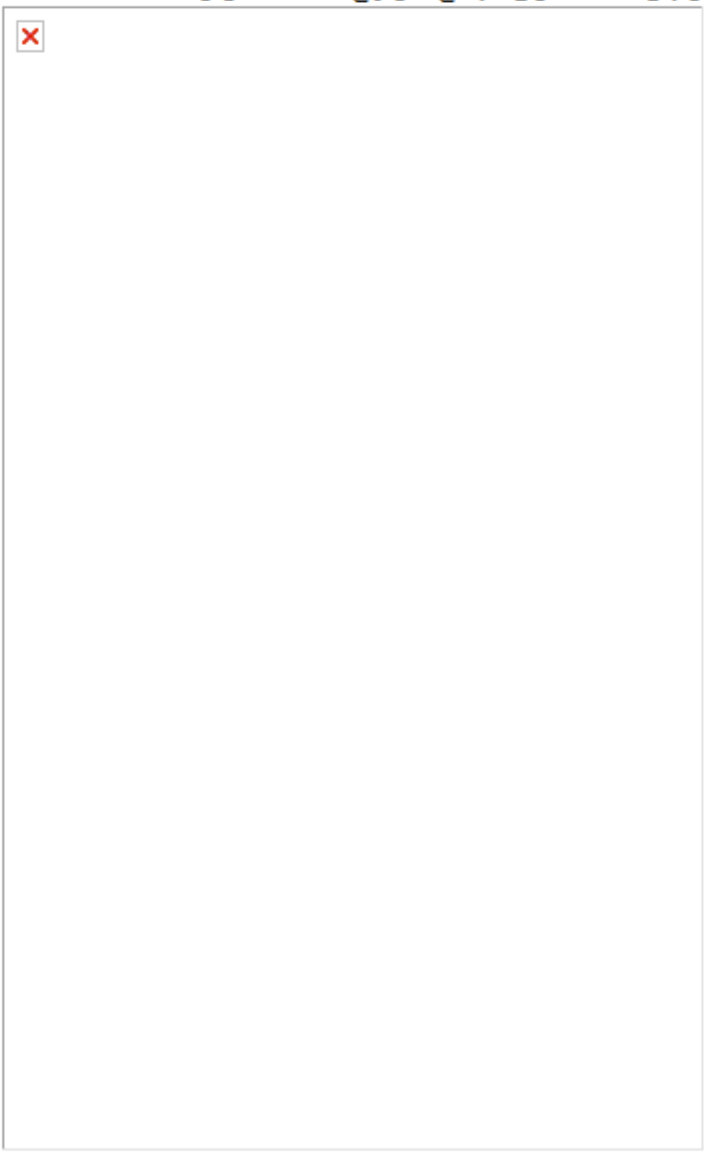

خواب درخشاں۔خودنوشت۔عبدالجلیل خان جامعی
ناشر: شفیع میموریل ٹرسٹ کراچی۔اشاعت: نومبر 2012

محترمہ فاطمہ جناح کے شب و روز۔ثریا کے ایچ خورشید
ناشر: آزاد انٹرپرائز، لاہور۔اشاعت: 1998

تخلیقی ادب۔اسلوب۔مدیر مشفق خواجہ
پانچواں اور آخری شمارہ ۔اشاعت: اکتوبر 1985
صفحات: 540

پرانی کتابوں کا اتوار بازار-2 جون، 2013

اس مرتبہ 2 جون، 2013 کو پرانی کتابوں کے اتوار بازار کی صبح اپنے جلو میں نت نئی دلچسپیاں لیے طلوع ہوئی۔ جو پایا گیا، جو لایا گیا، برسرِ عام رکھا جارہا ہے، لنک پیش خدمت ہے، تمام کتابوں کے سرورق اور فہرست مضامین کے ساتھ کل صفحات حسب معمول سو سے متجاوز ہوئے، دل کیجیے تو پڑھیے، دل کیجیے تو ڈاؤن لوڈ کیجیے:

http://www.scribd.com/doc/145199335/Karachi-s-Sunday-Old-Book-Bazar-2-June-2013-Rashid

اس مرتبہ قیصر تمکین بھی ہیں اور ان کی 1987 میں شائع ہونے والی نایاب خودنوشت "خبر گیر" بھی۔ خبر گیر انگریزی لفظ reporter کا ترجمہ ہے جو قیصر صاحب کا وضع کردہ ہے۔ قیصر مرحوم, پیدائش یکم جنوری 1938 , لکھنؤ سے تعلق، صحافت سے وابستہ رہے، لندن میں عمر گزاری۔ وطن سے اٹھے تو لندن میں جا کر دم لیا بھی اور دیا بھی وہیں۔ قیصر تمکین کی لکھنؤ میں ابتدائی زندگی عسرت میں بسر ہوئی تھی۔

کہتے ہیں " نچلے متوسط طبقے میں جو عام مفلسی اور نحوست چھائی رہتی ہے، اس میں ہمارے گھرنے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی حصہ پایا تھا۔ ظاہر ہے میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اگر قسمت سے دو وقت کا کھانا نصیب ہو بھی گیا تو بھی " گنی بوٹی اور نپا شوربہ" رہتا تھا۔ روٹیاں بھی گنتی کی تین چار ہی نصیب ہوتی تھیں۔ اس لیے "ہر وقت پیٹ خالی رہتا تھا اور معدے میں مروڑ ہوا کرتی تھی۔

.برطانیہ میں قیام پذیر, بزم قلم پر موجود ہمارے.بزرگ کرم فرما مقصود الٰہی شیخ صاحب قیصر تمکین مرحوم سے خوب واقف تھے،یقینا وہ بھی قیصر صاحب سے متعلق اپنے اپنے تاثرات سے نوازیں گے۔ شیخ صاحب کے رسالہ مخزن میں شائع ہوا قیصر تمکین کا ایک افسانہ بھی پی ڈی ایف فائل میں شامل کیا ہے۔

قیصر تمکین کا انتقال 25 نومبر 2009 کو لیڈز میں ہوا تھا۔ قبل ازیں نومبر دو ہزار دو میں ان کے بڑے بھائی حسین علوی کا انتقال ہوا تھا۔ پھر دو ہزار پانچ میں سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر شبیر احمد علوی کا اسلام آباد میں انتقال ہوا۔ اب ان کے ایک چھوٹے بھائی احمد ابراہیم علوی حیات ہیں جو لکھنو سے روزنامہ آگ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔

راقم سے "خبر گیر" کی فرمائش ہندوستان سے آئی ہے، کوشش ہوگی کہ اسے اسکین کرکے پیش کر دیا جائے۔

جلیس سلاسل کی کتاب " ٹیبل ٹاکس" انٹرویو کا مجموعہ ہے، 352 صفحات کی اس کتاب سے مہدی حسن اور بزرگ صحافی نصر اللہ خاں مرحوم کے انٹرویو شامل کیے ہیں۔

ادیب و نقاد نظیر صدیقی مرحوم کے خاکوں کی کتاب "جان پہچان" 1979 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب سے وحشت کلکتوی کا خاکہ شامل کیا گیا۔ مذکورہ کتاب، راقم نے کچھ عرصہ قبل نظیر مرحوم کے بھائی سے اجازت کے بعد انٹرنیٹ پر شامل کر دی تھی۔

اسی طرح رضوان صدیقی کے امریکہ کے سفرنامے "روشن اندھیرے" کا ایک باب، حکیم محمد سعید کے سفرنامے "ڈیلفی سے سونے کی کان تک" کا پہلا باب اور سبوحہ خان کی خودنوشت "دلی سے ڈیفنس تک" سے پہلا باب شامل کیا گیا ہے۔

میری تحریریں"، جاذب قریشی کے مضامین کا مجموعہ ہے جو محض ایک مضمون کے لیے " بحالت مجبوری خریدی گئی۔ مذکورہ تحریر "بھارت میں اردو کے وارث" بھی مذکورہ بالا لنک میں موجود پی ڈی ایف میں شامل کیا گیا ہے۔

: تمام کتابوں کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے

خبر گیر۔ خودنوشت

قیصر تمکین علوی۔ اشاعت: 1987

ناشر: اورینٹ پبلشر، لاہور

پی ڈی ایف فائل میں فہرست ابواب، پیش لفظ اور پہلا باب شامل کیا گیا ہے

بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری۔ مرتبہ: افتخار کھوکھر

ناشر: دعوہ اکیڈمی، اسلام آباد۔ اشاعت: 2003

ادب و آگہی۔ تنقیدی مضامین

مجتبی حسین۔ اشاعت: 1963

ناشر: مکتبہ افکار، کراچی

مُبیل مَاکس۔ انٹرویو

جلیس سلاسل۔ صفحات: 352

ناشر: پاکستانی جرنلسٹ گروپ آف پبلیکیشنز، کراچی

اشاعت: 1995

فہرست اور مہدی حسن اور بزرگ صحافی نصراللہ خاں مرحوم کے انٹرویو شامل کیے ہیں

جان پہچان۔ خاکے

نظیر صدیقی۔ ناشر: اردو اکیڈمی، سندھ

اشاعت: 1979

فہرست، مقدمہ اور وحشت کلکتوی کا خاکہ شامل کیا گیا ہے

بازگشت۔ امین نون

ناشر: مصنف نے 1991 میں کراچی سے شائع کی پیش لفظ اور طاہر مسعود کا تعارف

شامل کیا گیا ہے

روشن اندھیرے۔ رضوان صدیقی

سفرنامہ امریکہ۔ ناشر: کراچی گرافکس

اشاعت: 1996

پیش لفظ اور پہلا باب شامل کیا گیا ہے

بات چھپائے گوری۔ خلش ہمدانی

یہ ناول دراصل مصنف کی "شہوانخ نو عمری" (حضرت یوسفی سے معذرت) ہے

ڈیلفی سے سونے کی کان تک۔ سفر نامہ

حکیم محمد سعید۔ ناشر: ہمدرد

اشاعت: 1991

پہلا باب شامل کیا گیا ہے

دلی سے ڈیفنس تک۔ خود نوشت

سبوحہ خان۔ ناشر: کراچی اسٹڈی سرکل

اشاعت: 1998

پہلا باب شامل کیا گیا ہے

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، کراچی، 16 جون 2013۔انگلیاں فگار اپنی

اتوار بازار سے اس مرتبہ ملنے والی کتابوں سے کل 135 منتخب اوراق پر مشتمل پی ڈی ایف فائل کے لیے کارآمد سافٹ لنک:

http://www.scribd.com/doc/148112145/Sunday-Old-Book-Bazar-Karachi-16-June-2013-Rashid-Ashraf

آج کی پہلی کتاب جس کے مذکورہ بالا پی ڈی ایف فائل کا آغاز ہوتا ہے، سن 1979 میں کلکتہ 'ادارہ انشائے ماجدی، 147 رابندر سرانی کلکتہ 73 سے شائع ہونے والی مولانا عبدالماجد دریابادی کی "معاصرین" ہے۔کتاب بارہ سو کی تعداد میں شائع ہوئی تھی، صفحات دو سو بتیس،کتاب عبدالمجید الجید صدیقی ستمساروی کی اور طباعت کوہ نور آرٹ پریس کلکتہ کی۔کتاب کی ترتیب حکیم عبدالقوی دریابادی کے ذمے رہی تھی۔ مولانا ماجد نے معاصرین کا دیباچہ 17 مئی 1974 کو تحریر حکیم عبدالقوی کے مطابق 6 جنوری 1977 کو مولانا کا انتقال ہوگیا اور کتاب ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہوسکی۔

یہ مولانا کے تحریر کردہ خاکے وتذکرے ہیں۔ معاصرین تین حصوں میں منقسم ہے:

تینتالیس بڑے

کچھ برابر والے

آٹھ چھوٹے

بڑوں میں علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر، شوکت علی، حسرت موہانی، ریاض خیر آبادی، شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، راجہ صاحب محمود آباد، عبدالحلیم شرر، مرزا رسوا، اکبر یار جنگ، خواجہ حسن نظامی، چودھری محمد علی رودولوی، خواجہ غلام الثقلین جیسے نام شامل ہیں۔

مصنف نے "برابر والوں" میں ملا واحدی، مولانا مودودی، پریم چند، مولانا مہر و سالک جبکہ آٹھ چھوٹوں میں رئیس جعفری، شوکت تھانوی جیسی شخصیات کو رکھا ہے۔

راقم نے متذکرہ پی ڈی ایف فائل میں اکبر الہ آبادی، ملا واحدی، پیٹرک گیڈس، راجہ صاحب محمود آباد، دو گنج مخفی (دو بزرگوں کا احوال)، مولوی عبدالحق، مرزا رسوا، رئیس جعفری، شوکت تھانوی، عبدالرحمٰن ندوی نگرامی۔

اکبر الہ آبادی کا خاکہ دلچسپ ہے اور جس انداز اور جن پہلوؤں سے لکھا گیا ہے، ان کی عمومی شخصیت کی نفی کرتا ہے۔ مصنف اکبر سے عمر میں کم ہونے کے

باوجود بے تکلف تھے اور ان سے بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا عبدالماجد مغربی مصنفین کے بری طرح زیر اثر تھے اور بقول ان کے یہ ان کے "الحاد و تشکیک" کا زمانہ تھا۔ ایک روز اکبر کہنے لگے " کیوں صاحب! آپ کو اللہ میاں سے متعلق جو کچھ شک و شبہے رہے ہوں، یہ فرمایئے کہ کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟

سوال سنتے ہی مولانا ماجد چکرا گئے اور کہنے لگے " جی نہیں، اس میں تو کبھی شبہ ہوا ہی نہیں اور شاید ہو سکتا بھی نہیں ہے"۔

اکبر نے جواب دیا" بس اتنا ہی کافی ہے۔ اپنی عبدیت کا اقرار کیے جایئے۔ رہی اللہ کی ذات و صفات تو وہ آج تک کس کی سمجھ میں آئی ہے۔ جنھیں بڑے سے بڑا عالم و عارف کہا جاتا ہے، وہ بے چارے انہیں بحثوں میں حیران و ششدر نظر آتے ہیں جبھی تو میں نے (اکبر نے) کہا ہے۔۔۔۔ع

بندگی حالت سے ظاہر ہے، خدا ہو یا نہ ہو

یہ دلیل سن کر مولانا ماجد لکھتے ہیں کہ " میں قائل تو معا" کیا ہوتا البتہ سوچ میں اسی وقت سے پڑ گیا"

اکبر الہ آبادی کا وقت آخر قریب آیا تو خواجہ حسن نظامی ان کی نبض تھامے سرہانے بیٹھے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ نبض پر میرا ہاتھ تھا، جب میں کلمہ کہتا تو ڈوبتی ہوئی نبض ایک بار پھر تیز ہو جاتی تھی۔۔

: مولانا ماجد، ریاض خیر آبادی کے خاکے میں ان کا شعر لکھتے ہیں

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا

اس سوچ میں بیٹھا ہوں کہ آخر مجھے کیا کرنا

گورکھپور کے رئیس مولوی سبحان اللہ خاں، ریاض خیر آبادی کے بڑے قدردان تھے۔ ایک مرتبہ ایک مطلع پر خوش ہو کر انہیں ایک ہزار روپے کے رقم انعام میں دی۔

: مولانا کو مطلع یاد رہ گیا

اتری جو آسمان سے تھی کل اٹھا تو لا

طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

دلاور فگار کی تحریر کردہ کتاب " انگلیاں فگار اپنی" بیک وقت خودنوشت بھی ہے اور منتخب مجموعہ کلام بھی۔ ابتدائی 100 صفحات میں دلاور فگار نے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ راقم نے مذکورہ اوراق کو محفوظ کر کے انٹرنیٹ پر پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے جسے جلد پورا کیا جائے گا۔

شاعری میں دلاور فگار کا ایک علاحدہ اور خاص مقام تھا، یہ مقام ان کی وفات تک قائم رہا۔ زیر تذکرہ کتاب میں غزل کے عنوان سے یہ تخلیق ملاحظہ کیجیے:

اک دوات ایک قلم ہو تو غزل ہوتی ہے
جب یہ سامان بہم ہو تو غزل ہوتی ہے
مفلسی، عشق، مرض، بھوک، بڑھاپا، اولاد
دل کو ہر قسم کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے
بھوت، آسیب، شیاطین، اجنہ، ہمزاد
ان بزرگوں کا کرم ہو تو غزل ہوتی ہے
شعر نازل نہیں ہوتا کسی لالچ کے بغیر
دل کو امید رقم ہو تو غزل ہوتی ہے
تندرستی بھی ضروری ہے تغزل کے لیے
ہاتھ اور پاؤں میں دم ہو تو غزل ہوتی ہے
پونچھ کتے کی جو ٹیڑھی ہے تو کچھ بھی نہ بنے
اور تری زلف میں خم ہو تو غزل ہوتی ہے
صرف ٹھرے سے تو قطعات ہی ممکن ہیں فگار
ہاں اگر وہسکی و رم رم ہوں تو غزل ہوتی ہے

دلاور فگار یوپی کے شہر بدایوں میں 8 جولائی 1928 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد شاکر حسین بدایوں کے ایک کالج میں مدرس تھے۔ خودنوشت میں دلاور فگار نے بدایوں کی تہذیبی زندگی کے احوال کے علاوہ کراچی میں قیام کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔

اتوار بازار سے ملنے والی تمام کتابوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

انگلیاں فگار اپنی۔ دلاور فگار

ایجوکیشنل پریس کراچی۔ اکتوبر 1971

معاصرین۔ خاکوں کا مجموعہ

مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ادارہ انشائے ماجدی، رابندر سرانی، کلکتہ

سن اشاعت: 1979

کیمرہ، قلم اور دنیا۔ سفرنامہ

ریاض الرحمٰن ساغر۔ اشاعت: 1992

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، کراچی، 7 جولائی 2013

اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں سے منتخب کردہ کل 207 اوراق پر مشتمل پی ڈی ایف کا لنک یہ ہے۔ مذکورہ فائل میں سن 33ء میں علی گڑھ سے شائع ہونے والی خودنوشت "کارنامہ سروری" سے 100 صفحات بھی فائل کے آغاز میں شامل کیے گئے ہیں:

http://www.scribd.com/doc/149460069/Sunday-Old-Book-Bazar-Karachi-23-June-2013-Pagses-207-Rashid-Ashraf

اس مرتبہ ملنے والی کتابوں میں ریڈیو سے وابستہ رہے مظفر حسین کی خودنوشت "عرض و سماع" بھی شامل تھی۔ 384 صفحات پر مشتمل یہ تاریخی خودنوشت 1990 میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ "عرض و سماع" کو ہم ایک "فراموش کردہ داستان حیات" کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کتاب کے بارے میں امریکہ میں مقیم بزرگ ادیب اور میرے کرم فرما جناب ابوالحسن نغمی نے فون پر مجھ سے کہا: ''کچھ کتابیں کم نصیب ہوتی ہیں، ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور وہ وقت کی دھول میں کہیں گم ہو جاتی ہیں، میرے دوست مظفر حسین کی خودنوشت 'عرض و سماع' بھی ایسی ہی ایک کتاب ہے۔ لیکن یہ آپ کو کہاں سے مل گئی؟''

منفرد عنوان کی حامل یہ خودنوشت ریڈیو کے ادارے سے وابستہ رہے دونوں پیروں سے معذور ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اتنا تو غیر معروف نہ تھا کہ اس کی دلچسپ داستان حیات شہر کراچی کے اس نابغہ روزگار شخص کے پاس بھی نہ پہنچی ہو جسے خودنوشتوں سے ازحد لگاو؟ تھا اور جو شہر میں خودنوشتوں کے سب سے بڑے ذخیرے کا مالک تھا۔ یہ ذکر مشفق خواجہ مرحوم کا ہے۔ خواجہ صاحب کے کتب خانے میں عرض و سماع موجود نہیں ہے۔ اسی طرح شہر کی چند معروف لائبریروں میں بھی اس کتاب کی کوئی جلد موجود نہیں ہے۔ اردو خونوشتوں پر کیے گئے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے بیشتر مقالوں میں اس کا نام کہیں نہیں آیا، آپ بیتیوں پر لکھے گئے تحقیقی مقالے بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ سید مظفر حسین نے بچوں کے لیے تین ناول بھی لکھے تھے، کامران اور بھارتی جاسوس، کامران اور شاہی خنجر اور کامران اور شاہی خزانہ نامی تینوں مشہور ناول، فیروز سنز لاہور نے شائع کیے تھے۔ اس کے علاوہ تراجم میں ربیکا اور حکایات از شیکسپیئر شامل ہیں۔

عرض و سماع برصغیر پاک و ہند کے ایک سابق ریڈیو اور ٹی وی نیوز ریڈر و براڈکاسٹر کی سرگزشت ہے جو 1942 سے 1982 تک کے ان اہم حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے جن کے چشم دید گواہ نے 19 ستمبر 1943 کو ا?ل انڈیا ریڈیو دہلی سے باقاعدہ ملازمت کا آغاز کیا۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ عرض و سماع، نصف صدی کے آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان اور لاہور ٹی

وی کے پروڈیوسروں، ڈرامہ نگاروں و فنکاروں، شاعروں، ادیبوں اور دیگر مشاہیر ادب کی باتوں سے لبریز ہے۔ یہ خودنوشت کسی صورت ریڈیو کے ذوالفقار علی بخاری کی داستان حیات 'سرگزشت' سے کم نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں چھوٹے بخاری کا ذکر کچھ اچھے الفاظ میں نہیں ملتا۔ مصنف نے ان کو جس حال میں دیکھا، من و عن بیان کردیا، یوں کہا جائے کہ عرض و سماع میں وہ ' غلط بخاری ' ہی کے طور پر سامنے آتے ہیں، بیجا نہ ہوگا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کے انتقال کا دن مظفر حسین کو بہت عرصے تک یاد رہا۔ کراچی سے شکیل احمد نے مولانا کے انتقال کی خبر ان الفاظ میں نشر کی تھی:

'آج سہ پہر کو مولانا شبیر احمد عثمانی کو گولی مار کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ '

گولی مار، کراچی کا ایک گنجان آباد علاقہ ہے۔

عرض و سماع کے آخری صفحات میں مظفر حسین لکھتے ہیں: " ایک روز میں نے صدر مملکت ضیاء الحق کو اپنی حالت سے مطلع کیا، خط کی رسید تو ملی لیکن جواب نہ آیا۔ ایک زمانے میں بیگم عطیہ عنایت اللہ میرے ساتھ لاہور میں انگریزی کا

پروگرام کرتی تھیں۔ وہ معاشرتی فلاح و بہبود کی مشیر تھیں، ان کو خط لکھا لیکن ان کی طرف سے نہ کوئی عطیہ ملا، نہ کوئی عنایت ہوئی۔ ہو سکتا ہے وہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے معاشرہ تلاش کرتی رہی ہوں اور فلاح و بہبود کا موقع ہی نہ ملتا ہو البتہ ان کے بیانات ان کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ میں معذور بھی تھا، سفید پوش بھی اور غیرت مند بھی۔ آج میں پہلی بار اپنے آپ کو بے حد بے بس، بے کس اور مجبور محسوس کر رہا ہوں۔ میری بیوی اپنی ضروری خرید و فروخت کے لیے میری طرف دیکھتی ہے میں آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہوں کہ اوس سے کر لے فرشتے تک اوپر سے ہی اترتے ہیں۔''

عرض و سماع کے ذریعے ایک معذور شخص اپنے قاری کو جینا سکھا گیا۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

راقم الحروف نے احباب کے لیے یہ دلچسپ خودنوشت انٹرنیٹ پر پیش کی ہے۔ اسے درج ذیل لنک پر پڑھا اور ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے

http://www.scribd.com/doc/131969328/Arz-O-Sama-Part-Muzaffar-Hussain-Karachi-1990

کارنامہ سروری" ایک خودنوشت ہے۔ کون جانتا تھا کہ علی گڑھ سے 1933 میں "

شائع ہونے والی اس کتاب کا اصلی نسخہ ہمیں پورے 80 برس بعد کراچی کے فٹ پاتھ سے ملے گا۔ کتاب کے ایک کونے میں کسی صاحب کے دستخط ہیں جو 19 نومبر 1944 کو کتاب پر ثبت کیے گئے تھے۔

کتاب کی پیشانی پر لکھا مصنف کا نام تو ملاحظہ ہو:

"عالی جناب سرور الملک سرور الدولہ نواب آغا مرزا بیگ خان بہادر سرور جنگ مرحوم و مغفور" سابق معتمد پیشی و استاد خاص اعلی حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس"۔

اس قدر طویل اور شاہانہ القابات کے ساتھ انسان مرحوم تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا مغفور ہونا اپنی رعایا کے ساتھ کیے گئے حسن سلوک کے ساتھ مشروط ہے۔

یقینا مصنف ایک درمند دل رکھنے والے انسان تھے۔

یہ خودنوشت سرور جنگ کے فرزند نواب ذوالفقار جنگ بہادر نے طبع کرا کے شائع کروائی۔

سرور جنگ کی مرزا غالب سے رشتہ داری تھی۔ ان کا بچپن دلی میں گزرا جہاں انہوں نے ایک تہذیب کے عروج و زوال کو بغور دیکھا۔ ایک جگہ مرزا غالب کے بھائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مرزا یوسف برادر حقیقی کلاں مرزا اسداللہ خاں غالب افواج قاہرہ دولت آصفیہ میں نہایت مقتدر عہدے پر سرفراز تھے۔ کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا

''ایسی دوا کھلائی کہ وہ مجنون ہو گئے اور تاوقت انتقال مجنون رہے۔

راقم الحروف نے کارنامہ سروری سے 100 سے زائد اوراق کو مذکورہ پی ڈی ایف فائل میں شامل کیا ہے۔ ان میں مصنف کے ابتدائی حالات، سفر حیدرآباد دکن، سفر اورنگ آباد، میرا پہلا تجربہ دربار انگریزی اور میری خدمت کے آخری ایام نامی ابواب شامل ہیں۔

مصنف غدر کے بعد ہانپتے کانپتے مئی 1872 میں لکھنؤ سے چلے تو اگلے برس کے اوائل میں دکن پہنچے۔ سفر کی صعوبتوں کا احوال مذکورہ بالا باب میں موجود ہے۔ تحریر کی سلاست کے کیا کہنے، ذرا ایک ٹکڑا ملاحظہ توکیجیے, کہ ڈیڑھ سو برس پہلے بھی حالات ویسے ہی تھے جیسے آج ہیں۔

مقامات منزل مقرر تھے۔ ہر مقام پر سرائیں بنی ہوئی تھیں جن میں بھٹیارے بسے ہوئے تھے۔ ہر روز بھٹیارے اپنی سرائے سے دور تر جا کر مسافروں کو استقبال کرکے لاتے تھے، آپس میں خوب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ہر بھٹیارا اپنی صفات بیان کرکے مسافروں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ مسافر بیچارا ان کی باہم کشمکش میں حیران و پریشان ہوجاتا تھا۔ سرائے کے دروازے مین داخل ہوتے ہی عجیب سماں نظر آتا تھا۔ جدھر دیکھیئے گاڑیاں، بیل، گھوڑے، اونٹ وغیرہ سواریوں کا جھمگٹ ہے۔ درختوں پر جانوروں کا شور و غل، بسیرے کا وقت، بھٹیاروں کی

مسافروں کے ساتھ چھین جھپٹ۔ مسافروں کے غول کے غول پکانے ریند ھنے کی فکر میں ادھر ادھر دوڑ دھوپ اور غل غپاڑا، گھوڑوں کا ہنہنانا، بیلوں کا ڈکارنا، اونٹوں کا بلبلانا، شام کا رفتہ رفتہ رات ہوجانا، ایک خاص سماں بندھ جاتا تھا۔ بی بھٹیاری کی پکائی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں اور کھڑی چھلکوں کی ماش کی دال اس میں بڑا لوندا گھی کا رکھا ہوا۔ روٹیاں بھی گھی سے چپڑی ہوئی۔ تھکے ماندے مسافروں کو وہ مزہ دیتی تھیں "کہ بادشاہوں کی اغذیہ لطیفہ بھی ان پر صدقہ کردی جائیں۔

مصنف حیدرآباد پہنچے تو نظام کے دربار میں ملازمت کی سبیل کی فکر لاحق ہوئی، مراد پوری ہوتے پورے تین برس لگے۔ ان کا پہلا تقرر نظام کے انگریز اتالیق کے مددگار کے طور پر ہوا۔ نظام کے حضور پہلی پیشی کے احوال میں لکھتے ہیں:

"کچھ عرصے بعد حضور پرنور برآمد ہوئے تو انھوں نے مجھے طلب کیا۔ چھوٹا سا دلان، چھوٹی سی انگنائی۔ دلان میں مسند بچھی ہوئی۔ اس پر حضور کلاہ زرنگار برسر، انگرکھا دکنی دربر، لمبی لمبی چوٹیاں تا بہ کمر۔ عمر شریف کوئی آٹھ برس کی، جلوہ افروز تھے۔ دو تین مامائیں سفید مثل برف دوپٹوں میں لپٹی ہوئی پس پشت استادہ۔ بڑے میاں اور ان کے بیٹے دست بستہ روبروئے مسند بیٹھے ہوئے۔ اول لفظ جو حضور نے ارشاد فرمایا یہ تھا کہ انگریزی بولی کیسی ہوتی"

"ہے۔ سناؤ

میں نے انگریزی میں عرض کیا:

I pray for your highness 's life and prosperity

اس کے بعد فوراً برخاست ہو گئے۔

نواب سرور جنگ کی خودنوشت "کارنامہ سروری" شہر حیدر آباد اور نظام حیدر آباد کے دربار کی درست عکاسی کرتی ہے۔

دیگر کتابوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

کارنامہ سروری۔ خودنوشت

نواب سرور جنگ۔ ناشر: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشاعت: 1933

عرض و سماع۔ خودنوشت

مظفر حسین۔ صفحات: 384۔ اشاعت: 1990

ذہنی کوفت کا سفر

خودنوشت۔ کریم الدین احمد۔ ناشر: آئینہ ادب لاہور

اشاعت: 1988

تخلیقی ادب۔ اول شمارہ

زیر ادارت: مشفق خواجہ۔اشاعت: 1980

شاکر علی۔ فن اور شخصیت

صفحات: 235۔اشاعت: 1982

ناشر: شعبہ تحقیق و مطبوعات، پاکستان۔ اسلام آباد

جریدہ کتاب نما، دہلی۔ مئی 1990

گوشہ مشیر الحق بسلسلہ شہادت

آپ بیتا۔ خودنوشت

قمر یوسف زئی۔اشاعت: 2002

میری زندگی کے 75 سال۔ خودنوشت

اعجاز الحق قدوسی۔اشاعت: 1988

ناشر: مکتبہ اسلوب، کراچی

یاد خزانہ۔ خودنوشت

جمیل زبیری۔اشاعت: 1993

ناشر: مکتبہ دانیال، کراچی

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، کراچی۔ 11 اگست، 2013

عیدالفطر کا تیسرا دن ، صبح سویرے کا وقت۔۔۔۔۔ کتابوں کے اتوار بازار کی ویرانی دیدنی تھی۔ گنتی کے کتب فروش، فروکش تھے اور گاہک ناپید۔ ایسے میں ایک کتب فروش 'ہر مال بیس روپیہ' کی آواز لگاتا پایا گیا۔ کچھ ایسے خزانے لیے بیٹھا تھا کہ وہ دے اور بندہ لیتا جائے۔ ہر کتاب بیس روپے میں۔۔۔۔ یوں تو اس کے پاس سے ملنے والی تمام کتابیں ہی قابل ذکر رہیں لیکن اس وقت خصوصیت سے تذکرہ ہے سجاد حیدر زیدی کی کتاب ''عارض گیتی'' کا جو بیک وقت ''خودنوشت، مضامین سیر عالم، مطالعہ اور مشاہدہ'' کا مرکب ہے۔ عارض گیتی کے نام سے آج بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ آج کی دنیا میں جسے مارکیٹنگ و پبلسٹی کہا جاتا ہے، یہ کتاب ان 'نعمتوں' سے سرفراز نہ ہوسکی۔ بقول خامہ بگوش آج کل سو گرام کے کاغذ ہر دس گرام کی بات کہی جارہی ہے۔ عارض گیتی کے معاملے میں اس مثال کو ہر لحاظ سے الٹ کر دیکھا جانا چاہیے۔ مصنف کہ تحریر ہی سے ایک ذہین شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں، شاید نمود و نمائش سے دور تھے، اسی لیے آج ان کے نام سے شاید ہی کوئی واقف ہو۔

مذکورہ کتاب کا 75 فیصد دلچسپ حصہ (متفرق مضامین کو چھوڑ کر) اس پی ڈی ایف

فائل کا حصہ بنا دیا گیا ہے جس کا لنک ذیل میں پیش کیا جارہا ہے جبکہ مذکورہ فائل میں دیگر کتابوں سے بھی منتخب اوراق شامل کیے گئے ہیں۔

مذکورہ فائل میں عارض گیتی سے قبل ذکیہ حمید کے سفرنامے "سورج کے ساتھ ساتھ" کا ڈاکٹر جالبی کا تحریر کردہ مقدمہ شامل کیا گیا ہے اور اسپین واروں کی سیاحت پر مبنی باب پڑھا جاسکتا ہے۔

:سافٹ لنک جس کی مدد سے فائل کو پڑھا اور ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے

http://www.scribd.com/doc/159515347/Sunday-Old-Book-Bazar-August-11-2013-Rashid-Ashraf

عارض گیتی کے مصنف سجاد حیدر زیدی 1935 میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا، ملکوں ملکوں گھومتے رہے اور پھر کتاب کی شکل میں زندگی کے تجربات کو قارئین کے سامنے پیش کردیا۔ بقول مصنف، ان کے روزگار کا سلسلہ 1952 سے شروع ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ صحرائے عرب اور برطانیہ میں پڑاؤ رہا۔ ان کی زندگی کا زائچہ لکھنؤ، کراچی اور لندن کے گرد بنتا ہے۔ 1984 میں ان کی نظموں کا غزلوں کا مجموعہ ریزہ ریزہ خواب" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مصنف لکھنو کے قصبے نگرام سے تعلق" رکھتے تھے جہاں ان کا بچپن گزرا۔ واضح رہے کہ برطانیہ میں قیام پذیر افسانہ نگار صفیہ صدیقی مرحومہ کا آبائی تعلق بھی نگرام ہی

کی مٹی سے تھا۔

عارضِ گیتی میں پاک و ہند کے کئی شہروں کا مختصر احوال بھی شامل ہے۔ مصنف کراچی کے باب میں لکھتے ہیں کہ

ایک روز میں لیاقت آباد سپر مارکیٹ پلازہ کی دہلیز پر تھا کہ خیال آیا کہ اس علاقے " کی لائبریری بھی ملاحظہ کرتا چلوں کہ فخر روزگار شہروں میں ہمارا مشاہدہ رہا ہے کہ جتنا عمدہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور اتنی ہی اعلی اس کی لائبریری۔ چنانچہ میں نے ان سیڑھیوں پر ایک سوٹ کیس فروش سے جو اس بارے میں دریافت کیا تو اس مسخرے نے کیا برجستہ جواب دیا' آگرے میں ہوا کرتی تھی'۔

اس نے میرے تحت لاشعور کو جھنجھوڑتے زماں و مکاں کی وہ لہٹر لگائی کہ کہ میں اسے " دور تک دیکھتا چلا گیا۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

سن 61ء میں سجاد حیدر نے لکھنؤ کا قصد کیا۔ ایک پرانے دوست رفعت کمال پاشا سلجوقی روشن دولہ میں اچانک انہیں مل گئے۔ طے ہوا کہ لکھنؤ کی سیر کی جائے

گی۔ لکھتے ہیں:

"دوسری صبح ہم لوگ ایک رکشہ پر سوار شہر کے قلابے ملاتے رہے اور جب تحسین والی مسجد سے گزر کر فالودہ کھانے کے لیے ایک ریسٹوران میں بیٹھے تو رکشہ والا بھی ستانے کی خاطر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اس مہابلی سے مسلمان فالودہ کھانے کو کہا تو وہ سر جھٹک، چٹیا ہنچی کرکے راضی ہوگیا۔ اس پر پاشا سے نہ رہا گیا، بولے' سر تو جن سنگھی ہے لیکن پیٹ سالے کا مسلمان ہے'۔۔۔۔ اسی طرح لندن میں ایک ویک اینڈ پر ڈاکٹر لچھمن سری واستو، جمال خان ملیح آبادی سے ملنے آئے۔ گھر میں عمدہ قورمے کی خوشبو مہک رہی تھی۔ ان کی موجودگی میں ہم نے طعام میں توقف کیا تو ڈاکٹر صاحب نے خود اشتہا ظاہر کی۔ جمال صاحب نے کہا ؟ سری واستو صاحب ! آج صرف بے زبان کی زبان بنی ہے' تو واستو بولے' پیٹ کے لیے ایندھن ضروری ہے۔ پہلے آتما پھر پرماتما۔"

لولو و مرجان"، "سید محمد باقریاس بلگرامی"، "سید خاور حسین رضوی نگرامی" اور" جوش ملیح آبادی" عارض گیتی کے آخری دلچسپ ابواب ہیں جو احباب کے ذوق مطالعہ" کی خاطر پی ڈی ایف فائل کی زینت بنائے گئے ہیں۔ مصنف کی چند تصاویر بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

مرزا ظفرالحسن کی "ذکر یار چلے" سے مقدمہ اور پہلا باب شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح کلیم عاجز کی "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" سے چند اوراق پیش خدمت ہیں۔ کلیم عاجز ہندوستان کے معروف شاعر ہیں۔ "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" میں فراق گورکھپوری کا تبصرہ بھی پڑھا جاسکتا ہے جو انہوں نے 16 نومبر 1975 کو شدید علالت کی حالت میں لکھوایا تھا۔ آخری سطر میں فراق کہتے ہیں: " میں کلیم عاجز کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں "کچھ بھی نہیں کہہ سکتا

وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کے مطالعے کے بعد راقم پر رقت طاری ہو گئی اور وہ بھی" فراق مرحوم کا ہم خیال ہوگیا تھا۔ یہ کیفیت اس وقت ماند پڑی جب کلیم صاحب کی وہ غزل دوبارہ پڑھی جو مذکورہ کتاب میں شامل نہیں ہے:

میرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو
دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو، دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں، تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکے ملو، دُور سے کیا بات کرو ہو

ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمھیں، کیا بات کرو ہو
یوں تو ہمیں منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
بکنے بھی دو عاجز کو جو بولے ہے، بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

اتوار بازار سے ملنے والی تمام کتابوں کی مختصر اشاعتی تفصیل یہ ہے

۔عارضِ گیتی۔ سجاد حیدر زیدی۔ اشاعت: جولائی 1988، کراچی
۔سورج کے ساتھ ساتھ۔ ذکیہ ارشد حمید (جمیلہ ہاشمی کی دوست۔
۔سفر نامہ۔ اشاعت: اگست 1988، کراچی (
۔ذکر یار چلے۔ یادداشتیں۔ مرزا ظفر الحسن۔ نفیس اکیڈمی، کراچی۔ اشاعت: 1977
۔وہ جو شاعری کا سبب ہوا۔ خودنوشت و مجموعہ کلام۔ کلیم عاجز (ہندوستانی شاعر)
۔اشاعت: دسمبر 1981، کراچی
۔تخلیقی ادب۔ پانچواں اور آخری شمارہ، مدیر: مشفق خواجہ۔ اشاعت: اکتوبر 1985

پرانی کتابوں کا اتوار بازار۔18 اگست، 2013-ملاقات مسیحا و خضر

احوال سے قبل اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں سے منتخب کردہ اوراق کی پی ڈی ایف فائل کے لیے کارآمد لنک پیش خدمت ہے

http://www.scribd.com/doc/161140189/Sunday-Old-Book-Bazar-Karachi-August-18-2013-Rashid-Ashraf

چند ماہ قبل کویت سے تشریف لائے ہمارے دوست جناب محمد حنیف (ابن صفی ڈاٹ انفو والے) اور ہمارے کرم فرما فاروق احمد (اشتیاق احمد کے ناشر) کی ملاقات کا تصویری احوال یہاں "ملاقات مسیحا و خضر" کے عنوان سے پیش کیا گیا تھا۔ 18 اگست کو ایک مرتبہ پھر مسیحا کویت سے آئے اور ہم سے کہا کہ منجانب رہائش گاہِ خضر لے چلیے:

زخمی ہوں میں اس ناوکِ دزدیدہ نظر سے
جانے کا نہیں چور مرے زخمِ جگر سے

فاروق احمد صاحب کے پاس آخر ایسا کیا ہے؟ یا یوں کہیے کہ کیا نہیں ہے۔ طواف کوئے ملامت کو بار بار جانے کی آرزو دل آخر کیوں رکھتا ہے؟

سید معراج جامی صاحب سے درخواست کی کہ وہ بھی اس مرتبہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں کہ کچھ تو ذکریار چلے اور بار بار چلے یہاں ایک مرتبہ پھر استاد ذوق ہی یاد آرہے ہیں:

وہ خلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں
ہے شاخ ثمر دار میں گل پہلے ثمر سے

حنیف صاحب سے پہلی مڈ بھیڑ اتوار بازار میں ہوئی جہاں وہ اس وقت آئے جب ہم کتابوں کی خریداری کے فرض سے 'سبکدوش' ہو کر انہی کا انتظار کرتے تھے۔ پھر شہر کراچی میں چشم فلک نے بادلوں کی اوٹ سے دیکھا کہ وہ آئے اور ہماری معیت میں سیدھا قصد کیا اپنی منزل کا:

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

محفل کی گفتگو ہمہ جہت رہی۔اولین موضوعِ گفتگو دلی سے شائع ہوئی " ابن صفی ادبی مشن اور کارنامہ " کے گرد گھومتا رہا اور ساتھ ساتھ تکلف آمیز ماحول سے کوسوں دور گفتنی و ناگفتنی، ہر طرح کی بات ہوتی رہی۔ جامی صاحب نے اپنے اسفار ہند کے تذکرے چھیڑے تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ قیام بمبئی کی دلچسپ باتیں، میزبانوں کا حسن سلوک، کوکنی تہذیب کے قصیا ستدعا کی کہ حضرت!

یہ تاریخی قصے ہیں تو کیوں نہ تحریر کی شکل میں محفوظ کر دیے جائیں۔

پھر تمام احباب منجاب میزبان، لذت کام و دہن کی آزمائش کے مرحلے سے گزرے۔اور پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے کہ جب زبانیں رواں ہوئیں تو یک لخت احساس ہوا کہ وقت ملاقات تو قریب الختم ہے۔

☆÷☆

اس مرتبہ پرانی کتابوں کے اتوار بازار کے احوال میں پہلے چند تصاویر شامل کی گئی ہیں اور اس کے بعد کتابوں کا تعارف اور منتخب کردہ اوراق پیش خدمت ہیں۔ سردار جعفری کی ''مخدوم محی الدین'' نامی کتاب کا تحفہ فاروق احمد صاحب سے ملا۔ یہ کتاب 1948 میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی اور فاروق صاحب اسے اپنے تایا مرحوم کے ذخیرہ کتب سے چند روز قبل ہی لائے تھے، سو اسے بھی مذکورہ احوال ہی میں ضم کر دیا گیا ہے۔فاروق احمد کی والدہ صاحبہ کے انتقال (2013 کے رمضان کے مہینے میں)کے تیسرے ہی روز ان کے تایا کا انتقال ہوا تھا۔ جن کے سفر آخرت کا تذکرہ سن کر راقم ششدر رہ گیا تھا۔آخری وقت تک چاق و چوبند ہوش و حواس تاب و تواں سبھی کچھ ساتھ ہی تھا۔ سانس کی تکلیف محسوس کی تو اپنے ڈاکٹر داماد کو بلایا جو ان کو گاڑی میں بٹھا کر اسپتال کی طرف چلے تھے۔ عقبی نشست پر فاروق احمد کے تایا اپنے ڈاکٹر داماد کے ساتھ بیٹھے

تھے کہ اچانک مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا۔ '' اچھا میاں ! توخدا حافظ . . .
''ہم چلتے ہیں

یہ فقرہ ادا کیا اور روح آناً فاناً خدا کے حضور پہنچ گئی ، جسد خاکی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں میں رہ گیا۔

اللہ تعالی دونوں مرحومین کو جنت نصیب کرے۔

☆÷☆

اتوار کتب بازار سے ایک حیرت انگیز کتاب ''شب وروز'' کے عنوان سے ملی۔ مصنف ادبی دنیا کے لیے ایک گمنام شخص ۔۔۔۔ نام محمد شریف۔۔۔۔ کتاب میں تعارف ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحریر کردہ

۔۔۔۔ صفحات 155 ۔۔۔۔ اشاعت کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن متفرق یادداشتوں پر مشتمل مضامین ایسے کہ وہ لکھے اور پڑھا کرے کوئی۔۔۔۔ کون تھے، کہاں سے آئے۔۔۔کیا ہوئے۔۔خدا جانے لیکن 50 برس بعد فٹ پاتھ سے ملنے والی شب وروز'' نے نہال کردیا۔ کتاب کے مطالعے سے یہ علم ضرور ہوتا ہے کہ ''
موصوف ایک بینکار تھے۔ مذکورہ کتاب سے تین عدد مضامین اور ایک خط زیر نظر انتخاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

شب وروز'' کے مصنف کی زبان و بیان پر گرفت اور اسلوب کے چند نمونے ملاحظہ ''
ہوں :

۔ایک وسیع بیابان نما میدان اس تاریخی مقام کا یوں محاصرہ کیے ہوئے ہیں جیسے کسی جابر و قاہر تاجور کے محل شاہی کے ارد گرد دیو ہیکل فصیل۔

۔بہت ہی ہیریں شعلہ بداماں، نشہ شباب میں مست، عشوہ و ادا سے معرا، ایک عجیب شان بے نیازی سے محو خرید و فروخت تھیں۔

۔کارگاہ قدرت کے ستم ظریف عامل نے نہ جانے کس جذبہ نفرت و حقارت کے ماتحت میانوالی کا محل مقام منتخب کیا تھا۔

: محمد شریف ایک جگہ اپنی دلی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

غور کرنے سے مجھے تو عمر طبعی بس پچاس سے ستر سال تک معلوم ہوتی ہے۔ اس بیس" .برس کے عرصہ میں جو دنیا سے اٹھ گیا وہی خوش نصیب۔ ورنہ ناممکن ہے کہ ستر.برس کے بعد زندگی متواتر اجیرن نہ ہوتی چلی جائے۔ میں طویل عمر پانے والے انسان کا تصور کرتا ہوں تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ جب دوست نہ رہے، ہم عصر نہ رہے، پڑوسی نہ رہے، ماں باپ نہ رہے تو وہ غریب یہاں رہ کر کیا کرے گا اور کس سے دل بہلائے گا۔ مجھے تو اس کی مثال ایک ایسے اجنبی کی سی لگتی ہے جو اچانک کسی غیر ملک اور اجبنی معاشرہ میں دھکیل دیا جائے۔ وہ جدھر جائے گا اسے کوئی نہیں پہچانے گا۔ وہ جس بازار سے گزرے گا اسے اجنبی دکھائی دیں گے۔ بال بچوں کا رشتہ اول تو بیٹوں ہی تک ہے اور نہیں تو زیادہ سے زیادہ پوتوں اور نواسوں تک۔ اس سے پیچھے آنے والوں کو دادااور پڑدادا سے کیا

سروکار ؟ پنجابی کی مثل ہے ’ پڑ پیا اور رشتہ گیا‘۔ اور شاید اقبال کی نظر بھی ایسی ہی صورت حال پر تھی جس اس نے کہا تھا:

تھا جنھیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہوئے
لے کے اب تو وعدہ دیدار عام آیا تو کیا
رفتہ رفتہ وہ پرانے بادہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بہ جام آیا تو کیا

غالباً یہ محمد شریف ہی تھے جنھوں نے کتاب میں متوفین کے تذکرے میں دو مختلف مقامات پر تھامس گرے کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ راقم ایسا کہنے میں اس لیے حق بجانب ہے کہ ”شب و روز“ میں محمد شریف کی شاعری کے نمونے بھی جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے ان کا تصور ایک سنجیدہ اور انتہائی حساس طبیعت و مزاج کے حامل شخص کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے

چھوڑ دے اس کے محاسن کا نہ کر اب تذکرہ
بعد مرگ اس کے معائب بھی نہ کر اب بے نقاب
نیکیاں بدیاں لیے اپنی پڑا ہے چین سے
دستِ قدرت نے تھپک کر کردیا ہے محوِ خواب

☆

رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں سبھی بعد فنا

کون ہے پر جسم فانی کو خوشی سے چھوڑتا
کون ہے جو زندگی کے لطف سے ہوتا ہے سیر
کون وقت کوچ ہے مڑ مڑ نہیں جو دیکھتا

محمد شریف کہنے کو تو بینکار تھے لیکن شاید ان کے اندر ایک بے چین روح تھی جو ہر آن انہیں سوچنے پر آمادہ کیے رکھتی تھی۔ ''شب و روز'' میں انہوں نے اسی سوچ کو جا بجا الفاظ کے قالب میں اس طور ڈھالا ہے کہ تمام مفہوم واضح ہو کر قاری کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

'' مرنے والا تو شاید موت کو ایک معمولی واقعہ سمجھتا ہو گا۔اس کے لیے تو شاید یہ ایک بستی سے دوسری کا سفر ہو اور بس۔ لیکن پس ماندگان کے لیے یہ ایک سانحۂ شدید ہوتا ہے۔ انہیں تو در و دیوار کاٹنے کو آتے ہیں جن میں انہوں نے مرحوم کے ساتھ دن گزارے ہوں۔ ان کو ہزار تسلیاں دیجیے کہ صاحب پریشان نہ ہو جئے۔ یہ تو چند روز کی جدائی ہے، تم بھی عنقریب وہیں پہنچنے والے ہو لیکن وہ کسی کی نہیں سنتے۔ خدا معلوم یہ قدرت کی فیاضی ہے یا ستم ظریفی کہ دنیا کا ہر زندہ انسان یہی سمجھتا ہے کہ جانے والا تو گیا۔ لیکن اسے خود کو ایک مدت دراز تک یہیں بسنا ہے۔ یہ تو قدرت کا بنی نوع انسان پر ایک عظیم احسان ہے کہ موت سے پہلے ہم میں سے اکثر ایک غنودگی کے عالم میں مبتلا کر دیے جاتے ہیں اور کوچ کے وقت انہیں ایک نیند کا سا احساس

ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ہوش و حواس قائم رہتے تو ہم میں سے کتنے تھے جو اس عالم رنگ و بو کو خوشی خوشی الوداع کہہ سکتے ؟آپ غور فرمائیں کہ قدرت نے انسان کو یہ دو چیزیں۔۔۔حافظہ اور تصور۔۔۔ کتنی عجیب و غریب دے رکھی ہیں۔ان کے فیض سے ایک پریشاں حال انسان مطمعئن وپر سکون بھی ہے اور ایک مطمعئن وپر سکون انسان افسردہ وپریشان بھی۔ یہ چاہیں تو ایک ہنستے اور چہچہاتے ہوئے انسان کو دم بھر میں رلا دیں اور چاہیں تو ایک جنازہ بردوش ماتمی کو کسی محفلِ رقص و سرور میں پہنچا دیں۔ان کی مدد سے انسان بیٹھے بٹھائے دور دراز ممالک کی سیر کرسکتا ہے۔ تنہائی کا قفس توڑ کر دوستوں کی رنگین محفلوں میں شریک بادہ نوشی ہوسکتا ہے۔ فراق کی کلفتوں کو عیشِ وصل سے بدل سکتا ہے اور آنِ واحد میں مجلس غم کو محفل طرب کے سانچہ میں ڈھال سکتا ہے۔ اسی حافظہ اور تصور کی برکت سے بڑھاپے کی نامرادیاں شباب کی شوخیاں اور بچپن کی بے نیازیاں بن جاتی ہیں اور نوحہ و ماتم کی آوازیں نغمہ و سرور کا لباس پہن لیتی ہیں۔ غم وہم کی قیود، تصور ایک جست میں پھاند سکتا ہے اور یہ جابر و قاہر تاجداروں کو کئی کئی روز تک دماغ کی ایک چھوٹی سی کال کوٹھری میں مقید رہنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ماحول اس کی پرواز میں حائل نہیں ہوتا۔ شہنائیوں کے نغموں پر رقص کرتی برات میں ایک ایسا براتی بھی ہوسکتا ہے جو حافظہ اور تصور کے سبب ڈھول اور باجہ کی گھن گھرج میں کسی پرانے اجڑے ہوئے قبرستان میں ہڈیوں کے کسی کہنہ اور سڑے ہوئے ڈھانچہ کے سرہانے اپنے آنسوؤں کے تیل

سے چراغِ مزار روشن کرنے میں مصروف ہو۔ مومن نے تصور کی یہ کہہ کر تصویر کشی کی تھی کہ:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (شب و روز۔ از محمد شریف

محمد شریف نے پسرور کے گورنمنٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا۔ یہ بات تھی سن 1938 کی۔ بہت برسوں بعد ایک مرتبہ جب وہ اپنی پرانی درس گاہ کو دیکھنے گئے تو ان کے ذہن میں کئی یادیں گھوم کر رہ گئیں۔ بالخصوص کالج کا وہ مشاعرہ محمد شریف کو بہت یاد آیا جس میں انہوں نے اپنی پہلی غزل سنائی تھی۔ کالج بورڈ پر دو ہفتے قبل یہ مصرع طرح لکھ دیا گیا تھا:

نہیں شکوہ مجھے کچھ آسمان سے

پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے پسرور شہر کے کالج میں تعلیم پانے والے نوعمر محمد شریف مجمع کے درمیان ہانپتے کانپتے پہنچے اور لرزتے ہاتھوں سے کاغذ کو تھام، یوں گویا ہوئے:

مجھے بہتر ہے عمر جاوداں سے
نہ اٹھوں مر کے بھی اس آستاں سے
پھنسیں گے حلقہ گیسو میں وہ بھی
کسے امید تھی پیر مغاں سے

وہ کہتے ہیں ہمیں ملنے نہ آؤ
جگر لاؤں کہاں سے دل کہاں سے
امید آمد فصل بہاری
بندھے جب کہ ہوائے گل فشاں سے
جو باغ آرزو اپنا بھی ہو خشک
ہمیں الفت نہ ہو پھر کیوں خزاں سے
یہ میرا آشیان خشک واللہ
چلا ہے گرمی آہ و فغاں سے
ہوا ہوں دشمن جاں آپ اپنا
نہیں شکوہ مجھے کچھ آسماں سے
وطن آدم کا جب باغ جناں تھا
ہمیں نفرت نہ ہو پھر کیوں یہاں سے
شریف اس دار فانی سے نہ لپٹو
مکاں اپنا ملا لو لامکاں سے
☆÷☆

مالک رام کی ''ذکر غالب'' سے کون واقف نہیں ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اپریل 1938 میں شائع ہوا تھا جبکہ راقم کو ملنے والا نسخہ جنوری 1955 میں

دہلی سے شائع ہوا تھا۔ قیمت 3 پیسے درج ہے۔ یہ کتاب اور اس کے مصنف، دونوں مرزا نوشہ پر ایک سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذکورہ کتاب سے کئی اوراق شامل کیے گئے ہیں۔ مرزا غالب کی وفات کے بیان میں مالک رام رقم طراز ہیں:

آخر وہ دن آ ہی گیا جس کی انہیں ایک مدت سے تمنا تھی۔ چوں کہ انہیں یقین ہو گیا تھا" کہ اب میں پوری طرح سے صحت یاب نہیں ہو سکتا اس لیے اکثر اپنا یہ مصرع پڑھا کرتے:

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ شعر بھی عموماً ورد زبان رہتا تھا:

دم واپسیں بر سر راہ ہے

عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

مرض کی شدت کے باعث موت سے چند دن پہلے متواتر غشی کے دورے پڑتے رہے۔ موت سے ایک دن پہلے کچھ افاقہ ہوا تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ میرزا جیون بیگ (یعنی میرزا باقر علی خاں کامل کی سب سے بڑی صاحبزادی) کو بلاؤ۔ یہ عموماً انہی کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔ کلو ملازم انہیں بلانے کے لیے محل سرا آیا تو یہ آرام کر رہی تھیں۔ ان کی والدہ بگا بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے، جونہی جاگتی ہے، بھیجتی ہوں۔ ملازم نے واپس جا کر یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا، جب وہ آئے گی، ہم کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جونہی گاؤ تکیے پر سر رکھا بے ہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم

محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ تمام کوششیں اور علاج کیے گئے مگر بے سود۔ انہیں ہوش نہیں آیا، نہ ہی اس کے بعد انھوں نے کوئی بات کی۔ اسی حالت میں اگلے دن 15 فروری 1869ء مطابق 2 ذی قعدہ 1285ء) روز دوشنبہ، دوپہر ڈھلے (بوقت ظہر) اس باکمال کا) انتقال ہو گیا جس نے اگر ایک طرف اس ملک میں علم وادبِ فارسی کو نقطہ معراج تک پہنچادیا تو دوسری طرف اردو نظم ونثر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کرکے ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی جس کی پیروی تو بہتوں نے کی مگر کامیابی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ الا (ماشاء اللہ۔'' (ذکر غالب

☆÷☆

اتوار بازار سے ملنے والی تمام کتابوں کی مختصر اشاعتی تفصیل یہ ہے

۔مخدوم محی الدین۔ سردار جعفری۔ اشاعت: کتب پبلشر لمیٹڈ، بمبئی 1948

۔ذکر غالب۔مالک رام۔ جنوری 1955۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۔شب و روز۔ سوانحی مضامین۔ محمد شریف۔ لارک بک کلب، کراچی۔اشاعت: 1963

۔22 دن پاکستان میں۔ سفرنامہ۔ عاشق جعفری۔ ملٹی میڈیا افیئر، لاہور۔ 2009

،۔غالب کے تخلیقی سرچشمے۔ تحقیق۔ حامدی کاشمیری۔ یونین پرنٹنگ پریس

دہلی۔ مئی 1969

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، کراچی-یکم ستمبر، 2013-انتخاب شعرائے بدنام

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں

قبل اس کے کچھ بیان کیا جائے، بازار سے ملنے والی کتابوں کے تعارف پر مبنی پی ڈی ایف فائل کا لنک پیش خدمت ہے

http://www.scribd.com/doc/164600455/Sunday-Old-Book-Bazar-Karachi-1-September-2013-Rashid-Ashraf

بعض دوستوں نے بارے پرانی کتابوں کے اتوار بازار دریافت کیا کہ کیا وہاں کتابیں سربسجود، نمایاں جگہوں پر آپ کی منتظر ہوتی ہیں کہ جایئے اور اٹھا لیجیے۔ احباب کے ذہنوں میں اتوار بازار کا تصور ایک نہایت صاف ستھری جگہ کی حیثیت سے آتا ہے۔ نستعلیق لوگ، قاعدے کے کتب فروش، چمکتا دمکتا ماحول۔

ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

صفائی نہ ہونے کے برابر، پان کی پیکیں جابجا بکھری ہوئی، فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ کوڑے کے انبار، گھاگ اور حرفوں کے بنے ہوئے کتب فروش اور خریداروں میں علی الصبح زیادہ تر وہ جو درسی کتابیں، ڈائجسٹ اور فلمی رسائل، خریدنے کی

غرض سے وہاں جمع ہوتے ہیں۔ حلیہ اور وضع قطع ایسی کہ دیکھ کر دل بیٹھ جائے۔ گالی گلوچ تو ایک عام سی بات ہے۔ گزشتہ دنوں برطانیہ سے ایک خاتون تشریف لائیں اور راقم سے کہا کہ وہ بازار جانا چاہتی ہیں۔ اپنے ہمراہ لے جاتا تو سوائے شرمندگی کے، اور کچھ ہاتھ نہ آتا۔ ناصر نے کہا تھا:

بس ایک چہرہ کتابی نظر میں ہے ناصر
کسی کتاب سے میں استفادہ کیا کرتا

مگر کیا کیجیے کہ بازار میں سب چہرے ہی تیزابی نظر آتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ دن چڑھنے پر ماحول تبدیل ہو جاتا ہو لیکن علی الصبح تو وہی صورت حال ہوتی ہے جس کا نقشہ بیان کیا جا رہا ہے۔ ایک موصوف کی آواز ایسی گرج دار ہے کہ سارے بازار میں گونجتی ہے۔ وہ بھی ایسا بے شرم کہ صبح ہی سے گاہکوں کے متوجہ کرنے کے لیے کرخت آواز میں چلانا شروع ہوتا ہے تو اگلے ایک گھنٹے تک مجال ہے کہ ذرا تھم جائے۔ "دس دس روپے میں اسلامی کتابیں خریدیے" اس کا مخصوص نعرہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلام کا نہ تو اس کی شخصیت سے کوئی علاقہ ہے اور نہ ہی اس کے پاس موجود کتابوں میں اس کا شائبہ نظر آتا ہے۔ ایک روز راقم اس کا نعرہ سن کر اس جانب جا نکلا تو جو کتاب نمایاں جگہ پر رکھی نظر آئی وہ کوک شاستر تھی۔
شاستر سمجھ کر coke استفسار پر وہ بے حیاء ڈھٹائی سے گویا ہوا کہ میں تو اسے

بیچ رہا ہوں۔

راقم اس کے ذخیرہ الفاظ, شیطانی نوع کی بذلہ سنجی اور الفاظ کے الٹ پھیر پر ششدر رہ گیا۔

کچھ گاہک ایسے ہیں کہ ان کا آنا نہ آنا برابر ہے۔کتاب کی قیمت دریافت کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں، حسرت ہی رہی کہ کبھی ان کے ہاتھوں میں خرید کردہ کتابوں کا انبار دیکھیں ۔۔۔بقول شاعر:

کھلی کتاب کے صفحے اُلٹتے رہتے ہیں
ہوا چلے نہ چلے، دن پلٹتے رہتے ہیں

ادھر کچھ عرصے سے کتب فروشوں نے بھاؤ بڑھا دیے ہیں۔ اتنے کہ اب کتاب خریدتے وقت سوچنا پڑتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کیماڑی سے آنے والا ہمارا ایک پٹھان دوست بھی آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ اسی روپے کی کتاب اب اس کے پاس ایک سو تیس روپے سے کم میں دستیاب نہیں۔کتاب کس موضوع پر ہے، اس کے اچھوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ یہ فیصلہ وہ گاہک کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کرتا ہے جو عموما" اپنی پسند کی کتاب دیکھ کر متغیر ہو جاتا ہے اور پھر بھاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ہاشم رضا کی تنومند خودنوشت ہماری منزل لکھی انگریزی میں گئی ہے لیکن کتاب کے سرورق پر اس کا نام رومن میں درج ہے : hamai manzil

راقم نے انجان بن کر پوچھا " خاں صاحب ! یہ کتاب کتنے کی ہے "؟
جواب دیا: کون سا کتاب، یہ "امارا منزل" ؟ لے جاؤ سو روپے میں۔ اور کتنی چاہیں ؟

بعد میں اندازہ ہوا کہ ہمارا ممدوح انگریزی کتابوں کے معاملے میں فراخ دل ہے، پانچ سو صفحات کی ہماری منزل بھلا سو روپے میں کون دیتا ہے ؟
معلوم ہوا کہ "امارا منزل" کے کئی نسخے اس نے کہیں سے کوڑیوں کے داموں خرید کیے ہیں اور اب انہیں ریوڑیوں کے داموں فروخت کرنے پر آمادہ ہے۔
تو صاحبو ! یہ ہے اتوار بازار۔ اور رہا سوال کتابوں کی دستیابی کا تو کیفیت یہ ہے کہ گوہر نایاب ڈھیر میں سے تلاش کرنے کا یارا سبھوں میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کپڑوں کی بربادی کا خیال ترک کر کے، فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنی پسند کی کتابیں جھانٹنی پڑتی ہیں۔ اس سودے میں ہاتھ بھی مٹی سے آلودہ ہوتے ہیں۔ ہاں مگر یہ بھی ہے کہ مطلوبہ کتابیں ملنے پر تمام کوفت بھی جاتی رہتی ہے، عالم سرخوشی میں کتاب کے دوانوں کے دل سے یہی صدا نکلتی ہے :

کوئی آفت ترے میخانے پہ آ سکتی ہے ؟
سب دعا گو ہیں یہ جتنے ہیں شرابی ساقی

اس مرتبہ سید معراج جامی صاحب کی عنایت سے جو پہلی کتاب ہاتھ آئی وہ ہے

انتخاب شعرائے بدنام"۔ جلیل قدوائی اس کے مصنف ہیں۔232 صفحات پر مشتمل یہ" کتاب 1965 میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

شاعر، نقاد، محقق، افسانہ نگار جلیل قدوائی (پ: 16 مارچ 1904 - م: یکم فروری 1996) سے ان کی کی خودنوشت "حیات مستعار" مشفق خواجہ مرحوم نے بصد اصرار لکھوائی تھی اور اپنے مکتبہ اسلوب ہی سے شائع بھی کی تھی۔ "انتخاب شعرائے بدنام" میں جلیل قدوائی نے شیخ قلندر بخش جرات، شیخ امام بخش ناسخ، سید آغا حسن امانت، نواب سید محمد خاں رند لکھنوی اور سید انشاء اللہ خاں انشاء کے مختصر حالات زندگی اور کلام سے انتخاب شامل کیا ہے۔ مصنف، کتاب کو سپرد قلم کیے جانے کی توجیہہ حسرت موہانی کے اس بیان کو ٹھہراتے ہیں جس میں مولانا نے فرمایا تھا:

فاسقانہ شاعری کو بدمذاقی پر محمول کرنا، سوقیانہ و متبذل قرار دینا اور انصاف کا خون " کرنا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلم ہو تو پھر اس کے دائرے کو صرف پاک جذبہ عشق تک محدود کر دینے اور عامہ خلاق کے 99 فیصد جذبات ہوس کو اس سے ضائع کر دینے کی کوشش خود مخالفین ہوس نگاری کی "انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری کے سوا کسی اور چیز پر دلالت نہیں

جلیل قدوائی مزید کہتے ہیں کہ:

اسی نقطہ نظر کے مطابق عرصہ ہوا میں نے جرات، انشاء، ناسخ، امانت اور "

رند کے کلام کا بالااستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ان کے انتخابات کراچی کے موقر سہ ماہی رسالہ العلم میں شائع کرائے تھے اور اب انہیں کتابی صورت میں پیش کرتا ہوں۔ ناظرین ان اشعار میں حسن و عشق کے معاملات اور محبت کے اشارے، کنایے اور چونچلے ملاحظہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ یہ زندگی اور زندہ دلی سے کی تب وتاب سے، جن کے بغیر ہماری دنیا سونی، روکھی پھیکی اور بے نمک رہ جاتی ہے، مزین ہیں یا نہیں اور کیا ان کی بنیاد پر متعلقہ شعراء سے ان کے ابدی طور پر زندہ رہنے کا حق کوئی چھین سکتا ہے؟ "

ان تمام شعراء کے مختصر احوال میں جلیل قدوائی نے نہ صرف کھل کی ان کی حمایت کی ہے بلکہ ان کے رد میں دیے جانے والے بیانات پر بھی ان کی گہری نظر رہی ہے۔ مثلاً" شیخ قلندر بخش جرات کے احوال میں لکھتے ہیں:

سودا کے نقش قدم پر چل کر آزاد نے بھی آب حیات میں جرات کے خاندان کا مذاق" اڑایا ہے اور ان کے نابینا ہو جانے کے سلسلہ میں بھی لطیفہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمارے خیال میں کسی شاعر کی زندگی اور اس کے فن پر اس انداز سے تبصرہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ جرات کی چوما چاٹی حقیقتاً" فطری جنسی ترغیب اور اس کے لیے ایک لطیف چیز ہے۔ میر کے ہاں تو بعض جگہ ایسے مضامین بھی پائے جاتے ہیں جنھیں نرم نرم الفاظ میں غیر فطری اور بیہودہ کہا جاسکتا ہے مثلاً":

دلی کے کج کلاہ لونڈوں نے

کام عشاق کا تمام کیا

''جرات کے ہاں اس قسم کی مذموم شاعری کی کی کوئی مثال نہیں۔

: جلیل قدوائی، سید انشاء اللہ خاں انشاء کے بارے میں لکھتے ہیں

انشاء میاں کی علمیت، جدت طبع اور زبان دانی بلکہ ہفت زبانی کے سب قائل ہیں۔" آپ نے ٹھیٹ ہندی میں نثری داستان لکھی اور اردو زبان کے قواعد مرتب کیے مگر شاعری میں آپ کی بے اعتدالی، ناہموری اور غیر سنجیدگی بلکہ تمسخر اور عریاں نگاری کی سبھوں کو شکایت رہی۔ مصحفی سے تو خیر آپ کی باقاعدہ چوٹیں رہیں، اس لیے ان کے ع.....

واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے۔۔۔۔۔۔

کو معاصرانہ چشمک کا تازیانہ بھی سمجھ لیا جائے مگر میاں بیتاب کے بقول، سید انشاء کے "فضل کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔

: جلیل قدوائی نے انشاء کے منتخب کردہ کلام سے یہ نمونہ سب سے پہلے پیش کیا ہے

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا

ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

کہانی ایک سنائی جو ہیر رانجھے کی

اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

:اتوار بازار سے ملنے والی تمام کتابوں کی تفصیل یہ ہے

انتخاب شعرائے بدنام

جلیل قدوائی۔ناشر: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

اشاعت: 1965

افکار، کراچی۔سردار جعفری نمبر

اشاعت: 1991 ۔ صفحات: 732

لل دید۔کشمیر کی معروف شاعرہ

جے لال کول۔ناشر: ساہتیہ اکادمی، دہلی۔اشاعت: 1985

نئی دھرتی نئے انسان

افسانے۔خواجہ احمد عباس۔ناشر: مکتبہ جامعہ، دہلی

اشاعت: 1977

دلی والے-تذکرے۔حصہ اول

ڈاکٹر صلاح الدین۔ناشر: اردو اکادمی دہلی

اشاعت: 1986

براہ راست۔ سفرنامہ یورپ

بشریٰ رحمان۔ ناشر: وطن دوست لمیٹڈ، لاہور

اشاعت: نومبر 1983

کرن، تتلی اور بگولے۔ سفرنامہ

پروین عاطف

اشاعت: جنوری 1987

ڈاکٹر جمیل جالبی۔جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

:انتظار حسین اپنی خودنوشت 'چراغوں کا دھواں [۱]' میں لکھتے ہیں

"سلیم احمد اور میں نومبر ۴۷ء کی ایک ٹھنڈی صبح مغلپورہ کے اسٹیشن پر ایک دوسرے سے بچھڑے تھے۔ اب گیارہ برس بعد مل رہے تھے۔ سلیم کو تو ۴۷ء میں جیسا چھوڑا تھا، ویسا ہی پایا مگر وہ جو اس ٹولی کا دوسرا جوان تھا، جمیل خان، جس نے آگے چل کر جمیل جالبی کے نام سے اپنی محققی کا ڈنکا بجایا وہ کتنا بدل گیا تھا۔ ماشاء اللہ کیا قد نکالا تھا۔ جب میرٹھ میں دیکھا تھا تو نام خدا ابھی شاید مسیں بھی نہیں بھیگیں تھیں۔ چھریرا بدن، گوری رنگت، پتلے پتلے ہونٹ، ستواں ناک، جیسی اچھی صورت ویسا اجلا لباس۔ میرٹھ کالج کا نیا دانہ۔ اب جو دیکھا نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا تھا۔ لمبا قد، چوڑا چکلا بدن، چہرہ سرخ و سفید، کلے میں گلوری، ہونٹوں پر پان کی لالی، جیب میں پانوں کی ڈبیا اور قوام کی ڈبیا۔ کتنی جلدی جلدی مگر کس شائستگی سے جیب سے یہ ڈبیاں نکلتی تھیں۔

"ناصر صاحب! یہ پان لیجیے۔ اور یہ قوام چکھیے۔"

ناصر کاظمی کو جمیل خان کیا ملے، دونوں جہان کی نعمت مل گئی۔ فوراً ہی مجھے اپنی رائے سے آگاہ کر دیا۔

"یہ تمہارے جمیل صاحب شستہ آدمی ہیں۔"

پانوں کی اس ڈبیا اور قوام اس کی ڈبچی نے ہمارے بہنوئی شمشاد حسین کو بھی متاثر کیا۔

"ارے میاں! تمہارے دوستوں میں بس یہی ایک جوان کام کا ہے۔ باقی تو سب مجھے یوں ہی سے لگتے ہیں۔"

جمیل جالبی اصل میں اپنے دادا میاں کے ایک خستہ و بوسیدہ مخطوطے سے برآمد ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۴۸ء میں نظام کے دفتر میں مجھے ایک مخطوطہ موصول ہوا۔ پیلے بوسیدہ ورقے شکستہ خط میں لکھے ہوئے۔ بھیجنے والا جمیل احمد خاں۔ لکھا تھا کہ جالب دہلوی میرے دادا تھے۔ یہ ان کا مخطوطہ ہے۔ اسے نظام میں قسط وار شائع کیا جائے تو کیا خوب بات ہوگی۔ پتا نہیں کتنی قسطیں چھپیں نظام میں۔۔ مگر میرا پھوہڑ پن یا محققانہ روایت سے ناآشنائی کہ اس مخطوطہ کو سنبھال کر نہیں رکھا۔ ہاں اور ابھی اس مخطوطہ کی اشاعت کی ذمہ داری سے عہدہ برآں نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مخطوطہ موصول ہوا۔ یہ خود جمیل خاں کا مخطوطہ تھا۔ سفید اجلے اوراق جمیل خاں کی خوش نما تحریر۔ موضوع پاکستانی کلچر۔ شاید اس کی بھی کچھ قسطیں نظام میں چھپی تھیں۔ زمانے بعد جمیل خاں نے مجھ سے ان دونوں مخطوطوں کا تقاضہ کیا۔ مگر مجھ کم فہم سے ان مخطوطوں کی قدر و قیمت جاننے میں چوک ہوئی۔ اپنی لاپروائی سے انہیں گم کر دیا اور جمیل خاں پر اس کا

رد عمل کیا ہوا۔ اپنے لکھے کو تو انھوں نے دوبارہ لکھ ڈالا اور شاید اب مطالعہ اور غور و فکر کے بعد زیادہ سمجھداری سے لکھا۔ یوں ان کی کتاب 'پاکستانی کلچر' منصہ شہود پر آئی۔ باقی دادا کے مخطوطے کی گمشدگی کا جواب انھوں نے اس طرح دیا کہ اسی طرح کے خستہ و بوسیدہ کرم خوردہ مخطوطے تحقیق کرکے برآمد کرنے شروع کردیے اور جلد ہی نقاد سے محقق بن گئے۔ اسے دادا میاں کا فیضان کہنا چاہیے کہ ان کے ایک مخطوطے کی گمشدگی نے ان کے لیے قینچی کا کام دیا۔ پھر ایسے مخطوطات دریافت کرنا ہی ان کا فن ٹھہرا۔ دادا کے احسان کا بدلہ انھوں نے اس طرح دیا کہ ان کے نام کو اپنے نام کے ساتھ چسپاں کرلیا اور جمیل خاں سے جمیل جالبی بن گئے۔" (انتظار حسین

مذکورہ بالا اقتباس میں انتظار حسین نے جمیل جالبی کے دادا سید جالب دہلوی کا ذکر کیا ہے۔ جمیل احمد خاں، سید جالب دہلوی سے متاثر تھے، سو خود کو جمیل جالبی کہلوایا۔ ان کے دادا سید جالب دہلوی معلومات کا خزانہ تھے، چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا۔ نصر اللہ خاں مرحوم بیان کرتے ہیں " اگر آپ نے خدانخواستہ جالب دہلوی صاحب سے یہ پوچھ لیا کہ حقہ کس نے ایجاد کیا ہے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ وہ تھے کہ پوری تاریخ اس کے تمام اجزاء کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتائیں گے۔" ۔۔۔۔ سید جالب دہلوی کے شاگردوں میں دیوان سنگھ مفتوں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ دیوان سنگھ کی کامیابیوں کو

دیکھ کر ایک مرتبہ جالب دہلوی نے ان کے بارے میں کہا تھا" میرے شاگردوں میں " سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے۔ اس کی کامیابی پر مجھے فخر ہے۔

ایک شام کو مکرمی سید معراج جامی کے ہمراہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا اسے ایک سیر حاصل ملاقات کہا جاسکتا ہے ؟ وہ تو علم کا سمندر کہلائے جانے والے نادر روزگار لوگوں سے اس طور کی جاتی ہے کہ طالب علم سوال پوچھے اور علم کا سمندر رواں ہو۔ وہاں تو یوں ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ویل چیئر پر تشریف لائے اور ایک گھنٹہ اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں زیادہ تر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ان کی سماعت میں خلل واقع ہوا ہے۔ وہ ہمارے سوال کا جواب آہستگی سے دیتے تھے جو بہت غور کرنے سے سمجھ میں آتا تھا۔ ہماری کہی ہوئی باتیں، کئی سوال وہ سننے سے قاصر رہے۔ ہم تمام وقت ان کے انتہائی قریب بیٹھے رہے۔ ہمارے ساتھ امین ہاشم بھی تھے جو پرانی کتابوں کے اتوار بازار کے ساتھی ہیں۔ یہ ڈاکٹر جمیل جالبی پر لکھی کتابیں اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے ڈاکٹر صاحب نے ان پر دستخط کیے۔ شہر کراچی کا وہ قابل عزت شخص جو علم کا سمندر کہلاتا تھا، لکھنے پڑھنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا تھا، اب اس حال میں ہے کہ پڑھنے میں دشواری کا سامنا رہتا ہے، لکھنا تقریبا چھوٹ چکا ہے۔ اس اولین ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتوں

کا سلسلہ رکا نہیں، جاری رہا۔ راقم اپنی کتاب ''ابن صفی ۔ شخصیت اور فن'' پر ڈاکٹر صاحب کی رائے کے حصول کے لیے حاضر ہوا۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے ابن صفی مرحوم پر اپنی رائے لکھوائی۔ ہماری نظر میں یہ ایک بلند پایہ انسان کا ایک دوسری نابغہ روزگار شخصیت کو خراج تحسین بھی قرار پایا۔

راقم نے مضمون کے آغاز میں جمیل جالبی کے بارے میں انتظار حسین کا بیان نقل کیا ہے۔ ''لمبا قد، چوڑا چکلا بدن، چہرہ سرخ و سفید، کلے میں گلوری، ہونٹوں پر پان کی لالی، جیب میں پانوں کی ڈبیا اور قوام کی ڈبی''۔۔۔۔۔ انتظار حسین کے بیان کردہ حلیے و نقشے پر اس عمر میں بھی ڈاکٹر صاحب پورے اترتے ہیں حتی کہ چہرے کی رنگت اور ہونٹوں پر پان کی لالی بھی تراسی برس کی عمر میں بھی ویسے کی ویسی ہے۔ وضع داری تو دیکھیے کہ تصویریں بنواتے وقت مجال ہے کہ ان کی نگاہیں کیمرے کی جانب اٹھی ہوں۔ بلکہ سر اور چہرہ کچھ اور جھک جھک جاتا تھا۔ جیسے شرمندہ ہو رہے ہوں۔

جمیل جالبی کی وضع داری پر تو مرزا ادیب بھی فریفتہ تھے۔ اپنے مضمون 'دیو قامت' [میں مرزا ادیب نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صدر ایوب خان نے]٢ مغربی پاکستان کے چند ادیبوں کو مشرقی پاکستان کے دورے پر بھیجا تھا۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں: '' ہم ڈھاکہ سے گاڑیوں میں لد لدا کر ایک

سری گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ میں، جمیل جالبی، طفیل احمد جمالی، چار پانچ اور دوسرے احباب ایک ویگن میں سوار تھے۔ گاڑیاں تیزی سے جا رہی تھیں۔ ہمارا ڈرائیور شکل و صورت سے افیمی معلوم ہوتا تھا۔ ایک جگہ اس نے گاڑی کو بریک جو لگائی تو ساری سواریاں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں، اچھل پڑیں۔ اچھل کر گاڑی کے اندر ہی رہیں لیکن جالبی صاحب نیچے گر پڑے۔ ہم سب جلدی سے نیچے اترے، انہیں بڑی مشکل سے گاڑی کے اندر لے گئے اور لٹا دیا۔ ان کا رنگ وفور درد سے پیلا پڑ گیا تھا، نیم بے ہوش سے نظر آتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے لبوں کو حرکت ہو رہی ہے۔ چہرے پر جھکا تو ایک لفظ میرے کانوں میں پڑا۔ یہ لفظ تھا ''شکریہ''۔۔۔ سخت حیرت ہوئی کہ یہ شخص درد سے مرا جا رہا ہے مگر ایسے میں شکریہ کا لفظ نہیں بھولا۔ یہ وہ شائستگی ہے جو لال قلعے کے سائے میں پلی بڑھی تھی۔ یہ وہ وضع داری ہے جو سرزمینِ میر و غالب سے پھوٹی تھی۔ جالبی صاحب کی کمر پر ضرب لگی تھی اور شدید طور پر لگی تھی۔ بیٹھنا ان کے لیے محال تھا۔ ان دنوں مجھے ان کے تحمل اور صبر کا اندازہ ہوا۔ سخت اذیت کے عالم میں بھی ان کے ہونٹوں سے کراہ نہ نکلی۔ بڑی تکلیف سہنے کے بعد کہیں چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۲ جون ۱۹۲۹ کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ سرکاری ریکارڈ میں ان کی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۲۹ درج ہے۔ ۱۹۴۳ میں میٹرک کا امتحان

سہارن پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ میرٹھ کالج سے ۱۹۴۵ میں ایف اے اور ۱۹۴۷ میں بی اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان چلے آئے۔ یہاں سے ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد حاصل کیں۔ جمیل جالبی نے ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے حاصل کیں۔ جمیل جالبی کو ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ جالبی صاحب کراچی یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی خدمات سرانجام دے چکے ہیں اور مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے صدر نشین بھی رہ چکے ہیں اور متعدد اہم اداروں کے رکن بھی رہے ہیں۔

جمیل جالبی نے کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ ایسی چند تصانیف بشمول لغات و تراجم میں تاریخ ادب اردو (چار جلدیں)، ادبی تحقیق، بوطیقا از ارسطو، بزم خوش نفساں، ن م راشد۔ ایک مطالعہ، کلیات میرا جی، میرا امن۔ ایک مطالعہ، فرہنگ اصلاحات جامعہ عثمانیہ، میرا جی ایک مطالعہ، ہند و پاک میں اسلامی کلچر، ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت، پاکستانی کلچر، قدیم اردو کی لغت، قلندر بخش جرات، محمد تقی میر، ادب، کلچر اور مسائل، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، تنقید اور تجربہ، دیوان نصرتی، دیوان حسن شوقی، نئی تنقید، بارہ کہانیاں، حیرت ناک کہانیاں، ایلیٹ کے مضامین، ارسطو سے ایلیٹ تک، برصغیر میں اسلامی جدیدیت اور برصغیر میں اسلامی کلچر شامل ہیں۔ جمیل جالبی کو حکومت کی جانب سے ان

کی خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز اور ہلال دیا جاچکا ہے۔

: نصر اللہ خاں اپنے مضمون ''وضع دار آدمی'' [۳] میں لکھتے ہیں

''میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب شاہد احمد دہلوی، حسن عسکری، ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان، جمیل جالبی، سلیم احمد اور میں خود پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتے تھے۔ پیر کالونی اس وقت شہر کے معززین کی آماجگاہ تھی۔ سارے برصغیر سے آنے والے اکثر یہیں آکر قیام کرتے تھے۔شام ہوتی تو لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دور دراز سے آکر ایک جگہ اکٹھا ہونے والوں سے ملنے نکل جاتے۔اکثر جمیل جالبی سے شاہد صاحب کے گھر پر یا بس اسٹاپ کے آس پاس ملاقات ہوجاتی اور ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔بولنے کا کام میں کرتا تھا اور سننے کا کام جالبی کرتے تھے۔ کبھی ہم اپنے محلے کے گلی کوچوں میں چہل قدمی کرنے لگتے۔جالبی صاحب کو جس گھر سے رات کی رانی کی خوشبو آتی تو یہ بلا تامل اپنی لمبی سی گردن اس گھر کی دیوار پر رکھ کر ساری خوشبو ایک سانس میں کھینچ لیا کرتے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ دن کے راجہ کو اس کی خبر نہ ہوئی ورنہ قیامت گزر جاتی۔ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب ان کے گھر میں رات کی رانی نہ آئی تھی۔ جمیل جالبی وضع دار اور محبت و مروت والے بڑے بھلے آدمی ہیں۔اگر آدمی حالی ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا شبلی بھی ہو اور اکبر الہ آبادی میں تھوڑے سے سرسید احمد خان اور ملا دیے جائیں تو شکل ہی کچھ اور نکل آتی

ہے۔''

جمیل جالبی کا کتب خانہ ایک یکتا روزگار کتب خانہ ہے۔کتابوں کو محبت سے سینت سینت کر رکھنا تو کوئی ان سے سیکھے۔بقول نصراللہ خاں '' جمیل جالبی ریشم کے کیڑوں کی جگہ کتابوں کے کیڑے پالتے ہیں۔اگر انہیں ان کی پسند کی کرم خوردہ کتاب نہیں ملتی تو یہ کتاب کی جگہ اس کتاب کے کیڑے حاصل کر لیتے ہیں اور پھر ان کیڑوں کا پیٹ چاک کرکے اس میں سے اصل کتاب حاصل نکال لیتے ہیں۔''

جمیل جالبی کے ایک بے تکلف دوست صادق حسین کو ان سے ایک تعلق خاطر تھا۔اپنی یادوں کی قلم بند کرتے ہوئے وہ اپنے مضمون '' ڈاکٹر جمیل جالبی '' [۴] میں لکھتے ہیں :

'' قدرت نے انہیں ایک مقدس فریضہ سونپ کر کراچی بھیجا۔میری جواں سال بیٹی نرگس کا تابوت طرابلس سے آرہا تھا اور جمیل جالبی کو نرگس کا استقبال کرنا تھا۔وہ بیٹی جو مسکراتی ہوئی اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے طرابلس روانہ ہوئی تھی، اب کارگو کی صورت میں واپس آرہی تھی۔تابوت کے ہمراہ میری دو نواسیاں بھی آرہی تھیں۔وہ بہت چھوٹی تھیں۔انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی ماں سو رہی ہے۔نرگس سچ مچ سو رہی تھی ۔موسم سرما کی دھوپ میں تابوت کراچی پہنچا

'تو جمیل جالبی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی۔ 'بیٹی کراچی پہنچ گئی ہے۔
شہلا اور نبیلہ'' میں نے پوچھا۔'
وہ میرے گھر دوسرے بچوں کے ساتھ دھوپ میں کھیل رہی ہیں۔' جواب ملا۔ '
شام کی پرواز سے طیارہ اسلام آباد روانہ ہوا تو جمیل جالبی نے میری نواسیاں ابن انشاء کے حوالے کردیں جو اسی پرواز سے اسلام آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ابن انشاء میری ایک نواسی کو گود میں اٹھائے اور دوسری کو انگلی سے پکڑے جہاز کی سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ جمیل جالبی کی دی ہوئی امانت ابن انشاء نے میرے سپرد کردی۔ ابن انشاء کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ خاموشی بڑی گھمبیر تھی۔ ابن انشاء مرگئے مگر آج بھی وہ اسی طرح میری ایک نواسی کو گود میں اٹھائے اور دوسری کو انگلی سے پکڑے جہاز کی سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ یہ تصویر ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جمیل جالبی کی آواز میرے کانوں میں سدا گونجتی رہے گی۔ ' بیٹی کراچی پہنچ گئی ہے۔ شہلا اور نبیلہ دوسرے بچوں کے ساتھ دھوپ میں کھیل رہی ہیں' ۔۔۔۔۔ سردیوں کے اس دن کی دھوپ گواہی دیتی رہے گی کہ ایک شخص نے دوسرے کے دکھ کو کتنی شدت سے پہچانا۔ اس درد کو اپنا درد سمجھا اور اس طرح وہ انسان دوستی کے جذبے کا بے لوث ثبوت دے کر کندن بن گیا۔''
ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق کے میدان کے ایک نامور شہسوار ہیں۔ بحیثیت ایک محقق، وہ اپنے مسلک و طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو ۱۹۹۲

میں دیے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں : " تحقیق میں مسلک، اگر اسے مسلک کہا جاسکتا ہے تو، یہ ہے کہ میں کسی امر کی تحقیق میں ادبی مآخذ تک خود کو محدود نہیں رکھتا بلکہ غیر ادبی مآخذ پر بھی پوری توجہ دیتا ہوں تاکہ حقیقت کا سرا ہاتھ آسکے۔ میں یہاں ایک مثال دیتا ہوں۔تذکرہ ہندی میں مصحفی نے لکھا ہے کہ جب عہد محمد شاہ میں ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو اس کی غزلیں چھوٹے۔بڑوں کی زبان پر جاری ہو گئیں اور لوگ ولی کے ریختے گلی کوچوں میں پڑھنے لگے۔کام کرتے ہوئے تجسس پیدا ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے دیوان شمالی ہند پہنچے اور وہ آگ کی طرح گلی کوچوں میں پھیل جائے ؟۔اس کا جواب کسی تذکرے یا کسی اور دیوان یا کسی ادبی حوالے میں نہیں ملا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مرزا محمد حسین قتیل کی تصنیف ' ہفت تماشا' پڑھ رہا تھا۔ اس میں قتیل نے ایک جگہ لکھا تھا کہ کائستھ ہولی کے زمانے میں، نشے کی حالت میں، گلستان بوستان اور ولی کے ریختے پڑھتے ہوئے گلی کوچوں سے گزرتے تھے۔تذکروں میں
صرف مصحفی نے شاہ حاتم کے حوالے سے یہ بات لکھی تھی جس کی تصدیق ایک غیر ادبی مآخذ سے ہوئی۔تو یہ طریقہ کار تحقیق کے لیے مفید بھی ہے اور مناسب بھی۔"

ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بڑا ادیب بچوں کے لیے لکھنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، چہ جائیکہ ایک کھرا محقق یہ رستہ چنے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تمام تر تحقیقی مصروفیات کے باوجود اس جانب بھی خوب توجہ دی۔ ننھے بچوں کے لیے جمیل جالبی نے جو کہانیاں لکھیں ان میں بید کی کہانیاں، بلیاں، حضرت امیر خسرو، چھن چھن چھن چھن، عجیب واقعہ اور نئی گلستان شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فسانہ آزاد کے مزاحیہ کردار خوجی پر مبنی داستان 'خوجی پر کیا گزری' عنوان سے رسالہ 'ہونہار' کے لیے قسط وار لکھی جبکہ ان کی ایک طویل کہانی 'حیرت ناک کہانیاں' کے عنوان سے ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی۔ 'خوجی پر کیا گزری' کی کل ۶۶ اقساط شائع ہوئیں۔ ستمبر ۱۹۸۴ میں یہ سلسلہ اپنی آخری یعنی ۶۶ ویں قسط کے ساتھ اختتام کو پہنچا تھا۔ خوجی پر کیا گزری سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو ڈاکٹر محمود الرحمان کے مضمون 'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ بچوں کے ادیب' سے لیا گیا ہے:

"کیا آپ خواجہ صاحب کو یاد نہیں کریں گے؟ وہ آپ کے لیے سیر و تفریح اور لطف کا کیسا کیسا

سامان بہم پہنچا رہے تھے۔ اگر خوجی صاحب آپ کو کہیں مل جائیں (اور دیکھیے انہیں خواجہ صاحب کہنا

نہ بھولیے گا) تو آپ آزاد کو ضرور بتا دیجیے گا۔ آپ کی طرح مجھے بھی خوجی کی تلاش ہے۔ نہ ہوئی قرولی

کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ہمارا کتنا اچھا وقت ان کے ساتھ گزرا۔وہ جہاں بھی ہوں،

''خدا انہیں خوش رکھے۔خدا حافظ خوجی صاحب۔خدا حافظ

جمیل جالبی اور شاہد احمد دہلوی کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں یک جان دو قالب رہے۔ دونوں ہر مشورے میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے اور جہاں جاتے، ساتھ جایا کرتے تھے۔جمیل جالبی نے شاہد دہلوی کے مضامین کا مجموعہ 'بزم خوش نفساں' کے نام سے مرتب کیا تھا۔مذکورہ کتاب میں اپنے عزیز دوست پر لکھے تعارفی مضمون کے اسلوب کو ملاحظہ کیجیے کہ یہاں ہمیں جمیل جالبی کی خاکہ نگاری کی ایک دلکش جھلک بھی نظر آتی ہے:

'' شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات ان کی سادگی ہے۔ جھوٹی عزت ان کو پاس سے چھو کر نہیں گزری۔ تہبند باندھے چلے آرہے ہیں۔ کھل کر باتیں کر رہے ہیں۔نہ کسی کی برائی، نہ کسی کی غیبت۔سب پر فقرے چست کریں گے۔ سب کا ذکر کریں گے۔مزاہ لیں گے۔مذاق اڑائیں گے۔جس قسم کی صحبت میں بیٹھیں گے،اس میں گھل مل جائیں گے۔بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان اور بڑوں میں بڑے۔ہر ایک کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہر ادیب کا ذکر کریں گے۔اپنی ملاقات کی تفصیل سنائیں گے۔ مچھے دار انداز میں گفتگو کریں گے۔ خود بھی ہنسیں گے اور سننے والوں کو بھی

ہنسائیں گے۔ گھنٹوں چیخ رہے گی۔

خدا انہیں کروٹ کروٹ چین دے۔ صحیح معنوں میں ایک بڑے آدمی تھے۔ ایک تاریخ ساز مدیر تھے۔ ایک صاحب طرز ادیب تھے جن کی یادیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اب نہ شاہد صاحب ہیں اور نہ ساقی ہے لیکن ان کی تحریریں آج بھی ہمارے ذوق ادب کو سیراب کر رہی ہیں۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ میں پیدا ہوئے۔ دلی میں پلے بڑھے۔ بچپن جوانی وہیں گزرا۔ بال سفید ہوئے تو پاکستان آ گئے۔ ۱۹۴۷ سے پیر الٰہی کالونی میں مقیم ہیں۔ یہیں ساقی کا دفتر ہے۔ دلی میں سکون تھا، آسودگی تھی۔ کراچی میں نہ سکون ہے نہ آسودگی۔ بڑا کنبہ ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے اپنی ساری صلاحیتوں کو وضع داری سے بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی گا کر کماتے ہیں، کبھی لکھ کر۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ سدا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔ اب وہ ہیں اور ریڈیو پاکستان۔ اگر کبھی ریڈیو پاکستان سے اور ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے، جس کے ایک یا دو بٹن لگے ہوں، سیاہ رنگ ہو، آنکھوں پر چشمہ ہو، بیڑی منہ میں ہو، سر پر سیاہ یا گہرے کتھئی رنگ کی جناح کیپ ہو۔ ذرا دائیں طرف کو جھکی ہوئی، بائیں طرف سے اٹھی ہوئی اور وہ شخص کسی کا بازو پکڑے یا کندھے پر ہاتھ رکھے، چشمہ سے جھانکتی ہوئی چمک دار آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے چھوٹی مہری کا پاجامہ پہنے، جس کے پائنچے کی مہری کے ڈورے نکلے ہوں اور ہلکا سا، کشیدہ کاری کا جال بنا ہو، نیوکٹ کا جوتا ہو، تو سمجھ لیجیے کہ

شاہد احمد دہلوی ہیں۔ دلچسپ انسان، فاضل مدیر، بہترین مترجم، صاحب زبان، دلی والے۔۔۔۔اور جب ۲۷ مئی ۱۹۶۷ کی صبح کو ٹیلی فون پر ایک صاحب نے جنازے میں ''شرکت کے لیے ان کا پتہ پوچھا تو میں ان کو پتا نہ بتا سکا۔

:جمیل جالبی کے فن و شخصیت سے متعلق چند مشاہیر ادب کی آراء پیش خدمت ہیں

۔۔ڈاکٹر جمیل جالبی ایک منکسر المزاج عالم ہیں جن کی زندگی نئی نسل کے لیے قابل (تقلید ہے اور جن کے ادبی کارنامے اردو کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ (ڈاکٹر خلیق انجم

۔۔اور اب میری مستقل رائے ہے کہ جمیل جالبی صاحب، حالی سے لے کر آج تک کے (تمام اردو تنقید نگاروں میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

۔۔علمی تحقیقی مہمات کو سر کرنے کے لیے جس تحمل، استعداد، محنت اور منطقی ذوق کی ضرورت ہے وہ سب چیزیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ذات میں یکجا ہو گئی ہیں۔ (رئیس (امروہوی

۔۔جالبی صاحب کی تحقیق میں بھی ایک تخلیقی رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ یہ انداز اردو (کے بہت کم محققوں کو نصیب ہوا ہے۔ (ڈاکٹر عبادت بریلوی

۔۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ اردوادب' میں معلومات کے انبار لگے ہیں۔ کوئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے متعدد نئی معلومات نہ ملیں۔ کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا کسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری و روشنی نہ ملے۔ یہ

(تاریخ اردو ادب، اب تک کی بہترین تاریخ ہے۔ (ڈاکٹر گیان چند

۔۔۔ جمیل صاحب جالبی، چشم بدور، نکیلے جوان اور طباع انسان ہیں۔ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ان کے لہجے میں شرافت کی کمک پائی جاتی ہے۔ قدرت نے ان کو سخن فہمی اور بذلہ سنجی کا جوہر بھی عطاء کیا ہے اور بر محل صحیح بات کہنے کی صلاحیت بھی دی ہے۔ ان کی شخصیت میں جاذبیت اور ان کی عقل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ :

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے

(اب اور چاہتے کیا ہو، پیمبری مل جائے ؟ (جوش ملیح آبادی

بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اردو نثر میں تحقیق کی پر شکوہ عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان میں سے ایک ڈاکٹر جمیل جالبی بھی ہیں۔ یہ ستون اب بمثل ستون لرزاں ہے۔خدا اس کا سایہ تادیر اہل تحقیق اور اردو سے محبت کرنے والوں کے سروں پر سلامت رکھے۔

حوالاجات :

۔چراغوں کا دھواں۔ناشر: سنگ میل لاہور۔ سن اشاعت: ۱۹۹۹[۱]

۔ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ایک مطالعہ۔ مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔ناشر[۲] :

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ سن اشاعت: ۱۹۹۳

[۳] ایضاً۔

[۴] ایضاً۔

دنیا بھر سے کتابیں۔فرزانہ اعجاز کی خودنوشت کا بیان

۲۳ اگست ، ۲۰۱۳ کی ایک صبح کتابوں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ محکمہ ڈاک اور کوئیر کمپنی کے ہرکارے ایک ساتھ ہی ہانپتے کانپتے پہنچے تھے۔ اور مختلف رنگارنگ پارسل تھما کر شتابی سے رخصت ہوئے۔ شمس الرحمان فاروقی کی '' ہمارے لیے منٹو صاحب''، ش فرخ کی آپ بیتی'' جینے کا جرم'' ابن کلیم احسن نظامی کی ملتان سے ارسال کردہ کتابیں دلی یاترا حصہ دوم، محاسن خط رعنا اور کرنل افتخار حسین کی خودنوشت ''وردی کا سفر'' ان تمام کتابوں کی تفصیل اور منتخب کردہ اوراق ''توشہ خاص''کے ہمراہ زیر نظر پی ڈی ایف فائل کا حصہ بنا دیے گئے ہیں:

http://www.scribd.com/doc/162538713/Dunya-Bhar-Say-Kitabain-August-2013-Rashid-Ashraf

مگر آج صرف اور صرف بات ہوگی ان کتابوں کی جسے '' توشہ خاص'' کا نام دیا ہے۔ یہ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والی محترمہ فرزانہ اعجاز کی ارسال کردہ کتابوں کا تذکرہ ہے..... آپ انہیں ادیبہ کہہ سکتے ہیں لیکن ''ہمارے'' لیے وہ فرزانہ آپا ہیں۔یہ ہم کا صیغہ بھی خوب ہے۔ اہل لکھنؤ اس کا خوب استعمال کرتے ہیں.... یہ استعمال ان کے خون میں رچا بسا ہے۔ حسن رضوی نے اپنے

سفر نامہ ” دیکھا ہندوستان ،، (اشاعت ۱۹۹۲) میں لکھنؤ کے ایک ایسے نوعمر کوچوان کا ذکر کیا ہے جو اپنے گھوڑے کو آہستگی سے چلنے پر مجبور کر رہا تھا۔جب مصنف نے منزل پر پہنچنے میں دیر ہوتی دیکھ کر کوچوان کو گھوڑے کی تواضع چابک سے کرنے کے لیے کہا تو لڑکے نے جواب میں کہا کہ حضور! انہوں نے صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے۔اور حسن رضوی بھڑکنے کے بجائے پھڑک اٹھے۔

لاہور میں قیام پذیر ایک خاتون کو راقم سے ایم فل کے مقالے کے سلسلے میں مدد درکار تھی، گفتگو ہو رہی تھی۔ کہیں میں اپنے جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ بیٹھا کہ ” اس ،،سلسلے میں ہماری ایک کتاب بھی دیکھ لیجیے گا

خاتون نے قہقہ لگایا...کہنے لگیں ” ہم سے کیا مراد ہے آپ کی ؟ کیا آپ کی کتاب کے ،، لکھے جانے میں کچھ اور لوگ بھی ملوث تھے ؟

یہ سب باتیں اس لیے کہ چند روز ہوئے فرزانہ صاحبہ نے راقم کو فون کیا۔ دیر گئے تک باتیں کرتی رہیں۔ وہ اپنے لیے ہم کا صیغہ استعمال کر رہی تھیں۔ان کے زبان سے اسے سننا نہایت بھلا لگ رہا تھا۔ یہ ان کی تربیت تھی.....تہذیب کا رچاؤ تھا.... اسے لکھنؤ کا حسن کہیے....کوثر و تسنیم میں دھلی زبانوں کا اعجاز۔۔۔۔راقم کے شہر میں زبانیں پان اور سگریٹ سے دھلتی ہیں.....نوعمر

لڑکے منہ کھولتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ سن کر خاموشی اختیار کر لینے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ نوعمر لڑکے کسی بھی شہر، کسی بھی تہذیب و ماحول کو جانچنے کا ایک پیمانہ ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ڈھنگ سے کی گئی ہو تو اجنبی ایک لحظے میں اطراف کے ماحول کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

افسوس کہ زبان کے معاملے میں یہ پورا شہر ہی عمر شریف اور شہزاد رضا کے کسی اسٹیج ڈرامے کا حصہ لگتا ہے۔

میں دیر گئے تک فرزانہ اعجاز کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ گرچہ خاکسار نے اپنی جانب سے پوری کوشش کی تھی کہ مخاطب پر یہی تاثر جائے کہ ''ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں'' دوران گفتگو، لہجے کو نستعلیق بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی .... مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی ......یقینا یہ سب سن کر ہماری مخاطب ہماری جہالت پر مسکرا رہی ہوں گی۔

گفتگو میں لاکھ زور مارئیے لیکن وہ ماحول بھلا کہاں سے لایئے گا جس میں ہمہ وقت ......انسان کچھ نہ کچھ سیکھنے کی حالت میں رہتا ہے؟

فرزانہ اعجاز کی ارسال کردہ کتابوں میں کہکشاں (مختلف شعراء کی تخلیقات پر

مرتب کردہ کتاب)، بیس کہانیاں، حرف مکرر نہیں ہوں میں (والد محترم پر مضامین کا مجموعہ) حاضری کا شرف (سفر مقامات مقدس) کے علاوہ ان کی یادداشتوں کی کتاب آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا" اور سوانحی مضامین کا مجموعہ " بھلائے نہ بنے" شامل تھی۔ ان تمام کتابوں سے مختلف ابواب مذکورہ بالا پی ڈی ایف فائل کا حصہ بنا دیے گئے ہیں لیکن اس وقت خصوصیت سے جس کتاب کا ذکر ہے وہ ہے "آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا" ۔

ادھر ایک ماہ کے عرصے میں اوپر تلے تین خواتین کی خودنوشتیں شائع ہوئی ہیں۔ عابدہ رحمانی صاحبہ کی "مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا" راولپنڈی سے ، شائستہ جمال کی "زندگی اک تماشا" فیصل آباد سے اور کراچی کی صحافی ش فرخ کی خودنوشت "جینے کا جرم" لاہور سے شائع ہوئی ہے۔اور اب "آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا" کو بھی اسی صف میں شمار کیا جائے گا۔

آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا" میں فرزانہ اعجاز نے قاری کو لکھنؤ کی سیر کرائی ہے۔ یہ کتاب ' لکھنؤ ہی سے شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر کیمرے کی محفوظ کردہ ایک خوبصورت و پرشکوہ مسجد کی تصویر ہے۔کتاب میں مصنفہ نے اپنے لیے ہم کا صیغہ ہی استعمال کیا ہے جو پڑھنے والے کو بھلا بھلا سا لگتا ہے۔ رہی رہی کسر بیانئے نے پوری کر دی ہے جس میں ایک معصومیت کا عنصر غالب ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چھوٹی سی بچی اپنی داستان حیات بیان کر رہی ہو۔ ان کے

والد لکھنؤ کی معروف قابل احترام ہستی مانے جاتے تھے۔ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محل کی تہذیب کے وارث۔ ....

فرزانہ اعجاز لکھتی ہیں:

" چونکہ ہماری پرورش ادبی ماحول میں ہوئی، کچھ ایسے ماحول میں جہاں بات بات پر محاورے اور استعارے اور اشعار پڑھے جاتے تھے، فارسی کے جملے بولے جاتے تھے اور اس بات پر بہت زور دیا جاتا تھا کہ صحیح زبان بولی اور لکھی جائے ۔ مرد حضرات تو خیر فصیح و بلیغ زبان بولتے ہی تھے، خواتین اور بچے بھی صاف زبان بولتے اور با محاورہ گفتگو کرتے تھے۔ خصوصاً بچوں کو غلط تلفظ یا غلط الفاظ بولنے پر ٹوک دیا جاتا تھا "

بچپن کی یادوں میں مصنفہ کو تقسیم ہند کے فوری بعد کے شب و روز خوب یاد رہے تھے ۔ اس زمانے کے لکھنؤ کو یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

" کیا خوبصورت، پرسکون زمانہ تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں۔ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ہر تجربہ نیا تھا۔ آبادی اس قدر کم تھی کہ گھر کے باہر ہر شخص ایک دوسرے کو پہچانتا تھا۔ ہم لوگ سلطان المدرس، مشن اسپتال، کوئین میری روڈ اور میڈیکل کالج کے چوراہے کو کہ ہمارے گھر سے خاصا دور تھا)آ کر خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔) "

مصنفہ کے والد ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے اہل خانہ آسودگی کی زندگی بسر کر سکیں۔ تیج بہادر پریس نے کئی ہزار صفحات پر مشتمل مشکوۃ شریف چھپوائی تو مصنفہ کے والدین اس کی کتابت کے بعد کی تصحیح کافی عرصے تک کرتے رہے تھے۔ والدین کی آنکھیں خراب ہوگئیں لیکن مشکوۃ شریف کی برکت سے گھر کے مالی حالات سدھر گئے اور انہی دنوں مصنفہ کی والدہ نے پہلی مرتبہ سونے کا زیور خریدا...... یہ کان کی بالیاں تھیں۔ بقول ان کے، گھر میں فراغت کے انبار تھے، دولت کے نہیں۔ زندگی اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔ ادبی شخصیات کا گھر میں آنا جانا تھا۔ مجاز کو مصنفہ نے چچا لکھا ہے جو ان کے والد اور چچا کے دوست تھے۔ اسی طرح مولانا حسرت موہانی کو بھی انہوں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ مصنفہ کی جانب سے بچپن کی یادوں میں وہی سب کچھ رقم کیا گیا ہے جو ایک چھوٹی بچی کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ گڑیوں کے کھیل، عمر رسیدہ خواتین کی نصیحتیں، رشتے، ناطے ......کاکوری کے کباب ....ہرے ہرے سنگھاڑے ...فرید آباد کی مہندی فروخت کرنے والے ایک بزرگ جو ہمدم اخبار کے شمارے بھی بیچا کرتے تھے اور لوگ ان کی مدد کرنے کی غرض سے پرانے اخبار بھی خرید لیا کرتے تھے.... نخاس بازار میں میں گونجنے والی آواز " ہائے ہائے ربو...... بڑے بڑے کنگھو" لکھنؤ کی خوبصورتی... گھنے سایہ دار درخت....روڈویز کی عالیشان بسیں اور ٹیڑھی کوٹھی میں واقع ان کا دفتر ......اور پھر ایک بس کا رنگیلا ڈرائیور جو جان بوجھ کر اس طرح بریک لگایا

کرتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے اوپر گر گرپڑیں اور اس کی اس حرکت پر لوگوں نے ایک روز 'رنگیلے پیا' کی خوب خبر لی تھی۔ مصنفہ کو ہائی کورٹ والی بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر ابن صفی مرحوم کے ناولوں کے کردار حمید اور فریدی کی طرح دکھائی دیتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

زندگی کی بس کے ڈرائیور نے یک دم جو بریک لگائی تو فرزانہ اعجاز دو ایک نہیں پورے ۳۵ برس قبل ۱۹۷۸ء میں لکھنؤ سے مسقط جا گریں اور تادم تحریر وہیں قیام پذیر ہیں۔ فرزانہ اعجاز نے ایک مزے کا واقعہ لکھا ہے۔ لکھنؤ شہر میں شہر کوتوال نے نواب صاحب سے گزارش کی کہ 'کنگ جارج پنجم' کا انتقال ہوگیا ہے، آپ ان کی یاد میں کچھ اشعار کہیے۔ نواب صاحب تمام ہندستانیوں کی انگریزی حکومت سے جلے بیٹھے تھے۔ فی البدیہ کہنے لگے:

سچ تو یہ ہے بڑا کمال کیا

جارج پنجم نے انتقال کیا

آپ شعر میں جارج پنجم کی جگہ کسی ناپسندیدہ سیاست دان کا نام رکھ کر پڑھیے،

لطف دوبالا ہوجائے گا۔

فرزانہ اعجاز کے والد کے پاس شعراء کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جوش، مجروح، فنا نظامی، ماچس لکھنوی، آفتاب لکھنوی........! دلی کے لال قلعے میں ہونے والے مشاعرے میں پاکستانی شعراء بھی موجود تھے۔ فراق گورکھپوری سخت علالت کے باوجود شریک ہوئے تھے۔ فرزانہ اعجاز بھی وہاں سامعین میں ریڈیو کی ٹیم کے قریب ہی براجمان تھیں۔ ریڈیو والے آپس میں فراق کی حالت دیکھ کر کہہ رہے کہ "ارے ارے....ان کو ریکارڈ کرو، کیا پتہ پھر موقع نہ ملے"۔

:فنا نظامی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

میرا تو تعلق ہے دنیا کے ہر حسیں سے\
واعظ تجھے مبارک، پابند حور رہنا

جلوہ ہو تو جلوہ ہو، پردہ ہو تو پردہ ہو\
توہین تجلی ہے، چلمن سے نہ جھانکا کر

☆

ایک مرتبہ فنا نظامی، فرزانہ اعجاز کے گھر منعقدہ ایک نشست میں اپنا کلام سنا رہے تھے۔ مرد، مردانہ میں اور خواتین گھر کے اندرونی حصے میں مشاعرہ سن

رہی تھیں۔ فرزانہ اعجاز کے بھائی بھی بیٹھے تھے جن کی عمر اس وقت چند برس تھی۔ فنا نظامی کے ایک شعر ان کا ننھا منا بھائی بہت مسکرایا۔ شعر یہ تھا :

رند جنت میں جا بھی چکے
واعظِ محترم رہ گئے

مشاعرے کے بعد فرزانہ اعجاز نے بھائی سے مسکراہٹ کا سبب پوچھا ''تمہاری سمجھ میں کیا آیا جو مسکرا رہے تھے ؟''

کہنے لگا، فنا صاحب کہہ رہے تھے
رند جنت میں جا بھی چکے
والدِ محترم رہ گئے

اوروں کے ساتھ ساتھ فنا نظامی بھی مسکرا اٹھے تھے۔

آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا'' میں ایک جگہ افسانہ نگار (ڈاکٹر) صبیحہ انور کا تذکرہ پڑھ کر' خوشی ہوئی جنہیں منصنف نے ''وجاہت چچا کی ہونہار بیٹی ''لکھا ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ نے اردو میں خود نوشت سوانح حیات' کے موضوع پر لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی' کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ان کا یہ اہم ، قابل قدر و پر مغز مقالہ کتابی شکل اسی نام سے ۲۵ اگست ۱۹۸۲ء

کو نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

کل ۳۴۴ صفحات پر مشتمل 'آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا'' کا ابتدائی حصہ جس میں مصنفہ نے اپنے بچپن و جوانی کے حالات بیان کیے ہیں، کل ۱۲۴ صفحات پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب متفرق سوانحی مضامین، بیرون ممالک کے اسفار وغیرہ کے تفصیلی تذکروں سے پرُ ہے۔ یہ تمام اوراق کتاب سے مربوط ہیں۔

ساڑھے تین بج گیا، خانہ خدا، دلکش روایات اور لطیف بغاوت ، ابو کی پھوپھیاں، حنا بلڈنگ، دلارے صاحب، ماسٹر ناٹے محمود، دادی کی فقیرنیاں نامی ابواب میں مصنفہ نے لکھنو کی تہذیبی روایات اور اس سے وابستہ شخصیات کا تذکرہ کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب خود کو پڑھوانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ 'آنکھ نے جو کچھ کہ دیکھا'' کی قیمت ۲۵۰ مقرر کی گئی ہے اور یہ کتاب لکھنؤ میں درج ذیل پتوں سے حاصل کی جا سکتی ہے:

.برکت محل، فرنگی محل

فرنگی محل ۹

دانش محل بک سیلر، امین آباد

جون ایلیا نے معروف نقاد شمس الرحمان فاروقی سے دورہ ہند کے دوران ایک ملاقات پر استفسار کیا: ”وہ شاعر عظیم کیسے ہو سکتا ہے جس نے متضاد کرداروں کی مدح سرائی کی ہو۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال کا ہیرو بیک وقت اورنگ زیب بھی ہے اور سرمد بھی۔ ایک ہی شاعر بیک وقت قاتل اور مقتول دونوں کو بلند کردار کہہ رہا ہے۔۔ مسولینی میں عظیم انسان کی کون سی خوبیاں تھیں؟ وہ ڈاکٹر اقبال کا ہیرو کیسے ہوگیا؟ برٹش امپائر کے شہنشاہ کے سامنے اقبال نے سرِ تسلیم کیسے خم کردیا؟ کیا عظیم شاعر کا یہی کردار ہوتا ہے کہ وہ ہر طبقے کے لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کرے؟ اور شاہین ایک ایسا خونخوار طائر ہے جس میں رحم کا جذبہ ہرگز نہیں ہوتا۔ کیا اقبال نے شاہین کو علامت بنا کر انسان کو خونخوار بننے کی تعلیم نہیں دی؟

اس نوع کے سوالات کرنے کا حوصلہ صرف جون ایلیا ہی میں تھا۔ ع۔۔۔۔ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں۔

بی ون، مومن اسکوئیر، راشد منہاس روڈ، گلشن اقبال کراچی ۔جون ایلیا کا یہ پتہ بہت پرانا ہے جب وہ اس فلیٹ میں رہا کرتے تھے، یہ ان کی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ عرصہ ہوا یہ پتہ بدل چکا ہے۔جون ایلیا سے متعلق پہلی یاد ایک ٹی

وی مشاعرے کی ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب بھائیوں میں جائیداد کی چپقلش میں تلخیاں گھلنے لگی تھیں، چرچے عام ہونے لگے تھے. انہی دنوں انور مقصود نے ایک مزاحیہ مشاعرے میں "شاعر نمبر بارہ" کی زبانی یہ اشعار کہلوا دیے:

مرغ و شتر کے درمیاں گائیں رہی نہ بکریاں
میرے تمام چارہ گر تھا جو گھر میں وہ چر گئے
کیا پسندہ کیسی پسند، کس سے کہیں اے ارجمند
میرے تمام بھائی بند میرا کباڑا کر گئے

عجب مجنونانہ طبیعت پائی تھی جون ایلیا نے۔ دوبئی میں ہوئے ایک مشاعرے کے دوران عطاء الحق قاسمی نے یہ شعر پڑھا:

ظلم بچے جن رہا ہے شہر کی گلیوں میں
عدل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے

جون ایلیا نے اٹھ کر عطاء قاسمی کی پیشانی چوم لی!
اور ظلم کے بچے جننے کی رفتار دگنی ہو گئی!

جون ایلیا کی شاعری سے ایک زمانہ واقف ہے لیکن وہ ایک عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ قدرت کی جانب سے یہ ہنر بہت کم لوگوں کو ودیعت ہوتا ہے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے بینکار خالد احمد انصاری نے ایک کام تو یہ بہت اچھا کیا کہ جون

ایلیاکے انشائیوں و دیگر مضامین کو بدقت تمام یکجا کر دیا ہے۔ یہ انتخاب ۱۹۵۸ سے ۲۰۰۲ کے درمیانی عرصے میں انشا، عالمی ڈائجسٹ اور سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحاریر پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام 'فرنود' تجویز کیا گیا۔ فرنود کے معنی دلیل، سند یا مثال ہیں۔ پس ورق جون ایلیا کا یہ قول درج کیا گیا ہے " ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دستر خوان پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔ "

جون ایلیا یکم جنوری ۱۹۵۸ کو امروہہ سے کراچی پہنچے تھے۔ ان کے بڑے بھائی یعنی رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کراچی میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ جون کے پہنچنے پر دونوں بھائیوں کو ان کے روزگار کی فکر لاحق ہوئی۔ سو اردو ماہنامے انشا کا ڈول ڈالا گیا جو ایک علمی رسالہ تھا۔ انشا کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۵۸ میں منظر عام پر آیا۔ جون ایلیا اس کا اداریہ خود لکھا کرتے تھے، وہ ملکی و غیر ملکی مسائل کو موضوع خیال بنایا کرتے تھے۔ ۱۹۶۴ میں انشا کا نام تبدیل کر کے عالمی ڈائجسٹ رکھ دیا گیا۔ ۱۹۸۸ میں عالمی ڈائجسٹ بند ہوگیا۔ فرنود میں شامل دیگر تحریریں ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ سے اخذ کی گئی ہیں۔ یہ اداریے ۱۹۸۹ سے ۲۰۰۲ کے عرصے میں لکھے گئے تھے۔

خالد انصاری فرنود کو جون ایلیا کا عجائب خانہ نثر قرار دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جون ایلیا اپنے بھائی رئیس امروہوی کے قتل کے بعد سے محتاط ہو گئے تھے جن کے بارے میں خیال تھا کہ انہیں انتہا پسندوں نے قتل کیا ہے۔ لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ ۱۹۶۲ میں انہیں کس کا ڈر تھا، ایک اداریے ' فی سبیل اللہ فساد ' سے یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے کہ کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سطور نصف صدی قبل لکھی گئی تھیں :

آپ کو پاکستان پر شاید کبھی رحم نہیں آئے گا، مگر آپ اپنے اوپر تو رحم کیجیے۔ اگر" پاکستان بے وقار اور تباہ حال ہوگا تو آپ بھی بے وقار اور تباہ حال ہوں گے۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت پاکستان کے قانون میں تحریک جہاد کے لیے بھی ایک وفد شامل ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ اعلائے کلمہ حق کے لیے سب سے پہلے ملحد روس اور مشرک امریکہ ہی کے خلاف علم جہاد بلند کیا جائے گا۔ چناں چہ ایک وفد خروشیف اور ایک کینیڈی سے ملے گا اور کہے گا:

!یا تو اسلام قبول کرو

!یا جزیہ دو

"........نہیں تو ہم سے جنگ کرو

---☆---

دسمبر ۱۹۵۸ میں لکھے گئے ایک انشائیے کے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ پاکستان ہو یا ہندوستان۔۔۔۔ نصف صدی کا قصہ کیا آج کی بات نہیں لگتی :

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مدتوں سے ہمارے شہروں میں دانش و فن سے معاندانہ بیگانگی " اختیار اختیار کر لی گئی ہے۔ ہمیں چاروں طرف سے ایک ہجوم گھیرے ہوئے ہے۔ ایک ہجوم جو نہ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ ہماری بستیوں میں ایک عجیب و غریب نسل پیدا ہو گئی ہے۔ اس نسل کے پاس نہ حافظہ ہے اور نہ تخیل۔ جو ماضی کے قابل ہے نہ مستقبل کے شایان۔ اس کا مقدر یہ ہے کہ صرف حال میں معلق رہے اس نسل کا وجود، بالکل غیر طبعی ہے۔ ان کے سامنے اگر علوم و فنون کا ذکر کیا جائے تو ان کے چہرے متغیر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو سوال کرتے ہیں کہ علوم و فنون کا ذائقہ کیا ہوتا ہے ؟ یہ لوگ ادب، فلسفہ اور شاعری کو عام زندگی کی اشیائے ضرورت اور اسباب "تعیشات کی نسبت سے جانچتے ہیں۔

جون ایلیا نے بھی عجیب متلون طبیعت پائی تھی۔ ایک سیمابی روح تھی کہ انہیں ہر آن بے چین رکھتی تھی۔ کتاب کے پہلے مضمون 'رائگاں' میں کہتے ہیں " میری پیڑھی کے افراد نے اپنی قدیم عادات اور روایت کے مطابق علم، ادب اور شاعری سے اپنا رشتہ استوار کیا جیسے رئیس امروہوی، کمال امروہوی، سید محمد تقی۔ یہ سب کے سب کامیاب رہے، ناموری حاصل کی۔ مگر میں غریب اول جلول قسم کا آدمی بری طرح مارا گیا اور وہ اس لیے کہ میں ان سب سے زیادہ خیال پسند، مثالیہ پسند (idealist) اور اپنے رجحانات میں بے حد ضدی واقع ہوا تھا۔ "

رائگاں' میں انھوں نے خواتین کے بارے میں اپنے خیالات بلا کم وکاست بیان' کردیے ہیں۔ یہ وصف بھی انھی کے حصے میں آیا تھا، قاری کو چونکا دینے کا۔ بھلا اسے پڑھ کر کون مسکرائے بغیر نہ رہ پائے گا۔ لکھتے ہیں: ''میں نے حسین عورتوں کو عام طور پر بے ضمیر اور لالچی پایا ہے۔ کم سے کم مجھے تو کسی باضمیر اور بے غرض حسینہ سے ملنے کا آج تک موقع نہیں ملا۔ میں نے کوئی اور کارنامہ انجام دیا ہو یا نہ ہو مگر ایک کارنامہ ضرور انجام دیا ہے اور وہ یہ کہ میں نے حسین لڑکیوں کو بری طرح ذلیل کیا ہے۔ اس لیے کہ مجھے ان سے میر تقی میر اور اپنے معصوم ترین بھائی حضرت عبدالعزیز خالد کا انتقام لینا تھا۔ مجھے امید ہے کہ میرا خدائے غیور مجھے اس کا اجر دے گا۔ ''

عجب معاملہ تھا۔ 'حسین لڑکیوں' کو اس بات کا شائبہ بھی نہ ہوتا ہوگا کہ ان سے حضرت عبدالعزیز خالد کا انتقام لیا جارہا ہے۔ کتاب کے ابتدائی مضمون میں شکیل عادل زادہ بیان کرتے ہیں '' اپنی محبوباؤں کے نام بدل دینے کا انہیں شوق تھا۔ 'ف' سے شروع ہونے والے نام جانے کیوں انہیں بہت مرغوب تھے۔ کہتے تھے جانی! کیا وقت تھا۔ سال دو سال گلی کی ریاضت طواف کے بعد کہیں دریچوں میں آہٹ اور چلمنوں میں سرسراہٹ کی سرخوشی یا فتح نصیب ہوتی تھی۔

جون ایلیا دخترِ رز کے اسیر تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی کیفیت میں لکھا بھی کرتے تھے ۔ مشاعروں میں ان کا خاص رنگ بھی اکثر دخترِ رز کی 'مرہون منت' ہوا کرتا تھا۔ لوگ ان کی اس ادا پر فدا تھے، کلام سنانے کے بعد وہ سامعین کے پرزور اصرار پر جاتے جاتے لوٹ آتے تھے۔اسٹیج پر بیٹھے شعرا اور شرکاء سے مکالمہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ شکیل عادل زادہ بیان کرتے ہیں " آخر میں شراب کی کثرت اور شراب بھی سستی یا جو بھی میسر آجائے۔ڈاکٹروں کی تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ سب کو یقین دلاتے تھے اور اپنے آپ کو بھی کہ بھیا! اللہ پاک کی قسم، ٹیسٹوں میں جگر ایسا صاف آیا ہے جیسے کسی بچے کا ہو۔"

شکیل عادل زادہ، جون ایلیا کے نہایت قریب رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔کتاب کے لیے ایک عمدہ و دلچسپ مضمون شکیل عادل زادہ کا تحریر کردہ ہے۔ مذکورہ مضمون میں شکیل عادل زادہ نے جون ایلیا کی تمام زندگی کو اپنے مخصوص و دلنشین انداز میں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: " گفتگو میں انوکھے اچھوتے فقروں، نت نئی تاویلوں سے مخاطب کو لاجواب کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔برجستہ، ایسا سفاک، جارحانہ فقرے جست کرتے، ایسی دلیل وضع کرتے کہ تن بدن میں آگ لگادے۔بڑے بھائی رئیس امروہوی کے حادثاتی انتقال پر لوگ تعزیت کر رہے تھے اور صبر

واستقامت کی تلقین کر رہے تھے۔ سنتے رہے اور آہ بھر کر بولے، ہاں صاحب ! ہمیں اپنے بھائی کے قتل کا کوئی تجربہ تو نہیں تھا۔۔۔۔۔۔

کسی دن گھریلو امور کا قصہ چل رہا تھا، کہنے لگے : ''یار شکیل ! سنتے ہیں، پچھلے زمانوں میں بیویاں مر بھی جایا کرتی تھیں۔''

عبید اللہ علیم کے جنازے پر ایک ہم عصر شاعر بے حال تھے، پچھاڑیں' کھا رہے تھے۔ہر آنے والے سے لپٹ کر بین کرتے، ادھر جون صاحب کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ کسی دوست نے ہم عصر شاعر کے بارے میں سرگوشیانہ تبصرہ کیا کہ اس کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی۔ جون صاحب سر ہلاتے ہوئے ہونٹ سکوڑ کر بولے، ہاں جانی ! وہ ہم سے بازی لے گیا۔''

فرنود میں جون ایلیا کے کل ۷ مضامین شامل کیے گئے ہیں جبکہ انشائیوں /اداریوں کی تعداد ۱۸۱ ہے۔ تمام انشائیوں و مضامین کا طرز تحریر بے ساختہ ہے، کچھ کچھ سفاک اور کہیں کہیں لب و لہجہ ایسا کہ فساد خلق بپا ہو جائے لیکن جون ایلیا اس متوقع خوف فساد خلق سے بے پروا لکھتے چلے گئے تھے، یہ ضرور ہے کہ اس نوع کے مضامین آج کے زمانے میں لکھے جائیں تو لکھنے والا معتوب قرار پائے، خصوصا مذہبی حلقوں کی جانب سے ۔چند مقامات پر بیان کا حکومتی گرفت میں آنا بھی یقینی نظر آتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جون ایلیا کے طرز تحریر میں اپنے قارئین کو جکڑ لینے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔

مجنونانہ کیفیت جو ان پر طاری رہا کرتی تھی، کئی مضامین اس سے لبریز نظر آتے ہیں لیکن ان کا قاری ان کی انہی اداؤں کا تو اسیر ہے سو کتاب کا شائع ہونا تھا کہ نہ صرف وطن عزیز بلکہ پڑوسی ملک سے بھی اس کے حصول کی فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا۔فرنود میں شامل تحریروں کے ذریعے جون ایلیا نے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔یہاں ہمیں وہ جون ایلیا نظر آتا ہے جو اپنے بھائیوں کے مقابلے پر خود کو خیال پسند، مثالیہ پسند اور اپنے رجحانات میں بے حد ضدی سمجھتا تھا، سو قلم چلاتے وقت بھی یہی کیفیات ان پر غالب نظر آتی ہیں، اچھوتی بات، چونکا دینے والے نظریات اور اظہار کا بے باک انداز۔

فرنود میں شامل آخری اداریہ سسپنس ڈائجسٹ کے دسمبر ۲۰۰۲ کے شمارے سے لیا گیا ہے۔ یہ جون ایلیا کا آخری اداریہ تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے: ”نشیان، سحر البیان! تم نے سنا جون ایلیا مر گئے۔کیا کہا، جون ایلیا مر گئے۔“ ۔اور پڑھنے والے کو بے اختیار ان کے بڑے بھائی رئیس امروہوی کی یاد آجاتی ہے جو اپنے قتل کے وقت جو کالم لکھ رہے تھے، اس میں خود ان کی اپنی موت کی پیش گوئی موجود تھی۔

جون ایلیا نے اپنے آخری اداریے میں ان عوامل کی نشان دہی بھی کی تھی جن سے بقول ان کے، وہ ہارے تھے:

جون ایلیا ! تنہائی اور بے وفائی سے ہارے ہیں ''

جون ایلیا ! علمی بونوں سے ہارے ہیں

جون ایلیا ! اپنے خون سے ہارے ہیں

جون ایلیا ! اپنی ثقافت سے ہارے ہیں

جون ایلیا ! اپنی روایت سے ہارے ہیں

''یہ ہیں جون ایلیا کے قاتل

صفحات اور آٹھ سو روپے قیمت کی اس ضخیم کتاب کو لاہور کے ناشر الحمد پبلیکیشنز ۸۱۷ نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ البتہ کتاب کا سرورق دیکھنے والے پر نہایت بوجھل تاثر چھوڑتا ہے۔ وقت کی صلیب پر سفید کرتہ پاجامہ زیب تن کیے کم عمر نظر آتے جون ایلیا ٹنگے ہیں، دونوں ہاتھوں میں آہنی کیلیں ٹھکی ہوئی ہیں، ہاتھ لہولہان ہیں۔ خدا جانے یہ خیال کس کا تھا۔ راقم گواہ ہے کہ جون ایلیا کے پرستاروں نے اسے ہرگز ہرگز پسند نہ کیا۔

گمان ہے کہ جون ایلیا یہ سرورق دیکھتے تو اس کے تخلیق کار سے کہتے '' جانی ! تم نے تو صرف میرے ہاتھ خون میں لت پت دکھائے ہیں، یہاں تو پورا جسم ہی لہولہان ہے۔

''

ابن صفی۔دیار دل نہ رہا بزم دوستاں نہ رہی

یہ ہیں اسرار احمد المعروف ابن صفی ۔اپنی زندگی میں ان پر یہ الزام لگتا رہا کہ انہوں نے ایک ایسی صنف منتخب کی ہے جو سرے سے ادب کے زمرے میں آتی ہی نہیں، جاسوسی ناول بھلا کبھی ادب میں شامل ہو سکتے ہیں ؟۔لیکن یہ کہنے والے کون تھے ؟ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو بیان اس نوعیت کا دیتے تھے اور پھر ان کے تکیوں کے نیچے سے ابن صفی ہی کا کوئی ناول برآمد ہوتا تھا۔ یہ عجب تضاد تھا۔ابن صفی جو ایک درویش صفت انسان تھے، بالآخر ایک انٹرویو میں اپنے دل کی بات کہہ اٹھے، ملاحظہ تو کیجیے:

”مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں۔ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریقِ کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میرے احباب کا اعلیٰ وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے۔افسانوی ادب

خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی شطرنج سے نہیں بہل سکتا۔ اسی طرح ہماری سوسائٹی کے ایک بہتیرے حصے کے لئے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے۔ تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لئے کیوں لکھوں؟ میں اسی انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔ بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ لیکن ۱۹۴۷ میں جو کچھ ہوا اُس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کرکے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آ گئے اور چیخنا شروع کر دیا۔ ''یہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ بہت برا ہوا۔'' لیکن ہوا کیوں؟ تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمہارے گیت دیوانگی کے اِس طوفان کو کیوں نہ روک سکے۔

میں سوچتا... سوچتا رہا۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام سیکھے۔ اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اِسی لئے

منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لئے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے۔ اور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے کے لئے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔
''

کہتے ہیں کہ ' یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام سیکھے '۔ دنیا نے دیکھا کہ انہوں نے مشن کو ایسا نبھایا کہ لاکھوں پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت کر گزرے۔ زیر نظر مضمون کے عنوان سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ جیسے اس کا لکھنے والا ابن صفی کا قریبی دوست تھا، لیکن وہ صفی صاحب کے انتقال کے وقت نہایت کم عمر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن صفی کے تحریر کردہ ۲۴۵ جاسوسی ناولوں اور ان پر لکھے گئے سینکڑوں مضامین کو بحیثیت ایک محقق پڑھنے کے بعد اس کے سامنے اس عظیم انسان کی فکر و فن اور سوچ کا ہر پہلو نمایاں ہو کر سامنے آگیا ہے جس کی اہمیت کو اب ہر سطح پر تسلیم کیے جانے کا عمل نہایت زور و شور سے شروع ہو چکا ہے۔ وہ خود کو ابن صفی کے فن اور شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے والا پہلا شخص نہیں سمجھتا کہ اس سے قبل بھی کئی دوانے یہ کوشش بہ احسن طریق کر چکے ہیں۔

یادش بخیر ایک ہوتے تھے محمد بدر منیر۔ ابن صفی کے ایک سچے عاشق۔ ستر کی

دہائی میں نیشنل بک کونسل کے تعاون سے ابن صفی پر تحقیق کام کا آغاز کیا تھا لیکن پھر کسی وجہ سے وہ سلسلہ درمیان ہی میں رک گیا۔ ابن صفی سے ملاقاتیں بھی کیں اور انٹرویو بھی۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ہجرت کرکے کراچی چلے آئے تھے۔ اپنی مختلف تحریروں میں ابن صفی سے متعلق دلچسپ اور حیران کن انکشافات کیے ۔ اٹامک انرجی کے آئی یو عثمانی، پیر علی محمد راشدی، بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمان کی ضعیف والدہ اور لاہور کے شاعر استاد دامن ، ابن صفی کے پرستار تھے، یہ بتانے والے بدر منیر تھے۔ شیخ مجیب کی والدہ کو تو وہ ابن صفی کے ناول سقوط ڈھاکہ کے بعد بھی اسپتال میں جا جا کر سناتے رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہاں اردو میں بات کرنے کا مطلب تھا اپنی جان گنوانا۔ بدر منیر آخری وقت میں جنرل اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ ہو کر لاہور چلے گئے تھے۔ ۱۹۹۰ کے وسط میں لاہور میں انتقال کیا۔ محمد بدر منیر نے ایک ملاقات میں ابن صفی سے دریافت کیا:

"آپ کے خیال میں اردو میں جاسوسی ناولوں کا مستقبل کیا ہے؟"

ابن صفی کا جواب ملاحظہ ہو:

"بہت شاندار۔ اردو ہی کیا دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اگر کوئی ادب زندہ رہے گا تو وہ جاسوسی ادب۔ حالانکہ میں ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کا حامی

نہیں ہوں لیکن جو بزعم خود ''سکہ بند'' ادیب بنے ہوئے ہیں انہوں نے اسے خانوں میں تقسیم کر دیا ہے اور میں فی الحال اس تقسیم کو قبول کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہوں کہ جاسوسی ادب کے سوا کسی اور ''ادب'' کا مستقبل کہر آلود ہے۔ اور اردو ہی کیا، ہندی بنگلہ، سنسکرت، مراٹھی، انگریزی یہاں تک کے فرانسیسی اور عربی و فارسی میں بھی جاسوسی ادب کا بول بالا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ انسانی فطرت کی عکاسی کرتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں لکھنے والے کے لئے ایک کائنات آباد ہے۔ چنانچہ مجھے لکھنے میں کبھی دشواری پیش نہیں آئی۔ نہ مجھے ذہنی بحران کا سامنا کرنا پڑا نہ ''ذہنی تعطل کا اور نہ مجھے کسی اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

ابن صفی اپریل ۱۹۲۸ میں قصبہ نارہ، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ میں ناظم آباد، کراچی میں اپنے واقع اپنی قیام گاہ پر انتقال کیا۔ اس درمیانی وقفے میں ابن صفی کے قلم سے اردو زبان کے سری ادب نے اپنی معراج کی وہ منزلیں طے کیں کہ آج کیا، رہتی دنیا تک ابن صفی کے مقام کا تعین ہوگیا۔ اب تو یہ روایت بھی پرانی ہو چلی ہے کہ ادھر کوئی دنیا سے رخصت ہوا اور ادھر یہ اخباری بیان داغ دیا جاتا ہے کہ موصوف کا خلا پر ہونا مشکل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں صرف ابن صفی کے انتقال پر یہ روایتی جملہ من و عن سچ ہوتے دیکھا۔ یاروں نے ان کی زندگی ہی میں بہت

زور مارا لیکن وہ بات کہاں ؟ ایسے لوگوں کو ابن صفی پیار سے یاران طریقت کہا کرتے تھے ۔درویش صفت تھے ، لہٰذا اپنے ناولوں کے پیشرسوں میں اپنے نقالوں کے خلاف کاروائی کا عندیہ توزور و شور سے دیتے تھے لیکن کبھی ایسا کر نہ سکے۔ صرف ایک معاملہ تھا جو عدالت تک پہنچا، یہ ابنؔ صفی کے نام سے لکھنے والا ایک شخص تھا، مقدمہ کچھ ہی روز تک چلا پھر ابن صفی نے اس میں مزید دلچسپی نہ لی۔ ابن صفی کے ایک پر ستار تھے، پروفیسر مرزا حیدر عباس۔ کسی کا نام لیے بغیر بیان کرتے ہیں " ایک آدمی نے ان کے ساتھ فراڈ کیا۔ ابن صفی نے مقدمہ کر دیا۔ اس آدمی کو سزا ہو گئی۔ جب معلوم ہوا کہ اس کے بیوی بچوں کا کوئی سہارا نہیں ہے تو اس کو اپنے پاس سے وظیفہ دینا شروع کردیا۔'' ۔۔کیا خبر یہ نامعقول وہی ابنؔ صفی ہی رہا ہو۔

ناول نگاری کے فن کے بارے میں احمد صغیر صدیقی کہتے ہیں'' ناول اصطلاحاً دراصل ان قصوں کو کہا جاتا ہے جن میں داستانوں کی طرح فرضی واقعات پیش کرنے کے بجائے انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور معاملات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے۔ اس میں دلچسپی پلاٹ، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔''

جاسوسی ناول نگار کے لیے درج بالا مراحل پر پورا اترنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس

کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جاسوسی ناول میں پلاٹ ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت رکھتا ہے۔بقول شخصے اس میں ریاضی جیسی تکنیک ہوتی ہے۔ناول نگار کی ذرا سی کوتاہی اسے قاری کی نظر میں مضحکہ خیز بنا سکتی ہے۔جاسوسی ناول نگاری ایک بالغ و باشعور انسان کا کام ہے، اس میں بچپنے کی گنجائش سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ ابن صفی کے لکھے ۲۴۵ ناولوں میں کسی کو بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے، پلاٹ پر ان کی گرفت، زبان و بیان کی نزاکتوں، طنز و مزاح کی باریکیوں اور آخر میں قانون کی بالا دستی جیسے پیغام و معاملات پر ان کی دسترس حیران کن حد تک مضبوط نظر آتی ہے۔ ابن صفی کی منظر نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

”مرنے والے چیخ رہے تھے ......بلبلا رہے تھے۔ رو رہے تھے لیکن انھیں قتل کرنے والوں کے ہاتھ کسی طرح نہ رکے۔ اور پھر انھوں نے ان کی لاشیں بھی گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالیں۔ انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زندگی کی آخری حدوں پر کھڑے سامنے پھیلی ہوئی بیکراں تاریکی میں اپنے لئے جگہ تلاش کر رہے ہوں___ حالانکہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا مگر انھیں ایسا محسوس ہو ریا تھا جیسے یہ دُنیا کا آخری دن ہو، زمین کسی سیارے سے ٹکرا گئی ہو۔ سورج کے پر خچے اُڑ گئے ہوں! شکرالی وحشی بھی گھوڑوں پر دم بخود بیٹھے اپنی ہمیشہ اُداس رہنے والی آنکھوں سے کچلی ہوئی لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور پھر یک بیک ہوا تیز ہو گئی۔“ (درندوں کی بستی۔عمران سیریز نمبر ۱۸۔ سن اشاعت: ۲۷ مارچ ۱۹۵۷)

ادبی چاشنی لیے یہ ٹکڑا دیکھیے، لکھتے ہیں:

"موی شمعوں کی ٹھنڈی روشنی، مہاتما بدھ کی پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ اس کی روح کی گہرائیوں میں اتری جارہی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کسی کا قیدی ہے۔ کچھ اجنبی اسے کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جارہے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کون ہیں اور اس سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے اپنے انجام کا بھی اندیشہ نہیں تھا۔ اس کی روح اب سے ہزاروں سال پہلے کی دنیا میں بھٹکنے لگی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس غار میں تنہا ہو۔ جیسے وہ بھی موی شمعوں کی طرح پگھلا جارہا ہو... تنہائی... ہلکی سرخ روشنی، بدھ کا ملکوتی تبسم، ان کے علاوہ وہاں

کچھ نہیں تھا۔ اس کی ہمسفر کا چہرہ ہلکی سرخ روشنی میں چمک رہا تھا۔ حمید کے ذہن میں قدیم مندروں اور مٹھوں کی دیو داسیوں کا تصور ابھرا... اور وہ اسے اس تقدس آمیز روشنی میں کوئی مقدس کنواری معلوم ہونے لگی۔" (برف کے بھوت۔جاسوسی دنیا نمبر ۳۳۔ سن اشاعت: ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵۔)

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ لوگ انتظار کی کن کیفیات سے گزرتے ہوں گے جو ابن صفی کے نئے ناول کے حصول کی خاطر لائنوں میں لگا کرتے تھے، یہ لائنیں

پاک و ہند کے ہر بڑے شہر میں لگا کرتی تھیں۔ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں اور راقم ان سے رابطے میں ہے جو ایسی لائنوں میں لگ کر ابن صفی کا نیا ناول خریدا کرتے تھے۔ ہم تو ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے نئے ناول کی اشاعت کے انتظار کی صعوبتیں اٹھائے بغیر صفی صاحب کے انتقال کے بعد ایک ساتھ ہی ان کے ناول پڑھنا شروع کیے اور پھر اسی رو میں پڑھتے چلے گئے۔ایسا کرنے سے ہم نے ابن صفی کے کرداروں کے ذہنی ارتقاء کا خوب مشاہدہ کیا۔ علی عمران جو 'خوفناک عمارت' (پہلا ناول۔اگست ۱۹۵۵۔ کراچی) میں ایک کھلنڈرا انسان تھا، دھیرے دھیرے سنجیدہ ہوتا چلا گیا، بالخصوص ابن صفی کی زندگی کے آخری سالوں میں جب وہ ایک جان لیوا بیماری کا شکار ہو چکے تھے، علی عمران کی سنجیدگی سے خوف سا آنے لگا تھا۔ کم و بیش یہی حال جاسوسی دنیا کے لازوال کردار کیپٹن حمید کا بھی ہوا۔ بقول پیر حسام الدین راشدی، ''یہ ابن صفی کی ذہانت کا کمال ہے کہ اس نے فریدی کی خشکی کو رفع کرنے کے لیے کیپٹن حمید کو روغن بادام کی طرح استعمال کیا ہے اور اگر کیپٹن حمید نہ ہوتا تو فریدی اپنی تمام شجاعت اور بہادری کے باوجود '' بور'' کردار ہو جاتا۔

یہ وہ وقت تھا جب ابن صفی اپنی بیماری سے نبرد آزما تھے۔ ان کا قاری ان کے ان کرداروں کے بدلتے رویے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

علی عمران کہ لاکھوں کا آئیڈیل ہے، ایک جگہ اس کا مکالمہ ملاحظہ ہو :

''گلزار نام تھا''

'' کیا داڑھی گلاب کے پھول کی سی تھی ؟ ''

'' نہیں تو ''

''ابے ! تو پھر گلزار نام کیوں تھا ؟ ''

:یہی علی عمران ۲۳ مئی ۱۹۷۹ کو لکھے گئے ناول لرزتی لکیریں میں ایک جگہ کہتا ہے

میرا نظریہ حیات یہ ہے کہ جب مرنا ہوگا مرجاؤں گا۔ پہلے سے بور ہوتے رہنے کی کیا'' ضرورت ہے۔ نہ اپنی کوشش سے پیدا ہوا ہوں اور نہ اپنے ارادے سے مر سکوں گا۔

''لہذا عیش کرو۔

یاد رہے کہ یہ وہ وقت تھا جب ابن صفی پر بیماری اپنا تسلط جمانے کی تیاریوں میں مصروف تھی،احمد صفی کے بیان کے مطابق ان پر درد کا پہلا اور شدید حملہ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۹ کی رات کو ہوا تھا۔اس کے بعد ان کی صحت مسلسل خراب ہی رہی تھی۔

جولائی ۱۹۸۰ کو بلبل ہزار داستان اپنی نغمہ سرائی ختم کرکے خاموش ہوئی۔ سری ۲۶ ادب کی محفل ویران ہو گئی، وہ دنیا سے کیا گئے، گویا چمن ہی اجڑ گیا۔ علی عمران، کرنل ،فریدی، کیپٹن حمید ، قاسم، سر سلطان، رحمان صاحب، سنگ ہی، جولیا

صفدر۔۔۔ سبھی دوڑتے دوڑتے یک دم رک گئے۔۔ جیسے کسی نے طنابیں ہی کھینچ لی ہوں۔۔۔۔ جیسے انہیں خود بھی یقین نہ آ رہا ہو کہ ان کے ساتھ یہ کیا ہوا ؟

۔۔۔۔۔۔۔۔

مانگ کیا مانگتا ہے ؟ ایک کڑک دار آواز آئی۔اس مضمون کے لکھنے والے نے نظریں نیچی کر، ہاتھ باندھ، گڑگڑا کر کہا: ''کچھ دیر کے لیے سہی لیکن ایک ایسی جگہ ہو جہاں فریدی، عمران، حمید، قاسم ۔۔ سبھی مجسم حالت میں موجود ہوں ۔۔زندہ و جاوید، باتیں کرتے ہوئے، جواب دیتے ہوئے۔۔۔۔اور ایک جانب بیٹھے ہوں نارہ کے اسرار احمد المعروف ابن صفی !۔۔ میرے ابن صفی

ابن صفی بحیثیت طنز و مزاح نگار

ابن صفی کے فن کمال کی کئی جہتیں ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت قوی جہت ان کی طنز و مزاح نگاری ہے۔ بات آگے بڑھانے سے قبل یہاں یہ ذکر ضرور ہوگیا ہے کہ اردو ادب میں نصف صدی سے بھی اوپر کا عرصہ گزر جانے کے بعد احیاء ابن صفی موجود صدی کی اول دہائی کے آخر میں دیکھنے میں آیا۔ معروف ادیب و براڈکاسٹر جناب رضا علی عابدی نے راقم الحروف کے نام ایک حالیہ مکتوب میں کیا عمدہ بات کہی کہ " غنیمت ہے کہ بعد میں، قدرے تاخیر سے اہل ادب کی آنکھ کھلی اور خیال آیا کہ جس شخص کے گزر جانے سے ادب کے دامن میں سوراخ ہوگیا ہے اس کے بارے میں آنے والی نسلیں پوچھیں گی تو کیا جواب دیں گے۔"

ادھر ہندوستان میں مقیم ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ابن صفی کو دریافت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنی تازہ کتاب (جنوری ۲۰۱۳) ' ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح" میں رقم طراز ہیں: " میں نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں سے ایک پہلو تراش کر طنز و مزاح میں بھی ان کی ذہانت، فطانت اور چبھن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔" ۔۔۔ لگتا ہے اردو ادب کے بڑے لوگوں

کو ابن صفی کی اہمیت کا اندازہ ہو چلا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مزاح لکھنے کے لیے انسان کو اول تا آخر مزاح نگار ہی ہونا چاہیے۔ یہ کلیہ ابن صفی کے معاملے میں سچ ثابت نہ ہوا۔ اگر زیر نظر مضمون کا عنوان وہ نہ ہوتا جو ہے بلکہ ابن صفی بحیثیت شاعر، جاسوسی ناول نگار یا نثر نگار کے عنوانات کے تحت مضامین احاطہ تحریر میں لائے جاتے، تب بھی لاکھوں کے محبوب مصنف ،اس بے مثال ادیب کی تحریروں میں موجود حوالاجات کی مدد سے انہیں مکمل کرنا ذرا بھی مشکل نہ ہوتا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابن صفی کی نثر میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ مزاح کا عنصر کچھ اس طرح گندھ کر رہ گیا ہے کہ پڑھنے والوں کو ان کے ناولوں میں بیک وقت ایک اعلی پائے کی عمدہ نثر کے ساتھ ساتھ بہترین مزاح بھی پڑھنے کو ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک بار جس نے ابن صفی کو پڑھ لیا، عمر بھر ان کا گرویدہ ہی رہا۔

:طنز و مزاح کے باہمی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں

طنز، زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ” ہے۔ طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مزاح، زندگی اور ماحول سے انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے، اس سے محبت کرتا ہے

اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے اور توڑنے کے دوران ایک فاتحانہ قہقہہ لگاتا ہے چنانچہ طنز میں جذبہ افتخار کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتا ہے۔دوسری طرف مزاح نگار اپنی ہنسی سے ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑتا ہے اور پیار سے ناہمواریوں کو تھپکنے لگتا ہے۔ چنانچہ مزاح میں غالب عنصر ہمدردی کا ہوتا ہے۔'' [ا]

ابن صفی کی تمام تحریریں، ان کے تمام ناول، مذکورہ بالا تعریف پر ہر لحاظ سے پورے اترتے ہیں۔ایسا کہنا کیونکر ضروری سمجھا گیا ہے، اس کی چند مثالیں آگے بیان کی جائیں گی۔

اوسلو یونیورسٹی ناروے میں اردو کے استاد اور ابن صفی کے معتقد پروفیسر فین تھیسن کہتے ہیں:

اگر ہم اُن کا موازنہ اگاتھا کرسٹی سے کریں تو ابن صفی کی کتابوں میں دو اہم پہلو ایسے '' ہیں جو اگاتھا کرسٹی میں نہیں ہیں۔ ایک تو طنز و مزاح، میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو ان کی زبان رواں ہے، دوسری بات یہ کہ انہوں نے ایساکارنامہ انجام دیا جو شاید کسی اور نے انجام نہیں دیا، وہ یہ ہے کہ انہوں نے مزاح اور سسپنس کو یکجا کیا۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر لوگ مزاح لکھتے ہیں تو اس میں سسپنس نہیں ہوتا یعنی سسپنس اور مزاح

کا ایک ساتھ ہونا میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ عموماً مزاح لکھتے وقت سسپنس ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ مذاق ہی مذاق ہے، جبکہ ابن صفی کے ہاں [یہ دونوں ساتھ ہیں۔ یہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔'' [۲

حوصلے، استقلال اور خوش فکری کی قوتوں کو پامال کر دینے والی باتوں کی موجودگی میں ابن صفی کا اپنی تخلیقات میں خوش مزاجی، اور طنز و مزاح کا بے مثال عنصر برقرار رکھنا بجائے خود ان کی ذہنی برتری اور مافوق الفطرت فضیلت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ جاسوسی ناول نگاری کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کرتے ۲۴۵ ناولوں کی ایک ایک سطر کا لطافت و شگفتگی سے مالا مال رہنا ابن صفی کا دلنواز و دل فریب کارنامہ ہے جس نے انہیں طنز و مزاح نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس کی صحیح قدر و منزلت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ذوق سلیم کے ساتھ ساتھ کشادہ دلی کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ یہاں ان نقادوں کی بات نہیں ہے جو علم و انشاء کے زندگی بخش رموز و نکات سے بے بہرہ اور کورے ہیں۔

:ابن صفی نے متفرق مضامین کے مجموعے ڈپلومیٹ مرغ کے پیشرس میں لکھا تھا

طنز و مزاح میرا فن نہیں بلکہ کمزوری ہے۔ کمزوری اس لیے کہ میں صاحب ''

اقتدار نہیں ہوں۔ صاحب اقتدار و اختیار ہوتا تو میرے ہاتھ میں قلم کے بجائے ڈنڈا نظر آتا اور میں طنز کرنے یا مذاق اڑانے کے بجائے ہڈیاں توڑتا دکھائی دیتا۔ الحمد اللہ کہ میری یہ کمزوری قوم کی عافیت بن گئی اور قوم بلا سے واہ واہ نہ کرے، اسے ہائے ہائے تو نہیں کرنی پڑے گی۔ "

بہت عرصہ قبل ابن صفی کے دوست شاہد منصور ابن صفی کو بحیثیت ایک طنز نگار دیکھتے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا تھا :

" سراغ نگار نے طنز نگار کو نگل لیا۔ مگر وہ اسے فنا نہیں کرسکا۔ اب بھی طنز نگار، سراغ کے دل میں نشتر کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ کاش کوئی ابن صفی کے ناولوں سے طنز کے یہ اچھوتے ٹکڑے جمع کرکے تو ہوسکتا ہے کہ طنز میں ایک نئے دور کا آغاز ہوجائے ۔" (الف لیلہ ڈائجسٹ، کراچی۔ جولائی ۱۹۷۲)

جناب شاہد منصور کی خواہش کے احترام میں متذکرہ اوصاف سے بھرپور، ابن صفی کے ناولوں سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں :

ماہنامہ "کمر لچکدار" جس کی دھوم سارے مُلک میں تھی ! ..... وہ ادب اور ثقافت کا علم بردار تھا۔ ادب کا علم بردار یوں تھا کہ اس میں فلم ایکٹرسوں کی کمزوریاں اچھالی جاتی تھیں اور ثقافت کا علم بردار اس لیے کہا جاسکتا تھا کہ سرورق پر کسی لنگوٹی بند امریکن چھپکلی کی تصویر ہوتی تھی۔ (لڑکیوں کا جزیرہ۔ عمران سیریز نمبر ۱۰۔ اشاعت: ۱۵ جولائی ۱۹۵۶)

☆

اگر وہ مفلس آدمی ہوتے تو بھی میں اُن سے اسی طرح محبت کرتی کیونکہ ان کی روح تو" مفلسی میں بھی اتنی ہی عظیم ہوتی"۔

یہ عظیم روح کیا چیز ہے؟میں نے عظیم الدین سنا ہے، عظیم اللہ سنا ہے مرزا عظیم بیگ" چغتائی مرحوم سنا ہے لیکن یہ عظیم روح....." (آہنی دروازہ۔عمران سیریز ۱۴۔اشاعت: (نومبر ۱۹۵۶ ۲۵

☆

جب دو عورتیں بیک وقت تمہیں دلچسپ سمجھنے لگیں تو تم کسی بوڑھی عورت کو تلاش کرو جو اُن کے پیار کی تصدیق کرسکے۔ (الفانسے۔عمران سیریز نمبر ۱۷۔اشاعت: ۲۸ (فروری ۱۹۵۷

☆

عورتیں عموماً ہنسنے ہنسانے پر جان دیتی ہیں اور احمقوں سے تو انھیں بڑی دلچسپی ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ اُن کے شوہر نہ ہوں۔ (حماقت کا جال ۔عمران سیریز نمبر ۲۰۔اشاعت: ۱۵ (جون ۱۹۵۷

☆

شہنشاہیت میں تو صرف ایک نالائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن جمہوریت میں نالائقوں کی پوری ٹیم وبال جان بن جاتی ہے۔ (بھیانک جزیرہ۔جاسوسی دنیا نمبر ۱۷ (۔اشاعت: جون ۱۹۵۳

صبح ناشتے میں نفسیات، دوپہر کے کھانے میں نفسیات، رات کے کھانے میں نفسیات، اونگھتے میں نفسیات، چھینکنے میں نفسیات"۔

"او ہو تو کیا تمہارے ملک میں اس مضمون سے بہت زیادہ دلچسپی لی جارہی ہے"۔

"افسانوں سے لے کر گورکنی کے پیشے تک میں گھسی ہوئی ہے! گورکن قبر کھودتے کھودتے سوچ میں گم ہوجاتا ہے کہ آخر عورتوں نے اس پیشے کو کیوں نہیں اپنایا__ سمجھ میں نہیں آتا تو قبر ادھوری چھوڑ کر یونیورسٹی کی راہ لیتا ہے۔

"یونیورسٹی!"

"ہاں! یونیورسٹی۔ اور وہاں سے فرائڈ فرائڈ کا نعرہ لگاتا ہوا واپس آتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے گورکنی میں مصروف ہوجاتا ہے"۔

(خونی ریشے۔جاسوسی دنیا نمبر ۱۰۶۔اشاعت: ۳۰ ستمبر ۱۹۶۹)

☆

ابن صفی اپنے جاسوسی ناولوں میں دورِ حاضر کے ادبی مسائل کو بھی موضوع تحریر بنایا کرتے تھے۔ اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو موضوع بناتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں چوٹ کرنا ان کی تحریر کا وصف تھا۔ باتوں باتوں میں اپنے کرداروں کے ذریعے وہ ایسے جملے لکھ

جاتے تھے کہ ان کا قاری فوری طور اس میں چھپا لطیف طنز سمجھ جاتا تھا۔ابن صفی بنیادی طور پر فنون لطیفہ سے مکمل آگاہی رکھنے والے شخص تھے۔ بحیثیت ایک جاسوسی ناول نگار، ان کی تحریروں میں ایک بات واضح طور پر سامنے آتی تھی اور وہ تھی ان کی شعر و ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات سے مکمل آگاہی۔ رہین ستم ہائے روزگار رہے لیکن ادبی دنیاکے خیال سے ناواقف نہیں تھے۔زیادہ تر فقرے وہ اپنے لازوال کردار علی عمران کی زبان سے کہلوایا کرتے تھے۔ایسی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

"ہمارے ہاں تو کتابوں کو ترازو میں تول کر سال کی بہترین کتابیں منتخب کی جاتی ہیں اور ان پر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ عموماً سب سے زیادہ ضخیم کتاب کا مصنف انعام پاتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کر بیٹھے تو کہہ دیا جاتا ہے۔ اماں اتنی موٹی کتاب لکھ دی ہے، بے چارے نے، کہیں نہ کہیں تو کوئی قابلِ انعام بات قلم سے نکل ہی گئی ہو گی۔

(بلی چیختی ہے۔عمران سیریز نمبر ۴۳۔اشاعت: ۳۱ مارچ ۱۹۶۴)

☆

یار پتہ نہیں کیوں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم سب کسی ایک ہی استاد سے غزل کہلوا لاتے ہو___ مشاعروں میں سنتا ہوں___رسالوں میں پڑھتا ہوں___ سبھوں کا ایک ہی رنگ نظر آتا ہے۔ خدا بھلا کرے فیض صاحب کا کہ انھوں نے اپنے بعد پھر کوئی اور اوریجنل شاعر پیدا ہی نہ ہونے دیا___ صرف دو تین اس بھیڑ سے

الگ معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے جمیل الدین عالی.....اور جعفر طاہر وغیرہ..... آگے رہے

!___نام اللہ کا

اچھا___! شاعر صاحب نے جھلا کر کہا’’سردار جعفری کے متعلق کیا خیال ہے‘‘۔ ’’

’’___ پتھر توڑتے ہیں’’

واہ___واہ___سبحان اللہ..... جواب نہیں ہے اس تنقید کا۔ (ڈیڑھ متوالے۔عمران ’’

(سیریز نمبر ۴۲۔اشاعت: ۱۲ نومبر ۱۹۶۳

☆

میلارمے [۳] ہی کو توپڑھ پڑھ کر اس حال کو پہنچا ہوں.....! اردو میں میرا جی سے ’’

ملاقات ہوئی تھی‘‘۔

میرا جی تو آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا‘‘۔ ’’

عورتوں کی سمجھ میں نہ آئے تو بہتر ہے..... ورنہ پھکنیاں اور دست پناہ سنبھال کر ’’

دوڑپڑیں گی اس کی قبر کی طرف‘‘۔ (گیت اور خون۔عمران سیریز نمبر ۴۷۔اشاعت: ۹

(اگست ۱۹۶۶

ایک شاعر سے واقف ہوں جو میرؔ کے رنگ میں شاعری کرتے ہیں اور جعفر زٹلی کی شاعری سے متاثر ہو کر نثر لکھتے ہیں___ یہ تو ہوا آرٹ..... اور غالباً آرٹسٹک سنس اس کو کہیں گے کہ خواتین کے رسائل میں ہمیشہ اپنی نوجوانی کی تصویر چھپواتے ہیں۔

(دوسری آنکھ۔عمران سیریز نمبر ۴۸۔اشاعت: یکم دسمبر ۱۹۶۶)

☆

اپنے وجود کے ثبوت کے لئے میں ڈیکارٹس کے خیال سے متفق ہوں۔ یعنی میرا ادراک میرے وجود کا ثبوت ہے...... اور میرا وجود کسی کی حماقت کا نتیجہ ___ ! الہذا حماقت ہی بنیادی حقیقت ٹھہری...... دنیا کے سارے فتنوں کی جڑ تو عقل ہے۔ اس لئے عقل کو اٹھا کر طاق پر رکھ دینا چاہیے۔ جیسے میں نے رکھ دی ہے۔ (آنکھ شعلہ بنی۔ عمران سیریز (نمبر ۴۹۔ اشاعت: ۲۳ جنوری ۱۹۶۷

☆

ہمارے ملک میں گھسیاروں کو پکڑ کر ماہر تعلیم بنادیا جاتا ہے۔ اور وہ کم عمر گدھوں پر ''مُختلف قسم کے مضامین کی گٹھڑیاں لادتے چلے جاتے ہیں۔...... ابھی حال میں میں دوسری جماعت کے ایک بچّے سے اُس کے نصاب کے متعلق پُوچھ بیٹھا تھا...... اُس نے بتایا کہ وہ اُردو، انگریزی، سوشل اسٹڈی۔ ارتھمیٹک۔ نیچر اسٹڈی۔ اسلامیات۔ آرٹ اینڈ کرافٹ اور ہائی جین وغیرہ وغیرہ پڑھتا ہے...... ذرا سوچو تو کیا حشر ہوگا اس کا۔ کیا وہ بچپن ہی سے ذہنی بد ہضمی میں نہیں مبتلا ہو جائے گا ___ کیا اکتاہٹ اور مایوسی اس کی زندگی کے اجزاء لازم نہیں ہو جائیں گے۔ کیا اس کی تخلیقی صلاحیتیں کند نہ ہو جائیں گی۔ اور پھر کیا مستقبل اسے صرف ایک کلرک بنا کر نہ رکھ دے گا''۔

قوم کی تعلیم پر زرِ کثیر صرف کیا جارہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک

بھی ان پڑھ نظر نہ آئے۔ سب کے سب منشی فاضل ہو جائیں۔ اس لیے ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کی ہیں جو قوم کے لئے بہت اچھی گاف کھیلتے ہیں اور اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لئے سمندر پار بھیج دیتے ہیں۔ (ڈاکٹر دعاگو۔ خصوصی ناول ۔ عمران سیریز

(۔اشاعت: مارچ ۱۹۶۳

☆

ابن صفی ادبی رویوں و رجحانات سے خوب واقف تھے، اپنے مخصوص انداز میں چوٹ کرنا ہو تو ناول سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذریعہ بھلا کون سا ہو سکتا تھا۔ اپنے سدا بہار کردار علی عمران کی زبانی کہلواتے ہیں :

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ احمقانہ کھیل کب تک جاری رہے گا"۔___ "کون سا کھیل؟" __ "یہی شاعرانہ کھیل جس نے لڑکی کی یہ درگت بنائی ہے!" ___ "کچھ آپ ہی کہیے اس سلسلے میں"۔___ "سارے شاعر میری جان کو آجائیں گے۔ ابھی حال ہی میں ایک بڑے میاں [۴] نے اپنے ڈیڑھ درجن عشق تحریر فرمائے ہیں اور ان پر بچوں کی طرح قلقاریاں مارتے رہتے ہیں" ۔ (پہاڑوں کے پیچھے۔عمران سیریز

(۔اشاعت: ۱۸ مارچ ۱۹۷۱ ۶۰

☆

محبوبہ ہر حال میں محبوبہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی کی بیوی ہو یا نہ ہو۔ اور محبوبائیں عموماً بدمعاش ہی رکھتے ہیں۔ شریفوں میں تو بیوی رکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

(جاپان کا فتنہ ۔ جاسوسی دنیا ۷۰۔اشاعت: ۸ نومبر ۱۹۵۷)

☆

لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں جیسے بگڑا شاعر مرثیہ گوئی اختیار کرتا ہے اسی طرح نا اہل مُصوّر کارٹونسٹ بن جاتے ہیں۔حالانکہ یہ غلط ہے۔اچھے کارٹونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا مصوّر بھی ہو۔ورنہ وہ اچھا کارٹونسٹ ہو ہی نہیں سکتا! بالکل اسی طرح جیسے گھٹیا قسم کے انشاپرداز مزاح نگار نہیں ہو سکتے۔(سینکڑوں ہم شکل ۔ جاسوسی دنیا ۸۰ ۔اشاعت: ۲۵ نومبر ۱۹۵۸)

☆

فنون لطیفہ پر ابن صفی کی گہری نظر تھی۔ وہ خود بھی ایک اچھے آرٹسٹ تھے۔ایک جگہ فن تجرید پر چوٹ کرتے کرتے ابن صفی کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

”پچھلے دنوں ایک غیر ملکی سفارت خانے نے تصویروں کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔تمہارا یہ نوکر (عمران کا باورچی سلیمان۔راقم) وہاں بڑے ٹھسے سے پہنچا تھا اور تصاویر پر تنقید کرتا پھرتا تھا۔“

”اچھا! لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ پکاسو کا بہت بڑا مداح ہے۔تجریدی آرٹ پر جان دیتا ہے اور جیسی تصاویر دیکھ کر آتا ہے ویسی ہی چپاتیاں پکانے کی کوشش کرتا ہے۔ایک دن ساڑھے تین فٹ لمبی چپاتی پکائی تھی۔میں نے پوچھا ’یہ کیا‘ تو کہنے لگا صدائے صحرا ہے اور ’ابدیت‘ ابھی توے پر ہے۔“ ۔(تصویر کی اڑان۔عمران سیریز ’ نمبر ۵۳۔اشاعت: ۱۹۶۸)

☆

اردو زبان و ادب میں شاعری ایک 'سنگین' مسئلے کا رخ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ حالیہ چند دہائیوں میں ایسے شعراء کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو محض اپنا کلام شائع کرانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس عمل کے دوران شاعری کے معیار کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی نام نہاد شاعروں پر چوٹ کرتے ہوئے ابن صفی کے ناول سے یہ چلبلا، کٹیلا اقتباس ملاحظہ ہو:

" سارجنٹ ناشاد ایک غزل کہہ رہا تھا۔ سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر اس نے بہت سے قوافی لکھ رکھے تھے۔ ان قافیوں پر میں ایک ایک مصرعہ کہہ کر ان پر گرہیں لگاتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک مصرعے میں اسے گاڑی رکتی ہوئی سی معلوم ہونے لگی۔ اس نے اس کی تقطیع شروع کر دی۔ غم جاناں۔۔ اے کھٹ کھٹ۔۔ لہو بن کر۔۔۔ اے کھٹ کھٹ۔ ۔۔ہا۔۔ ٹھیک تو ہے۔۔۔ غم جاناں لہو بن کر ٹپک آنکھوں سے کچھ یوں بھی۔۔۔ اے کھٹ کھٹ۔۔۔ اے کھٹ کھٹ۔۔۔ اے کھٹ کھٹ۔۔۔

سارجنٹ ناشاد اسی طرح مصرعوں کی تقطیع کرتا تھا۔ فاعلات فاعلات کے بکھیڑے آج تک اس کی سمجھ ہی میں نہیں آئے تھے۔ ویسے وہ اکثر دوسرے شعراء کو عروض سے ناواقف اور اور بالکل ہی کندہ ناتراش بتایا کرتا تھا۔ سارجنٹ ناشاد فوجی آدمی تھا ۔ تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے جگت استاد ہونے کا

دعوی تھا۔اور اس کے ساتھ والے اس کی استادی کے قائل بھی تھے کیونکہ اکثر اس کے اشعار میر و غالب جیسے اساتذہ سے بھی لڑ جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر کسی نے اعتراض کر دیا۔ سارجنٹ ناشاد دہڑسے بولا' تولد ہوا ہے۔' اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ اسے 'تولد' نہیں توارد' کہتے ہیں۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ [۵]

☆

ابن صفی کا ایک ایسا کردار بھی تھا جو ایک جیتا جاگتا شخص تھا اور جسے انہوں نے اپنے ناولوں میں استعمال کرکے ابدی شہرت عطا کردی تھی۔ یہ ذکر استاد محبوب نرالے عالم کا ہے جو شہر کراچی میں مقیم تھے اور آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں استاد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ابن صفی کے دیرینہ دوست جناب شاہد منصور اس ضمن میں بیان کرتے ہیں:

" پھر بارگاہِ ابن صفی میں کچھ اور لوگ آ گئے۔ محفل کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔ پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ابن صفی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ استاد بھی اس درمیان ایک دو بار ملے مگر کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ پھر ابن صفی کی مشہور کتاب ڈاکٹر دعاگو چھپ کر آ گئی تو بڑے ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس کتاب میں، میں نے استاد محبوب نرالے عالم کو منِ و عن اسی طرح براجمان پایا جیسے وہ مجھے ابن صفی کے دفتر میں براجمان ملے تھے۔ اپنی تمام ترہیت

کذائی مشکل و صورت ، لباس اور بھونپو اور مکالموں کے ساتھ کوئی بھی فرق تو نہیں
[تھا۔ لگتا تھا کہ قدرت نے استاد کو ابن صفی کا کردار بننے کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔'']٦
استاد محبوب نرالے عالم سے متعلق عمران سیریز کے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ
ہوں۔ یہاں ہمیں طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے، وہ لطیف جذبہ یعنی ہنسی نظر آتا ہے جو
:بقول ڈاکٹر وزیر آغا، ہمیں اس سنجیدہ کائنات میں زندہ رکھنے کا ذمہ دار ہے

یہ تھے استاد محبوب نرالے عالم۔ بے پناہ قسم کے شاعر۔شاعر کس پائے کے ہوں گے، یہ
تو تخلص ہی سے ظاہر تھا۔ اتنا لمبا چوڑا تخلص شاید ہی کسی مائی کے لال کو نصیب ہوا ہو۔
استاد کا کہنا تھا کہ بڑا شاعر وہی ہے جس کے یہاں انفرادیت بے تحاشا پائی جاتی ہو،
لہٰذا ان کا کہا ہوا شعر ہمیشہ بے وزن ہوتا تھا۔ بسر اوقات کے لیے پھیری لگا کر مسالے
دار سوندھے چنے بیچتے تھے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جو بھی پکڑ پاتا بری طرح جکڑ لیتا۔
بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا کہ سننے سنانے کے چکر میں استاد ہفتوں دھندے سے دور
رہتے۔ بڑے بڑے لوگوں سے یارانہ تھا، پھر عمران کیسے محروم رہتا۔
کوئی عمدہ سا شعر استاد' ۔ عمران انہیں کی میز پر جمتا ہوا بولا'
استاد نے منہ اوپر اٹھایا۔ تھوڑی دیر ناک بھوں پر زور دیتے رہے پھر جھوم کر

'بولے 'سنیے
حسن کو آفتاب میں صنم ہوگیا ہے
عاشق کو ضرور بے خودی کا غم ہوگیا ہے
:پھر بولے۔ 'پچھلی رات مجھ میں غالب کی روح حلول کر گئی تھی، سنو
تم بھلا باز آؤگے غالب
راستے میں چڑھاؤگے غالب
کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
یہ تو وزن دار ہے استاد'۔ عمران حیرت سے بولا'
میں نے بتاہا نا غالب کی روح حلول کر گئی تھی، پھر وزن کیسے نہ ہوتا'' (ڈاکٹر '
(دعاگو۔ عمران سیریز کا خصوصی ناول
کارڈ پر نظر پڑتے ہی اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کارڈ پر تحریر تھا'' امام الجاہلین، قتیل
''ادب، استاد محبوب نرالے عالم
بلاؤ' ۔ عمران کراہا'
'تشریف رکھیے'
لیکن استاد تشریف کہاں رکھتے، وہ تو کنکھیوں سے نرس کو دیکھے چلے جارہے تھے۔

'میں نے کہا استاد'

'جی۔ جی ہاں' استاد چونک کر بولے : 'آج میں ارتعاش سیمگاں کا مقیم مصلوب ہوں'

عمران نے اس طرح سر ہلایا جیسے پوری بات سمجھ میں آ گئی ہو۔

اکثر استاد پر بڑے بڑے نامانوس الفاظ بولنے کا دورہ پڑتا تھا۔ کبھی کبھی نئے الفاظ بھی ڈھالتے۔ اس قسم کے دورے عموما'' اس وقت پڑتے جب آس پاس کوئی عورت بھی موجود ہو۔

نرس اٹھ کر چلی گئی اور استاد نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر جھک کر آہستہ سے 'بولے : 'یہ دوسری کب آئی

''آتی جاتی ہی رہتی ہیں' ۔ عمران لاپرواہی سے بولا '' مگر آپ کیوں مغموم ہیں'

'نہیں جناب، یہ بے پردگی۔۔ یہ ٹڈے ٹڈیاں۔۔ میں عنقریب حج کرنے چلا جاؤں گا'

'ہوا کیا۔۔ کوئی خاص حادثہ '

جی ہاں، کل رینو میں میٹنی شو دیکھنے چلا گیا تھا۔ دیر ہو گئی تھی۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔' ہائے کیا فلم ہے ڈاکٹر نو دیکھی ہے آپ نے۔ سالے، لونڈیا کو چوڑی دار پاجامہ پہنا دیتے 'ہیں

چوڑی دار پاجامہ نہیں استاد، اسے جین کہتے ہیں' ۔عمران نے کہا۔ (ڈاکٹر'

(دعاگو۔عمران سیریز کا خصوصی ناول

☆

عمران نے استاد کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا: 'سنو اکثر لوگ تمہارے آئیڈیاز چرا لیا
کرتے ہیں'

جی بس کیا بتاؤں۔ استاد ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ 'نہ صرف وہ لوگ جو زندہ ہیں بلکہ
وہ بھی جو مر گئے'

وہ کیسے استاد؟

خواب میں آ کر۔۔ مومن، غالب اکثر اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔۔ میرا شعر
تھا:

بے غیرت ناہید کی ہر تان ہے زمبک
شعلہ سا اپ اپ اپ جھپک

اب آپ دیکھیے، ٹیلی وژن والوں سے معلوم ہوا کہ یہ غالب صاحب کا ہے۔

'۔۔مومن کا ہے استاد':

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اب یہی دیکھ لیجیے، میں نے بے غیرت ناہید کہا ہے، اور وہ فرماتے ہیں اس غیرت
ناہید۔۔۔ ہوئی نہ وہی خواب کی چوری والی بات'

صبر کرو'۔ عمران ان کا شانہ تھپک کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور استاد میکانکی طور پر
آبدیدہ ہو گئے۔۔۔ (پاگلوں کی انجمن ۔عمران سیریز۔ناول نمبر

(۵۸۔اشاعت: یکم جون ۱۹۷۰

☆

ابن صفی کی تحریروں سے طنز و مزاح پر مبنی مذکورہ بالا انتخاب کرنے کے دوران راقم الحروف کو پنڈت برج نرائن چکبست [۷] کا وہ بیان یاد آگیا جو انہوں نے 'اودھ پنچ' کے مزاح نگاروں کے متعلق دیا تھا:

"اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ان کے قلم سے پھبتیاں ایسے نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔"

پنڈت برج نرائن چکبست کا یہ بیان بالخصوص اس وقت بہت یاد آتا ہے جب قاری ابن صفی کے ناولوں میں جاسوسی دنیا کے کردار قاسم اور عمران سیریز کے کردار استاد محبوب نرالے عالم کی زبان سے ادا ہونے والے جملوں اور مذکورہ کرداروں کا احوال پڑھتا ہے۔

کم و بیش ۲۵ برسوں تک اپنے جاسوسی ناولوں کے ذریعے بامقصد انداز میں لاکھوں قارئین کی ذہنی تربیت کرنے والے مصنف ابن صفی کے تحریر کردہ تمام ناولوں کی

کئی جہتیں ہیں، ان تمام پر کئی حوالوں سے تحقیقی کام کی گنجائش باقی ہے۔ ابن صفی ایک نثر نگار، ابن صفی ایک جاسوسی ناول نگار، ابن صفی ایک شاعر لیکن 'ابن صفی ایک طنز و مزاح نگار' کا موضوع ایک اچھوتا اور منفرد موضوع ہے۔ جب بھی اس پر کام کیا جائے گا، ابن صفی ایک اہم طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے پطرس، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، کرنل محمد خان جیسے مصنفین کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔

حوالاجات:

۔اردو ادب میں طنز و مزاح۔ڈاکٹر وزیر آغا۔مکتبہ عالیہ، لاہور۔۱۹۷۷[۱]

۔مشتاق احمد قریشی کو انٹرویو۔ماہنامہ نئے افق، کراچی۔اگست ۱۹۸۶[۲]

۔فرانسیسی شاعر و دانشور۔تاریخ پیدائش: ۱۸ مارچ Stéphane Mallarmé۔[۳]

۔تاریخ وفات: ۹ ستمبر ۱۸۹۸ ۱۸۴۲

۔جوش ملیح آبادی کی خودنوشت آپ بیتی، 'یادوں کی برات' کی جانب اشارہ ہے[۴]

۔لڑکیوں کا جزیرہ۔عمران سیریز۔ناول نمبر ۱۰[۵]

۔یادوں کی برات۔شاہد منصور۔ماہنامہ نئے افق، کراچی۔اگست ۱۹۹۳[۶]

۔پنڈت برج نرائن چکبست۔شاعر، ادیب و نقاد۔تاریخ پیدائش: ۱۹ جنوری ۱۸۸۲[۷]

۔تاریخ وفات: ۱۲ فروری ۱۹۲۶، رائے بریلی، بھارت

جو رہی سو بے خبری رہی

شہر کے گنجان آبادی والے علاقے میں اس کی دکان خوب چلتی تھی۔ جدی پشتی نائی تھا، باپ دادا بھی یہی کام کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ فضل کریم کے باپ نے مرتے وقت اس کو تاکید کی تھی کہ بیٹا چاہے کچھ ہوجائے، یہ دھندا مت چھوڑنا اور ہوسکے تو اپنے بچوں کو بھی اپنے ساتھ لگالینا۔ فضل کریم نے اپنے باپ کی نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا تھالیکن بچوں پر اس کا بس نہ چلا، ایک نے سائکلوں کی مرمت کی دکان کھولی، دوسرا چھوٹی عمر میں اپنے ماموں کے ساتھ گاڑیوں کے مستری کی حیثیت سے کام پر لگ گیا۔ بیوی چند برس قبل اچانک چل بسی تھی۔ لڑکیاں تین تھیں، فضل کریم دو کی شادی کرچکا تھالیکن سولہ برس کی اپنی تیسری لڑکی کی طرف سے فکر مند رہتا تھا، بیوی کے انتقال کے بعد تو اپنے کام کے دوران بھی یہی سوچ اس پر غالب رہتی تھی۔ شیو کرتے کرتے گاہک کو چرکا لگا بیٹھتا تھا اور پھر اسے گاہک کی باتیں سننی پڑتی تھیں۔ وقت کے ساتھ بدلتے حالات اس کے گھر پر بھی اثر انداز ہوئے تھے۔ وہ جس علاقے میں رہتا تھا، وہاں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جن کے گھر میں دو وقت کھانے کے لیے روٹی ہو نہ ہو، ٹی وی کیبل کا ہونا لازمی تھا۔اس کا گھر بھی کیونکر محفوظ رہتا۔ کئی مرتبہ بیٹی کو سمجھایا، غصہ بھی

کر کے دیکھا لیکن سب بے سود۔ وہ جواب میں کہتی تھی کہ اب میں سارا دن گھر میں پڑے پڑے کیا کروں۔

اس کی دکان میں کوئی نہ کوئی گاہک ہر وقت ہی موجود رہتا تھا۔ علاقے کے کچھ بڑے بوڑھے بھی وقت گزاری کے لیے چلے آتے۔ ان میں احمد میاں سے تو اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے رازدار بھی تھے اور بدلتے حالات کے بارے میں ایک دوسرے کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہتے تھے۔ اس نے احمد میاں کے لیے دکان کے ایک کونے میں فوم کا گدا لگی کرسی مخصوص کردی تھی۔ فضل کریم کی دکان تھی تو بازار کے عین وسط میں لیکن معاشی حالات نے کبھی اسے اپنی دکان کو جدید انداز میں بنانے سنوارنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ پرانے لوگ آج بھی اس کے پاس آنا پسند کرتے تھے۔ دکان کی اندورنی دیواروں پر کیا ہوا رنگ ملگجا ہوگیا تھا، ایک کونے میں پرانے اخبارات کا ڈھیر تھا، شیشوں کی حالت بھی خستہ تھی بلکہ ایک تو ایسا تھا جس کے بیچ میں پڑے بال کی وجہ سے میں گاہک کو اپنی شکل بھی ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی۔ ایک برس قبل کسی مذہبی جماعت کا کارکن اسے 'ٹی وی کی تباہ کاریاں' کے عنوان پر لکھا ایک پرچہ دے گیا تھا جسے اس نے ایک نمایاں جگہ آویزاں کردیا تھا۔

اس روز بھی وہ دکان میں اپنے کام میں مگن تھا، تین گاہک اپنی باری کا

انتظار کر رہے تھے۔ دکان کا چھوٹا جسے سب چھوٹا ہی کہہ کر پکارتے تھے، تیزی سے صفائی میں مصروف تھا۔ تمام دن استاد کی جھڑکیاں کھاتا تھا، مجال ہے جو کبھی اف تک کی ہو، لیکن دل ہی دل میں استاد کی طرف سے مخاصمت رکھتا تھا۔ وہ ان ہزاروں لاکھوں بچوں میں سے تھا جنھیں معاشی بدحالی سے تنگ آئے ان کے ماں باپ بچپن ہی میں کسی نہ کسی کام پر لگا دیتے ہیں۔ دن میں وہ کم از کم سو مرتبہ استاد کو اس کی جھڑکیوں کے جواب میں قتل کرتا تھا۔ یہ سب سے آسان کام جو ہوا۔ ہم آپ یہی تو کرتے ہیں، دفتر میں، سڑک پر گاڑی چلاتے وقت، ٹی وی پر اپنے ناپسندیدہ شخص کی باتیں سنتے ہوئے، آپ کے خون کا دباؤ یک لخت بڑھتا ہے اور وہ آپ کی کنپٹیوں پر ٹھوکر مارتا ہوا کبھی ہاتھ میں پستول تھما دیتا ہے تو کبھی چاقو اور آپ اپنے مخالف کو چشم تصور میں قتل کر کے ایک سکون سا محسوس کرتے ہیں۔

اچانک دوروازے پر وہ نمودار ہوا۔ شوخ رنگ کی قمیص، بالوں پیچھے کی جانب الٹے ہوئے، گلے میں زنجیر۔ پتلون کے پائنچے اوپر کی طرف مڑے ہوئے۔ عمر یہی کوئی پچیس کے لگ بھگ۔ کتنا وقت لگے گا بھائی صاحب؟ اس نے دروازے ہی سے ہانک لگائی۔ در وازے کے ساتھ بیٹھے اخبار پڑھتے احمد میاں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ فضل کریم نے نظر اٹھا کر پہلے اس کی طرف اور پھر گاہکوں کی جانب دیکھا اور پھر کہا 'آدھ گھنٹے بعد آجاؤ۔' یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں

مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو دروازے پر کھڑا نوجوان غائب ہوچکا تھا۔ وقت گزرتا رہا، گاہک آتے رہے۔ موسم گرما کی دھوپ نے دکان کے اندر ہر چیز کو چکا چوند کر دیا، فضل کریم دکان کے باہر کپڑا لگانے چلا گیا، کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی کچھ نہ کچھ پکا کر ساتھ کر دیتی تھی، اس کا پکایا ہوا ذائقے میں اچھا تو نہیں ہوتا تھا لیکن جیسا بھی تھا وہ اور چھوٹا مل کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی احمد میاں بھی ان کے ساتھ شریک ہوجاتے تھے۔ چھوٹا دکان کی صفائی میں مصروف تھا۔ گاہکوں کے ہر طرف بکھرے بالوں کو سمیٹ کر اس نے ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔ وہ شیو کی پیالیاں، کنگھوں، چھوٹی بڑی قینچیوں اور دیگر اوزاروں کو باہر رکھی پانی کی بالٹی میں ڈال کر دھو رہا تھا۔

کھانے کے دوران فضل کریم، احمد میاں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ چندہ مانگنے والوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

اب ان کو دیکھو بھیا! آگئے پیسے مانگنے کل صبح صبح۔۔ بھئی ہمیں گھر کا پورا نہیں پڑتا،'' ان کو کہاں سے دیں۔ لے تو بھی کھا لے چھوٹے'' بات کرتے کرتے اس نے آواز دی۔ اس کی آواز پر چھوٹا بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ فضل کریم نے ایک بچی ہوئی روٹی اس کے سامنے رکھ دی۔ روٹی پر تھوڑا سا سالن لگا ہوا تھا۔ اس ادھ کھائی روٹی کو دیکھ کر چھوٹے کے دل سے اپنی بے توقیری پر دھواں سا

اٹھا۔اسے آج شدت کی بھوک لگی تھی۔ مایوسی کے عالم میں چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر منہ میں ڈالنے لگا۔

فضل کریم! دریا میں رہتے ہو، خود ہی بتاؤ کہ مگرمچھ سے بیر کیسے رکھ سکتے ہو؟'' ''

احمد میاں لقمہ توڑتے ہوئے بولے۔

دو روز بعد وہی نوجوان دکان میں پھر داخل ہوا۔ اس روز بھی اس نے کپڑے پچھلی مرتبہ والے ہی پہن رکھے تھے البتہ اس مرتبہ بالوں سے کسی سستے خوشبودار تیل کی تیز مہک اٹھ رہی تھی۔ اس نے سوال بھی اسی روز والا کیا۔ کتنا وقت لگے گا بھائی صاحب ؟ ۔۔ فضل کریم نے اس کی طرف دیکھا اور گاہکوں کی تعداد گننے کے بعد کہنے لگا ''ایک گھنٹہ لگے گا بھئی، تم بیٹھ جاؤ۔'' اس نے نوجوان سے کہا۔ نوجوان سرہلا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد فضل کریم کو احساس ہوا کہ نوجوان غائب ہے۔ اسے خیال آیا کہ شاید کسی ضروری کام سے چلا گیا ہوگا۔ شام ڈھلے دکان سے گھر واپسی کے دوران بھی اسے نوجوان کا خیال آیا، '' یہ لونڈا دو دن پہلے بھی تو آیا تھا'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا۔ گھر میں اس کی بیٹی حسب معمول ٹی وی کے سامنے بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے باپ کو خاموشی سے کھانا نکال کر دیا اور خود واپس جا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ کھانا کھاتے وقت فضل کریم اپنی بیٹی کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ سوتے وقت

بھی اسے اپنی بیٹی ہی کا خیال تھا۔ اسی بارے میں سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔
اگلے روز وہ صبح ہی سے مصروف تھا۔ اتوار کا دن تھا اور دکان میں گاہکوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس روز احمد میاں بھی سویرے ہی سے آ گئے تھے اور حسب معمول اخبار کے مطالعے میں گم تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ بج گئے۔ اچانک دکان کے دروازے کی جانب سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ آج کتنا وقت لگے گا بھائی صاحب ؟۔۔ فضل کریم نے چونک کر اس طرف دیکھا، ادھر شیو کے لیے بیٹھے ہوئے گاہک کے چہرے پر گھاؤ لگ چکا تھا اور وہ اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ نوجوان کا لباس نیا تھا اور آج تو اس کے کپڑوں پر لگی تیز خوشبو دکان کے اندر تک محسوس کی جا سکتی تھی۔ فضل کریم کو سخت تشویش ہوئی، اس نے گاہکوں کے سامنے خود پر قابو رکھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا'' آج لوگ زیادہ ہیں، دو گھنٹے لگ جائیں گے ''۔ اس مرتبہ نوجوان بلا توقف فضل کریم کے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے چلا گیا۔ فضل کریم لپک کر چھوٹے کے قریب آیا، اسے بازو سے پکڑ کر دکان سے باہر لے گیا، سامنے وہ نوجوان تیز تیز قدم اٹھا کر ایک جانب چلا جا رہا تھا۔ فضل کریم نے آہستگی سے چھوٹے سے کہا'' جا بے ! اس کے پیچھے پیچھے جا، اور دیکھ کر آ کہ یہ آتا کہاں سے ہے'' ؟

چھوٹا استاد کا حکم سن کر نوجوان کی جانب لپکا، احمد میاں بھی اخبار ہاتھ میں تھامے باہر آچکے تھے۔ احمد میاں! آپ اندر چل کر بیٹھیں، میں آتا ہوں، فضل کریم نے ان سے کہا اور وہ سرہلاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اسی اثناء میں دکان کے اندر سے ایک گاہک نے زور سے فضل کریم کو پکارا ’ اماں! کہاں رہ گئے فضل بھائی‘‘ ۔۔اس کی آواز سن کر فضل کریم ہڑبڑا کر دکان میں داخل ہوا اور بے صبرے گاہک کے بال کاٹنے میں مصروف ہوگیا۔ آج اس کے ہاتھ بہت تیز چل رہے تھے۔ گاہکوں کو نمٹا کر وہ ہانپتا ہوا ایک کونے میں بیٹھ گیا، اتنے میں ایک دوسرا شخص اندر داخل ہوا، فضل کریم نے اسے ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بیڑی سلگا کر احمد میاں کے قریب جا بیٹھا۔ احمد میاں بھی متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہی لونڈا ابھیا جو ایک ہفتے سے آرہا ہے، آج پھر آیا تھا، ہمیشہ آکر یہی پوچھتا ہے کہ ’’ آج کتنا وقت لگے گا، لیکن پھر غائب ہوجاتا ہے، ابھی چھوٹے کو اس کے پیچھے بھیجا ہے کہ پتہ کرکے آئے کہ مردود آتا کہاں سے ہے ’’

تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے فضل کریم، تم ہی سے بال بنوانا چاہتا ہوگا۔‘‘، احمد ’’ میاں سرہلا کر بولے

نہیں نہیں بھیا، اس کا حلیہ آپ نے نہیں دیکھا، لوفروں جیسا ہے، خدا جانے کیا معاملہ ہے۔"

اتنے میں چھوٹا واپس آیا، اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا فضل کریم کے قریب آیا، اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں اپنے استاد پر جمی ہوئی تھیں، ان تین برسوں میں فضل کریم نے اس قدر اعتماد سے اسے قدم اٹھاتے کبھی نہیں دیکھا تھا، چھوٹے نے اپنا منہ اپنے استاد کے کان کے قریب لا کر آہستگی سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر فضل کریم کا چہرہ زرد پڑ گیا اور آنا فانا پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے ۔ وہ قریب رکھی کرسی پر ڈھے گیا۔ اس نے چھوٹے کو دکان کے باہر جا کر بیٹھنے کو کہا اور خود ہانپنے لگا۔" بھائی صاحب ! آپ بعد میں آ جایئے گا، میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" فضل کریم نے دکان میں موجود اپنی باری کا انتظار کرتے آخری گاہک سے لجاجت سے کہا، گاہک اٹھ کر بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

احمد میاں اس کی حالت غور سے دیکھ رہے تھے، وہ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور پوچھا

" کیا ہوا، چھوٹا کیا کہہ رہا ہے، اس کے پیچھے گیا تھا نا وہ "

بھیا! چھوٹا کہتا ہے کہ استاد وہ آتا تو پتہ نہیں کہاں سے ہے البتہ جاتا "

تمہارے گھر ہے۔" یہ کہتے ہوئے فضل کریم کی پیشانی پر ایک مرتبہ پھر پسینے سے بھیگ چکی تھی۔

(یہ تحریر ایک ایک پرمزاح واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے)

خودکش

ویگن کے اڈے پر وہ خاموش ایک طرف بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں ایک تھیلا اور اس میں کھانے کا کچھ خشک سامان۔ سرخ و سفید رنگت، چہرے پر تازہ تازہ اگتے بال اور جسم پر ایک سادہ سا قمیض شلوار۔ قمیض کی اندرونی جیب میں ایک پرانا سا موبائل فون جو اسے خصوصی طور پر استاد صاحب نے چلتے وقت دیا تھا۔۔۔" اسے سنبھال کر رکھنا اور کسی کو مت بتانا کہ تمہارے پاس ایسی کوئی چیز ہے۔۔" وہاں تربیتی کیمپ میں اسے سب استاد صاحب کہتے تھے، وہ بھی جو اس سے عمر میں بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے وہ ایک جہاندیدہ شخص دکھائی دیتا تھا، پچاس کے پیٹے میں بھی اصل عمر سے کم ہی لگتا تھا۔۔اس کی بھی ایک کہانی تھی ۔۔وہاں ہر شخص کی ایک نہ ایک دلدوز کہانی تھی لیکن اب وہ تمام کے تمام یہ کہانیاں اپنے سینے میں ہی چھپا کر رکھنے پر مجبور تھے کہ وہاں انہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔۔کب نجانے کس کی باری آجائے اور اسے روانہ ہونا پڑے اور وہ اپنے ساتھیوں کو بروز قیامت ملنے کا وعدہ کرکے چلتا بنے ۔۔ ایک بڑے سے کمرے میں کسی مقامی فنکار کو بلوا کر خصوصی طور پر چند تصاویر بنوائی گئیں تھیں۔ سبزے سے بھرپور باغات، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی، درمیان میں کہیں دودھ کی نہر بہتی دکھانے کی کوشش کی گئی تھی ۔۔" اسے ذہن میں بٹھا لو، یہی

تمہارا آخری گھر ہے جہاں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔۔'' استاد صاحب نے ایک روز اسے کئی دوسرے نوجوانوں کے ہمراہ آگاہ کیا تھا اور اس کی نظر آخر تک انہی باغات پر جمی رہی تھی جبکہ دوسرے کب کے وہاں سے منتشر ہو چکے تھے۔ ہریالی اسے بہت پسند تھی، وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔۔" اگر یہاں رہنا ہے تو میں تو بہت خوش قسمت ہوں۔" اس نے خود سے کہا تھا۔

استاد صاحب اسے حتمی روانگی سے قبل امیر المومنین کے پاس لے آئے تھے جو ایک تخت پر بیٹھے تسبیح پھر رہے تھے۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ '' جاؤ بیٹا، اللہ کے حوالے '' اور ایک لحظے کو اس کا دل بھر آیا، وہ امیر المومنین کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا تھا اور ان کی کہی ایک ایک بات پر اسے اندھا اعتقاد تھا۔ استاد صاحب تو پھر اکثر تربیت کے دوران سخت لہجہ اختیار کر لیتے تھے لیکن امیر صاحب۔۔۔۔'' کیا ''معلوم وہ بھی وہیں مل جائیں جہاں میں نے ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔۔

ویگن کے ہارن کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ اپنا تھیلا سنبھالتا ہوا اٹھ گیا۔ سامنے ایک پولیس والا مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر وہ پرسکون ہی رہا۔ اس کے سامنے سے گزرتے وقت اس کے ذہن میں روکے جانے کی صورت میں ممکنہ جوابات گھوم گئے جنہیں استاد صاحب نے اسے اچھی طرح

ذہن نشین کروادیا تھا۔ حکومت نے ایک بار خود کش حملہ آور کی پہچان کی نشانیاں بتا کر الٹا انہیں مزید چوکنا کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا چہرہ اور جسم کی سکنات کو پر سکون رکھتے ہیں، پھٹنے سے قبل منہ ہی منہ میں کسی قسم کا کوئی ورد نہیں کر رہے ہوتے، کپڑے بھی عام انداز کے پہنتے ہیں اور رات کو اطمنان سے سونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ بھی نہیں ہوتیں۔

ویگن نے اسے شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں اتار دیا تھا جہاں سے وہ ایک جانب پیدل چل پڑا۔ بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک تنگ سی گلی میں اس نے ایک دروازے پر دستک دی، دروازہ کھولنے والا ایک باریش شخص تھا۔ شناختی جملوں کے تبادلے کے بعد اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا گیا۔ ایک چھوٹے سے صحن سے گزار کر وہ ایک مختصر سے کمرے میں داخل ہوئے۔۔ "تم بالکل محفوظ ہو یہاں۔۔" باریش شخص نے اسے اطمینان دلایا۔ کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

وہ سامنے غسل خانہ ہے، یہ نیند کی گولی ضرور کھا لینا، رات کو آرام سے سونا، کوئی چیز چاہیے ہو تو مجھے آواز دے دینا لیکن کمرے سے باہر مت نکلنا، صبح جلدی اٹھنا ہے۔" باریش شخص نے اسے تنبیہ کی۔ اس کے منہ میں بڑا سا نوالہ تھا اس لیے وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر وہ چلا

گیا تھا اور خود کش حملہ آور چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔

باہر گلی میں کوئی بانسری بجاتا گزرا تھا۔۔۔ کچھ ہی دیر میں وہ کچھ پرانی تلخ یادوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ماں، باپ، بہن بھائی، سبھی تو تھے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن ایک دھماکے نے یک دم اس کی دنیا اجاڑ دی تھی۔ دھماکے قبل کسی طیارے کی پرواز کی جانی پہچانی آواز آئی تھی۔ لوگ ایسی آوازوں کے اب عادی ہو گئے تھے اور ایسے موقعوں پر گھر کے اندر ہی رہنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔ لیکن اس بار کمپیوٹر کے سافٹ ویئر میں کوئی غلطی ہو گئی تھی یا پھر زمینی حدف پر الیکٹرونک چپ رکھنے والے ایجنٹ
سے کوئی چوک ۔۔۔ لیکن اس کا نتیجہ اس کے گھر والوں کی اچانک اور دلدوز موت کی شکل میں نکلا تھا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا، قریب واقع درختوں کے نیچے بانسری ہی تو بجا رہا تھا۔

گھنے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر بانسری بجانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی عیاشی تھی۔ اس کی پسندیدہ ہریالی اور اس ماحول میں بیٹھ کر نئے نئے شوق کی مشق ۔۔۔ اس شوق پر کئی بار وہ اپنے باپ سے پٹ چکا تھا، ایسے موقعوں پر اس کی بہن اس کی مدد کو آتی تھی۔۔۔ ”بابا! بجانے دو نا اگر اسے اچھا لگتا ہے

۔۔''جواب میں اسے کافی دیر تک باپ کی صلواتیں سنی پڑتی تھیں۔

دھماکے کی آواز اس قدر شدید تھی کہ بانسری اس کے منہ سے نکل کر دور جاپڑی اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ منہ میں بھر جانے والی مٹی نکالتا ہوا دیوانہ وار گھر کی جانب دوڑ پڑا تھا لیکن اس وقت تک سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ تربیتی کیمپ میں وہ کسی کے توسط سے پہنچا تھا جہاں اس جیسے اور بھی کئی نوجوان تھے ۔ سب کی کہانی ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ سونے سے پہلے وہ نیند کی گولی کھانا نہیں بھولا تھا۔

علی الصبح اسے نماز کے لیے اٹھایا گیا۔ باریش شخص نے اسے ناشتے کے لیے پوچھا۔۔''

''کوئی خاص چیز کھانے کا دل کر رہا ہو تو بتاؤ! ہم سب سے پوچھتے ہیں۔۔

اور جواب میں اس نے گھی لگی روٹی اور قہوے کی فرمائش کی تھی، باریش شخص مسکرا کر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں ناشتے کے ہمراہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

ناشتے کے بعد چاہو تو کچھ دیر آرام کرلو، پھر نہا کر تیار رہنا، میں ایک

گھنٹے بعد دوبارہ آؤں گا۔۔'' وہ یہ ہدایات دے کر چلا گیا تھا

ایک گھنٹے بعد باریش شخص اس کے جسم پر بارود سے بھری جرسی باندھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے خانوں میں بارود بھرا تھا اور وہ بڑی مہارت سے اس کے جسم پر اسے نصب کر رہا تھا۔ درمیان میں وہ اسے آہستہ سے ہدایات بھی دے رہا تھا۔۔'' ہلنا مت، اب گھوم جاؤ، داہنا ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔۔'' اور وہ خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ یوں بھی اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، تربیتی کیمپ میں اپنے سامنے وہ ایسا ہوتے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ شروع شروع میں تو ایک بار چھپ کر یہ سب دیکھتے وقت استاد صاحب نے اسے ڈانٹ بھی دیا تھا لیکن وہاں سے گزرتے ہوئے امیر المومنین نے مشفقانہ لہجے میں انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔'' مت روکو اسے، ایک دن تو اسے بھی یہ کرنا ہے۔۔''

اب تم بالکل تیار ہو۔۔'' باریش شخص نے اس پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے '' کہا۔۔'' تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا، بس اس جگہ پہنچ کر لوگوں میں گھل مل جانا، اور ان کے عین درمیان پہنچ کر ہاتھ اٹھا کر زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگانا، اس کے بعد چند ہی لمحوں میں تمہیں شہادت نصیب ہو جائے گی اور تم اپنی اس پسندیدہ جگہ پہنچ جاؤ گے جہاں تمہیں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔۔۔''

جرسی بڑی مہارت سے نصب کی جاچکی تھی، بارلیش شخص اپنے کام میں ماہر تھا۔ایک موقع پر اس نے اسے فخر سے بتایا کہ اس کی تربیت امیر المومنین کے ہاتھوں ہوئی ہے۔۔ کام مکمل کرکے اس نے اسے کھڑے ہونے کو کہا تھا اور چاروں طرف سے مکمل جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر سرہلایا۔۔'' وزن زیادہ تو نہیں۔۔'' ؟

''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔۔۔۔حالانکہ وزن زیادہ تو تھا ہی ۔ وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا اور سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی ۔ اس نے اس سے قبل کسی جرسی والے کو اس طرح بے چین نہیں دیکھا تھا جیسی بے چینی وہ اس وقت محسوس کر رہا تھا لیکن اس کا اظہار کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

زیادہ ہلنا جلنا مت، لیٹنا بالکل نہیں،ایک جگہ بیٹھے رہو، کچھ ہی دیر میں ہمیں روانہ ہونا ہے"۔۔ بارلیش شخص یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آواز لگائی ۔۔'' چلو، اٹھو، احتیاط سے ۔۔'' اور وہ بارلیش شخص کی ہمراہی میں گھر کے صحن سے گزرتا، وہاں بکھری مختلف چیزوں پر نظر ڈالتا باہر نکل آیا۔ گھر کے باہر ایک ویگن کھڑی تھی ۔ یہ ایک عام سی گاڑی تھی جو عموماً اسکول کے بچوں کو لانے اور لے جانے کے کام آتی ہے۔ بارلیش شخص نے اسے آہستہ سے فی

امان اللہ کہا۔ منزل پر وہ اس کے ساتھ نہیں جائے گا، یہ بات وہ اسے گھر سے نکلنے سے قبل ہی بتا چکا تھا۔ ڈرائیور کی کرسی پر بیٹھے شخص نے اسے گاڑی کی عقبی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ چپ

چاپ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی تھی اور وہ راستے میں بکھرے منظر کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ علی الصبح اسکول جاتے ہوئے چھوٹے بچے، سڑکوں کی صفائی کرتے خاکروب، پٹرول پمپ پر گاڑیوں کی قطار۔۔۔۔ پھر اچانک اس کی نظر پھولوں کے ایک جھنڈ پر پڑی جسے بڑی مہارت سے سنوارا گیا تھا، اس کے دل میں خوشی در آئی ۔۔ یہ اس کا پسندیدہ منظر تھا۔ ڈرائیور بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ بلاآخر وہ ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں سے کچھ فاصلے پر پولیس کی وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ مال روڈ پر ہونے والا ایک مظاہرہ تھا، ہر طرف کالے کوٹوں کی بھرمار تھی اور ان کو ڈنڈوں کے زور پر روکتے ہوئے پولیس والے۔ ڈرائیور نے اسے اترنے کا اشارہ کیا اور وہ آہستگی سے اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ کچھ ہی ساعت میں وہ نعروں کی آوازیں بلند کرتے مظاہرین کو روکتے پولیس والوں کے درمیان پہنچ چکا تھا، ایک پولیس والے نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی ، اس نے اپنا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند کرکے اللہ

اکبر کا زوردار نعرہ لگایا اور ایک کان پھاڑ دینے والے خوفناک دھماکے نے فضا کو دہلا دیا۔ دھوئیں کے بادلوں سے فضا سیاہ ہو رہی تھی، کئی پولیس والوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے اور ان کے اعضاء دور دور تک بکھر چکے تھے۔

اگلے ہی لمحے اس نے خود کو ہوا میں اڑتے پایا، وہ تیزی سے ایک جانب اڑتا جارہا تھا، اس کا بدن ہوا کی طرح ہلکا ہوچکا تھا۔اس کے اردگرد مناظر تیزی سے بدلتے جارہے تھے۔ جلد ہی وہ ایک جگہ ایسی جگہ جاکر رک گیا جہاں ہر طرف ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے دیکھا کہ اس کے چاروں جانب جلے ہوئے پتھروں کا ڈھیر ہے، ایک عجیب سی بو اسے پریشان کر رہی تھی۔ماحول سوگوار تھا۔ اس کی پسندیدہ ہریالی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک سامنے سے کوئی اس کی جانب آتا دکھائی دیا۔'' کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں ؟'' ۔ جواب میں اس شخص نے جو کہا، اسے سن کر اسے ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔۔

اس سے اگلی رات وہ استاد صاحب کے خواب میں آیا، وہ ہاتھ باندھے استاد صاحب کے سامنے کھڑا تھا اور گڑگڑاتی ہوئی آواز میں استدعا کررہا تھا: '' حضرت ! براہ کرم امیر المومنین تک یہ درخواست پہنچا دیں کہ خودکش جرسی میں بارود ذرا کم ڈالا کریں۔۔ میں جنت سے پچاس کلومیٹر آگے نکل گیا ہوں۔۔''

ابو الحسن نغمی کی کتاب

مجھے کیا خبر تھی کہ ایک روز میں جناب ابو الحسن نغمی سے رابطے میں آجاؤں گا۔ یہ انٹرنیٹ بھی عجب ایجاد ہے، درمیان میں حائل فاصلے ایسے مٹتے ہیں گویا تھے ہی نہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب نغمی صاحب کی خودنوشت 'یہ لاہور ہے' تازہ تازہ پڑھی تھی۔ نصف صدی سے زائد کا قصہ ہے جب انتظار حسین کی اپنے احباب کے ہمراہ محمد حسن عسکری سے پہلی ملاقات ہوئی۔ تعارف ہونے پر انتظار حسین نے عسکری سے پوچھا: آپ محمد حسن عسکری ہیں''۔۔جواب ملا 'جی'۔انتظار حسین کے دوستوں میں ایک صاحب نے کہ سعید بور کہلاتے تھے ،استعجاب کے عالم میں پہلے انتظار حسین کی جانب دیکھا اور پھر عسکری سے پوچھ بیٹھے: '' حرامجادی والے عسکری'' ؟

کچھ اسی طرح میں نے بھی نغمی صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ وہی ہیں نا۔۔۔'یہ لاہور ہے' والے نغمی صاحب ؟

عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے خد و خال ضرور تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن عموما اس

کی آواز ویسی ہی رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہونے والے موہنی حمید کے پروگرام کے 'بھائی جان' کی آواز آج بھی ویسی ہی ہے جیسی ان دنوں میں رہی ہوگی۔ آج بھی جب میری ان سے گفتگو ہوتی ہے، ان کی آواز کا اثر دیر گئے تک رہتا ہے۔ گھن گھرج والی، گہری عمیق آواز، تہذیب اور شائستگی کے رچاؤ کی حامل، خالصتاً ریڈیو کی آواز۔ لاہور سے نقل مکانی کے بعد ابوالحسن نغمی وائس آف امریکا واشنگٹن سے انٹرنیشنل براڈکاسٹر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ خالد حسن مرحوم نے ان، پر انگریزی میں مضمون لکھا تھا، اس کا عنوان تھا 'ایک لاہوری امریکہ میں' ، خالد حسن کہتے ہیں کہ لاہور نے ۱۹۷۲ میں ابوالحسن نغمی کو شہر بدر کیا لیکن لاہور خود کو ابوالحسن نغمی کے اندر سے نہ نکال سکا۔

جب میں نے 'یہ لاہور ہے' کے پس ورق نغمی صاحب کی تصویر پہلی مرتبہ دیکھی تو وہ تمام لوگ یاد آئے جو اپنے بڑھاپے کے خوشگوار ہونے کی دعا کیا کرتے تھے۔ اس خوشگوار بڑھاپے میں انھوں نے واشنگٹن میں اپنی رفیقۂ حیات یاسمین نغمی کے تعاون سے اردو کے عالمی ادارے ''انجمن ادب اردو'' کا سنگ بنیاد رکھا جس کا انگریزی نام سوسائٹی آف اردو لٹریچر'' ہے۔ متذکرہ انجمن کے ذریعے نغمی صاحب دیار غیر میں'' اردو زبان و ادب کی قندیل کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔

ایک روز یونہی تنہا بیٹھے غم جاناں کا حساب کرتے کرتے جناب ابوالحسن نغمی کو خیال آیا کہ زندگی کے سفر میں وہ بہت دور نکل آئے ہیں اور کیوں نہ اس شخص کی جلتی بجھتی یادوں کو صفحہ قرطاس پر یکجا کیا جائے جو آج بھی ان کے ذہن و قلب میں بشکل چراغ روشن ہے۔ دنیا جسے سعادت حسن منٹو کے نام سے جانتی ہے۔خدا سلامت رکھے ان کی پرانی ڈائریوں کو جو منٹو سے متعلق ان کی یادوں کو محفوظ کرنے کا سبب بنیں۔ کیا عجب اتفاق ہے کہ آج جب ادب کا ایک طالب علم یہ بے ربط سی تحریر سپرد قلم کررہا ہے، سعادت حسن منٹو کی پیدائش کو سو برس مکمل ہو چکے ہیں۔۱۸ جنوری ۱۹۵۵ کو منٹو کے انتقال کے روز تک، ابوالحسن نغمی کو منٹو کی زندگی کے آخری تین برسوں میں ان کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ زیر تذکرہ کتاب انہی دنوں کی روداد ہے۔ان دنوں کی روداد جن کے بارے میں ۱۹۸۴ میں عصمت چغتائی نے ابوالحسن نغمی سے کہا تھا'' اللہ ! وہی تین برس تو ان کی زندگی کے انتہائی دکھ بھرے دن تھے''۔۔۔ اس سے قبل اے حمید ہمیں اپنے مضامین کے ذریعے منٹو کے آخری ایام کی جھلک دکھا چکے ہیں، اسی طرح میں اسد اللہ غالب نے 'منٹو میرا دوست' کے عنوان سے ایک 'متنازعہ' کتاب ۱۹۵۵ لکھی تھی۔ لیکن زیر نظر کتاب کی اشاعت کے بعد مجھے یقین ہے کہ سنجیدہ ادب کا قاری قیام پاکستان کے بعد کے زمانے کے سعادت حسن منٹو کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو ایک نئے زاویے سے دیکھے گا۔

منٹو پر یہ کتاب لکھ کر جناب ابو الحسن نغمی نے اس عظیم افسانہ نگار کی یادوں کو ہمارے ذہنوں میں ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا ہے جو قیام پاکستان کے بعد معتوب ٹھہرایا گیا تھا، برصغیر پاک و ہند میں جس کے پانچ افسانوں پر فحاشی کے مقدمے چلے۔ ابو الحسن نغمی کی یہ مختصر سی کتاب ان یادوں کا احاطہ کرتی ہے جو منٹو کے تعلق سے یقیناً لاہور میں مقیم کئی مشاہیر ادب کے ذہنوں میں محفوظ ہوں گی اور جو انہیں صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کرکے ادب کے قاری کے ساتھ ظلم روا رکھے ہوئے ہیں۔

مکتبہ فرینکلن کے تحت کیے گئے تراجم ہوں، بچوں کے لیے لکھے ناول ہوں، مضامین و افسانے ہوں یا پھر یادداشتوں پر مبنی دو عدد کتابیں، ابو الحسن نغمی کی تحریر کا ایک خاص اسلوب ہے
جو قاری کو اپنے ہمراہ لے کر چلتا ہے لیکن زیر نظر کتاب کو انہوں نے کسی اور ہی ڈھنگ سے لکھا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دنوں کی جھلک دکھانے والوں نے عموماً ان میں
موجود چند ایسی بشری کمزوریوں کو پیش کیا ہے جن کے سامنے منٹو نے بظاہر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لیکن ابو الحسن نغمی نے ایسی تمام باتوں سے پہلو بچاتے

ہوئے ایک ایسے شخص کے آخری ایام کی تصویر کشی کی ہے جو ایک عادی شرابی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وفا شعار بیوی کا شوہر اور تین پیاری بچیوں کا باپ بھی تھا۔اپنی طلب پوری کرنے کے لیے لوگوں سے پیسے مانگنے والا، دہشت پسند، فحش نگار، سُکی سعادت حسن منٹو جس نے ابوالحسن نغمی سے اتنے برس کے تعلق کے دوران صرف ایک مرتبہ پانچ روپے مانگے تھے۔جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ اپنے شناساؤں کو شراب کا عادی بنانے کی کوشش اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد اس کی ضرورت پوری کرسکیں لیکن اسی منٹو نے نوجوان ابوالحسن نغمی سے ایسا کوئی تقاضہ نہیں کیا۔ تکیہ کلام کے طور پر فحش الفاظ کا فراوانی سے استعمال کرنے والے بزرگ ادیبوں و شاعروں کے برخلاف، ابوالحسن نغمی نے منٹو کی زبان سے اپنی ان گنت ملاقاتوں کے دوران کوئی فحش کلمہ نہ سنا۔ ابوالحسن نغمی اس افسوسناک موقعوں کے بھی گواہ ہیں جب منٹو کے دوستِ بلانوش شاد امرتسری نے ایک سے زائد مرتبہ لاہور کے ریگل چوک پر کالج کے طلبہ اور دیگر راہگیروں کو جمع کرکے سعادت حسن منٹو سے بھیک منگوائی۔ کیا عجب ستم ظریفی ہے کہ اسی لاہور شہر میں اب سے چند ماہ قبل دھوم دھام سے زر کثیر صرف کرکے منٹو کی صد سالہ تقریبات کا انعقاد کیا تھا۔

ابوالحسن نغمی نے زیر تبصرہ کتاب کا انتساب صفیہ منٹو کے نام ان الفاظ میں

کیا ہے ”اپنی لائق صد احترام بھابھی صفیہ منٹو کے نام جن کی معصوم روح یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئی ہو گی ع۔۔۔چمن میں آئے گی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے“۔

کتاب میں سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے مختصر تبصرے کے علاوہ دختر منٹو، نزہت منٹو ارشد کا تعارفی مضمون ”بھائی جان نغمی“ بھی شامل ہے۔ نزہت لکھتی ہیں ” بھائی جان نغمی ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر امریکا چلے گئے لیکن یہ ابا جان سے وابستہ یادوں کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ کبھی واشنگٹن کی اردو انجمنوں کے اجلاس میں تو کبھی روزنامہ مشرق لاہور میں قسط وار ابا جان کے بارے میں مضامین لکھتے رہے۔ میری طرح ان کا حافظہ بھی بہت اچھا ہے۔ بھائی جان نغمی نے ایک اچھا شغل یہ اختیار کیا کہ تمام عمر اپنی ذاتی ڈائریاں لکھتے رہے۔ منگل، ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ کو ابا جان کا انتقال ہوا، اس دن کی ڈائری انھوں نے مجھے دکھائی تو میں اشکبار ہو گئی۔ “

کتاب کے آخر میں ابو الحسن نغمی ایک معصوم سی خواہش کا اظہار کرتے ہیں جو مجھے اس لیے بھی جذباتی کر دیتی ہے کہ میں بھی اپنے محبوب مصنف جناب ابن صفی کے بارے میں یہی سوچا کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ” جب میں امریکا کی سڑکوں

پر ڈرائیونگ کرتا ہوں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کاش آپ (منٹو) اس وقت میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوتے۔ میری مسرتوں کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ کاش میں سو جتن کرکے آپ کو اپنے ساتھ امریکا لے آتا۔ یہاں آپ کا علاج ہوتا۔ آپ اچھے ہوجاتے۔ سال میں کئی مرتبہ اخباروں میں ایسے لوگوں کے احوال اور تصویریں شائع ہوتی ہیں جو سو سال کی عمر میں معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب میں ایسی خبریں پڑھتا ہوں تو آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہ تھا کہ آپ اپنی بقیہ عمر امریکا میں گزارتے اور اب کے برس ۲۰۱۲ء میں مئی کی گیارہویں تاریخ کو امریکا میں آپ کی صد سالہ سالگرہ منائی جاتی۔"

ابوالحسن نغمی کے منٹو صاحب اس وقت انتقال کرگئے تھے جب نغمی صاحب لاہور سے باہر تھے۔ منٹو صاحب میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: "جب مجھے منٹو صاحب یاد آتے ہیں تو جنوری کی وہ شام بھی یاد آتی ہے جب میں منٹو صاحب کے سالے خواجہ ظہیر الدین سے تعزیت کرکے اپنے دوست فاروق کے ساتھ لکشمی مینشنز سے نکلا تو مجھے اپنا دکھ کچھ یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں آج کسی عدالتِ عالیہ سے اپنا مقدمہ ہار کر باہر نکلا ہوں۔" "سعادت حسن منٹو۔ ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق" لکھ کر ابوالحسن نغمی نے وہ ہارا ہوا مقدمہ دوبارہ جیت لیا ہے۔

نقی صاحب ! آپ نے اس کتاب کا عنوان '' سعادت حسن منٹو۔ذاتی یاداشتوں پر مبنی اوراق'' تجویز کیا ہے۔ یہ اسی نام سے شائع ہوئی ہے، اسی نام سے پہچانی جائے گی لیکن نہ جانے کیوں آپ کی خودنوشت 'یہ لاہور ہے' کے مطالعے کے بعد ان سطور کا راقم اس کتاب کو 'یہ منٹو ہے' کے نام سے یاد رکھنا زیادہ پسند کرے گا۔

سوگ میں ہے فسانہ گوئی آج اس کا وہ بانکپن ہوا رخصت
''ہر زباں پہ ہے اب یہ فسانہ کہ'' سعادت حسن ہوا رخصت
(حفیظ ہوشیار پوری) ------------------

۱۹۵۵ ء

صفیہ صدیقی۔ بوئے گل سو گئی

کسے خبر تھی کہ آج زیر نظر مضمون کا عنوان وہی منتخب کیا جائے گا جو صفیہ صدیقی کے اس مضمون کا تھا جو انہوں نے اپنے بہنوئی اور سری ادب کے نامور مصنف ابن صفی پر لکھا تھا۔ صفیہ صدیقی کہ اردو کی دور افتادہ بستیوں کو بسانے والوں کی سرخیل سمجھی جاتی تھیں، 28 نومبر 2012 کی شام لندن میں انتقال کر گئیں۔ وہ طویل عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھیں۔ افسانہ و ناول نگار کی حیثیت سے انہوں نے اردو ادب میں ایک الگ مقام حاصل کیا تھا۔ صفیہ صدیقی کا آبائی تعلق محلّہ مولویانہ، قصبہ نگرام ضلع لکھنؤ سے تھا جہاں وہ یکم جنوری 1935 کو پیدا ہوئی تھیں۔ وہ گزشتہ کئی دہائیوں سے لندن میں مقیم تھیں۔ان کے والد کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب وہ سات برس کی تھیں، بعد ازاں وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ اپنے نانا کے پاس رائے بریلی چلی گئیں جہاں انہوں نے پانچ برس قیام کیا۔ 1947 میں ہونے والی اسکول کی چھٹیوں میں وہ بشمول اہل خانہ اپنی خالہ کے پاس شملہ گئی ہوئی تھیں کہ اسی اثناء میں تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور تمام لوگ افراتفری میں پہلے کالکا کیمپ اور پھر والٹن کیمپ لاہور پہنچے اور وہاں سے راولپنڈی رخ کیا۔ صفیہ صدیقی لندن میں روزنامہ جنگ کے 1971 میں اجراء ہی سے اس سے وابستہ ہو گئی

تھیں جہاں سے انہوں نے 1982 میں خرابی صحت کے باعث استعفی دے دیا تھا۔ صفیہ صدیقی نے انگریزی سے تراجم کیے، افسانے لکھے، ناول لکھے، کالم نویسی کی، انٹرویو کیے اور متفرق مضامین تحریر کیے۔ بریڈ فورڈ کے ہفتہ وار اخبار 'راوی' سے منسلک رہیں۔ غرضیکہ ہر صنف ادب میں اپنی موجودگی کا قوی احساس دلایا۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے اور ایک ناول (وادی غربت میں) شائع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام یہ ہیں: پہلی نسل کا گناہ، چاند کی تلاش، چھوٹی سی بات، بدلتے زمانے، بکھرتے لوگ۔ صفیہ صدیقی نے ''اردو اینڈ آئیر'' کے عنوان سے لکھے گئے رالف رسل کے ایک طویل مضمون کو اردو کے قالب میں ''یاداشتیں'' کے عنوان سے ڈھالا جو 2002 میں کراچی کے مجلے 'آج' میں شائع ہوا تھا۔ لکھنؤ سے تعلق ہونے کے سبب انہیں زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔ افسانہ نگاری میں وہ ایک جداگانہ مقام رکھتی تھیں اور ان کے افسانوں آغاز تا انجام اچھوتے اور چونکا دینے والے ہوا کرتے تھے۔

ایک طویل عرصہ لندن میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے صفیہ صدیقی کے اظہار بیان میں صاف گوئی اور بے باکی کے عناصر عود کر آئے تھے۔ مغربی معاشرے کا گھناؤنا چہرہ قارئین کے سامنے عیاں کرنے میں انہیں کبھی کوئی جھجھک مانع نہ رہی اور وہ وقتاً فوقتاً اپنی کہانیوں میں اس کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ زندگی کروٹ بدلتی ہے، اور سمندر رونے لگا، فیصلہ، ایک اور موت، منزل، چھوٹی سی بات، خواب سی زندگی، کب در زنداں کھلتا ہے، سوز غم ہائے نہانی ان کے چند عمدہ

افسانے ہیں۔بریڈ فورڈ سے جناب مقصود الٰہی شیخ کی زیر ادارت دس برس تک سے شائع ہونے والے ادبی مجلے ''مخزن'' میں ان کے افسانے مستقل شائع ہوتے رہے تھے۔صفیہ صدیقی لیوٹن کے رسالے سہ ماہی سفیر اردو اور لندن کے رسالے ماہنامہ پرواز کی بھی مستقل قلمکار تھیں۔پروفیسر ممتاز احمد خان نے صفیہ صدیقی پر اپنے تبصرے میں کہا تھا: '' صفیہ کا اسلوب سادہ مگر صاف و شفاف ہنر مندی سے عبارت ہے۔'' ۔ معروف افسانہ نگار محترمہ اصغرا اصغر نے کہا تھا: ''برطانوی پیش منظر میں صفیہ صدیقی نے مشرقی جذبوں کی کہانیاں قلم بند کی ہیں۔غیر معمولی جذباتیت سے گریز کرنے کے باوجود ''فیصلہ'' اور ''ایک اور موت'' قاری کے جذبات میں ہلچل مچاتی ہیں اور دیر تک گرفت میں رکھتی ہیں۔'' ۔ڈاکٹر انور سدید صفیہ صدیقی کے بارے میں کہتے ہیں '' صفیہ صدیقی کی کہانیوں میں وہ عورت بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کی جڑیں اپنے وطن کی سرزمین میں گہری اتری ہوئی ہیں۔اپنے ماں باپ اور دھرتی سے کٹی ہوئی یہ عورت اولاد، بیوی اور پھر اپنے بچوں کی ماں ہے۔خوبصورت مکان کا حصول اس کی عزیز ترین خواہش ہے۔'وارمنگ پارٹیوں' میں شرکت اس کی دلچسپی کا ایک زاویہ ہے لیکن یہ زاویہ اس وقت غیر اہم ہوجاتا ہے جب اس کی بیٹی جوان ہوجاتی ہے اور حریص نظروں میں گھِر جانا ماں کو کسی طرح قبول نہیں ہوتا۔''

پروفیسر رالف رسل صفیہ صدیقی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں صفیہ صدیقی کو عرصے سے جانتا ہوں لیکن مجھے ان کی تحریروں کے بارے میں ''
تین چار سال قبل اس وقت علم ہوا جب میں نے ان کا افسانہ ''کمیونٹی لیڈر'' پڑھا۔ اس افسانے نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ برطانیہ میں بسنے والے پاکستانیوں کے رویہ اور انداز فکر میں جو خوب و ناخوب تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان کو صفیہ صدیقی نے اس افسانے میں نہایت سچائی سے، بڑے دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے صفیہ صدیقی کے تقریبا تمام افسانوں کو پڑھا ہے اور ان کی بہترین تحریریں ان خوبیوں سے مزین ہیں۔ ''

اپنے بارے میں ایک مختصر سوانحی مضمون میں صفیہ صدیقی کا انداز بیاں ملاحظہ ہو۔

راقم الحروف سے رابطے اور ای میلیز کے تبادلے میں بھی ان کی اپنے وطن سے محبت لفظ لفظ سے عیاں ہوا کرتی تھی :

مجھے اس وقت فیض صاحب کا ایک مصرعہ یاد آ رہا ہے، خدا جانے''
کیوں۔۔۔۔ع۔۔۔ میرے درد کو جو بیاں ملے مجھے اپنا نام و نشاں ملے
اب آپ فرمائیں گے کہ آپ کو کیا دُکھ ہے، انگلستان میں بیٹھی ہیں اور مزے سے زندگی گزار رہی ہیں، نہ لوڈ شیڈنگ ہے نہ چینی کی قلت، اور نہ اپنے بھائی بند کے کلاشنکوف اور بم سے خود کو سجائے بنائے، جنت میں جانے کی شدید خواہش سے

بیتاب آس پاس پائے جانے کاڈر ہے، مگر ان کو معلوم نہیں کہ وہ جو گھر تباہ.برباد کر رہے ہیں اور معصوم اور بے گناہ جانیں لے رہے ہیں وہ بے گناہ تو جنت پہنچ جائیں گے مگر یہ خود دروازے پیٹتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ جو وطن کی فکر اور تردد ہماری زندگی میں در آیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ ''

صفیہ صدیقی کے ایک یادگار افسانے '' چھوٹی سی بات '' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو کہ اس میں تارکین وطن کو درپیش مصائب اور ان کی سوچ کا ذکر ایک علاحدہ ڈھنگ سے کیا گیا ہے:

'' میرے دل میں درد کا طوفان اٹھ رہا تھا، مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا، وہ اندھیری شامیں اور بچوں کی اسکول سے واپسی۔ سرد کمروں کی آغوش میں انھیں اپنی ماں کی ضرورت تھی۔ماں کی توجہ کی ،دیکھ بھال کی۔شاید میں نے غلط فیصلہ کیا تھا۔مجھے اپنے بچوں کو محبت اور ذہنی آسودگی پہنچانے کی ضرورت تھی۔پیسوں کی کمی کے باوجود گزر ہو ہی جاتی مگر اس وقت تو ہمیں بچوں کو بہتر معیار زندگی مہیا نہ کر سکنے کا غم رہتا تھا۔ بہتر زندگی ہی کے لیے تو یہ تکلیفیں اٹھائی ہیں، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔اب تو وقت مٹھی سے نکل چکا ہے۔ وقت کی ریت تو کب کی مٹھیوں سے نکل چکی ہے، وہ کب ٹھہرتی ہے۔ہم نے اپنے لحاظ سے تو بچوں کے لیے اتنی قربانیاں دیں۔ کبھی اپنے متعلق نہیں سوچا۔کپڑے لتے، گھومنا پھرنا، سینما تھیٹر۔ساری آرزوئیں دل میں دفن ہو گئیں۔ ساری

رنگینیاں اسی لندن شہر میں موجود تھیں مگر ہم ان سے بے نیاز محنت اور مشقت کے اندھیروں میں زندگی گزارتے رہے اور آج وہی کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ان کو جذباتی محرومیاں دیں۔ کمینے کہیں کے۔ آج ان کے پاس ساری آسائشیں ہیں۔ انہیں ہماری تکالیف کا کیا اندازہ۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم نے نسلی تعصب کے نام پر کتنی ذلتیں سہیں، کتنی توہین برداشت کی، دل ہی دل میں کڑھتے رہے، جلتے رہے اور بچوں کی خاطر سب کچھ سہہ گئے۔ اپنی انا، اپنی عزت نفس، خودداری۔ سب کو دبا کر زندگی کا ایک مقصد بنا لیا تھا کہ بچوں کو بہتر تعلیم اور معیار زندگی مہیا کرنا ہے۔ "

راقم الحروف کے ای میل ریکارڈ میں صفیہ صاحبہ کے کئی پیغامات آج بھی محفوظ ہیں۔

24 نومبر 2011 کو ارسال کردہ ایک پیغام میں وہ رقمطراز ہیں:

" ابھی آپ کی بھیجی ہوئی میل دیکھی اور پڑھی، اور ان تصویروں میں میرے بھائی جان کی بھی ایک تصویر تھی کافی پرانی، بہت خوشی ہوئی، آپ کو شاید معلوم نہیں کہ مکین احسن کلیم میرے بڑے بھائی تھے، وہ لاہور میں تھے جب ان کا انتقال ہوا۔ قیصر تمکین صاحب نے خبر گیر میں ان کا تذکرہ کیا ہے، یہ کتاب میرے پاس ہے، جب انھیں معلوم ہوا کہ میں ان کی بہن ہوں تو تمکین صاحب میرا بہت خیال کرنے لگے تھے، وہ کوئی 14 یا 15 برس کے رہے ہوں گے جب وہ قومی آواز میں پارٹ ٹائم کام کیا کرتے تھے وہیں بھائی جان سے ملاقات ہوئی

'' تھی۔

واضح رہے کہ 15 نومبر 1923 کو محمود آباد، ہندوستان میں پیدا ہونے والے ترقی پسند ادیب و صحافی مکین احسن کلیم لاہور میں 11 دسمبر 1976 کو انتقال کر گئے تھے۔ مکین صاحب کا ذکر معروف ہندوستانی افسانہ و ناول نگار آنجہانی رام لعل کی خودنوشت کوچہ قاتل''، قیصر تمکین علوی کی خودنوشت ''خبر گیر'' اور اے جی خان کی خودنوشت '' یادوں کا سفر'' میں موجود ہے۔ مکین صاحب کا ڈاکٹر عبادت بریلوی پر لکھا ایک عمدہ'' مضمون 1956 میں نقوش کے شخصیت نمبر میں شائع ہوا تھا۔

:ادیب و افسانہ نگار تسلیم الہی زلفی لکھتے ہیں

آپ صفیہ صدیقی کے تمام افسانے پڑھ جایئے بلاشبہ ان میں واقعات، افراد، قصے اور'' اسلوب کے اعتبار سے نمایاں فرق محسوس ہوگا، پر وہ انداز جس سے وہ زندگی دیکھتی ہیں، کسی زنجیر کی طرح ابتداء سے انتہا تک چلا گیا ہے، اور ان کا یہ انداز ہی ان کے بیان کئے ہوئے ہر واقعے کو کسی نہ کسی بنا پر سماج کی اجتماعی زندگی سے وابستہ کر دیتا ہے اور ان اثرات کو واضح کرتا ہے جو اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے مرتب ہوتے ہیں، لہذا ثابت یہ ہوا کہ صفیہ کا کردار اپنے ماحول اور معاشرے سے الگ نہیں بلکہ سماج کا ایک جزو ہے اور وقت

کے تقاضوں کے زیر اثر جو بھی تبدیلی سماج کے باطن کو متاثر کرتی ہے اس سے سماج کا یہ جز و متاثر ہوتا ہے۔ صفیہ صدیقی اس زاویہ نگاہ سے اپنے ہر کردار کو پرکھنے کے بعد اپنے افسانے میں شامل کرتی ہیں۔ ''

زیر نظر مضمون کے آغاز میں صفیہ صدیقی کے ابن صفی پر لکھے مضمون کا ذکر آیا تھا۔ تین دہائیوں قبل لکھے متذکرہ مضمون کو صفیہ صدیقی نے حقیقت پسندی پر مبنی جن الفاظ میں سمیٹتے ہوئے اختتام پذیر کیا تھا، آج انہی کو دوہراتے ہوئے ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کے طلبگار ہیں:

''ہم سب کو معلوم ہے کہ موت سے کسی کو رُستگاری نہیں آگے پیچھے سب کو جانا ہے یہ دنیاوی جھمیلے، یہ محبتیں، یہ رشتے ناتے سب فانی ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خود جواب دہ ہوگا لیکن سب جانتے ہوئے اور ان پر ایمان رکھتے ہوئے بھی ہم جانے والوں کے لیے کیوں روتے ہیں؟ کیا یہ ہمارے ایمان کی کمزوری ہے۔ خداوند عزوجل ہم سب کو ایمان کی قوت عطا فرمائے تاکہ ہم اس کے احکام کی تعمیل میں انسانی کمزوریوں پر قابو پا سکیں اور اس کے فیصلوں کو بسر د چشم رونے دھوئے قبول کرلیں۔ آمین۔ ''

ساحر لدھیانوی۔ ایک سرکش سے محبت کی تمنا

ساحر لدھیانوی محبت کے آدمی تھے۔ سرحد کے اِدھر بھی اور سرحد کے اُدھر بھی...... جو دیکھتا تھا، ساحر کے سحر میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ شخصیت کا سحر تھا، سرکشی کا یا شاعری کا، خدا جانے لیکن تھا جان لیوا.... لیکن ساحر کے لیے نہیں، بلکہ ان کے جادو سے گھائل ہو جانے والوں کے لیے۔ ذرا نام بھی تو دیکھیے کہ کیسے کیسے قد آور لوگوں کے آتے ہیں۔ ہاجرہ مسرور (م: ۱۵ ستمبر ۲۰۱۲) بھی خود کو نہ روک پائی تھیں۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں بمبئی کے اخبارات میں ان کی ہاجرہ مسرور سے منگنی کی خبر کی اشاعت کا تذکرہ حمید اختر (م: ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۱) نے اپنے خاکے 'بنے بھائی' میں کیا ہے۔ لیکن ساحر ہی تھے جو بھاگ نکلے تھے۔ بنے بھائی کہ بقول حمید اختر سراپا جمال ہی جمال، انکسار ہی انکسار، لکھنؤ کی تہذیب کا نمونہ، ساحر کو ہاجرہ مسرور سے شادی پر آمادہ کرنے میں ایسے الجھے کہ خود کو الجھا بیٹھے اور ان کی پریشانی اس وقت دو چند ہوئی جب ہاجرہ مسرور کی بہنیں عائشہ جمال اور خدیجہ مستور ان سے ساحر کی شکایت کرنے آ دھمکیں۔ ساحر کے اس رویے کی وجہ سے بنے بھائی کو ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ کھائے جاتا تھا۔ مگر یہ کوئی پہلا موقع تو تھا نہیں۔ حمید اختر کے مطابق اس سے قبل امرتا پریتم، لتا منگیشکر اور سدھا ملہوترہ .... سب ساحر کی ساحری

کے اسیر رہ چکے تھے۔۔۔ خالصہ اسکول لدھیانہ کی ایشر کور تو ماضی کا قصہ بن چکی تھی...... ساحر کی پہلی محبت ۔۔۔۔ سدھا ملہوترہ سے معاملہ ختم ہوا تو ایک فلمی اخبار نے تبصرہ کیا تھا کہ ساحر کو اپنے نام کے ساتھ اسکینڈل بنانے کا شوق ہے۔وہ محبت کا کھیل کھیلتے ہیں اور جب تعلقات کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو خود ہی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

ایک برس ہوا جب لاہور کے ماہنامہ الحمراء میں کراچی سے تعلق رکھنے والے ادیب و مترجم قاضی اختر جوناگڑھی کا ایک مضمون شائع ہوا۔ قاضی صاحب لاہور گئے تھے اور حمید اختر سے ساحر لدھیانوی اور ہاجرہ مسرور کی منگنی ختم ہونے کا سبب کھوج لائے تھے...... لکھتے ہیں:

اردو زبان کی ایک معروف افسانہ نگار کی جوان دنوں ممبئی ہی میں مقیم تھیں، منگنی ” ساحر لدھیانوی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ساحر کو ایک ایسے مشاعرے میں شریک ہو کر اپنی شہرہ آفاق نظم تاج محل سنانا تھی جس میں جوش ملیح آبادی بھی شرکت کرنے والے تھے جو الفاظ کے غلط تلفظ کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔چونکہ ساحر لدھیانوی اہل زبان نہیں تھے لہٰذا انہوں نے اپنی نظم تاج محل میں استعمال کیے گئے لفظ ''مقابر'' کے صحیح اور درست تلفظ کے بارے میں ان خاتون سے رائے طلب کی۔ انہوں نے بتایا کہ صحیح تلفظ ''مقابِر'' یعنی ''ب'' کے نیچے زیر آئے گا۔ گویا یہ مصرعہ یوں ہو جائے گا:

مردہ شاہوں کے مقابر سے

بھلنے والی.....جوش صاحب نے ساحر کو جو ملاحیاں سنائی ہوں گی، ان کا اندازہ آپ اسے واقعے سے لگا سکتے ہیں کہ اس نے فی الفور ان خاتون سے اپنی منگنی کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔"

خیر ہاجرہ مسرور کا یہ معاملہ تو ساحر لدھیانوی کی افتاد طبع کے باعث ختم ہوا لیکن پھر امرتا پریم کو کیا کہیے کہ شادی تو امروز سے کی اور وہی امروز، سلیم پاشا کو ایک ملاقات میں بتاتے ہیں کہ " یہ جانتے ہوئے بھی کہ امرتا ساحر سے پیار کرتی ہے، میں امرتا سے پیار کرتا ہوں۔ میں اسے اسکوٹر پر بٹھا کر اسٹوڈیو لے جاتا تو وہ میرے پیچھے بیٹھی میری کمر پر ساحر ساحر لکھتی رہتی۔" ....امرتا نے "یادوں کے لمس" میں اپنے محبوب کو کچھ ان الفاظ میں یاد کیا تھا:

" یہی وہ چہرہ تھا جس نے میرے اندر انسانیت کی وہ جوت جگائی کہ ملک کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہو کر بھی جب میں اس حادثے کے بارے میں قلم اٹھایا تو دونوں گروہوں کی زیادتیاں بغیر کسی رعایت یا ہزر ویشین کے قلمبند کر سکی۔"

اسی امرتا پریتم نے ساحر کی موت کی خبر سن کر قلم اٹھایا اور اسے یوں خراج تحسین پیش کیا تھا:

یار بدنیت یا
تم نے تو یار ہمارے ساتھ بدنیتی کر دی
ہم نے تو تیرے نام پر دنیا کے لاکھوں الزام لیے
اور آج تم ہی دغا کر رہے ہو
یار بدنیت یا
چلو جہاں چلوگے ہم ساتھ چلیں گے
اگر موت کے ریگستان سے بھی گزرنا ہوگا تو گزریں گے

☆

نریش کمار شاد (م: ۱۹۶۹) کو دیے ایک انٹرویو میں ساحر نے ایک قہقہے کے ساتھ شادی نہ کرنے کے سوال کے جواب میں کہا تھا ''کچھ لڑکیاں مجھ تک دیر میں پہنچیں اور کچھ لڑکیوں تک میں دیر میں پہنچا''۔بقول کیفی اعظمی '' شادیاں ان پر منڈلائیں، منڈلاتی رہیں اور منڈلا کے رہ گئیں مگر ساحر ہر مرتبہ بچ نکلے''۔
لدھیانہ کے ایک زمیندار گھرانے میں عبدالحئی کے نام سے پیدا ہونے والا ساحر لدھیانوی، نجی زندگی میں نہایت شرمیلا اور بزدل انسان تھا۔ اتنا کم ہمت کہ اس میں لاہور کے ناشر چودھری نذیر سے اپنی کتاب 'تلخیاں' کی بقایا رقم مانگنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ یہ کام بھی اس کے عزیز دوست اے حمید (م :

اپریل ۲۰۱۱) ہی کو کرنا پڑا تھا۔ غرض پوری ہوئی تو دوستوں کا یہ ٹولہ انارکلی میں ۲۹ واقع ممتاز ہوٹل میں چائے اور پیسٹری کھانے جا پہنچا جو ان دنوں ایک عیاشی تصور کی جاتی تھی۔ وہ زمانہ بھی خوب تھا، ممبئی کی زبان میں کہیے تو سب دوست کڑکے ہوتے تھے۔ان سبھوں کی ایک رات ایسے ہی کٹی تھی.... مانگے کے سگرٹوں پر گزرا کرتے۔ مفلسی نے سبھوں کو دبوچا ہوا تھا لیکن حوصلے جوان تھے۔ رات کے آخر ہوتے ہوتے سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ پو پھٹے، ساحر نے اے حمید کے سامنے یہ حسین' راز عیاں کیا کہ اس کے پاس دو روپے ہیں۔ سالم دو روپے۔ دونوں دوستوں' نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا جہاں چائے اور سگرٹ، دونوں ہی کا بندوبست تھا۔ اے حمید لاہور کے ان یادگار دنوں کا کیا خوب نقشہ بیان کرتے ہیں ''ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والا بھوت گھر الاٹ ہوگیا تھا۔اس کا کمرہ نچلی منزل پر تھا۔بلڈنگ خستہ حال تھی۔دیواروں کا چونا گر رہا تھا۔ اونچی چھت میں جالے لٹکے تھے۔ غسل خانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تھی۔ نلکے کی ٹوٹی سے ہر وقت پانی گرتا رہتا تھا۔ اس جگہ کھڑکی میں ٹوٹا ہوا شیشہ رکھ کر ساحر لدھیانوی شیو بنایا کرتا تھا۔ روشن دان میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس عمارت کے آگے ایک لان تھا جس میں جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ ....''

کیسے خوش نما دن تھے وہ.... جیبیں خالی لیکن حوصلے جواں۔ اور جب ساحر

لدھیانوی کو فلمی دنیا سے وابستگی کے بعد سب کچھ مل گیا تب کیا اس بے چین روح کو قرار آیا تھا؟ حمید اختر اپنے ہمدم دیرینہ ساحر لدھیانوی سے اس کے عروج کے دنوں میں ملنے گئے تھے گرچہ کئی لوگوں نے انہیں وہاں جانے سے منع کیا تھا، کہا تھا کہ ساحر لدھیانوی بدل گیا ہے۔ان میں علی سردار جعفری بھی تھے جنھوں نے حمید اختر سے کہا تھا کہ ''ساحر کے یہاں ٹھہروگے تو تکلیف میں رہوگے کیونکہ ساحر وہ نہیں رہا جو ۱۹۴۸ ء میں تم لوگوں کو چھوڑ کر گیا تھا''۔لیکن حمید اختر کے دل کو قرار کیسے آتا۔ یہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ کی صبح تھی جب حمید اختر ساحر کے گھر پہنچے تھے۔ وہ غیر شادی شدہ زندگی بسر کر رہا تھا..... دولت میں کھیل رہا تھا........ برملا کہتا تھا کہ '' جارج برنارڈشا کو تو ایک لفظ کا صرف ایک پاؤنڈ ہی ملتا تھا، میں نے تو ایک ایک گیت کے پانچ ہزار سے دس ہزار لیے ہیں۔''

ساحر لدھیانوی کو دیکھ کر حمید اختر کو خوشی نہیں ہوئی۔وہ انہیں بدلا ہوا نہیں لگا بلکہ ٹوٹا ہوا دکھائی دیا۔حمید اختر بیان کرتے ہیں '' بیماری نے اس کے خوف میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔اس کا بیڈ روم دور ایک کونے میں تھا۔وہ سونے کے لیے جاتا تو اسے یہ خیال پریشان کرتا کہ رات کو دل کا دورہ پڑا تو یہاں سے کسی تک اس کی آواز نہیں پہنچے گی۔ اسے سفر کرنا پڑتا تو ئی دو گاڑیوں میں ہوتا۔اسے ہفتوں کہیں نہیں جانا ہوتا تھا مگر ڈرائیور کو حکم

تھا کہ وردی پہن کر صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر آ جائے۔ شاید ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت پڑ جائے۔ دن بھر وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں کھول کر خلا میں تکتا رہتا جیسے اسے گمشدہ کڑی (کی تلاش ہو۔'' (بنجارہ۔ حمید اختر

ساحر بمبئ میں کئی منزلہ عمارت کا مالک تھا۔ پرچھائیاں...... جو اسی کے ایک مجموعے کا عنوان تھا۔ اسی عنوان پر عمارت کا نام رکھا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بات خود :اس کے اس بیان کے برخلاف تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بات یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی

ساحر کی غیر یقینی طبعیت ومزاج کے بارے میں ندا فاضلی بھی 'حتمی' بیان دے چکے تھے: '' ماضی کی تلخ یادوں نے انہیں کسی حد تک sadist بنا دیا ہے۔ دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہہ کر اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر کے بے مقصد چکر کٹوا کر انہیں اب سکون بھی ملتا ہے۔ ساحر کے پاس جو بھی کسی کام کے لیے جاتا ہے، کبھی مایوس نہیں لوٹتا مگر جھوٹے وعدے کرنا اور مہینوں دوسروں کو ان میں الجھائے رکھنا ان کی مخصوص ہابی بھی ہے۔ ان بے مقصد چکر کاٹنے والوں کی مجبوریوں سے وہ نئے نئے لطیفے تراش کر اپنی شام کی محفلوں کو بھی رنگین بناتے ہیں۔ ساحر کو اپنے ہاتھ سے پیسہ دینے میں مزہ آتا ہے

لیکن اگر کہیں کسی کا روزگار لگ رہا ہو تو اس میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لطف کو وہ کبھی ''ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

ایک طرف یہ رویہ بیان کیا گیا ہے لیکن دوسری جانب اس کے عہد شباب کے دوست ابراہیم جلیس کا بیان بھی مد نظر رہنا چاہیے ۔ جلیس اگست ۱۹۶۰ء میں ساحر سے ملنے بمبئی گئے۔ بیان کرتے ہیں :

وہ ساحر لدھیانوی جو بمبئی کے فیشن ایبل علاقے وارڈن روڈ کے تفریحی ساحل پر بیچ '' کینڈی اسکینڈل پوائنٹ کے سامنے پارسیوں کی ایک پرانی وضع کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا اور لال پارک میں بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتا تھا اب وہی ساحر لدھیانوی اندھیری کے ایک شاندار بنگلے میں رہتا ہے۔ وہ اب ہندوستان کا امیر ترین شاعر ہے لیکن اس کے باوجود اس نے غریب عوام سے اپنے اٹوٹ رشتے کو فراموش نہیں کیا ہے اور اب بھی اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ علمی، ادبی اور عوامی اداروں کے لیے وقف ہے۔'' (عبدالحیٔ سے....)

لیکن کیا یہ کیفیت اس دنیا میں بسنے والے انسان کے لیے کوئی نئی بات ہے ؟ بچپن کی نفسیاتی الجھنوں کا اثر زندگی میں آگے چل کر بعض اوقات شخصیت پر عجب خوفناک طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ ۔۔انسان جو بیک وقت تضادات کا

مجموعہ ہے۔۔۔اپنے اندر تنہائی کا بوجھ اٹھائے ....روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا.....شہرت ، دولت، عزت.... یہ تمام چیزیں تو پائدار نہیں ہیں لیکن ساحر لدھیانوی کے یار عزیز حمید اختر اس بات پر مطمعٔن تھے کہ ان کے دوست سے زندگی کے نشیب و فراز میں ایک چیز کوئی نہ چھین سکا...اپنے فن سے اس کا خلوص۔

اس نے صاف سیدھی زبان میں ملک کے کروڑوں عوام سے جو مکالمہ اٹھارہ برس کی عمر میں شروع کیا تھا، وہ ساٹھ برس کی عمر تک اسی شد و مد سے جاری رہا۔ وہ لکھتا رہا لوگوں کے لیے، بہتر مستقبل کے لیے، امن اور خوشحالی کے لیے۔اس نے فلمی شاعری کو ایک نیا حسن اور نئی جہت دی مگر وہ اپنے اصل کام، تخلیق کے عمل کو نہیں بھولا اور اس نے محبت ، مسرت اور امن کے گیت گانے بند نہیں کیے۔'' (حمید اختر)

حمید اختر ساحر کے وہ دوست تھے جن کی ہم نشینی میں لدھیانہ میں ساحر نے یادگار دن گزارے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں دونوں کی آخری ملاقات ہوئی تھی، اس کے بہت برسوں بعد دسمبر ۱۹۷۸ میں حمید اختر بمبئی اپنے دوست سے ملنے گئے اور پھر اپنی وفات تک ساحر کو موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں لکھے گئے اپنے کالمز میں تواتر کے ساتھ یاد کرتے رہے۔

حمید اختر پاکستان میں ساحر پر اتھارٹی

مانے جاتے تھے۔ ۱۹۴۶ میں دونوں لدھیانہ سے اکھٹے بمبئی اپنی قسمت آزمانے گئے تھے۔ ساحر کی پہلی فلم 'آزادی کی راہ پر' تھی جس کے گانے اس نے لکھے جبکہ مکالمے لکھنے والوں میں ہاجرہ مسرور، حمید اختر اور ابراہیم جلیس شامل تھے۔ حمید اختر اپنے کالم میں لکھتے ہیں " وہ بہت دبلا پتلا بلکہ کمزور قسم کا نوجوان تھا۔ البتہ اس کا قد تقریباً چھ فٹ تھا۔ سفید پتلون قمیض اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ پاؤں میں وہ انگوٹھے والی چپل پہننے کو ترجیح دیتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں اسے اپنے بدشکل ہونے کا بہت احساس رہتا تھا۔ حالانکہ وہ اگر خوبصورت نہیں تھا تو بدصورت بھی ہرگز نہیں تھا۔ چہرے پر چیچک کے بہت ہلکے سے داغ تھے جو بہت غور سے اور قریب سے دیکھنے پر ہی نظر آتے۔ ناک خاصی لمبی تھی مگر اس کی شکل وصورت کا مجموعی تاثر خاصا خوشگوار تھا۔ اگر کوئی کمی تھی تو وہ اسے خوش لباسی اور بذلہ سنجی سے پورا کرلیتا تھا۔ وہ معاشقے سے زیادہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنے میں دلچسپی لیتا تھا اور بالعموم اس کے نتیجے میں ایک آدھ نظم لکھنے کے بعد وہ فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگتا تھا۔ ساحر کی رہائش گاہ 'پرچھائیاں' ان دنوں خالی پڑی ہے۔ میں نے ۱۹۷۹ میں اس کے پاس قیام کے دوران اس کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر اس سے پوچھا تھا کہ اس نے اس جائداد کا کیا سوچا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں وصیت لکھ چکا ہے اور اس کا زیادہ حصہ فلاحی اداروں کو ملے گا مگر اس کی وفات کے بعد اس کی کوئی وصیت دستیاب نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے اس کی ماموں زاد بہنیں انور، سرور وہاں

رہیں پھر یہ دونوں بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور اس وسیع عمارت پر کئی برس صابر دت (حمید اختر نے یہی لکھا ہے) کا قبضہ رہا جہاں اس نے ساحر پبلشنگ ہاؤس قائم کر رکھا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ الہ آباد میں اس کے دو ماموں رہتے تھے، ان کی اولادیں بھی زندہ نہیں ہیں اور ایک طرح سے اس کی کروڑوں کی جائداد لاوارث پڑی ہے اور اپنے مالک، اس بڑے شاعر کی یاد میں سرنگوں ہے۔'' (ساحر کی یاد میں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساحر کے سینے میں ایک ایسا دل دھڑکتا تھا جو دوسروں کی پریشانی دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ فلمی دنیا کے خوفناک اور بے رحم نشیب و فراز کے کتنے ہی ان گنت قصے سننے میں آئے ہیں اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔ آغا جانی کاشمیری کی خود نوشت ''سحر ہونے تک'' پڑھیں یا آغا اشرف کی ''ایک دل ہزار داستان'' .... یہ قصے ہمیں اس ناپائدار زندگی کا اصلی اور تلخ چہرہ دکھاتے ہیں جس کی چکا چوند روشنیوں کے پیچھے اندھیرے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب امرتسر سے تعلق رکھنے والے ماسٹر نثار کا ہندوستانی فلمی صنعت میں طوطی بولتا تھا۔ مس کجن کے ساتھ جس کی جیسی جوڑی تھی، ویسی آج تک کوئی نہ بنا سکا۔ پروانے قطار اندر قطار اس کی ایک جھلک کے متمنی ہوا کرتے تھے۔ اسی ماسٹر نثار کو ساحر نے ایک موقع پر کاردار اسٹوڈیو میں اس حال میں دیکھا کہ اس کا کلیجہ خون ہوگیا۔ کرشن ادیب (م: ۷ جولائی ۱۹۹۹) اس واقعے کے

چشم دید گواہ تھے۔انھوں نے ماسٹر نثار کو بی آر چوپڑہ کے ائیر کنڈیشنڈ دفتر کے باہر چپراسیوں کی وضع قطع میں سخت گرمی میں بیٹھے دیکھا جو ہر آنے جانے والے کو بلا ضرورت سلام کر رہا تھا۔ ساحر، کرشن ادیب کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا۔چوپڑہ کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ساحر نے ماسٹر کو اگلے روز ملاقات کے لیے بلانے کا سندیسہ بھیجا، وہ ماسٹر کو کچھ کام دینا چاہتا تھا۔ دو گھنٹے گزار کر جب یہ لوگ باہر نکلے تو ماسٹر نثار نے جھک کر ساحر کے پاؤں پکڑ لیے۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساحر نے اسے سینے سے لگایا اور پھر بغل میں ہاتھ دے کر اپنی گاڑی تک لے گیا اور کہا ''چلیے ! جہاں آپ کو جانا ہے، میں چھوڑے دیتا ہوں۔'' .... ماسٹر نثار ان دنوں ایک کھولی میں رہا کرتا تھا۔۔۔بعد میں کرشن ادیب کو ساحر نے بتایا کہ اس شخص کے پاس دنیا کی مہنگی ترین گاڑی رولز رائس ہوا کرتی تھی۔

کرشن ادیب نے اپنے مضمون '' ساحر یادوں کے آئینے میں'' میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وادی چنبل کے ڈاکوؤں کی کہانی پر مبنی فلم ''مجھے جینے دو'' نمائش کے لیے پیش کی گئی اور چنبل کے ڈاکوؤں نے بھی اسے دیکھا۔اس فلم کا نغمہ نگار ساحر تھا۔ ساحر انھی دنوں ایک مرتبہ کرشن چندر اور اپنی والدہ اور بہن انور کے ہمرہ لدھیانہ جا رہا تھا کہ رستے میں گوالیار شو پوری کے مقام پر ڈاکوؤں کے سردار نے اس کی کار کو روک لیا۔ اسے خبر تھی کہ ساحر

لدھیانوی اس رستے پر سفر کر رہا ہے۔ سردار نے ساحر سے استفسار کیا کہ کیا آپ وہی ساحر لدھیانوی ہیں جس نے "مجھے جینے دو" کے گانے لکھے ہیں؟ ساحر سمیت سبھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے حامی بھری اور ادھر سردار کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ان سب کو اپنے اڈے پر لے گیا، رات وہیں بسر ہوئی، ساحر اپنا کلام سناتا رہا اور تڑکے ڈاکوؤں نے انہیں عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔

معروف وبیباک افسانہ نگار واجدہ تبسم (م: ۷ دسمبر ۲۰۱۰) کو ساحر سے ایک تعلق خاطر تھا۔ ساحر ان کی ناز برداریاں کیا کرتے تھے، شفقت کیا کرتے تھے۔ واجدہ، ساحر کی غیر متوازن شخصیت پر اعتراض کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دیا کرتی تھیں، ملاحظہ ہو: "ایک شخص جس نے شادی نہ کی، نہ بیوی کی قربت میسر آئی، نہ ازدواجی زندگی کا سکھ دیکھا، نہ بچوں کی جنت کے مزے لوٹے، اس کی محرومیوں کے بارے میں بھی تو سوچو۔ اگر یہ شخص اپنی ہی تقدیر لکھنے پر قادر ہوتا، اپنا کاتب تقدیر آپ ہوتا تو ہر مرد، ہر عورت، ہر انسان اپنے آپ کو بیحد خوبصورت بناتا، بیحد تعلیم یافتہ بناتا، بیحد امیر بناتا۔ اچھا جیون ساتھی چنتا، خوب اولاد، خاص طور سے بیٹے اپنے لیے چنتا۔ لیکن ہم سب کسی اور کے قلم کا لکھا پورا کر رہے ہیں۔ اچھے سے کر رہے ہیں یا برے سے کر رہے ہیں بہرحال زندگی کو گزار رہے ہیں۔ تو کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو اپنی محرومیوں کے

"باوجود دوسروں کے لیے جئیں۔

☆

یادش بخیر، ہمارے یہاں ایک ہوتے تھے سعید رضا سعید۔ آج ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ نامور صحافی، ادیب، شاعر و ادیب تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سعید رضا سعید، معروف شاعرہ منور سلطانہ کے خاوند تھے تو شاید بات بنے گی۔۔۔۔ سعید رضا، جولائی ۱۹۲۹ میں اجمیر میں پیدا ہوئے اور ۲۱ جولائی 1995 میں لاس اینجلس میں انتقال کیا۔ سعید رضا ہمیں غیر منقسم ہندوستان اور ساحر لدھیانوی کی ایک جھلک یوں دکھاتے ہیں:

" جگر صاحب جب بھی کسی آل انڈیا مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آتے تھے، اپنے کسی ہونہار شاگرد کو ساتھ لاتے اور فلم انڈسٹری میں متعارف کراکے چلے جایا کرتے تھے۔ شکیل اور مجروح کو بھی جگر صاحب نے دریافت کیا تھا اور انھوں نے پرانے جمے ہوئے شاعروں مدھوک، قمر جلال آبادی وغیرہ کی فصیلوں میں رخنے ڈالنے شروع کردیے تھے۔ ساحر بمبئی آئے تو انہیں جگر صاحب جیسی کسی بیساکھی کا سہارا نصیب نہیں تھا۔ وہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ مجروح ہوشیار آدمی تھے۔ باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ سیاسی مشاعروں میں آتے تو یہ پڑھ کر داد سمیٹے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے تھے کارواں بنتا گیا
:اور فلموں میں اس قسم کے گیت لکھ کر پیسے سمیٹتے
ع نجر لاگی راجہ تورے بنگلے پر
لیکن اس قسم کی سمجھوتے بازی ساحر کی فطرت کے خلاف تھی۔ کمیونسٹ ہونے کا لیبل ان پر بھی لگ چکا تھا اس لیے کہ انہوں نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی ۔اردو، مارواڑی اور گجراتی پروڈیوسر اس لفظ سے ایسے بدکتے تھے جیسے لال کپڑے سے بیل۔ شروع شروع میں ناکامیاں ہوئیں۔ ایک آدھ چانس مل جاتا تو پیسے نہیں ملتے۔ ساحر نے بہت سخت دن گزارے۔ لیکن حالات کی سختیاں اس دبلے پتلے نوجوان کو توڑ نہیں سکیں۔ اور پھر برف ٹوٹی۔ ساحر کے گیت ہندوستان کے چوٹی کے گلوکاروں کی آواز میں (گونجنے لگے۔'' (ساحر چلا گیا۔ سحر باقی ہے
شہرت آئی تو اپنے جلو میں ساحر کے لیے بہت کچھ لے کر آئی۔ ایوارڈز کی لائن لگ گئی۔اہل لدھیانہ کیوں پیچھے رہتے، وہ تو اس کی جنم بھومی کے باسی تھے۔ ۱۹۷۵ میں سول لائن لدھیانہ میں ایک سڑک کا نام ساحر روڈ رکھا گیا۔ اس کی تقریب میں موجود تھے کشمیری لال ذاکر۔ان کو یاد رہا کہ اسٹیج پر موجود سردار سیوا سنگھ نے سڑک کے بارے میں اعلان کیا تھا اور ساحر کو چند کلمات کی ادائیگی کی دعوت دی تھی۔ ساحر اپنے گلے میں پھولوں کا ہار پہنے آیا اور

کہنے لگا'' میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے وہ اعزاز بخشا ہے جس کا میں 'مستحق 'تھا'' پھر وہ تالیوں کی گونج میں ایک توقف کے بعد بولا تھا'' میں اس اعزاز کا اس لیے حق دار ہوں کہ میری تمام عمر سڑکوں پر گزری ہے''۔

اس مرتبہ تمام ہال تالیوں کے ساتھ ساتھ قہقہوں سے بھی گونج اٹھا تھا۔

☆

اکتوبر ۲۰۱۳ کو ساحر لدھیانوی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۳۳برس ہو جائیں ۲۵ گے، ۱۹۸۰ میں اسی مہینے، اسی تاریخ کو'' تلخ بستہ اداسی کے شاعر'' نے ۵۹برس کی عمر میں اپنے دوست ڈاکٹر آر۔پی۔ کپور کے بازوؤں میں دم توڑا تھا۔

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو

۔×۔

حوالاجات:

۔۔۔۔ آشنائیاں کیا کیا۔ حمید اختر۔۱۹۸۷۔جنگ پبلیکیشنز، لاہور

۔۔۔۔ گلستان ادب کی سنہری یادیں۔اے حمید۔ مکتبہ القریش، لاہور۔۲۰۰۷

۔۔۔۔ لاہور کے نوادرات۔ قاضی اختر جوناگڑھی۔ماہنامہ الحمراء۔فروری ۲۰۱۲

۔۔۔۔ میں تینوں فیر ملاں گی۔ سلیم پاشا۔ سنبل، راولپنڈی۔۲۰۰۹

۔۔۔۔ احوال واقعی۔ حمید اختر۔ بک ہوم، لاہور۔۲۰۰۵

۔۔۔ساحر کا فن اور شخصیت۔ سلطانہ مہر۔ادارہ تحریر، گلشن اقبال، کراچی۔۱۹۸۹

انٹرویو۔ راشد اشرف

انٹرویو۔ راشد اشرف

سوالنامہ منجاب محترمہ فرزانہ اعجاز، مسقط

یہ انٹرویو لکھنؤ کے اخباروں ''آگ'' اور ''اودھ نامہ'' میں بالترتیب 24 اور 25 ستمبر اور 5 اکتوبر 2013 کو شائع ہوا تھا۔

راشد اشرف۔ کراچی سے

١۔آپ کی پیدائش کہاں کی ہے، اور آپکے اطراف ادبی اور سماجی ماحول کیسا تھا ؟

پیدائش کراچی کی ہے۔ 70 کی دہائی میں ادبی ماحول کے بارے میں اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت پنگوڑے میں تھا اور پنگوڑے کے اطراف کا ماحول ہمیشہ انتہائی غیر ادبی ہوتا ہے۔

٢۔۔۔آپ نے ابتدائی اوراعلی اتعلیم کہاں حاصل کی ؟اور تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ سے علمی استفادہ کیا؟

اوائل عمری ہی میں والدین کا بسلسلہ روزگار تبادلہ حیدرآباد سندھ میں ہوگیا

تھا جہاں والد ایک بینک سے وابستہ تھے جبکہ والدہ تدریس کے شعبے سے منسلک تھیں اور چند برس قبل پروفیسر آف فزکس کے عہدے سے سبکدوش ہوئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم انٹر تک حیدرآباد ہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد "اعلیٰ تعلیم" کے حصول کے لیے حیدرآباد سے کراچی کا رخ کیا جہاں سے این ای ڈی یونیورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اردو میں لکھنے کا آغاز سولہ برس کی عمر میں کیا۔ یہ بھی گویا ایک المیہ ہی ہے اس لیے کہ بچے عموماً ڈھائی تین برس کی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

تعلیمی زندگی میں اپنے اساتذہ کا احترام راقم کے دل میں شروع ہی سے تھا (اساتذہ منجانب راقم اپنے دلوں میں کتنی قدر و احترام رکھتے تھے، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے) خاص کر پبلک اسکول حیدرآباد میں اردو کے استاد سے راقم کو دلی عقیدت تھی۔ ان کا نام نعیم الرحمٰن جوہر تھا، نعیم صاحب پہلے ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ انٹر کی کلاس کے آخری دن نعیم صاحب نے اپنے تمام طالب علموں کے سامنے اپنی داستان حیات بیان کی۔ تمام طالب علم ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی باتیں سننے میں محو تھے۔ قبول اسلام سے قبل نعیم الرحمٰن جوہر، نربھرے رام جوہر تھے، ان کے والد نے انہیں گیتا کے ساتھ ساتھ بائبل اور قرآن کریم کی تعلیم بھی دی جس کی بنیاد پر آگے چل کر وہ اختیاری طور پر نربھرے رام سے نعیم الرحمٰن ہوئے۔

۳۔۔۔راشد صاحب۔ بتایئے کہ اس وقت اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی کی کیا صورت حال ہے؟اور کون سی صنف زیادہ ترقی کر رہی ہے؟

اس وقت اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی کی صورت حال بیک وقت مایوس کن اور خوش کن ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انٹرنیٹ کی آمد اور لوگوں کی کثیر تعداد کے اس سے استفادے کے بعد اردو لکھنے کا رجحان کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ ''کٹ اینڈ پیسٹ'' کا دور دورہ ہے۔ اکثر کہتا ہوں کہ اگر پاکستان میں اگر'' گوگل سرچ انجن'' کی سہولت بند کردی جائے تو یقین کیجیے کہ اردو کے آدھے اخبار راتوں رات دم توڑ جائیں گے، آدھی صحافت کا صفایا ہوجائے۔ غالباً ہند میں بھی معاملہ مختلف نہ ہوگا۔ دوسری جانب امید افزاء پہلو یہ ہے کہ اس صورت حال میں بھی نئے لکھنے والے تواتر کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں حالیہ چند برسوں میں خودنوشت لکھنے کے رجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اس صنف ادب کو کئی لکھنے والوں نے درخور اعتنا جانا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کئی لکھنے والوں نے اس انداز سے خودنوشت لکھی ہے کہ اپنے قاری کو ''درگور'' کردیا ہے (یہاں جی چاہ رہا کہ درخور اور درگور کے استعمال کی جانب اسی انداز سے قارئین کی توجہ مبذول کراؤں جیسے محترم بشیر مشاعروں میں بدر ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر سامعین کی توجہ اپنے اشعار کی جانب کرانے میں ید طولی رکھتے ہیں)۔۔۔۔۔۔

خاکہ نگاری، سفرنامہ اور تنقید میں بھی کثیر تعداد میں کتابوں کی اشاعت کا

سلسلہ جاری ہے۔

رہا سوال شاعری کا تو اس سلسلے میں خامہ بگوش کا وہ بیان راقم کی نظر میں ہمیشہ تازہ رہے گا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "عہد میر میں دلی میں پانچ ہزار شاعر تھے، آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔"

اردو زبان و ادب میں شاعری ایک 'سنگین' مسئلے کا رخ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ حالیہ چند دہائیوں میں ایسے شعراء کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو محض اپنا کلام شائع کرانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس عمل کے دوران شاعری کے معیار کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے شعری مجموعوں کی کثیر تعداد میں اشاعت کے بارے میں کہا تھا :

"میں کسی طرح معاصر ادب کا نقاد نہیں لیکن میرے پاس شعری مجموعے جس کثیر تعداد میں آتے ہیں، میں ان سے سراسیمہ ہو گیا ہوں۔ اکتوبر نومبر 1986 میں چھ ہفتوں کے لیے میں حیدرآباد (دکن) سے باہر گیا۔ اس عرصے میں سات شعری مجموعے وصول ہوئے جن میں پانچ کے خالق ایسے تھے جن کا نام میں نے پہلی بار ان مجموعوں کے طفیل سنا۔ اگر کسی ہفتے کوئی شعری مجموعہ نہ آئے تو میں اسے مبارک جانتا ہوں۔ ایک شامت اعمال ہفتے میں تین مجموعے وصول ہوئے۔ اگر مجھ بے بصیرت کا یہ حال ہے تو جو حضرات اردو کے نامور مبصر اور دیدہ ور نقاد ہیں، ان کے ہاں تو شعری مجموعوں کی ایسی باڑھ آتی ہوگی کہ گھر میں ان کے

''بیٹھنے اٹھنے کو ایک جگہ بھی نہ بچتی ہو گی۔

۴۔۔۔۔کیا کسی زبان کی ترقی محض اس بات پر منحصر ہے کہ اسکو سرکاری تحفظ حاصل ہو؟اگر ایسا نہیں ہے تو زبان اور ادب کے تحفظ اور ترقی کے کیا کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

کسی زبان کی ترقی ہر گز ہر گز محض اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ اس کو سرکاری تحفظ حاصل ہو۔ اردو زبان میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی بھرپور قوت ہے۔ یہ تمام تر نامساعد و ناموافق حالات کے باوجود بھی اپنا راستہ بنا رہی ہے۔ ان حالات میں سرکار عوام کو تحفظ دے لے ، وہی بہت بڑی بات ہو گی، ایسی صورت میں عوام خود خوشی خوشی زبان کو تحفظ دے لیں گے۔

۵۔۔۔۔آپکی دلچسپی اردو کی کتابیں جمع کرنے میں ہے اور ان میں سے اکثر کتب کو ۔کمپیوٹر پر منتقل کرنے کا محنت طلب کام کرنے کا خیال کیوں کر آیا؟

انٹرنیٹ پر راقم تادم تحریر پونے تین سو نادر و نایاب کتابیں پیش کر چکا ہے اور ان تمام کتابوں کے دائرہ مطالعہ یا ''ریڈر شپ کا'' ریکارڈ حیران کن ہے۔ اب تک پوری دنیا میں ایک لاکھ سے زائد افراد ان کتابوں کو پڑھ چکے ہیں جبکہ ڈاؤن لوڈ کرنے والوں کی تعداد علاحدہ ہے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے پس پردہ صرف ایک ہی سوچ تھی اور وہ یہ کہ کسی بھی عمدہ و دلچسپ کتاب کو کسی

فرد واحد کی ذاتی جاگیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ہر خاص و عام کی دسترس میں ہونا چاہیے۔

ایک امریکی اور ایک برطانوی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔۔برطانوی نے اپنی دوبین سے "ساحل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "وہ دیکھو! سو فٹ دور کس قدر حسین لڑکی کھڑی ہے '' امریکی نے جواب دیا'' وہ تو ٹھیک ہے مگر سو فٹ دور کھڑی حسینہ کس کام کی ؟

سو کوئی اہم اور تاریخی کتاب اگر کسی صاحب کے کتب خانے میں برسوں سے پڑی ہے اور (معاف کیجیے گا) وہ اگر اس پر پھن کاڑھے بیٹھے ہیں تو اس کا دوسروں کو کیا فائدہ۔

اس کام کو کیے جانے کے پس پردہ اردو زبان کی ترویج کے ساتھ ساتھ یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ اردو کی وہ کتابیں پیش کی جائیں جو ماضی کی گرد میں کہیں چھپ کر نظروں اور ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھیں اور جو فی زمانہ کسی تحقیق کے کام میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں مزید یہ کہ دنیا کے ایسے حصوں میں قیام پذیر لوگ ان سے استفادہ کر سکیں جہاں اردو کی کتابیں پہنچنا تو کجا، وہ اردو بولنے کو بھی ترس جاتے ہیں۔

بیرون ممالک میں مقیم ایسے ہزارہا لوگ ہیں جنھوں نے مذکورہ کتابوں میں شامل فیروز سنز سے سن ستر کی دہائی میں شائع ہوئے بچوں کے ڈیڑھ سو سے زائد

ناولوں کو اپنے بچوں کو اردو سکھانے کی غرض سے ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔ راقم کے ذاتی ای میل میں اس سلسلے میں سینکڑوں ای میلز آ چکی ہیں، لوگوں نے انہیں خود پڑھا ہے، اپنے بچوں کو پڑھوایا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ انٹرنیٹ پر درج ذیل لنک کی مدد سے مذکورہ تمام کتب تک بہ آسانی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے:

http://www.scribd.com/zest70pk/documents

اس بات کا ذکر اہم ہے کہ ان میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کو شائع ہوئے چالیس سے پچاس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ راقم کا ای میل پتہ یہ ہے، اگر کسی صاحب کو اس سلسلے میں کسی دقت کا سامنا ہو تو براہ راست رابطہ کر سکتے ہیں: zest70

pk@gmail.com

۶۔۔۔۔اس مشکل کام کرنے میں کیا کوئی دوسرا بھی آپکا مددگار ہے یا آپ اکیلے ہی چلے ہیں جانب۔اردو ادب۔؟

واضح رہے کہ ان کتب کو اسکین کر کے انٹرنیٹ پر پیش کرنے کے سلسلے میں میں راقم اکیلا ہی کام کرتا رہا ہے اور ایک اندازے کے مطابق تادم تحریر ایک لاکھ سے زائد اوراق اس سلسلے میں اسکین کر کے پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہ دوانے کا سودا ہے، اور اس کام سے کسی مالی فائدے کی امید سے راقم کوسوں دور ہے۔ کتابیں ہر "عام و خاص" کے لیے ہیں اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا

چلا جا رہا ہے۔ جب تلک ساغر چلے گا، چلائیں گے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کتابوں یا مطلوبہ مواد کی لوگوں کو فراہمی کے پس منظر میں مدد کا جذبہ کارفرما ہے اور اس سلسلے میں راقم، مشفق خواجہ مرحوم، سید معراج جامی اور عقیل عباس جعفری جیسے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی حقیر سی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیشہ بنا کسی غرض، لوگوں کی مدد کی اور کر رہے ہیں۔

ے۔۔۔۔دنیاکے ہر کونے سے آپ کو کتابیں موصول ہوتی ہیں ،آپ کا کیا تاثر ہے کہ دنیاکے الگ الگ حصوں میں رہنے والے،اردو والے،اور انکی نگارشات ایک جیسی ہیں یا ان میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اور یہ کہ خصوصاً برصغیر ہند وپاک میں اردو زبان کا کیا مستقبل نظر آتا ہے۔اور دونوں ملکوں میں لکھے جانے والے ادب اور طباعت میں کیا کیا نمایاں فرق نظر آتا ہے؟

یہ بات درست ہے کہ راقم الحروف کو دنیاکے ہر کونے سے کتابیں موصول ہوتی ہیں۔ خاص کر ہندوستان سے جہاں سے ہر طرح کی چیز، ہر طرح کا سامان پاکستان آتا ہے سوائے کتابوں اور جرائد کے۔

دنیاکے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والوں کی نگارشات ہرگز ہرگز ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ان میں تنوع ہوتا ہے، ہر علاقے اور خطے کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، ہر تحریر کا الگ الگ مزہ ہوتا ہے۔ خاص کر خود نوشتوں کے معاملے میں تو بیک

وقت کی 'ذائقے' محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ہاں البتہ پاک و ہند سے شائع ہونے والی خودنوشتوں میں ایک قدر مشترک ضرور ہے۔۔برصغیر کے نامساعد حالات میں لوگوں کا آگے بڑھنا، زیست کرنا، اس میں درپیش مصائب کا بیان اور ہمت اور عزم سے ان سے نبرد آزما ہونے کا احوال۔ یہ قاری کو ہمت اور حوصلہ دیتا ہے۔

حالیہ دنوں میں راقم نے دہلی سے شائع ہوئی ایک ایسی ہی خودنوشت "پگڈنڈیاں" کا مطالعہ کیا اور مصنفہ "بچنت کور" کے دکھ کو اپنے دل میں محسوس کیا۔ اسی طرح خاکہ نگاری کی صنف میں بے شمار لوگوں نے اہم سنگ میل قائم کیے ہیں، درجنوں معیاری مجموعے منصہ شہود پر آچکے ہیں۔ منٹو، شورش کاشمیری، چراغ حسن حسرت، نصراللہ خاں، ماہر القادری، اسلم فرخی، غرضیکہ کس کس کا نام لوں اور کس کا نہیں۔ لیکن حال ہی میں ہندوستانی فلمی صنعت سے وابستہ میرے محترم کرمافرما جاوید صدیقی کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ''روشندان' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے مطالعے کے بعد راقم کا یہ ماننا ہے کہ خاکہ نگاری کی تیزی سے ماند پڑتی صنف ادب میں گویا اس کتاب نے ایک نئی روح پھونک دی ہے اور اس کی رگوں نیا خون دوڑا دیا ہے۔ ہر حساس دل رکھنے والے کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔

پگڈنڈیاں'' ہو یا ''روشندان''، دونوں میں حالات حالات کے شکنجے میں جکڑے'' ہوئے مجبور انسانوں کی داستانیں موجود ہیں۔ یہ اس خطے کی قسمت ہے جسے

برصغیر پاک و ہند کہا جاتا ہے۔ یہاں کی اکثریت کو نان و جویں کے لیے سنگلاخ پتھروں کا کلیجہ چیرنا پڑتا ہے۔ اپنا آپ داؤ پر لگانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے اور وہ بھی سب کے نصیب کا حصہ نہیں بنتا۔

راقم کی نظر میں برصغیر ہند وپاک میں اردو زبان کا مستقبل تمام تر ناموافق حالات کے باوجود پائدار ہے۔ خاص کر ہندوستان میں جب تک "اردو" زبان میں فلم بنتی رہے گی، اردو آگے بڑھتی رہے گی۔ یقین کیجیے کہ جب تک چھوٹے چھوٹے اداکار بچے ہندوستان میں بنی "چلر پارٹی" جیسی فلموں میں بے عیب، ش قاف کا خیال رکھتے ہوئے اردو (ان مقامات کو چھوڑ کر جہاں بمبئیا اردو بولی گئی ہے) بولتے رہیں گے، اردو آگے بڑھتی رہے گی۔ جب تک رچی مہتا جسے لوگ ''عمل'' جیسی فلموں کو پیش کرتے رہیں گے اور نصیر الدین شاہ جیسے عظیم اداکار مذکورہ فلم میں بے عیب اور بامحاورہ اردو بولتے رہیں گے، اردو کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ گلزار صاحب جب تک بامحاورہ مکالمے لکھتے رہیں گے، وہاں اردو پیش قدمی کرتی رہے گی۔

یہاں میں ہندوستانی آرٹ فلموں کا ذکر قصداً نہیں کرنا چاہتا کہ وہ میری انتہائی دلچسپی کی چیز ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کا یہ متحمل یہ انٹرویو نہیں ہو سکتا۔ لیکن بہرحال اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ ان فلموں میں سے بہتیری ایسی ہیں جن میں اردو زبان کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور دیکھنے والوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب ملی ہے۔ پاکستان کہنے کو اردو کا

گردانا جاتا ہے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ انگریزی داں طبقہ اردو کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔پاکستان میں انگریزی بولیے ، رکے ہوئے کام ہوجائیں گے، سامنے والا مرعوب ہوجائے گا۔ یہاں ایسے مناظر دیکھتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے۔

ہند میں انگریزی بولنا باعث فخر نہیں سمجھا جاتا جبکہ یہاں اس کے برعکس ہے۔

ادھر یہاں کے ٹی وی چینلز نے وہ ادھم مچایا ہے کہ الامان الحفیظ۔ سب سے زیادہ بگاڑ یہی لوگ پیدا کررہے ہیں۔ خبریں پڑھنے مرد و خواتین سارا دن غلط اردو بولتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھوں نے کبھی اردو کی کوئی کتاب کھول کر بھی نہ دیکھی ہوگی۔ محترم آصف جیلانی کی بات دوہرا رہا ہوں کہ لفظ ''حوالہ'' پاکستان میڈیا کے اعصاب پر سوار ہوگیا ہے۔ ایک ایک جملے میں چار چار مرتبہ اس لفظ کو دوہرایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا چینل ہونے کے دعوے دار ٹی وی چینل پر ایک میک اپ میں لتھڑی ہوئی خبریں پڑھنے والی خاتون کا قصہ تو محمود شام صاحب نے راقم سے بیان کیا تھا۔پاکستان میں 2009 میں آنے والے سیلاب کے دنوں میں کیے گئے ایک براہ راست پروگرام کے دوران وہ ناظرین سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے فرمارہی تھیں کہ ''آگے بڑھیے ! ہم آپ کی دست درازیوں کے منتظر ہیں'' ۔اب کوئی اس سے پوچھتا کہ بی بی ! تمہاری درخواست کے جواب میں یہاں تو پروانوں کی قطار لگ جائے گی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ جو عورت مذکورہ بالا فقرے کے مفہوم اور اس کے 'نتائج' سے نابلد تھی، اسے وائس آف امریکہ نے اپنے پروگرام میں بطور میزبان لے لیا تھا۔

دونوں ملکوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی طباعت میں واضح فرق ہے۔ یہ فرق صاف نظر آتا ہے۔ راقم کو ایک ہندوستانی ناشر نے حال ہی میں بتایا تھا کہ ہند میں سرکار اردو زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کو مالی معاونت فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سے آنے والے رسائل کی قیمت ناقابل یقین حد تک کم ہوتی ہے، اتنی قیمت میں پاکستان میں رسالے کا سرورق ہی بنتا ہوگا۔ یہی حال کتابوں کا ہے۔ ہند سے شائع ہونے والی کتابوں کا کاغذ نہایت عمدہ اور معیاری ہوتا ہے جبکہ یہاں بڑے بڑے نامی گرامی ناشرین کا یہ حال ہے کہ وہ "میٹ" کاغذ (ایک سالخوردہ نظر آنے والا مٹیالا و ملگجا سا شرمناک کاغذ جسے دیکھ دل بیٹھ جاتا ہے) کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں نامور ادیب و براڈکاسٹر رضا علی عابدی کی کتاب ''کتابیں اپنے آباء
کی'' شائع ہوئی ہے اس قدر عمدہ اور دلچسپ و تاریخی کتاب کی طباعت کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اس نوعیت کی کئی مثالیں ہیں۔ کتابیں اپنے آباء کی، ''آباء'' ہی کے زمانے میں شائع ہوئی کوئی کتاب جان پڑتی ہے۔

۸۔۔۔آپ کو خود ادب کی کون سی صنف زیادہ پسند ہے اور آپ کس صنف میں اظہار

خیال کرنا پسند کرتے ہیں؟

خودنوشت، خاکہ اور سفرنامہ۔ راقم الحروف کے خیال سے یہ تینوں اصناف ادب محض اس کی نہیں بلکہ اکثریت کی پسندیدہ ہوتی ہیں۔ پاکستانی ادیبوں کے تحریر کردہ ہندوستان کے سفرناموں سے شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ 2011 میں فرزند ابن صفی جناب احمد صفی دلی گئے تو راقم نے انہیں لذت کام و دہن کی آزمائش کے لیے کریم ہوٹل کا نام تجویز کیا اور نتیجہ حسب حال نکلا۔ کریم ہوٹل کے کھانے کھا کر ان کا وزن اور واپسی پر اس کے بیان سے ہماری اشتہا، دونوں میں قابل ذکر اضافہ ہوا تھا۔ اسی طرح اور کئی مثالیں بھی ہیں۔

خودنوشت آپ بیتی راقم کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہے اور اس صنف ادب میں کچھ کام بھی کیا ہے۔ پاک و ہند سے شائع ہونے والی خودنوشت آپ بیتیوں کی فہرست پر راقم گزشتہ چار برس سے کام کر رہا ہے، یہ تقریبا مکمل ہو چکی ہے اور امکان ہے کہ کسی موقر (یا غیر موقر) ادبی جریدے میں شائع ہو گی۔ اسی طرح ابن صفی پر دو کتابیں لکھنے کے بعد اب اردو خودنوشتوں پر ایک جامع کتاب لکھنے کا ارادہ ہے لیکن کیا کیجیے کہ راقم کسی ''قدر ناشناس'' کی تگڑی سی ''زرپرستی'' کا طلبگار ہے اور ذاتی طور پر سوچتا ہے کہ اگر اس کے بجائے ملکہ شراوت پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوتا تو ناشرین کی قطار لگ چکی ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ قطار میں موجود ناشرین کی اکثریت میں 'نا' اور 'شر'، دونوں عناصر کا غلبہ ہوتا۔ لیکن صاحب، کیا کیجیے کہ اگلے وقتوں میں

زور شرافت پر ہوتا تھا، اب ''شراوت'' پر ہے۔

! خیر یار زندہ صحبت باقی بلکہ ناشر زندہ شراوت باقی ۔۔۔۔۔

رہا سوال اظہار خیال کرنے والی بات کا تو کتابوں بالخصوص خود نوشتوں پر تبصرے ہی عرصہ چار برسوں سے دلچسپی کا موضوع رہے ہیں جو پاک و ہند کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ راقم اس کوشش کو اپنے باعث فخر نہیں سمجھتا، یوں سمجھ لیجیے کہ دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۹۔۔۔۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے۔اردو والوں کو۔بہت قریب، کر دیا ہے ، یہ اچھی علامت ہے یا تصادم کی ؟

اس بات میں دوسری کوئی رائے نہیں ہو سکتی کہ کمپیوٹر کی ایجاد نے اردو والوں کو قریب کر دیا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے سماجی رابطوں کی ویب سائٹس اور متفرق فورمز کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جہاں نئی کتابوں کی اشاعت کی اطلاعات، شاعری، نثری مضامین سبھی کچھ ایک پلک جھپکتے میں ای میل باکس میں پہنچ جاتا ہے، لوگ اسے باقاعدگی سے دیکھتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے کتابوں کی فروخت میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا ہے۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ راقم الحروف کی، بارے نئی کتابوں کی اشاعت، پیش کی جانے والی خبروں کے رد عمل میں لوگ اردو بازار کراچی کی سب سے بڑی دو دکانوں میں متعلقہ کتاب کے حصول کے لیے راقم کی "مدلل" رائے و تعارف کے احترام میں راقم کا نام

لیتے پہنچے۔ البتہ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہ مل سکا کہ زر کثیر صرف کر کے کتاب خریدنے اور اسے پڑھنے کے بعد وہی لوگ راقم الحروف کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ سچ پوچھیے تو طبیعت میں پائی جانے والی درویشی اور متاثرین کے متوقع رد عمل کے سبب کبھی ہمیں اس کی تفصیلات جاننے کا شوق بھی نہ ہوا۔

بہر حال یہ صحت مندانہ رجحان ہے، حوصلہ افزاء بات ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اردو ٹائپنگ یعنی یونی کوڈ (یا ان پیج) کے استعمال میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور راقم کے ذاتی علم میں ایسے کئی بزرگ ہیں جو اسی برس سے زیادہ کی عمر میں مہارت سے اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ، پروفیسر اطہر صدیقی، آصف جیلانی۔۔۔۔ کتنے ہی ان جیسے مزید نامور لوگ ہیں جو مذکورہ طرز تحریر میں مہارت رکھتے ہیں۔

اس شعبے میں کئی خاموش مجاہد صلے کی تمنا کی پروا کیے بغیر چپ چاپ اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں کئی نام ہیں جیسے فرخ منظور، محمد وارث اور اسی طرح ہند میں اعجاز عبید ہیں جنھوں نے یونی کوڈ میں متفرق موضوعات پر ہزارہا برقی کتابوں کی دستیابی کو ممکن بنایا ہے۔ پاکستان میں ایک صاحب شرجیل نامی نے شکاریات پر ایک عمدہ ویب سائٹ بنائی ہے۔ اعجاز عبید صاحب کو پاکستان سے بھی کئی لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ان تمام لوگوں کی ستائش کر سکوں۔ اردو محفل، اردو ویب، اردو سخن

وغیرہ کئی ایسی سائٹس ہیں جہاں اراکین اردو میں لکھتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔
حال ہی میں ریختہ کے نام سے ہند میں ایک اردو ویب سائٹ کا آغاز کیا گیا ہے جہاں پرانی کتابیں دستیاب ہیں۔ یہ نہایت کارآمد ویب سائٹ ہے جو تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔
راقم الحروف نے بھی اس سلسلے میں کچھ ٹوٹا پھوٹا کام حسب توفیق و استطاعت کیا ہے اور تادم تحریر متفرق موضوعات پر 282 کتابیں اپ لوڈ کی ہیں۔ ان میں پچانوے فیصد کتابیں ایسی ہیں جن کی اشاعت کو چالیس سے پچاس اور بعض کو ساٹھ برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان میں خودنوشتیں بھی ہیں، سفرنامے بھی اور خاکوں کے مجموعے بھی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین کی اکثریت اس دنیا سے جا چکی ہے بصورت دیگر وہ کاپی رائٹ کی اس خلاف ورزی کی صورت میں راقم پر یقینا" نالش کر دیتے۔
پاک و ہند سے جب کبھی بھی کوئی رابطہ کرکے یہ اطلاع دیتا ہے کہ راقم کی اپ لوڈ کی ہوئی فلاں کتاب اس کے ایم فل یا پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں کارآمد ثابت ہوئی ہے تو یقین کیجیے کہ یہ خاکسار کے لیے از حد باعث طمانیت و انبساط ہوتا ہے۔

۱۰۔۔۔۔ آخیر میں ان ادیبوں اور شاعروں کے نام بتائیے ؟ جو آپکو زیادہ پسند

ہیں اور ایسے کچھ اشعار سنائیے جو آپ کے دل کے قریب آ گئے۔

یہ سوال دلچسپ ہے۔ اوائل عمری ہی سے بچوں کے ناول لکھنے اور ترجمہ کرنے والے ادیب میرے دل کے قریب رہے تھے۔ یہ مجھے ایک ایسی دنیا میں لے جاتے تھے جو ایک طلسماتی دنیا تھی۔ یہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے تھے، ذہنوں کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ یہ وہ خاموش مجاہد تھے جن کے اوپر تاحال کوئی تحقیق نہ ہوئی، کوئی مقالہ نہ لکھا گیا، اور تو اور ان میں سے اکثر کا ذکر بعد از مرگ وفیات کی کتابوں میں بھی نہ آیا۔ وہ قلم کی مزدوری کرتے، کسی صلے کی تمنا کے حصول کے بنا، خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن مجھ ایسے لاکھوں پڑھنے والوں کے ذہن و قلب میں وہ آج بھی پوری آب و تاب سے زندہ ہیں۔ ان میں مقبول جہانگیر ہیں، سلیم احمد صدیقی، زبیدہ سلطانہ، جبار توقیر، محمد یونس حسرت ہیں۔ راز یوسفی، سعید لخت، سعید احمد سعید، ابو ضیاء اقبال ہیں۔

ان میں سید ذاکر اعجاز، شوکت ہاشمی، قمر نقوی، فرخندہ لودھی، عزیز اثری، ذوالفقار احمد تابش، سیف الدین حسام جیسے قلمکار شامل ہیں۔ یہ میرے ہیرو ہیں اور میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔

اور پھر اے حمید مرحوم کو تو کسی طور نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ کچھ وقت گزرا اور چھٹی جماعت میں پہنچا تو وقت سے قبل ہی ابن صفی مرحوم کو جا پکڑا اور ان کی تحریر کے سحر میں ایسا مبتلا ہوا کہ آگے چل کر ان پر

باقاعدہ تحقیق کرڈالی, اور ان پر دو عدد کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ مختصر الفاظ میں کہنا چاہوں گا کہ ابن صفی، اے حمید اور محمد خالد اختر سے میں نے محبت کی ہے۔ ان میں اے حمید مرحوم سے لاہور میں ان کی قیام گاہ پر ملاقات کرنے کا بھی موقع ملا تھا۔ آج بھی ان تینوں ادیبوں کی کوئی بھی کتاب ہاتھ میں تھام کر دنیا و مافیہا، بلکہ کراچی کے حالات کے تناظر میں "مافیا" کہیں تو بہتر ہوگا، سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔

ان مصنفین کی برسہابرس پرانی تحریر کردہ کتابوں کو دیکھ کر آج بھی میری وہی کیفیت ہوتی ہے جسے محمد خالد اختر نے ایک مرتبہ اپنی پسندیدہ کتابوں کو ایک زمانے بعد اپنے عزیز از جان دوست ، مشہور مزاح نگار شفیق الرحمٰن کے گھر میں ایک ڈبے میں رکھا دیکھ کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

" وہ لکھتا تھا اور ملنے essays چھ سبز چھوٹی سی کتابیں۔ کیسے خوبصورت، مسرت بخش میں وہ کتنا شفیق، ہنس مکھ ، خوش گفتار رفیق ہوگا۔ اب میں نے اس کی کتابیں سالوں کے بعد دیکھیں۔ ایک پھانس سی میرے حلق تک آئی اور میں نے انہیں بھیگی ہوئی آنکھوں سے، احترام سے اس گوشے سے اٹھایا۔ اپنے ہاتھ سے بار بار تھپکا۔ ایلفا، پیارے زندگی کے ، essays ایلفا۔ تم نے ہمیں ہماری جوانی میں کیا کچھ نہیں دیا۔ تمہارے جیسے حزن، اس کی شادمانی اور خوبصورتی سے دیکھتے ہوئے، اب کون لکھ سکے گا"۔

رہا سوال اشعار کی پسندیدگی کا، تو چند پسند کے اشعار یہ ہیں لیکن خدارا اس سے خاکسار کے ذہنی رجحان، رویوں وغیرہ کا اندازہ نہ لگایا جائے جیسے ماہرین تحریر شناسی، تحریر دیکھ کر اور دست شناس ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بعد الل ٹپ اندازے لگاتے ہیں کہ فلاں شخص نے اب تک کی زندگی میں اتنے قتل اور اتنے عشق کیے ہیں اور مزید اتنے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے :

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

دل کو ہم سمجھا کے لائے کوئے جاناں سے حسن
دل ہمیں سمجھا بجھا کر، کوئے جاناں لے چلا

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں مرے ہے
لیکن وہ مرے خواب، مرے خواب، مرے خواب

کھلا اک عمر میں کار ہوس میں کچھ نہیں رکھا
پھر اس کے بعد میں نے دسترس میں کچھ نہیں رکھا

جمال یار میں رنگوں کا امتزاج تو دیکھ
سفید جھوٹ ہیں ظالم کے سرخ ہونٹوں پر

شاہ محی الحق فاروقی۔کیا دوانے نے موت پائی ہے

31دسمبر 2011 کا سورج جاتے جاتے ادیب، مترجم وکالم نگار شاہ محی الحق فاروقی کو اپنے ہمراہ لے کر غروب ہوا۔ فاروقی صاحب حکومت پاکستان کے ریٹائرڈ جوائنٹ سیکریٹری تھے اور کراچی کی ایک دور افتادہ بستی میں گزشتہ کئی برس سے مقیم تھے۔
راقم کی فاروقی صاحب سے پہلی ملاقات گزشتہ برس ہوئی تھی۔انہوں نے 1998 میں 'بلبلیں نواب کی' کے عنوان سے ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا، یہ ہندوستان کی سول سروس سے وابستہ رہے موسی رضا کی یاداشتوں کا مجموعہ ہے، ملاقات کا سبب متذکرہ کتاب تھا۔ 82 برس کی عمر میں بھی فاروقی صاحب کی بذلہ سنجی قائم تھی۔ میں ایک صاحب کے ساتھ گیا تھا، میز پر مشروبات و فواکہات دھرے تھے۔ فاروقی صاحب نے دھیرے سے ہم سے کہا: لیجیے، تکلف نہ کریں
ان صاحب نے رسمی جملے کا سہارا لیا: " ارے صاحب ! تکلف کیسا ! اپنا ہی گھر ہے"
اور فاروقی صاحب بیساختہ بولے: " خیر صاحب ! گھر تو میرا ہے"
ہمارے قہقہوں میں فاروقی صاحب نے ہمارا ساتھ دیا تھا!

شاہ محی الحق فاروقی کی تصانیف میں بلبلیں نواب کی، بیدار دل لوگ (خاکوں کا مجموعہ) کھٹے میٹھے انار (کالمز کا مجموعہ) اور ان دیکھی گہرائیاں (ہارون ابن علی کی انگریزی، خودنوشت کا ترجمہ)، 'ایک جج ہنس بھی سکتا ہے شاید (جسٹس ایم آر کیانی کی کتاب ترجمہ)، رہنمائے تربیت، تفہیم کراچی، سانحہ مشرقہ پاکستان، تصوری کا دوسرا رخ، شمالی امریکہ کے مسلمان شامل ہیں۔ فاروقی صاحب نے اپنی خودنوشت سپرد تحریر کے بعد گزشتہ کئی برس سے اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی، وہ اس کی اشاعت کے متمنی تھے۔ ان کے انتقال کے تیسرے روز راقم معروف ادیب، شاعر و ناشر سید معراج جامی کو ان کے صاحبزادے کے پاس مذکورہ خودنوشت کی اشاعت کے سلسلے میں بات چیت کے لیے لے گیا اور ایک مختصر سی نشست کے بعد فاروقی صاحب کے صاحبزادے نے کتاب کی اشاعت کی منظوری دے دی۔ مذکورہ خودنوشت گزشتہ برس بزم تخلیق ادب سے شائع ہوچکی ہے۔ کاش کہ یہ خودنوشت فاروقی صاحب کی زندگی میں شائع ہوجاتی۔ فاروقی صاحب نے اپنی خودنوشت کا نام بھی کچھ الگ ہی رکھا تھا۔ کلرک سے کلرک تک۔ایک گزشت۔اِس دلچسپ نام کی وجہِ تسمیہ اُن کے الفاظ میں یہ تھی کہ جب انھوں نے Sir کہا کرتے تھے اور جب ملازمت سے سبکدوش SIR ملازمت کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر شخص کو کہہ رہا تھا۔ SIR ہوئے تو ہر شخص اُن کو

شاہ محی الحق فاروقی کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید مشیر الحق، کشمیر یونیورسٹی کے

وائس چانسلر تھے، ایک روز وہ گورنر جگٹ موہن سے مل کر واپس آرہے تھے کہ رستے میں اغوا کرلیے گئے اور پھر 10 اپریل 1990 کے دن ان کی لاش ملی۔ یہ وقت کراچی میں مقیم شاہ محی الحق فاروقی پر بہت کڑا گزرا تھا، انہیں باوجود کوشش کے ہندوستان کا ویزا نہ مل سکا اور وہ اپنے بھائی کی تدفین میں شریک نہ ہوسکے۔

شاہ محی الحق فاروقی 15 جون 1932 کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے قصبہ بحری آباد ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ شبلی کالج اعظم گڑھ سے 1947 میں میٹرک کیا۔ اسی سال اکتوبر میں پاکستان آ گئے۔ سندھ مسلم کالج کراچی سے بی اے اور اسلامیہ لا کالج سے ایل ایل بی کیا اور پھر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ شاہ محی الحق فاروقی نے اپنی ملازمت کا آغاز بطور ایک جونیئر کلرک کیا اور آخر میں فنانس ڈائریکٹر کے منصب سے سبکدوش ہوئے۔ شاہ محی الحق فاروقی نے وفاقی پبلک سروس کمیشن سے لوئر ڈویژن کا امتحان پاس کیا۔ 1951 میں وفاقی وزارتِ قانون میں تعیناتی (LDC) کلرک ہو گئی۔ 1959 میں اسسٹنٹ سے ترقی پا کر وفاقی سیکریٹریٹ کے اوّلین سیکشن آفیسرز میں منتخب ہوئے۔ پھر اپنی خداداد صلاحیتوں کی مدد سے ترقی کرتے ہوئے کیبنٹ ڈویژن کے جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر 15 جون 1992 کو کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن کے ڈائریکٹر فنانس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

فاروقی صاحب کے ایک قریبی عزیز احمد حاطب کی بیان کردہ تفصیلات کے مطابق ''شاہ محی الحق فاروقی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مدیر ماہنامہ ''ساقی'' شاہد احمد دہلوی، مدیر ماہنامہ ''نقش'' شمس زبیری، مدیر پندرہ روزہ ''نمک دان'' مجید لاہوری اور سابق صدر شعبہ اُردو، جامعہ کراچی ڈاکٹر اسلم فرخی وغیرہ کی معیت میں کیا تھا۔ یہی لوگ اُن کے ادبی ہم سفر اور اُن کے ادبی ارتقا کے شاہدین میں سے تھے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سابق ناظم مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن اُن کے معترفوں میں سے تھے، محب عارفی اُن کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور ڈاکٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر محمد الغزالی اُن کے نیازمندوں میں سے۔ 1962 میں جب وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے پہلے سیکریٹری مقرر ہو کر لاہور گئے تو وہاں اُن کی ملاقات مولانا کوثر نیازی سے ہو گئی۔ مولانا کی فرمائش پر اُن کے ہفت روزہ ''شہاب'' میں ابن منیر کے قلمی نام سے تازہ خبروں پر طنزیہ تبصرے لکھتے رہے۔ 1964 میں اُن کی تقرری اسلام آباد میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی میں ہو گئی۔ فاروقی صاحب نے ادارے کے تحقیقی جریدے ''فکر و نظر'' میں بہت سے طبع زاد مضامین لکھے اور انگریزی سے کئی ترجمے بھی کیے۔ اُن کے طبع زاد مضامین میں ''وقف علی الاولاد'' اور ''اہانتِ انبیاء'' کے موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین کو بڑی پذیرائی ملی۔ فاروقی صاحب ایک بلند پایہ مزاح نگار اور انتہائی مقبول کالم نگار تھے۔ روزنامہ ''اُمت''

کراچی میں ایک طویل مدت سے ''کھٹے میٹھے انار'' کے مستقل عنوان سے پُر لطف اور پُرمزاح کالم نگاری کر رہے تھے۔ ُ۔ اُنھوں نے مزاح میں بھی متعدد تراجم کیے جن میں امریکی مزاح نگار مارک ٹوئن کے مزاح پارے بھی شامل ہیں۔

کم ''مزاح نگار'' ایسے ہوتے ہیں جو ''مجلسی مزاح گو'' بھی ہوں۔ فاروقی صاحب اپنی تحریروں کی طرح اپنی مجلسی گفتگو سے بھی محفل کو کشتِ زعفران بناکر رکھ دیتے تھے۔ اصل میں وہ تھے ہی مجلسی آدمی۔ اُن کے

کالموں میں بھی مجلسی گفتگو ہی کے چٹخارے ملتے تھے۔ وہی قصے، وہی کہانیاں، وہی لطیفے اور وہی حاضر جوابیاں۔

فاروقی صاحب بڑے حاضر جواب آدمی تھے۔ پاکستان قومی اتحاد نے جب 1978ء میں ضیاء الحق کی کابینہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو محمود اعظم فاروقی صاحب وزیرِاطلاعات ونشریات مقرر کیے گئے۔ شاہ محی الحق فاروقی کی دینداری اور دیانت داری کے سبب، محمود اعظم فاروقی صاحب نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اُن کے سیکریٹری کے طور پر کام کریں۔ محی الحق فاروقی صاحب نے انکار کیا تو محمود اعظم فاروقی صاحب نے کہا: ''آپ جیسے دیانت دار لوگ بھی انکار کریں گے تو افرادِکار کہاں سے آئیں گی؟ آخر آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟'' محی الحق فاروقی صاحب پہلے تو کچھ دیر عذر سوچتے رہے پھر بولی: ''آپ کے لیے بڑی مشکل

ہو جائے گی"۔ محمود اعظم فاروقی صاحب نے قدرے تلخ لہجے میں پوچھا: "کیا مشکل ہو جائے گی؟" محی الحق فاروقی صاحب نے جواب دیا: "جب آپ فون اُٹھا کر کہیں گے کہ میں فاروقی بول رہا ہوں تو ہر شخص ہر مرتبہ یہ پوچھے گا کہ کون سے فاروقی؟ مسٹر فاروقی یا منسٹر فاروقی؟"

شاہ محی الحق فاروقی کے برادر نسبتی احمد حاطب صدیقی مزید بیان کرتے ہیں کہ فاروقی صاحب کیبنٹ ڈویژن کے جوائنٹ سیکریٹری تھے کہ 1990ء میں یکایک اُن کا تبادلہ ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے ڈائریکٹر فنانس کے عہدے پر کر دیا گیا۔ یہ بے نظیر بھٹو کا پہلا دورِ اقتدار تھا۔ وزیر اعظم کی ایک قریب ترین شخصیت نے اُن سے بالواسطہ طور پر ایک ایسا کام کروانا چاہا جو غیر قانونی اور ناجائز تھا۔ فاروقی صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ سزا کے طور پر وہ افسر بکارِ خاص (OSD) بنا کر ایک گوشے میں بٹھا دیے گئے۔ اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ یہ عاجز کالم نگار اُن سے ملاقات کے لیے ایک روز کراچی سے اسلام آباد پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اُن کی تعیناتی سیکریٹریٹ نمبر دو میں ہے۔ وہاں پہنچ کر اُن کا کمرہ پوچھنا شروع کیا۔ فاروقی صاحب دفتر میں بھی شیروانی اور چوڑی مُہری کا علی گڑھ کٹ پاجامہ پہن کر جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے دفتر میں "S. M. H. Farooqi" کے نام سے پہچانے جاتے تھے، جب کہ اُن کا یہ ملاقاتی ہر شخص سے 'شاہ محی الحق فاروقی' کو پوچھتا پھر رہا تھا۔ بالآخر ایک صاحب نے

تفتیشِ مزید کی خاطر شکل، صورت اور حلیہ پوچھا تو لفظوں میں اُن کا سراپا کھینچ دیا۔ وہ لہک کر بولا: ''اچھاآآآ ..... وہ پاجامے والے سیکریٹری؟'' تب یاد آیا کہ اُن کی نمایاں شناخت تو اُن کا لباس ہی ہے۔ خوش ہو کر کہا: ''جی ہاں..... وہی وہی''۔ یوں ہم اُن کے کمرے میں پہنچائے گئے۔ سب سے پہلے ہم نے اُن کو یہی قصہ سُنایا اور اُن سے کہا کہ: ''صاحب! یہاں تو آپ پاجامے والے سیکریٹری کے طور پر پہچانے جاتے ہیں''۔ کہنے لگی: ''ہاں میاں..... اب یہاں بس ایک میں ہی تو پاجامے والا رہ گیا ہوں''..... شہر کراچی سے ایک محبت کرنے والا شخص اٹھ گیا، فاروقی صاحب کا ہر چاہنے والا ان کی جدائی کے کرب کو اپنے دل میں محسوس کررہا ہے:

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

زندگی اک تماشا۔ ایک معلّمہ کی خودنوشت

بچپن میں پولیو کی مار اور بقیہ زندگی میں انسانی رشتوں کی بے رخی کی مار۔۔۔۔۔۔ یہ ہیں شائستہ جمال اور یہ ہے ان کی چند روز قبل شائع ہونے والی خودنوشت ''زندگی اک تماشا''۔ خودنوشت کا شائع ہونا تھا کہ خاندان کے وہ لوگ جو خاتون سے پہلے ہی ناراض تھے، مزید ناراض ہوگئے۔ ناراضگی دوآتشہ سے سہ آتشہ ہوگئی۔ سچ کا تڑکا چیز ہی ایسی ہے۔ زد میں آنے والا بولایا بولایا پھرتا ہے۔ سامنا کرنے کی ہمت نہیں کرپاتا۔
خودنوشت کی اشاعت کے بعد مصنفہ سے فون پر رابطہ ہوا۔ راقم کو 'سر' کہہ کر مخاطب کررہی تھیں۔ بے اختیار پوچھ بیٹھا 'آپ کی مدت ملازمت کتنی باقی ہے؟''۔۔ ''دو سال بعد سبکدوشی ہے''۔۔۔۔۔۔ہم نے عرض کیا'' پھر تو ہمیں آپ کو سر کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ خودنوشت لکھ آپ نے مردوں والا کام کیا ہے''۔
مقتدرہ قومی زبان کے سابق سرخیل ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں ''شائستہ کی آنکھوں کی چمک ، چہرے کی معصومیت، لہجے کی کھنک اور اپنی شخصیت پر اعتماد سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کبھی بچپن میں پولیو کی یلغار نے اس سے کچھ چھینا بھی ہے، یا محبت کرنے والے باپ نے آنکھیں موند کر 'للن میچی' کے

المناک کھیل کو ایک زندگی سے بھی زیادہ طول دے دیا ہے، اس کے ددھیال والے رشتے ایسے ٹوٹے کہ ان کی بازیابی کی تمنا اس کے دل سے اب تک نکل نہیں سکی، اس کی بیوہ ماں نے اور شادی کرکے اس کے معصوم دل کو خراش لگائی، جو تب بالکل نہیں جانتا تھا کہ ایک خوب رو بیوہ کے لئے اپنے یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنے والے دردمند ہاتھ اور دستِ ہوس میں امتیاز کرنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر انوار احمد نے مذکورہ خود نوشت کا مقدمہ لکھا ہے۔ لیکن آخر میں ایک ایسی بات لکھ گئے ہیں جس پر ان اپنا مقدمہ کمزور ہوگیا ہے۔ فرماتے ہیں " اب بھی جو احباب ایک سو روپے میں ایسی اچھی کتاب خریدنا چاہیں۔ وہ لوگ ڈاکٹر روبینہ ترین (ملتان)، ڈاکٹر شاہ محمد مری (کوئٹہ) سجاد نعیم (خانیوال) ، حمیرا اشفاق (اسلام آباد)، ظفر ہرل (فیصل آباد) تک اپنے پیسے اور پتے بھجوادیں۔ مجھ سے وہ رابطہ کریں جو پورا ایک سو یکمشت ادا نہ کرسکتے ہوں۔"

ڈاکٹر انوار نے تین سو روپے کی اس کتاب کی قیمت سو روپے لکھی ہے۔ شاید بقیہ دو سو روپے وہ پر نسخے پر خود اپنی جیب سے ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ نیز یہ کہ انہوں روبینہ ترین و دیگر لوگوں کے نام لکھ کر یہ تصور کرلیا ہے کہ گویا ان حضرات سے پورا ملک بخوبی واقف ہے کہ اگر کتاب کی قیمت محض ان کے

ناموں کے بل بوتے پر ان کے شہروں میں بھیج دی جائے تو یہ ان تک بہ آسانی پہنچ جائے گی۔یک مشت ادا نہ کرنے والوں کو کتاب کی فراہمی کا فراخدلانہ وعدہ کرکے ڈاکٹر صاحب نے آبیل مجھے مار والے محاورے کو آواز دی ہے۔ ہمارے ملک میں کتاب خرید کر پڑھنے کا 'فیشن' ختم ہوتا جارہا ہے۔ لوگ اسی ادھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ کسی طرح انہیں کتاب مفت میں مل جائے۔

کتابی شکل میں اشاعت سے قبل ''زندگی اک تماشا'' ادبی جریدہ 'سنگت' کوئٹہ میں قسط وار شائع ہوئی تھی ۔ مصنفہ ،ڈاکٹر انوار کی شاگرد رہ چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے انہیں اسے کتابی شکل میں شائع کرانے پر آمادہ کیا تھا۔

شائستہ جمال کی زندگی میں ان کا بچپن ہی پر کشش تھا جب ان کے دادا حامد علی منصوری انہیں گود میں اٹھائے کراچی کے علاقے آرام باغ کے ایک فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے تھے اور وہ سوچتی تھیں کہ دو ٹوٹی سیڑھیوں والے اس زینے کو کیونکر پھلانگا جائے گا۔ ان کی دادا اور دادی نے انہیں وہ پیار دیا جو بقیہ زندگی میں انہیں کبھی نصیب نہ ہوسکا۔ ماں نے دوسری شادی کرلی۔ طنز کے تیر برساتی بہن دشمن جاں بن گئی۔ ایک بھائی چہیتا تھا، وہ اللہ کو پیارا ہوا۔ ایک شخص جو ان کے مزاج کو سمجھتا تھا، اس سے باوجود خواہش کے، شادی نہ

ہو سکی۔ غرضیکہ زندگی میں کبھی سکھ نصیب نہ ہوا۔ یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے اور خدا جانے کب تک جاری رہے گا۔ تلخ لب و لہجے کی حامل اس ضرورت سے بہت زیادہ کھری خودنوشت کی اشاعت کے بعد شائستہ جمال کی زندگی مزید اجیرن ہوئی۔ چند روز قبل شائستہ جمال راقم الحروف کو ایک گفتگو میں بتا رہی تھیں کہ جو ان کے خلاف نہ تھے، وہ بھی ہوگئے ہیں۔

صاحبو! زندہ رہنے کے لیے تھوڑی بہت منافقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دل رکھنے کے لیے چھوٹی تعریفوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ یہ بات ہم سب اچھی طرح سمجھتے ہیں اور گاہے گاہے اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو زندگی جہنم بن کر رہ جائے۔ شائستہ جمال کے چچا محمد علی منصوری، تقسیم ہند سے قبل دہلی میں قیام پذیر تھے۔ وہاں ان کی دوستی اختر الایمان سے ہوگئی۔ یہ دوستی اس وقت رشتے داری میں تبدیل ہوئی جب شائستہ جمال کی چھوٹی پھپھو سلطانہ سے ان کی شادی ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد سارے رابطے ٹوٹ گئے۔ ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی بنا پر شائستہ جمال کے دل میں سلطانہ ایمان کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ یہ گرہ ڈالنے والی مصنفہ کی اپنی بہن صوفیہ تھی۔ یہ وہی بہن ہے جس سے مصنفہ کی سرد جنگ ہمیشہ ہی سے جاری رہی۔ برف تب پگھلی جب انہوں نے ”زندگی

اک تماشا" سپرد قلم کرنے کا آغاز کیا اور انھوں نے ایک روز ہمت کر کے سلطانہ ایمان کو فون کرڈالا۔ خلاف توقع سلطانہ ایمان نے انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور شائستہ جمال ان سے یک لخت رابطے میں آگئیں۔ سلطانہ، خاندان کے لوگوں کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ بن گئیں۔

اپنی خودنوشت میں شائستہ جمال نے اپنی بہن صوفیہ سے جھگڑوں سے متعلق سب ہی کچھ بیان کر دیا ہے۔ ایک بہن اپنی بہن کی ایسی دشمن بھی ہو سکتی ہے؟ لیکن ہمارے معاشرے میں سب کچھ ممکن ہے۔

شائستہ جمال اپنی والدہ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہوئے گویا اپنی تمام زندگی کو کوزے میں سمیٹ کر قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ درج ذیل سطور میں نہ صرف مصنفہ کی نفسیاتی الجھنیں اور پریشانیاں عیاں ہو کر سامنے آتی ہیں بلکہ ہمارے بے رحم معاشرے کے وہ پہلو بھی آشکار ہوتے ہیں جن پر اس نام نہاد سوسائٹی کی بنیاد قائم ہے۔

"میں اپنی امی سے بہت محبت کرتی ہوں، ان کی بیماری کی وجہ سے فکرمند بھی رہتی ہوں۔ ان سے بدتمیزی کرنا بھی میں نے اب چھوڑ دیا ہے۔ صوفیہ اور باقی

بہن بھائیوں سے بھی مجھے بہت پیار ہے۔ لیکن ان لوگوں سے اور خاص کر امی سے بات کرتے ہوئے گزرے وقت کی تلخیوں کو بھلا نہیں پاتی۔ بچپن اور جوانی کے زہریلے پریشان کن لمحے میرے وجود کو آسیب زدہ بنا چکے ہیں۔ان لمحوں نے میرے وجود میں ایسا زہر بھر دیا ہے، جس کا تریاق شاید اب ممکن نہیں۔ بچپن میں ٹائیفائڈ کے باعث ہونے والی جسمانی معذوری کو تو میں نے کبھی اپنے راستے کی دیوار نہیں بننے دیا لیکن میری ذہنی حالت میرے لیے اکثر وجہ پریشانی بنی رہی۔ شاید میں مناسب جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگایا ہوا ایسا پودا بن گئی ہوں جو نئی جگہ کی آب و ہوا میں پنپ نہیں سکا''

زندگی اک تماشا 256 پر مشتمل ہے۔ مذکورہ خودنوشت مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد نے شائع کی ہے۔ ناشر کا رابطہ نمبر یہ ہے: 0300-6668284

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، کراچی

اکتوبر 2013۔خاکوں کے مجموعے 13

اس مرتبہ پرانی کتابوں کے اتوار بازار کا رخ کرتے وقت اپنے دوست اعجاز منگی کی وہ سطور یاد آرہی تھیں جن میں انہوں نے سندھ کے ایک صوفی منش انسان کا تعارف کرایا تھا۔ یہ ذکر ہے خورشید احمد قائم خانی مرحوم کا جنھوں نے سندھ کی اقلیتوں کے حقوق کی خاطر اپنی زندگی تج دی تھی۔ وہ تین کتابوں '' سپیاں اور پتھر''، ''بھٹکتی نسلیں''، ''سپنوں کا دیس'' کے مصنف اور خدیجہ گوہر کی کتاب '' امیدوں کی فصل'' کے مترجم تھے۔ صحافی سہیل سانگی لکھتے ہیں: '' ٹنڈوالہ یار میں وہ گھر پر شاذ و نادر ہی موجود ہوتے تھے۔ ان سے ملنے والے انہیں باگڑی کالونی، بھیل کالونی، جوگی کالونی، وغیرہ میں ڈھونڈتے تھے اور وہ وہیں ملتے تھے۔وہ اپنا وقت دانشوروں یا دوسری فضولیات میں گنوانے کے بجائے عام بھیل، کولہی لوگوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتے تھے۔ عجب شخص تھا۔ سیلانی بھی تھا اور مٹی سے محبت کرنے والا بھی۔ان کے اندر سے اپنی جنم بھومی راجستھان آخر تک نہیں نکل سکا۔ اور وہ اس لیے خود کو خانہ بدوش ہی سمجھتے تھے۔

انہوں نے زندگی میں پچھتاوے نام کی کسی چیز کو قریب آنے نہیں دیا۔ آخری ایام میں انہوں نے لوگوں سے دور رہنے اور سکون میں وقت گزارنے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ بہت لکھا، بہت باتیں کیں اور خوب محفلیں کیں۔ اب بس کرنی چاہئے۔ انہوں نے کراچی کے ایک پبلشر کو خودنوشتہ سوانح حیات شائع کرنے کے لیے دی۔ پبلشر نے یہ کتاب شائع کرنے کی ہامی تو بھر لی، مگر ان سے کہا کہ ان کے جیتے جی یہ کتاب شایع نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں بعض اداروں کے بارے میں مخالفانہ مواد ہے اس واقع کا بیان اپنی ایک کتاب کے پیش لفظ میں یوں کرتے ہیں: میں اردو پبلشروں سے مایوس ہوچکا ہوں، لہٰذا اب سندھی ناشرین سے رجوع کیا ہے ''جہاں میرے موضوعات کے بڑی تعداد میں قاری بھی موجود ہیں۔

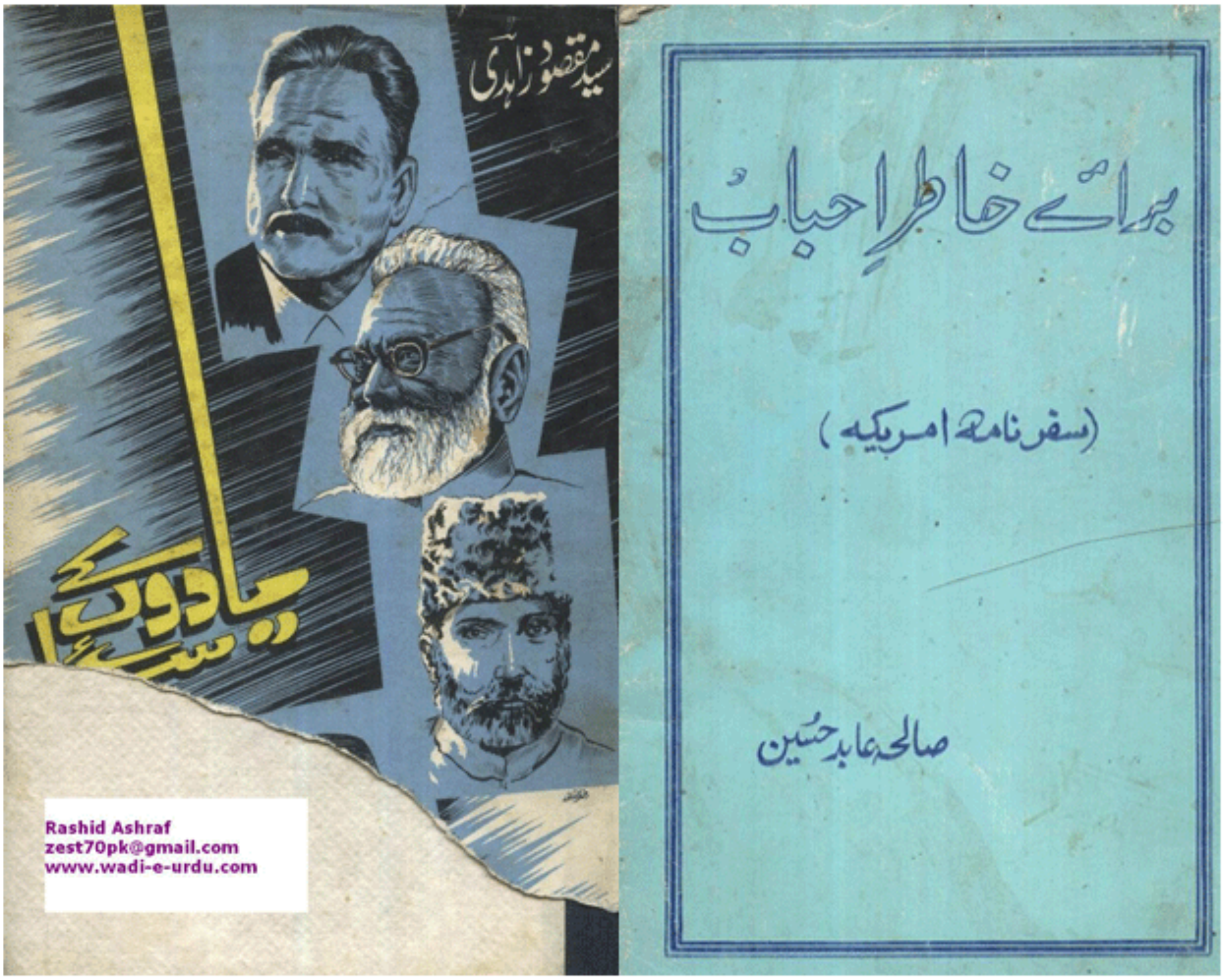

.برادرم اعجاز منگی نے خورشید قائم خانی کی ایک تخلیق پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ اشعار فیض صاحب سنتے تو اپنے مجموعہ کلام کا انتساب اس شاعر کے نام کرتے جو ساری زندگی گمنام ہی رہا۔ جس نے ساری زندگی عدالت کی ملازمت میں اپنی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر چلائیں.......بقول اعجاز، ایسے اشعار چراغوں کی طرح تاریخ کے طوفان میں زندہ رہتے ہیں، جن کی لو آنکھ جیسی اور تیل لہو ہوا کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

احسانِ عیادت ان کا یہ بیمار پر ہے
اور زور بھی گرتی ہوئی دیوار پر ہے
مطربا دیکھ کہیں یہ میری شہ رگ تو نہیں
تیری انگشت حسیں، ساز کی جس تار پر ہے

راقم انہی اشعار کی سرشاری میں اتوار بازار پہنچا تھا۔

اس مرتبہ شخصی خاکوں کی کتابوں نے میدان مار لیا۔ نیم رخ کے عنوان سے پروفیسر مجتبی حسین کی کتاب 1978 میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی ''چند شخصیتیں چند تاثرات'' نامی کتاب جولائی 1962 میں شائع ہوئی۔ جبکہ تیسری کتاب سید مقصود زاہدی کی ''یادوں کے سائے'' ہے جو اتوار بازار ہی سے وابستہ ایک شخص کے ذریعے گزشتہ ہفتے ملی تھی اور جس کا تذکرہ زیر نظر احوال کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ زاہدی صاحب کی کتاب کے مطالعے

کے بعد احساس ہوا کہ یہ بلاشبہ صنفِ خاکہ نگاری میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ انداز بیان، تحریر کا حسن و بانکپن اور اس کی چاشنی بالکل ویسی ہی ہے جیسے 'کیا قافلہ جاتا ہے' میں نصر اللہ خاں کی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ کتاب چراغ حسن حسرت، ماہر القادری، ڈاکٹر اسلم فرخی و دیگر بلند پایہ ادیبوں کی لکھی خاکوں کی کتابوں سے معیار کے معاملے میں کسی طور بھی ہلکی پڑتی ہے۔ مولوی عبدالحق ہوں یا ظفر علی خان، ڈاکٹر عابد حسین کا تذکرہ ہو یا پھر یلدرم و نیاز فتح پوری کا، مصنف نے قلم کا حق ادا کردیا ہے۔ مگر دلی کے مولوی عبدالسلام نیازی اور آغا طاہر نبیرہ آزاد کے خاکوں کی تو چھب ہی نرالی ہے۔ یہ زندہ رہنے والے خاکے ہیں۔ افسوس کہ یہ کتاب اپنی اشاعت کے بعد وقت کے دھندلکوں میں کھو کر رہ گئی۔ اشاعت ثانی کے بارے میں کسی کو خیال ہی نہ آیا۔ یہ کسی نے نہ سوچا کہ اس نوع کی تحریروں کو تو بار بار قارئین کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔ مقصود زاہدی کو شہر ملتان سے عشق تھا۔ تقسیم ہند کے بعد قدم اکھڑے تو ساری زندگی ملتان ہی میں گزری۔ آخری وقتوں میں طوعاً و کرہاً اسلام آباد میں سکونت اختیار کی اور بقول فارغ بخاری، ملتان سے دوری کا یہی غم انہیں لے ڈوبا۔

اردو کے رباعی گو شاعر، افسانہ نگار سید مقصود زاہدی 6 فروری 1918 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ہومیو پیتھ معالج کی حیثیت سے نام کمایا۔ ذکر و فکر کے عنوان سے ان کے افسانوں کی پہلی کتاب 1942 میں شائع ہوئی تھی۔ 6 نومبر 1996 کو اسلام آباد میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے

ڈاکٹر انور زاہدی ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی جبکہ صاحبزادی ماہ طلعت زاہدی کا نام بھی ادبی حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔

مقصود زاہدی، یادوں کے سائے کو اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے شندرات کا نام دیتے ہیں۔ ایسے شندرات جنہیں مصنف نے یادوں کے دریچوں سے سایوں کی مانند پھیلتے دیکھا ہے۔ مقصود زاہدی، بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ملاقات کو گئے تو اس وقت نوعمر تھے، جاتے ہی اپنی کتاب ذکر و فکر مولوی صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ عبدالحق صاحب بولے "بھئی آپ کے داڑھی تو ہے نہیں، پھر آپ کی تصنیف میں کیا ذکر و فکر ہوگا"۔ مقصود زاہدی کو کیا سوجھی کہ یک دم بول پڑے " مولوی صاحب قبلہ، بعض "لوگوں کے چہرے پر داڑھی ہوتی ہے بعض کے پیٹ میں

مولوی صاحب کی آنکھوں میں شوخی کی لہر نمودار ہوئی، بولے " گویا اس تصنیف میں وہ ذکر و فکر ملے گا جو پیٹ میں داڑھی والوں کا ہوتا ہے۔ آپ بہت شوخ معلوم ہوتے ہیں "

مقصود زاہدی نے معافی مانگتے ہوئے جواب دیا" مولوی صاحب، میں تو شاید عمر کے تقاضے سے ایسا نظر آتا ہوں لیکن آپ تو اس سن و سال کے باوصف اتنے

''شوخ ہیں

مقصود زاہدی کو مولوی عبدالحق سے ہونے والی آخری ملاقات بھی یاد رہی۔ بیان کرتے ہیں: '' ان دنوں مولوی صاحب کوئی بیاسی تراسی کے لپیٹ میں تھے۔ ان کی طبیعت میں جو طنطنہ تھا، وہ چڑچڑے پن میں تبدیل ہوگیا تھا۔ وہ حکومتی اہلکاروں سے بھی دل برداشتہ تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی۔ باتوں باتوں میں مقصود زاہدی سے کہنے لگے ' یہاں تو ہر شخص نے پاکستان کو مال غنیمت سمجھ رکھا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کی ہر ایک کو پڑی ہے۔ ہر شخص اس نوزائدہ مملکت پر اپنے حقوق جتاتا ہے اور اپنے فرائض کی طرف بہت کم حضرات متوجہ ہیں۔ شاید ابھی مسلمانوں کا شعور اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ ''انہیں ایک آزاد مملکت کا انعام قدرت کی طرف سے ملتا۔

مقصود زاہدی نے مولانا حسرت موہانی کا خاکہ بھی خوب لکھا ہے۔ انہوں نے مولانا کا تذکرہ سن رکھا تھا اور دید کی حسرت دل میں موجزن تھی۔ 1938 کے آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس میں مقصود زاہدی کی حسرت پوری ہوئی۔ لکھتے ہیں:

اجلاس میں مولانا کی زیارت سبھوں نے کرلی۔ وہ ایک عجیب سے غریب سے بے '' ڈھبے، بدوضع اور بدقطع انسان تھے جن کی کوئی بات اور کوئی قرینہ ڈھنگ کا نظر نہ آتا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی جس کا پھندنا غالباً دانستہ پیلے

دھاگوں کا بنا کر ڈال لیا گیا تھا۔ عینک وہی تھی جو بوڑھے دہقان سستی سے سستی چلتے پھرتے عینک والوں سے خرید کر لگا لیا کرتے تھے۔ اس کی ایک طرف کی کمانی ثابت تھی اور دوسری سمت کی ٹوٹی ہوئی کمانی کا کام موٹے سوتی دھاگے سے لے لیا گیا تھا۔ کپڑے کھدر کے تھے لیکن کپڑوں پر کھدر ہی کی سبز رنگ کی کوئی شے پہن رکھی تھی جسے جی چاہے تو اچکن کہہ لیجیے جی چاہے عبا کہہ لیجیے۔ جوتے جاپانی کینوس کے تھے لیکن جوتوں پر نیلی سیاہی پوتی ہوئی تھی۔ چہرے پر ناک چھائی ہوئی تھی اور بے طور بڑھی ہوئی داڑھی نے چیچک رو چہرے کے تین چوتھائی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مولانا اس ہیئت کذائی میں پنڈال میں پھر رہے تھے لیکن وہ جس جانب بھی نکل جاتے حاضرین میں سرگوشیاں شروع ہوجاتیں اور جب وہ کسی بھی کرسی نشینوں کی قطار تک پہنچتے تو لوگ خواہ "مخواہ کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر کھڑے ہونے لگتے۔

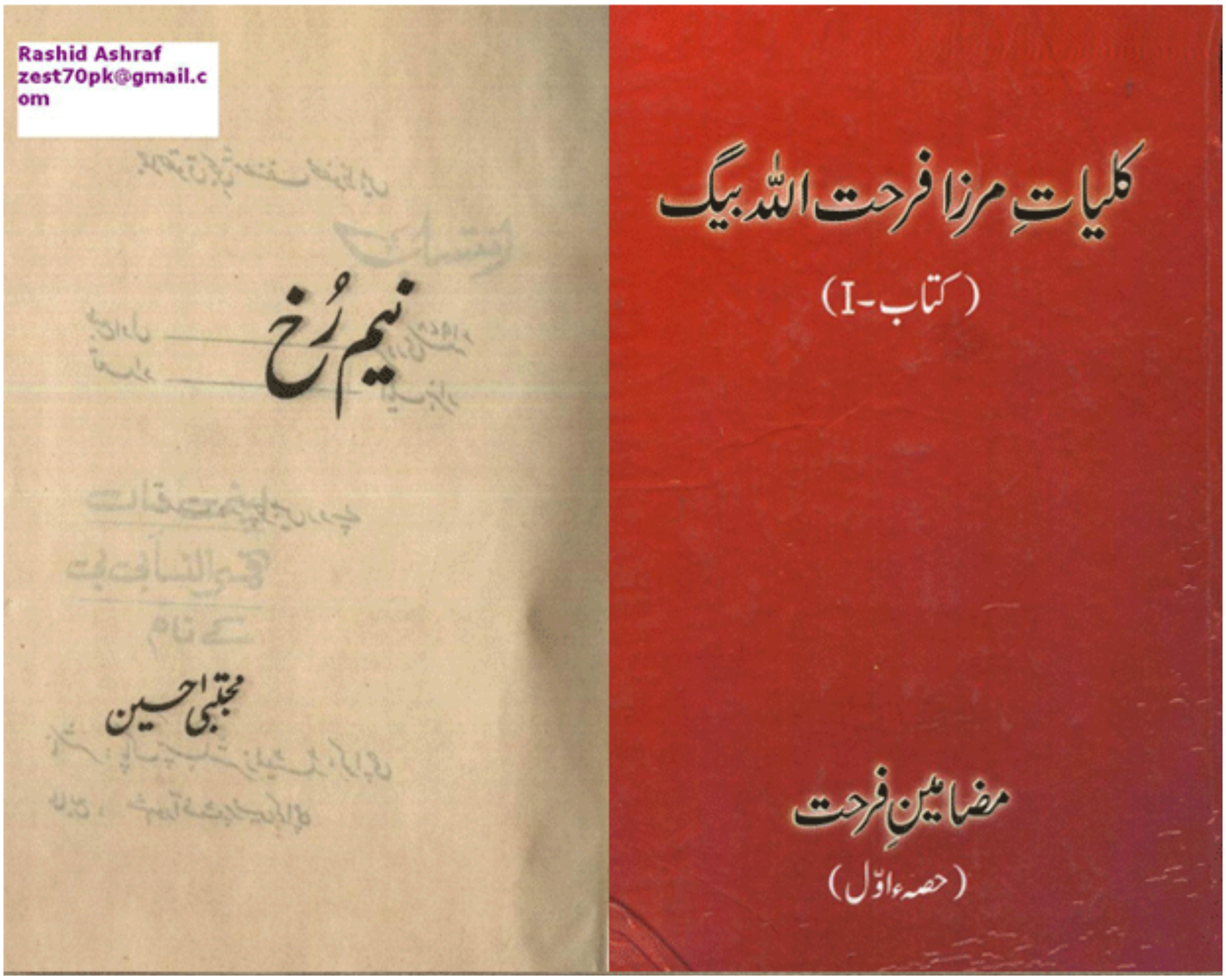

ایک موقع پر مقصود زاہدی نے مولانا حسرت موہانی کی شخصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے
مولانا عوام کو منظم کرنے کی صلاحیتوں سے بالکل عاری تھے۔ وہ لوگوں کو اپنے گرد و " پیش جمع نہیں کرسکتے تھے۔ وہ ایسے سالار لشکر تھے جو فوج کی رہنمائی کرتے کرتے عین ہنگامہ کارزار میں گم بھی ہوسکتے تھے۔ میدان چھوڑ کر نہیں بلکہ عرصہ جنگ میں کسی گوشے میں بیٹھ کر ایک غزل لکھنے کے لیے۔ مولانا کا تغزل اور تصوف، دونوں انہیں ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو سے گوشہ تنہائی میں کھینچ کر لے جاتے تھے۔ یہ مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا تضاد رہا۔ ایک ہی ذات میں بیک وقت اتنی صفات کا اجتماع لاکھوں کیا کروڑوں انسانوں میں کسی ایک میں بمشکل مل سکتا ہے۔ ایک حسن پرست حسن کی ادا شناس رکھنے والا شاعر، ایک صوفی صافی اشتراکی اور انقلابی تصورات کا حامی۔انگریز سامراج کا دشمن، حق بات پر مٹنے والی کوہ ثبات طبیعت اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک عاجز و مسکین، گدائے بوریہ نشین، محنت و مشقت کی توفیق کو سب سے بڑی سعادت سمجھنے والا۔ کبر و نخوت، " زاہدانہ غرور سے متنفر، سادہ وبے ریا انسان مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

نبیرہ آزاد، آغا طاہر کے خاکے میں ایک زندہ دل انسان کا تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے۔" آغا طاہر کے برادر خورد نے ریڈیو کی دنیا میں بہت نام کمایا۔ ان کو اہل علم آغا اشرف کے نام سے جانتے ہیں۔ آغا اشرف، ذوالفقار علی بخاری کے ہمراہ بی بی سی ریڈیو کے ہندوستان میں قیام و آغاز ہی سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آغا طاہر، اپنے چھوٹے بھائی آغا اشرف سے خوش نہیں تھے۔ اس ضمن میں مقصود زاہدی بیان کرتے ہیں:

" آغا طاہر اگرچہ خود بلا کے ذہین انسان تھے لیکن انہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی قابل ذکر معرکہ سر نہ کیا۔ وہ ایک مجلسی انسان تھے اور ساتھ ہی سخت قسم کے گھریلو بھی۔ دو اپنے دونوں لڑکوں سے بے اندازہ محبت کرتے تھے۔ وہ آغا اشرف سے، جو ان کے چھوٹے بھائی تھے، بہت محبت کرتے تھے لیکن کبھی کبھار ایسی باتیں بھی ان کے منہ سے نکل جاتی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی سے جو توقعات انہوں نے قائم کیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ ایک دن جب میں نے ان کی دنیاوی ترقی اور کامیابی کا ذکر کیا تو انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور فوراً ایک شعر پڑھا جو مجھے آج تک یاد ہے:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ

داد را نمی زیبد بال و پر بمن تنہا

واضح رہے کہ آغا اشرف بی بی سی سے پطرس بخاری سے ایک چھوٹی سی بات پر ہوئے اختلاف کی بنا پر بی بی سی کو خیر باد کہہ گئے تھے۔ اس ضمن میں اخلاق احمد دہلوی بیان کرتے ہیں:

آغا اشرف جیسا کھنک دار آواز کا اناونسر دنیا کے کسی ریڈیو اسٹیشن سے آج تک نہیں سنا گا۔ ان کے گلے میں جیسے اشرفیاں کھنکتی تھیں اور یہ خوبصورتی ان کی آواز میں قدرتی تھی کہ لوگ ان کی آواز سننے کے لیے اس زمانے میں ریڈیو خریدتے تھے۔ ان کا کچھ تنازعہ پطرس بخاری سے مٹی کے تلفظ پر ہو گیا تھا۔ آغا اشرف کہتے تھے 'مٹی' بالکسر بھی درست ہے اور بالفتح بھی۔ لیکن پطرس صاحب کا اصرار تھا کہ لفظ مٹی زبر سے ہے، زیر سے نہیں۔ اس پر آغا اشرف استعفی دے کر ڈیرہ دون چلے گئے۔ دون کالج میں انگریزی کے لیکچرار بن کر اور پھر بی بی سی لندن سے آداب عرض کہا اور آخر کار اقوام متحدہ میں ریڈیو کے شعبے کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے وفات پائی۔"۔ (یادوں کا (سفر۔ خود نوشت۔ اخلاق احمد دہلوی

یوں تو آغا طاہر کا مکمل خاکہ ہی لائق مطالعہ ہے لیکن اس کے آخر میں مقصود زاہدی نے آغا صاحب کا بیان کردہ ایک چشم کشا واقعہ درج کیا ہے۔ تقسیم کے

دنوں میں آغا طاہر دیگر مسافروں کے ہمراہ جس ٹرین میں پاکستان جانے کے لیے سوار تھے، وہ امرتسر اور لاہور کے کہیں وسط میں اچانک رک گئی۔ مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت تھا، گاڑی ہلنے کا نام نہ لیتی تھی، اندھیرے میں پھیلا ہوا سناٹا کلیجوں کو دہلائے دے رہا تھا، جان کے خوف سے سہمے مسافروں کے چہروں پر موت کی زردی چھا چکی تھی۔ یکایک دور سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شور بھی ایسا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ حملہ آور تعداد میں زیادہ ہیں اور اب کچھ ہی دیر میں سر پر پہنچ کر سبھوں کو تہ تیغ کر دیں گے۔ لبوں پر دعائیں تھیں لیکن مقابلے کے لیے کچھ پلے نہ تھا۔ اچانک کھٹ کھٹ کی آواز نے سناٹے کو توڑ دیا اور پھر دور کسی شخص کے بولنے کی آواز آتی رہی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ہر ڈبے کے سامنے رکتا تھا اور اپنی بات دوہراتا آگے بڑھ جاتا تھا۔ چند لمحوں میں وہ آغا طاہر کے ڈبے تک

آن پہنچا۔ مقصود زاہدی کی زبانی آگے کا احوال پڑھیے:

پھر اس شخص کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا:

”بھائیو! مسلمانو! دیکھو دشمن آرہے ہیں۔ یاد رکھو موت کا ایک وقت معین ہے۔ جس کی آئی ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی اور جس کی موت نہیں آئی اسے دنیا کی کوئی طاقت مار نہیں سکتی۔ مصیبت کے وقت صبر اور عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تمہارے پاس جتنے بھی ٹرنک اور بھاری سامان ہیں اسے ڈبے کی دیواروں کے ساتھ دروازوں اور کھڑکیوں سے پیوستہ کرکے رکھ دو۔ اس

کے پیچھے اپنے بستروں اور گٹھڑیوں کو رکھ دو۔ آگے جوان اور پیچھے بوڑھے مرد بیٹھ جائیں۔ڈبے کے عین درمیان عورتوں اور بچوں کو کرلو۔ حملہ آور تیزی سے آئیں گے۔ وہ دروازے اور کھڑکیاں توڑنے کی کوشش کریں گے۔ جس ڈبے کو وہ توڑنے میں کامیاب ہوجائیں گے، اسی میں گھس کر لوٹ مار کا سلسلہ شروع کردیں گے اور پھر بھاگ جائیں گے۔ بس ان باتوں کو اپنے پلے میں باندھ لو اور جلدی سے اپنی پوزیشنیں درست کرلو۔ ہمت اور حوصلہ بڑی چیز ہوتا ہے۔"

آغا صاحب فرمانے لگے کہ یہ جاں بخش مختصر تقریر سننے کے بعد ایک دم سے میری سوئی ہوئی لیڈرشپ کی حس بیدار ہوگئی۔ میں نے فوراً لوگوں سے کہا آنا! فاناً میں کھڑے ہوجاؤ اور یہ بندوبست کرڈالو۔ دیکھتے ہی دیکھتے منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں ٹرنک کھڑکیوں کے آگے رکھ دیے گئے۔ ٹرنکوں کے پیچھے بستر آگئے۔ بستر کے پیچھے جوان اور تنومند لوگ بیٹھ گئے اور جوانوں کے عقب میں بوڑھے اور ڈبے کے عین وسط میں عورتیں اور بچے سما گئے اور سب مسافر آنے والے خطرے کے مقابلے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں دیر تک آتی رہیں اور ساتھ ہی اس جواں مرد اور باہمت انسان کے سمجھانے کی آواز آتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ حملہ آوروں کے نعروں اور شور و غوغا میں بالکل دب گئی۔ کچھ دیر بعد حملہ آور سر پر پہنچ گئے اور پھر ایک دم سے شور قیامت مچ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سروں پر تبر اور کلہاڑے برس رہے ہوں۔ ہمارے ڈبے پر بھی

بیسیوں کاری ضربیں لگیں لیکن حملہ آور ناکام ہو کر آگے بڑھ گئے۔ چند منٹ کے بعد واویلا اور آہ وزاری کی فلک شگاف چیخ دھاڑ نعروں کی آوزوں پر غالب آ گئی۔اس یلغار کے کافی دیر بعد ہماری گاڑی چل پڑی۔ جب ہم واہگہ کی سرحد پر پہنچے اور اتر کر اپنی گاڑی کا جائزہ لیا تو دو درجے ایسے نظر آئے جو خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ شاید یہ وہ ڈبے تھے جن کے مسافروں نے اس عالی ہمت انسان کی باتوں کو لائق اعتنا نہ گردانا تھا اور حفاظتی تدابیر نہ اپنائی تھیں۔

مقصود زاہدی بیان کرتے ہیں کہ یہ واقعہ سنانے کے بعد آغا طاہر کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہو گئی۔ ایک طویل عرصے کے تعلق کے دوران مقصود زاہدی نے آغا صاحب کو کبھی روتے نہ دیکھا تھا۔وہ بچوں کی طرح زاہدی مرحوم سے پوچھ رہے تھے "مقصود! کیا تم کو یقین ہے کہ پاکستان قائم رہے گا؟ اگر پاکستان قائم نہ رہا اور اسے استحکام نصیب نہ ہوا تو مسلمانوں کا ہندوستان کے طول و عرض میں یہی حشر ہوگا جو اس ریفیوجی اسپیشل کے مسافروں کا ہوا تھا"۔

: سید مقصود زاہدی نے اس بات کا وہی جواب دیا جو ان جیسی شخصیت کو دینا چاہیے تھا آغا صاحب! جب تک کسی گروہ میں ایسے افراد موجود ہیں جیسا کہ وہ عظیم "

انسان تھا جو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اس خوفناک رات کو، اس ہیبت ناک عالم میں اسپیشل کے مسافروں کو ہمت
'' اور حوصلہ دے رہا تھا، اس وقت تک کوئی قوم فنا کے گھاٹ نہیں اتر سکتی

یادوں کے سائے'' میں مولوی عبدالسلام نیازی کے عمدہ اور جامع خاکے کا تذکرہ اوپر کیا گیا تھا۔ مذکورہ خاکے''
کے مطالعے کے بعد ہی راقم الحروف نے مولوی صاحب پر لکھی تحریروں کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا اور چند مخلص
کرم فرماؤں کے تعاون سے اس سلسلے میں خاصی پیش رفت ہو چکی ہے۔

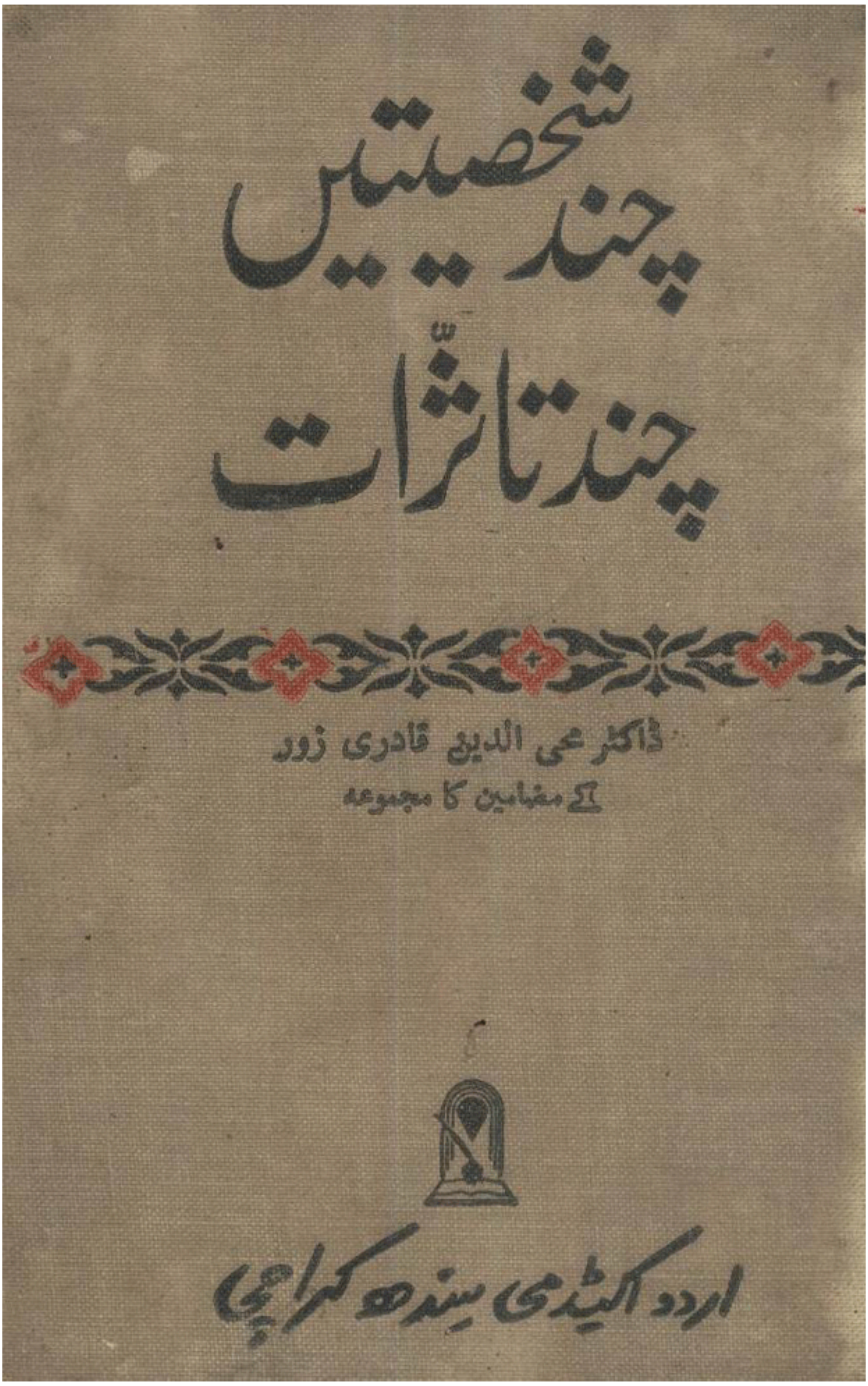

مقصود زاہدی ، ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھے۔ ناصر کاظمی کے آخری ایام میں جب ان سے

مل کر آئے تو ناصر کاظمی کی حالت دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ وہ چراغ سحری ہیں۔ اسپتال کے کمرے سے باہر نکل کر مقصود زاہدی اپنے ہمراہ موجود ایک عزیز سے کہنے لگے "اگر ناصر ٹھیک ہوگئے تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔ ناصر، ظاہری تمام قرائن سے صرف چند دن کے مہمان ہیں۔ کتنے دن کے، یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں کوئی پیش گوئی نہیں کر رہا بلکہ اپنے معالجانہ تجربے کی رو سے مریض کی حالت دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔"

مجتبی حسین کی "نیم رخ" میں جن شخصیات پر طویل خاکے ہیں ان میں شامل ہیں یگانہ چنگیزی، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، نہال سیوہاروی، میرا جی، مجاز، فیض احمد فیض، سلام مچھلی شہری اور عزیز حامد مدنی۔

چند شخصیتیں چند تاثرات میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جن شخصیات پر لکھا ہے ان میں شامل ہیں: اصغر گونڈوی، عظمت اللہ خاں، سالار جنگ، صاحبزادہ میکش، مولوی محمد مرتضی، سر مہدی یار جنگ، پنڈت دتاتریہ کیفی، خواجہ حسن نظامی، سید علی منظور، مولوی عبد الحق، جگر مراد آبادی، امجد حیدر آبادی، نواب زین یار جنگ، مولوی تمکین کاظمی اور مولوی عبدالقدیر صدیقی حسرت۔

مجتبی حسین کی "نیم رخ" بھی ایک خوب کتاب ہے۔ طویل خاکے بلکہ تذکرے کہیں

: تو زیادہ بہتر ہوگا۔ مجاز کے بیان میں لکھتے ہیں

بمبئی کے علاوہ غالباً 1976 میں بھی ان سے الہ آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ” ملاقات بھی فراق صاحب کے یہاں ہوئی۔ شام کے وقت جب میں فراق صاحب کے یہاں پہنچا تو مجاز کھڑے ہوئے فراق صاحب سے انگلی کے اشارے سے بار بار کہہ رہے تھے ’ فراق جب ہم تمہیں اپنی طرف بلائیں گے تو تمہیں آنا پڑے گا۔ ‘ ۔فراق صاحب مجاز کی اس ہذیانی کیفیت سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہیں سہارا ملا۔ انھوں نے حکم دیا کہ میں کسی طرح مجاز کو وہاں سے لے جاؤں۔ بدقت تمام کسی طرح سمجھا بجھا کر انہیں ہٹا لے جانے میں کامیابی ہوئی۔ رام نرائن کے چوراہے پر پہنچ کر میں نے تانگہ کیا۔ مجاز کو بہ ہزار خرابی تانگے پر بیٹھنے پر راضی کیا۔ جب تانگہ چلا تو ان پر : ایک اور دورہ پڑا۔ وہ دفعتاً رونے لگے، کہنے لگے

مجتبی میں بہت خراب ہوگیا ہوں ۔مگر اس پر بھی جب میں پہنچتا ہوں تو میری ماں میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے۔

: روتے روتے نہ معلوم انہیں کیا سوجھی، کہنے لگے

جب میکسم گورکی کی ماں ہو سکتی ہے تو میری بھی ماں ہو سکتی ہے۔اور مجھے تقریباً چیخ کر : حکم دیا

’ کہو ماں ‘

چنانچہ ہم دونوں نے ماں ماں کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ یہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ ممکن ہے وہ تانگے سے اتر جاتے۔شارع عام پر ہی چیخنا شروع کر دیتے۔ رات ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر بڑی بھیڑ تھی۔ "

مجاز سے مجتبیٰ حسین کی آخری ملاقات کراچی میں ہوئی جہاں مجاز مشاعرہ پڑھنے آئے تھے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کی مانند۔خاصا مجمع تھا، طلبہ کا غلبہ تھا۔ مجاز نے ''آوارہ'' کے چند بند سنائے مگر پھر نقاہت کے باعث اسے درمیان ہی میں چھوڑ کر اسٹیج پر جا بیٹھے۔ ادھر سامعین کا شور کہ وہ مجاز کو سننا چاہتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

بارے مجاز ڈائس پر آئے۔انہوں نے ''اعتراف'' سنانی شروع کی۔ وہ پڑھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کی سانس بار بار ٹوٹ جاتی اور وہ رک جاتے۔ انہیں مستقل کھانسی آ رہی تھی اور وہ ہر جھٹکے کے ساتھ سینہ تھام لیتے۔ طلبہ کا مجمع کچھ بے چین اور بے کیف ہوا جا رہا تھا۔ بعض گوشوں سے ہوٹنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ مگر مجاز سامعین کی اکتاہٹ سے بے خبر ہو کر پڑھے جا رہے تھے:

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

ان کی آواز میں ایک عجیب حزن آگیا تھا۔ مجاز اپنی بربادی کا مرقع بنے ہوئے نظم پڑھ رہے تھے۔ ان کی لے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹتا نہیں تھا، بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ مگر اس ٹوٹ جانے میں بھی ایک کیفیت تھی۔ ایک عظیم شکست و ریخت کا تاثر تھا۔ رفتہ رفتہ مجمع کی ہنسی رک گئی۔ اور خاموشی چھا گئی۔ دفعتاً میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے دوسرے سے پوچھا 'یہ کون شاعر ہے'۔

معلوم نہیں اس نے کیا جواب دیا۔ کیا جانے اسے بھی معلوم ہو یا نہ رہا ہو۔ میں اس سوال یک عہد کچھ اور نہیں سن سکا۔ زمانہ اتنا بدل گیا ہے، اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا۔ جس مجاز کے نام پر بقول عصمت چغتائی، لڑکیاں قرعے ڈالتی تھیں۔ جس کے نام کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ آج اسے ایک درس گاہ کی ادبی محفل میں طالب علم جانتے بھی نہیں۔

(اس کے بعد میں مجاز سے کبھی نہیں مل سکا۔ (مجتبیٰ حسین

:اتوار بازار سے ملنے والی کتابوں کی تفصیل یہ ہے

:یادوں کے سائے۔ شخصی خاکے۔ سید مقصود زاہدی۔ مکتبہ کارواں، ملتان ۔اشاعت

1976

نیم رخ۔ شخصی خاکے۔ مجتبی حسین ۔پاک پبلشر لمیٹڈ، کراچی ۔اشاعت : فروری

1978

چند شخصیتیں چند تاثرات۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ سندھ یونیورسٹی پریس،

حیدرآباد سندھ۔اشاعت: جولائی 1962

برائے خاطر احباب ۔ سفرنامہ۔ صالحہ عابد حسین

کلیات مرزا فرحت اللہ بیگ ۔ حصہ اول۔ علی ظہیر نے حیدرآباد دکن سے شائع

کی۔اشاعت:2007

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، کراچی

17 نومبر 2013۔ باقر مہدی کی یاد میں

پرانی کتابوں کا اتوار بازار، علی الصبح کا وقت، جانب بازار گامزن ہونے کے دوران چند روز قبل احباب سے ہوئی گفتگو ذہن و قلب میں حاوی تھی۔ ہوا یوں کہ پاکستان میں کھمبیوں کی مانند اگ آنے والے ان گنت نوزائیدہ ٹی وی چینلز میں سے ایک نے رات آٹھ بجے اپنے پرائم ٹائم کے ایک اہم سیاسی پروگرام میں سرخی دکھائی کہ " اجلت میں کیے گئے اس فیصلے............"۔ راقم نے اس روح پرور منظر کی ایک تصویر محفوظ کرکے فیس بک پر آویزاں کردی اور احباب کے تبصروں کی بھرمار ہوگئی۔ ایک صاحب نے جون ایلیا کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ "یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں"۔ چند روز پیشتر پاکستان اور جنوبی افریقہ کے مابین تیسرا کرکٹ میچ کھیلا جارہا تھا۔ ایک "جید" ٹی وی چینل پر اچانک سرخی چھا گئی، لکھا تھا" جنوبی افریقہ کے خطرناک کھلاڑی ڈومنی آوٹ ہوگئے"۔

یاخدا۔ ہم نے سوچا۔ کیا جنوبی افریقہ کی ٹیم میں اب ڈومینیاں بھی کھیلنے

لگیں ؟

Jean-Paul Duminy ہیں جن کو ''ڈومینی'' کے بجائے وہ لکھا گیا معلوم ہوا کہ یہ ہے جس سے ذہنوں میں ایک 'خوشگوار' ابہام کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر راقم نے محمود شام صاحب کا سنایا ہوا وہ قصہ یہاں احباب کے سامنے پیش کیا تھا جس میں کچھ اسی قسم کی بات کی گئی تھی۔ یہ سب سے بڑے چینل ہونے کے دعوے دار ٹی وی چینل پر میک اپ میں لتھڑی ہوئی ایک خبریں پڑھنے والی خاتون کا قصہ تھا۔ پاکستان میں 2009 میں آنے والے سیلاب کے دنوں میں کیے گئے ایک براہ راست پروگرام کے دوران وہ ناظرین سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے فرما رہی تھیں کہ ''آگے بڑھیے ! ہم آپ کی دست درازیوں کے منتظر ہیں'' ۔

کوئی پوچھے کہ بھلے مانسوں ، ہم ایسے لوگ کہیں پھسلے تو فرق نہیں پڑے گا، تم پھسل جاؤ گے تو ان گنت ناظرین بھی تمہارے ساتھ ہی غوطہ کھا جائیں گے۔

ابن صفی مرحوم نے اپنے ایک کردار علی عمران کی زبانی علامہ کے ایک شعر کو یوں کہلوایا تھا :

خدا تجھے کسی ''دہقان'' سے آشنا کر دے

کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

صاحبو! خدا لگتی کہوں گا کہ یہ ان گنت ٹی وہ چینلیز پر براجمان ''لینکر پرسنز'' ، صحافی کم اور اخباری ہاکر زیادہ لگتے ہیں۔ لمحے لمحے بعد بریکنگ نیوز دینے کی دوڑ نے وہ سماں باندھا ہے کہ الامان۔ سندھ کے شہر سکھر میں شوہر نے بیوی کو پیٹ ڈالا.....اس تاریخی موقع کی خبر ''بریکنگ نیوز' کے عنوان سے ہم نے خود دیکھی ہے۔

ریڈیو کی بھی سن لیجیے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی سے روایت ہے کہ ذوالفقار علی بخاری کے دور میں عابد علی عابد کی غزل '' بہ وصف عقل میری چاک دامانی نہیں جاتی'' گائی جارہی تھی ۔ مغینہ کچھ یوں غزل سرا تھیں:

بہ وقت وصل میری پاک دامانی نہیں جاتی

ذوالفقار علی بخاری اس وقت ریڈیو سن رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ریڈیو کے کنڑول روم میں فون کیا اور یوں اس فاش مگر دل لبھاتی غلطی کی تصحیح کی گئی۔

☆

ذکر ہے اتوار بازار کا۔ اور اس مرتبہ تذکروں اور خاکوں پر مبنی کتاب ''نیم

رخ'' نے میدان مار لیا۔ یہ کتاب ہم تک محترم عقیل عباس جعفری کی مہربانی سے پہنچی۔ یہ وہ نیم رخ نہیں ہے جو مجتبیٰ حسین نے لکھی تھی۔ بلکہ یہ اس شخصیت کی 'نیم رخ' ہے جو باقر مہدی کہلاتا تھا۔ اکھڑ مزاج، کج رو، کج ادا، کھرا........ ایک کڑوا شخص۔ سچ کو منہ پر دے مارنے والا انسان جس سے بڑے بڑے نامی گرامی کنارہ کرنا ہی عافیت سمجھتے تھے۔

میں تنگ آ گئی تری بدعہدیوں سے
ان آئے دن کی باقر مہدیوں سے

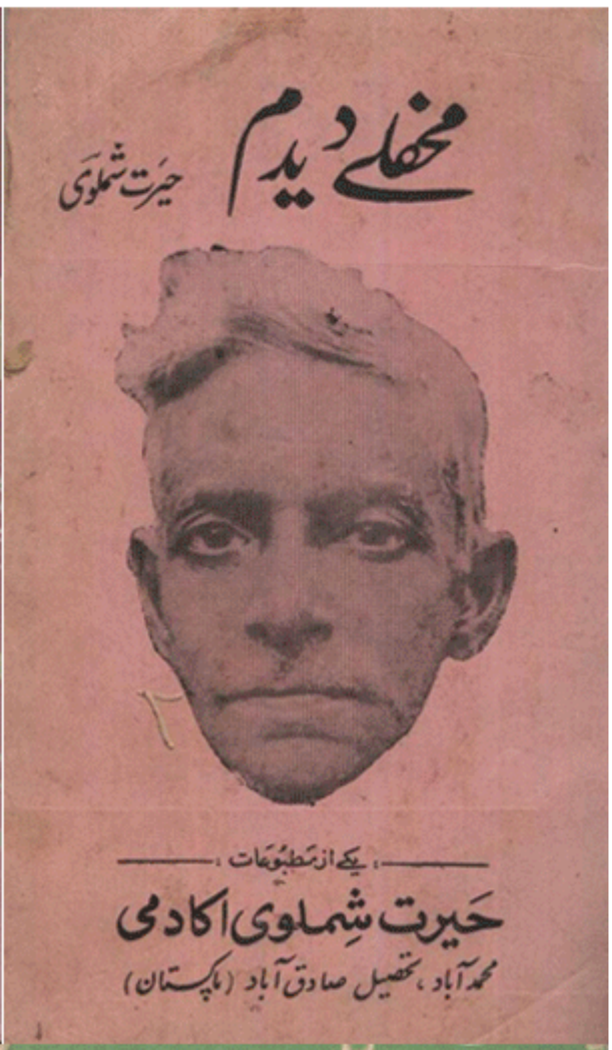

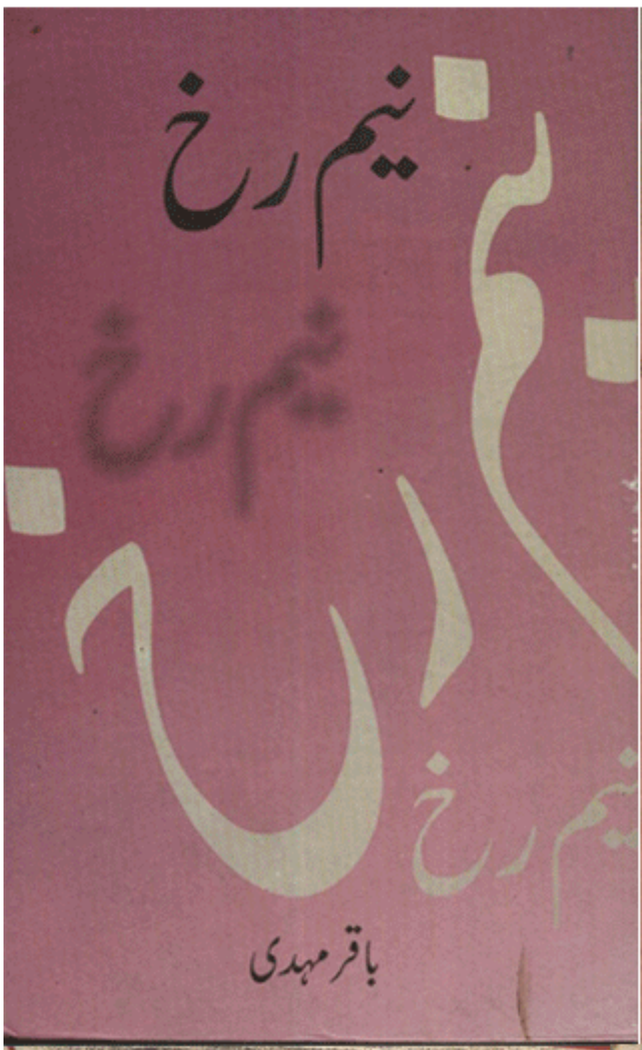

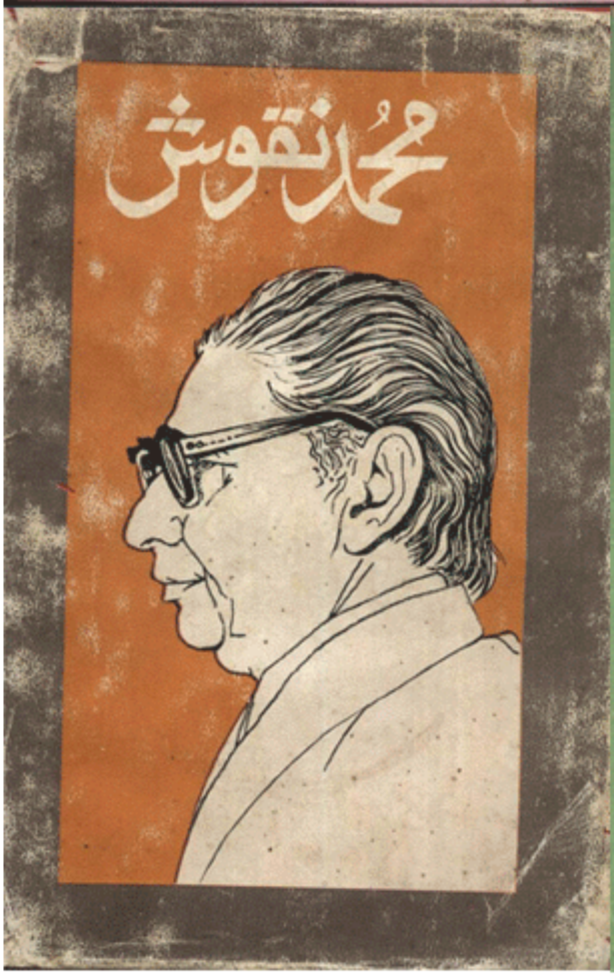

شعر مذکورہ کو مشفق خواجہ نے اپنے ایک کالم میں باندھا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں کی ایک نظم سے لیے گئے اس شعر کو سن کر ایک مرتبہ تو باقر مہدی بھی

مسکرا اٹھے ہوں گے۔ مشفق خواجہ کا یہ کالم 28 دسمبر 1989 کو شائع ہوا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب باقر مہدی، پاکستان میں تھے ۔ خامہ بگوش لکھتے ہیں:

’’ہندوستان سے آئے دن ادیب آتے رہتے ہیں جن سے مل کر اور جن کی باتیں سن کر ہم خوش ہوتے ہیں ۔ لیکن اب کے ایک ایسا ادیب آیا ہے جس کے آنے کی خبر سن کر سب پر خوف طاری ہوگیا اور مل کر ایسا محسوس ہوا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ باقر مہدی اپنی وضع کے بالکل مختلف آدمی ہیں۔ روایتی ادب اور روایتی اخلاق، دونوں سے بیزار۔ نتیجہ یہ ہے کہ سوائے وارث علوی کے کوئی ان کو پڑھ کر خوش ہوتا ہے نہ مل کر۔ وہ تحریر میں شمشیر عریاں ہیں تو گفتگو میں تیغ
محرف۔ نوک خنجر سے لکھتے ہیں تو نیزے کی انی سے بولتے ہیں۔‘‘

نیم رخ اپریل 2005 میں ممبئ سے شائع ہوئی تھی ۔ جبکہ مشفق خواجہ اسی سال فروری میں انتقال کر گئے تھے، زندہ رہتے تو متذکرہ کتاب ضرور پڑھتے اور شاید مزید ایک کالم لکھ ڈالتے۔ کتاب ہی کچھ ایسی ہے۔ 11 فروری 1927 کو ردولی میں مولوی جعفر مہدی رزم ردولوی کے گھر پیدا ہونے والے باقر مہدی نے 24 ستمبر 2006 کو ممبئ میں جان، جان آفریں کے حوالے کی تھی۔

اس عالم رنگ و بو میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو غیر روایتی شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے ہی چند احباب کا تذکرہ جوش نے یادوں کی برات میں بھی

کیا ہے۔ ان میں ایک صاحب تھے جو یاروں کی جمی جمائی محفل کے عین درمیان ان سبھوں کو یہ کہہ کر للکار بیٹھے تھے کہ تم لوگ خود کو بوژوا کہتے ہو اور کیا خاک کہتے ہو، بوژوائیت تو یہ ہے کہ میں کموڈ میں پلاؤ کھا سکتا ہوں جو تم لوگ نہیں کھا سکتے۔ جوش کہتے ہیں کہ یہ عجیب و غریب دعوی سن کر سبھی پیچھے ہٹ گئے اور ان صاحب نے کموڈ منگوا کر اسے راکھ سے دھلوایا اور اس میں پلاؤ ڈال، شتابی سے چٹ کر گئے۔ یادوں کی برات ہی میں ایک اور شخصیت کا تذکرہ بھی ہے جن کی والدہ کے انتقال پر ایک خلقت ان کی کوٹھی کے سامنے تعزیت کے لیے جمع ہو گئی اور وہ اندر سے برآمد ہوئے اور مجمع کو مخاطب کرکے قریب موجود ایک شخص سے فرمانے لگے کہ " ان سب کا ہماری والدہ سے کیا تعلق ہے کہ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہو گئے ہیں؟"

سب کے سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور آن کی آن میں کوٹھی کا احاطہ خالی ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی شخصیت باقر مہدی کی بھی تھی۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو کہ اپنے بارے میں اس قسم کا اظہار خیال دل گردے کی بات ہے:

بس میرا ذکر آتے ہی محفل اجڑ گئی
شیطان کے بعد دوسری شہرت ملی مجھے

راوی کہتا ہے کہ ایک پاکستان ادیب نے نہایت عقیدت سے باقر مہدی کی خدمت میں اپنی کتاب پیش کی۔ باقر مہدی نے کتاب اور مصنف دونوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور کہا'' اس زحمت کی کیا ضرورت ہے''۔ مصنف نے اپنی عقیدت کو مزید گاڑھا کرتے ہوئے عرض کیا'' یہ حقیر تحفہ آپ کی نذر ہے''۔ باقر مہدی نے جواب دیا'' میرے اپنے ملک میں ایسے حقیر تحفوں کی کیا کمی ہے جو میں آپ کے ملک کی کتابیں ساتھ لے جاؤں''۔

ذکر ہے باقر مہدی اور ان کی نیم رخ کا۔ کتاب مذکورہ 320 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں شخصی خاکوں وتذکروں کے علاوہ مختلف مشاہیر ادب کے وہ مکاتیب بھی شامل ہیں جو مختلف ادوار میں باقر مہدی کے نام لکھے گئے تھے۔ نیم رخ میں خلیل الرحمٰن اعظمی، احتشام حسین، وارث علوی، جاں نثار اختر، پروفیسر مجتبیٰ حسین، آل احمد سرور، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، انور خان، فراق اور حسن نعیم کے خاکے شامل ہیں۔

اوپر ہم نے مشفق خواجہ کے کالم کے حوالے دیے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب باقر مہدی پاکستان آئے تھے۔ کالم میں ایک جگہ مشفق خواجہ لکھتے ہیں :

سننے میں آیا ہے کہ باقر مہدی آج کل لاہور میں ہیں اور وہاں کی ادبی محفلوں میں '' صبح وشام شرکت کر رہے ہیں اور چہک رہے ہیں۔ چہکنے کی وجہ یہ ہے

''کہ کشور ناہید ان کی میزبان ہیں۔ کشور ناہید جہاں چاہتی ہیں انہیں لے جاتی ہیں۔

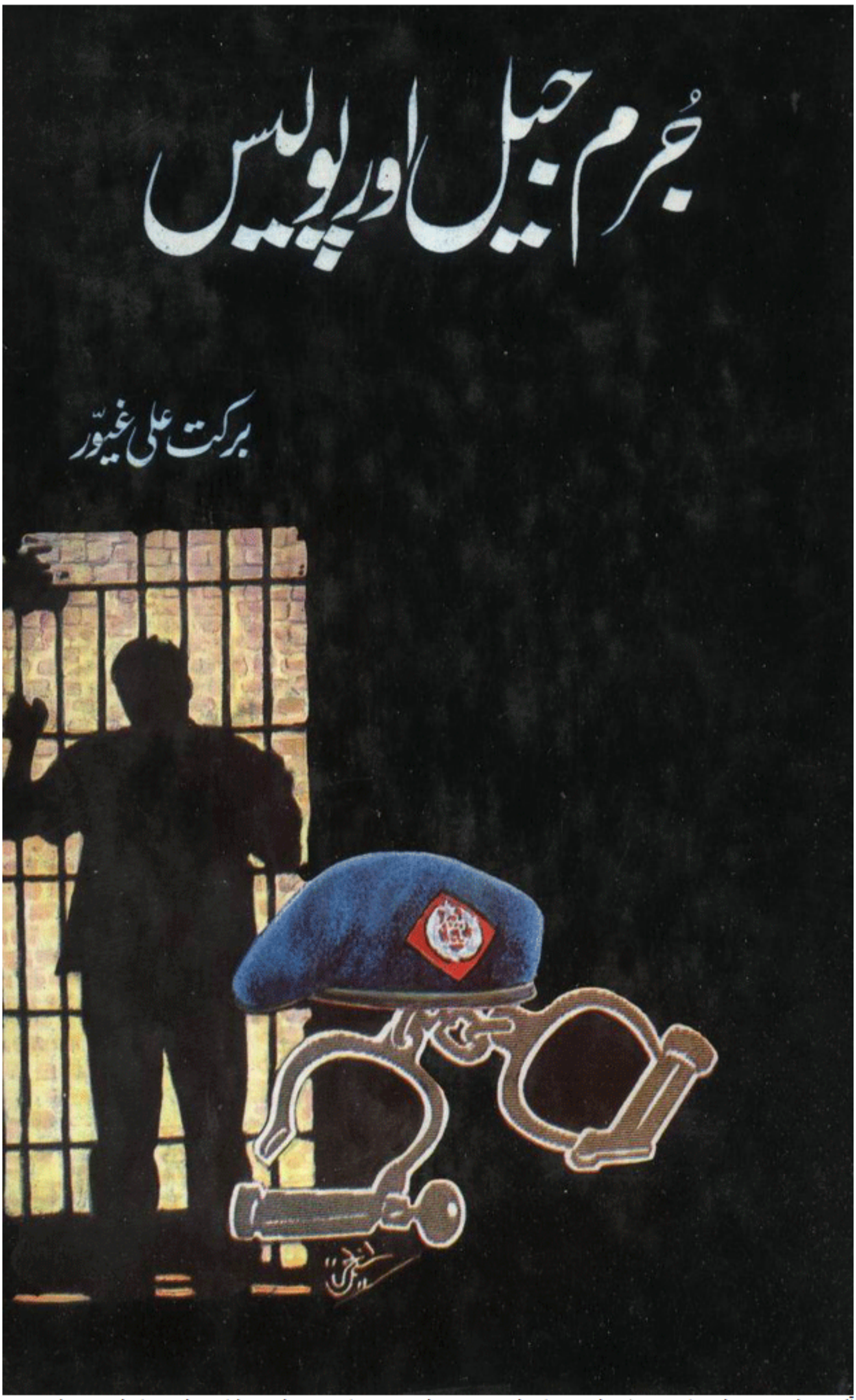

آئیے دیکھتے ہیں کہ قیام لاہور اور کشور ناہید کی ہم نشینی کے سبب باقر مہدی کی جھکاروں کے بیان کے برعکس خود باقر مہدی اس بارے میں نیم رخ میں کیا لکھتے ہیں:

'' میرے تعلقات کشور ناہید سے بھی ختم ہوگئے۔ اس لیے کہ انہوں نے میرے 'اعزاز 'میں سنگ میل اشاعتی ادارہ اور وزیر آغا کے یہاں جلسہ رکھا۔شاید وہ میری دعوت کا 'معاوضہ' ادا کرنا چاہتی تھیں۔میں نے کراچی سے 23 دسمبر 1989 میں انہیں نہایت سخت قسم کا خط لکھا ۔یہی کہ میں اس قسم کے جلسے اور اعزاز کے خلاف ہوں۔مجھ 'غریب' (غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد)پر کیوں اتنی رحم کی

''بارش کرتی ہیں۔ خیر۔

باقر مہدی ایک غصہ ور شخصیت کے مالک تھے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں تو خیر ایک معمول کی بات تھی البتہ ہاتھاپائی کی بھی نوبت آجایا کرتی تھی۔ سردار جعفری کے خاکے میں انہوں نے ایسا ہی ایک واقعہ لکھا ہے۔باقر مہدی کے امریتاپریتم اور ساحر سے متعلق ایک گستاخانہ فقرے کو سن کر سردار جعفری اس قدر طیش میں آگئے کہ انہوں نے باقر مہدی پر سوڈے کی بوتل کھینچ کر ماری۔ مگر شومئی قسمت کہ بوتل ساتھ کھڑے ہوئے غلام ربانی تاباں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔اسی طرح ایک موقع پر باقرمہدی، قتیل شفائی کے ایک شعر کی تحریف کرکے حسن نعیم کو ناراض کر بیٹھے، شعر یہ تھا:

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
گاتے گاتے بیٹھ گئی آواز قتیل شفائی کی

غضب تو تب ہوا جب باقر مہدی کی جھڑپ مجنوں گورکھپوری سے ہوئی۔ باقر مہدی لکھتے ہیں:

''میں پہلی اور آخری بار مجنوں گورکھپوری سے ملا تھا۔ شراب کم پڑ گئی تو حسن نعیم ایک آشنا اسمٰعیل کے گھر گئے اور وہاں میری چخ مجنوں صاحب سے ہو گئی۔ شاید میں نے کہا تھا کہ مجھے تھامس ہارڈی کا ناول Tess نہیں Return of the Native پسند ہے اور آپ کا نام 'ہیا ہیا' اچھا نہیں لگا ہے، یہ میں نے فیض

آباد میں گلاب واڑی کے کتب خانے سے لے کر پڑھا تھا۔ وہ برہم ہوگئے اور اپنی چھڑی لے کر مجھے مارنے کے لیے بڑھے۔ ہم سب مدہوش تھے مگر مجھے ان کی بزرگی اور علمیت کا احترام تھا اس لیے بچنے کے لیے کمرے میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔''

اول تو باقر مہدی کا یہ لکھنا کہ ''ہم سب مدہوش'' تھے، صورت حال کو واضح کر دیتا ہے۔ مزید وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب انہیں سطور میں ذرا آگے چل کر باقر مہدی یہ کہتے ہیں کہ جب اس بھاگ دوڑ کے بعد انہوں نے مجنوں صاحب کی تعریف یہ کہہ کر کی کہ وہ تو انہیں فراق سے بھی بڑا دانشور سمجھتے ہیں تو مجنوں صاحب ساری ناچاقی یک لخت بھلا کر خوش ہوگئے۔ مجنوں صاحب یہ بھی بھول چکے تھے کہ کچھ دیر قبل وہ باقر مہدی کو زدو کوب کرنے کی نیت سے ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

نیم رخ میں ایک مزے دار واقعہ لکھا ہے۔ بمبئی کی ایک محفل میں جوش موجود تھے۔ بھارت بھوشن مجمع کو چیرتے ان تک پہنچے اور کہا ''جوش صاحب! میں نے مرزا غالب میں غالب کا کردار ادا کیا'۔ جوش کو یہ مداخلت بے جا پسند نہ آئی اور انہوں نے برجستہ جواب دیا'' میں غالب کا مخالف نہیں ہوں مگر تم نے کیسے یہ کردار ادا کیا کہ لوگ غالب کے مخالف ہوگئے۔''

:نیم رخ میں باقر مہدی نے اپنی شادی کا قصہ خوب بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں

" خیر النساء (باقر مہدی کی اہلیہ) سے چند لمحے گفتگو بھی ہر ہفتے ہوتی تھی۔ میں نے اپنے اخراجات کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح سگریٹ، چائے اور کھانے میں کفایت سے کام لینے لگا۔ ٹیکسی کا خیال بالکل چھوڑ دیا۔ اگر ٹرام نہ ملے تو زیادہ تر بس پر سفر کرتا تھا۔ شادی کی تاریخ بڑھتی چلی جارہی تھی مگر مجھے اس کی زیادہ فکر تھی کہ میرے معاشی حالات بہتر ہوجائیں۔ آخر 10 اکتوبر کو ہماری شادی ہوئی۔ جاں نثار اختر، اختر الایمان، استاد خلیل شریک تھے۔ 12 اکتوبر کو میرے طرف سے ضیافت کا انتظام سراج الحق کے دوست وارثی صاحب نے تاج ہوٹل کی انیکسی میں کرایا تھا، صرف چائے کیک کا انتظام تھا۔ حیرت ہے کہ اردو کے مشہور شعراء شریک ہوئے مگر کوئی شیعہ نہ آیا۔"

ہماری دسترس میں باقر مہدی پر لکھا صرف ایک ہی خاکہ ہے۔ یہ ہے انور ظہیر خان کی دلچسپ اور جاندار تحریر "کتابیں، قہقہے اور باقر مہدی" ۔ انور ظہیر کی اس تحریر سے باقر مہدی کی شخصیت کے مزید کئی پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ انور ظہیر کی باقر مہدی سے پہلی ملاقات تھی جو مختصر رہی اور واپسی پر ان کے یہ کہنے پر کہ " دعاؤں میں یاد رکھیے گا، خدا حافظ"'، باقر مہدی نے ایک قہقہہ لگا کر اپنی بیگم کو آواز دی "

،آہاہاہاہا...........سنو خیری

یہ ، یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ دادا رے دادا۔ میں اور دعا..... دعا اور میں''۔

انور ظہیر خان کے بقول جب باقر مہدی کے والد انہیں گھیر گھار کر مسجد کی جانب لے گئے تو انہوں نے کچھ ان الفاظ میں نماز کی نیت باندھی تھی'' اللہ تعالی، میں نیت کرتا ہوں دو رکعت کی نماز کی۔، مگر آپ کے نہیں ابا کے ڈر سے، منہ میرا طرف کعبہ شریف کے ، اللہ اکبر''

اور باقر مہدی کے والد نے ایک زناٹے کا تھپٹر ان کے منہ پر رسید کرڈالا۔

باقر مہدی کی بھری محفلوں میں مشاہیر ادب کی بھد اڑانے کے قصے عام تھے،۔ ایسے ہی ایک واقعے کے راوی انور ظہیر خان بھی تھے۔ موقع تھا مہارشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے منشی پریم چند سیمنار کا، ڈائس پر سردار جعفری، آل احمد سرور، شمس الرحمان فاروقی، خواجہ احمد عباس وغیرہ بیٹھے تھے اور تقریر کررہے تھے ۔لکھتے ہیں:

باری آنے پر پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے گھمبیر لہجے میں تقریر کرتے ہوئے جب کچھ اس طرح کے جملے ادا کیے '' پریم چند اور ڈاکٹر اقبال اردو کے دو بڑے تخلیقی فنکار ہیں جنھوں نے اپنی نظر اور نظریے اور زبان و بیاں سے فکر اور

شعریات کے دھارے بدل دیے۔'' ۔باقر مہدی سے نہ رہا گیا، زور سے سر کو جھٹکا دیا۔ ہاتھ لہرایا اور کرسی پر اچھلے اور آہستہ آہستہ بولے '' پھ پھ پھر وہی پہ پہ پرانی بات، یہ ......یہ درست نہیں ہے۔ درست نہیں۔''

آڈیٹوریم میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ جو لوگ ان کے قریب بیٹھے تھے، سر جھکا کے یا رومال میں منہ چھپا کر ہنسنے لگے۔ جو دور تھے، گردنیں اونچی کر کرکے دیکھنے لگے کہ یہ آواز کس خانہ خراب کی ہے۔ سرور صاحب تقریر ختم کرکے بیٹھنے لگے تو باقر مہدی کھڑے ہو گئے اور بولنا شروع کر دیا '' سووو... سرور صاحب....اقبال اور پریم چند آپ کی پرانی کمزوری ہیں۔ آج پھر آپ نے دونوں کا موازنہ کر ڈالا جبکہ دونوں کی تھنکنگ مختلف اور ٹریٹمنٹ جداگانہ ہیں۔'' اور اتنا کہتے ہی 'آہا آہاہا' کہتے ہوئے کرسی میں سما گئے۔ ان آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ اس وقت ہنسنے والے باقر مہدی تنہا نہیں تھے۔ ''

مذکورہ خاکے میں انور ظہیر خان ایک موقع پر ہمیں ایک دوسرے باقر مہدی کی جھلک بھی دکھاتے ہیں۔ شاید یہی باقر مہدی کا اصل چہرہ تھا، حساس اور درد مند۔ یہ موقع تھا ایک ایسے سیمنار کا جہاں باقر مہدی مقالہ پڑھنے گئے تھے اور اپنے مرحوم دوستوں ظ انصاری، عزیز قیسی اور حسن نعیم کو یاد کرتے رہے تھے۔ تقریب کے اختتام پر ان کی آنکھیں نم تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

: وہ انور ظہیر و دیگر سے یوں گویا ہوئے تھے

”میں کیا کروں دادا رے دادا۔ سردار جعفری اور وارث علوی کو دیکھ کر مجھے وہ تینوں دوست یاد آ گئے۔ وہ صحبتیں، وہ راتیں یاد آ گئیں۔ جب ہم دھوم مچاتے تھے۔ لہکتے تھے، بہکتے چہکتے تھے اور کسی کی کسی بات پر پہروں کھنچے کھنچے بھی رہتے تھے۔ آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ اگر کوئی گستاخی ہو تو معاف کیجئے گا جناب۔ آپ لوگ فرشتوں کی طرح routine life جی رہے ہیں۔ ہم اور ہمارے ساتھی خوب پڑھتے controversies پیدا کرتے ، اکھاڑ پچھاڑ ہوتی، جوش جنوں میں گریباں پر ہاتھ ڈالتے اور جب جنوں کا پھین ختم ہو جاتا تو دامن پکڑ لیتے ۔گلے میں بانہیں ڈال کر گھومتے۔ ہائے وہ کیا دن تھے۔ کیا راتیں تھیں۔ کیا باتیں تھیں۔ ہائے ہمارے مہرباں بھی کیسے کیسے تھے اور کیا کیا کر گزرے۔ معافی چاہتا ہوں۔ نئی نسل ان نعمتوں، صحبتوں سے محروم ہے۔ ہم وحشی تھے مگر انسان تھے۔ آپ لوگ صرف انسان ہیں انسان۔ دادا رے دادا۔“

☆☆☆

:اتوار بازار سے ملنے والی دیگر کتابوں کی تفصیل یہ ہے

محفلے دیدم، خاکوں کا مجموعہ، حیرت شملوی ، مرتب: سید انیس شاہ جیلانی۔ حیرت

شملوی اکادمی، محمد آباد، تحصیل صادق آباد۔اشاعت: 1981
محمد نقوش، مدیر نقوش محمد طفیل پر تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ، سید معین الرحمٰن ،
کاروان ادب، ملتان۔اشاعت: 1983
اردو زبان اور ادب کا خاکہ، پی ایچ ڈی کا مقالہ، ڈاکٹر خوشحال زیدی، بزم خضر راہ، نئی
دہلی۔اشاعت: 1993
کفر کے اندھیروں سے نور اسلام تک، ایک نو مسلم کے قبول اسلام کی داستان ، غازی
احمد (سابق کرشن لال)، صدیقی ٹرسٹ، کراچی۔اشاعت: 1983
جرم، جیل اور پولیس ، اسیری کی یادداشتیں، برکت علی غیور، جنگ پبلیکیشنز۔اشاعت:
1994